جلد 47 • شمارہ 08 • اگست 2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: لبنیٰ خیال

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من ...... السلامُ علیکم ......!

اگست کا شمارہ پیشِ خدمت ہے، آزادی کی سترّویں سالگرہ اور اس کی دلی مبارک باد کے ساتھ۔ ہم ماشاء اللہ آزادی کے سترّ برس گزار چکے لیکن صورتِ حال کچھ بہتر نہیں۔ چھوٹے موٹے واقعات کا تو ذکر ہی کیا، ذرائع ابلاغ سے آنے والی خبروں کے مطابق پنڈی میں ایک نمایاں سیاسی خاتون کے گھر سے سولہ سالہ ملازم کی بوری بند لاش ملی، لاہور میں ایک معزز سرکاری اہلِ کار کے اہلِ خانہ نے کم سن ملازمہ کو تشدد کا نشانہ بنایا، ایک رکن اسمبلی نے کوئٹہ کی شاہراہ پر ایک پولیس افسر کو اپنی غیر قانونی گاڑی سے کچل کر ہلاک کر دیا، ایک کھیت کے مالک نے ایک بچے کو محض اس لیے کہ اس کا گدھا کھیت کو خراب کر رہا تھا، گدھے سے باندھ کر گدھے کو دوڑا دیا اور وہ بدنصیب بچہ زمین پر گھسٹتا، لہولہان ہو کر ہلاک ہو گیا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن میں ظلم بلکہ جرم کا ثبوت موجود ہے، ظالم بھی سامنے ہے اور مظلوم فریاد کناں ہیں یا ملکِ عدم کے راہی ہو چکے ہیں۔ سب کچھ اتنا واضح ہے تو انصاف فوری ہو جانا چاہیے تھا لیکن کیا کیا جائے کہ اثر و رسوخ اور تفتیشی سرخ فیتے اس راستے کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ بااثر لوگوں کو غرور ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ مخلوق ہیں، دوسرے شہری اُن کی نظروں میں حقیر کیڑے مکوڑوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ انہیں حسبِ خواہش مارا پیٹا یا کچلا جا سکتا ہے۔ یہ سب ریمنڈ ڈیوس نہیں ہوتے لیکن خود کو اس سے کم تر نہیں سمجھتے۔ ان کی چند وارداتوں کے فوری اور عبرت اثر فیصلے صادر و نافذ ہو جائیں تو ان کے دماغوں سے تکبّر کا خناس نکل سکتا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں غریب اور بدحال شہریوں کے لیے سکون و عافیت کا وہ دن نہ جانے کب طلوع ہو گا جب وہ بھی کسی وڈیرے، جاگیردار، سیاسی رہنما یا سرکاری افسر کی دہشت کے بغیر سینہ تان کر بےفکری اور برابری سے جی سکیں گے۔ پاکستان کے مظلوم شہریوں کے لیے دعائے خیر کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں خیر کے ساتھ شر نہیں بلکہ شرارت بھی پائی جا رہی ہے۔

صوابی سے کوثر اسلام کی دشواریاں ”اس بار 5 جولائی کو جاسوسی نے پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے رُخِ زیبا کا دیدار کرایا۔ سرورق کو دیکھ کر ہم ابھی تک یہ گتھی نہ سلجھا پائے کہ متبسم شخص کس بات پر مسکرا رہا ہے۔ (زیادہ زور نہ ڈالیں) نیچے دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہیں جس میں خون آلود چاقو پکڑے غفور طارق سے بیگ چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔ حیرت انگیز طور پر طارق کے جسم پر کوئی گھاؤ نہیں۔ رہی بات دوشیزہ کی، تو دوشیزاؤں کی طرف ہم نظرِ التفات نہیں کرتے اس لیے کہ یہ جاسوسینز کا کام نہیں۔ چینی نکتہ چینی میں دوستوں کی محفل خوب جمی۔ سرورق کی پہلی کہانی سوگ وزیاں لاجواب تھی۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی رہی دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایلیا کے پھنسنے سے بی پی لو ہو گیا۔ لیکن کہانی بہت عجلت میں سمیٹی گئی۔ دوسری بات غفور نے طارق پر صرف ایک وار کیا تھا، اس کے پیٹ میں چاقو گھونپا تھا لیکن فرانسک ڈپارٹمنٹ میں ڈاکٹر شازیہ کے مطابق اسے دل اور جگر میں دو وار لگے تھے، یہ کیسے؟ پہلی کہانی پُرخار راستے ایک اچھی کہانی تھی۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ پولیس اور ہمارے معاشرتی نظام سے تاجو پیدا ہوتے رہتے ہیں ہمارے معاشرے میں قانون سب کے لیے یکساں نہیں۔ شیریں نے ثابت کر دیا کہ عورت محبت میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی شیریں کے مطابق تاجو کے والدین ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسے تھے جبکہ بلیک برڈ کے مطابق اس کے والد اسپتال میں جب کہ ماں ہارٹ فیل سے مر گئی تھی۔ (بلیک برڈ کی تحقیق غلط تھی) گڑھا بھی اچھی کہانی تھی بعض اوقات اپنے ہاتھوں سے کھودے گئے گڑھے زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ دوسرا کیس نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ آسان مشکل بھی اچھی کہانی تھی۔ رپورٹر پر بہت افسوس ہوا جو خبر بنانے کے چکر میں خود خبر بن گئی۔ آج کل ایک دوسرے پر سبقت اور ریٹنگ کے لیے ٹی وی چینلز کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جاوید مغل کے انگارے شعلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں جبکہ آوارہ گرد شاید اختتامی سفر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ احتیاط، پہلی غلطی، تجربے کی ذہانت، گمشدہ عمدہ کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ شاندار تھا۔“

کراچی سے سعدیہ قادری کی امیدیں ”اس بار برستی شام میں جاسوسی ملا تو بنا کھولے ہی رکھ دیا کیونکہ اپنے تبصرے کے شائع ہونے کی کوئی امید نہ تھی اور امید ہوتی بھی کیوں جبکہ تبصرہ بھیجا ہی نہیں تھا۔ فرصت میسر آتے ہی جب نکتہ چینی کی طرف نظر کی تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ بہت سے احباب نے میری والدہ کو اپنی پرخلوص دعاؤں میں یاد رکھا۔ خوش رہیں آباد رہیں۔ اس بار ایم اے راحت کی وفات کی وجہ سے اداسی چھائی رہی۔ میری ادارے سے درخواست ہے کہ ایم اے راحت، کاشف زبیر، محی الدین نواب اور سلیم فاروقی مرحوم کے اعزاز میں ایک خاص نمبر نکالا جائے۔ پاکیزہ بھی اسی ادارے کے تحت شائع ہوتا ہے اور پاکیزہ نے شازیہ چوہدری اور فرحانہ ناز ملک کی وفات پر جس طرح انہیں خراجِ تحسین پیش کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ امید ہے کہ میری درخواست پر غور کیا جائے گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ اس مرتبہ انگارے کی دو اقساط اکٹھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ مغل صاحب کی منظر نگاری مجھے بہت پسند ہے۔ جس طرح شاہ زیب نے بدترین تشدد کے آگے ہار نہ مانی، وہ تھوڑا نا قابلِ یقین لگا۔ کبیر عباسی کی دوسرا کیس بھی اوسط درجے کی رہی، امید ہے آگے چل کر نکھر جائے گی۔ آسان مشکل

صرف مظہر سلیم ہاشمی کا نام دیکھ کر پڑھی، اچھی تھی لیکن اب کی بار آپ غیر ملکیوں کے بجائے پاکستانی معاشرے پر کچھ لکھیں تو اور اچھا لگے گا۔ اب بات کرتے ہیں سرورق کے رنگوں کی۔ سوگ وزیاں میں ایلیا کا نام پڑھتے ہی رسالہ رکھ دینے کا دل کیا کیونکہ اس بار کوئی غیر ملکی یا ترجمہ شدہ کہانی پڑھنے کا موڈ نہیں تھا لیکن اگلی لائنوں میں خان کے نام پر نظر پڑی اور اچھا ہی ہوا ورنہ میں اتنی اچھی کہانی سے محروم رہ جاتی۔ ہمارے معاشرے میں ہر شعبے میں کرپشن جس طرح رچ بس گئی ہے، اسے مصنفہ نے بہت خوبی سے ظاہر کیا۔ ڈاکٹر مسیحا کے روپ میں بھیڑیا نکلا۔ دوسرے رنگ پہ میری پسندیدہ مصنفہ چھائی ہوئی تھیں۔ موجودہ دور کی بہت سی تلخیوں کو عیاں کرتی تحریر متاثر کن رہی خاص طور پر بیوہ کے ساتھ اس کے سسرالیوں کا رویّہ، زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ آخر میں مصنفہ نے بہت اچھا پیغام دیا کہ آسائش کے ساتھ آزمائش بھی ہوتی ہے۔ تبصرہ بھیجنے میں ٹائم باقی تھا اس لیے ایچ اقبال صاحب کو بھی پڑھ لیا۔ واقعی ہمارے معاشرے کی ناانصافیوں کی بدولت بہت سے ایسے نوجوان جو کہ بہترین ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں بن سکتے تھے، وہ گینگسٹر اور ٹارگٹ کلر بن کر اندھیرے کے مسافر بن گئے۔ باقی شمارے پہ تبصرہ قلتِ وقت کے باعث نہیں کیا جاسکے گا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اس بار کراچی میں کوئی اچھی حکومت آئے جو ٹریفک اور سیوریج کے مسائل کا سنجیدگی سے حل نکالے۔''

دبئی سے طلعت مسعود کے مشورے ''جولائی کے جاسوسی نے عید کے دو دن بعد دیدار کروایا جہاں سرورق پر براجمان لڑکی بڑی ادا سے آنکھیں گھما کر دیکھ رہی تھی لیکن ساتھ ہی ذاکر انکل نے پُراسرار قتل کا سین بھی بنا دیا اس لیے جلدی سے وہاں سے گزر کر آگے بڑھے تو مدیر کرکٹ ٹیم کی جیت کی خوشی شیئر کر رہے تھے۔ میری طرف سے بھی جاسوسی پڑھنے والوں اور پوری قوم کو چیمپئنز ٹرافی کی شاندار جیت مبارک۔ محفلِ خطوط میں پہلے نمبر پر عاصم جٹ صاحب نپے تلے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ دوسرے نمبر پر ہمارا اپنا ہی خط دیکھ کر خوشی ہوئی، اس حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ انصر علی کا متوازن اور ایمانے زارا شاہ کا عقل مندانہ تبصرہ پسند آیا، اسی طرح آتے رہا کریں۔ مقصود اویسی صاحب کی پہلی انٹری متاثر کن رہی، ویلکم! محمد اقبال، اشفاق شاہین، نوار گل، مومنہ کشف کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ اعتزاز شرماتے ہوئے شادی کے بارے میں سوچتے نظر آئے اور تبصرہ بھی عمدہ کیا۔ کہانیوں میں حسب معمول انگارے سے اسٹارٹ لیا جہاں مغل صاحب شاہ زیب بے چارے پر تشدد کے پہاڑ تڑوا دیے ویسے لگتا ہے اب جلد ہی جاماجی میں فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ رنگوں میں روبینہ رشید صاحبہ نے سوگ وزیاں ڈاکٹری جیسے مقدس پیشے کی آڑ میں چھپے سفاک درندوں کو بے نقاب کیا۔ اتنے سفاک دہشت گردی کا نیٹ ورک ایک اسپتال کی آڑ میں آسانی سے دھندا کرتے رہے۔ ایسے لوگ معاشرے اور قانون دونوں کے مجرم ہیں۔ مجموعی طور پر کہانی بہتر رہی۔ اسما قادری کا دہشت نگر مجھے زیادہ پسند آیا۔ سائرہ نے جس طرح ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا، وہ سب کے لیے سبق ہے اور ایسے ہی لوگوں کی قربانیوں اور ولی جیسے گمنام سپاہیوں کی بدولت اب دہشت گردی کی لعنت پر بہت حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں کبیر عباسی کی دوسرا کیس عمدہ رہی۔ دیسی محاورے کے استعمال نے مزہ دیا۔ کافی عرصے بعد کوئی طبع زاد سیریز نظر آئی۔ امید ہے اس میں آگے مزید دلچسپ کیس دیکھنے کو ملیں گے۔ مظہر سلیم ہاشمی کی پہلی انٹری آسان مشکل کی صورت میں متاثر کن رہی۔ غیر ضروری طوالت سے گریز کر کے صرف کیس کی تفتیش پر فوکس رکھا جس سے کہانی دلچسپ رہی۔ ہاشمی بھائی کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں پھر منظر امام صاحب نے استاد نرالے عالم سے ملاقات کروائی اور آخر میں استاد کی زبان سے صاف اردو کا فقرہ سن کر ہم نے بھی کہانیوں کو بریک لگا کر تبصرہ لکھا۔ آخر میں ایک گزارش ہے کہ جیسے پہلے گوشۂ خاص سلسلہ ہوا کرتا تھا اسی طرح اگر کوئی سلسلہ شروع کیا جائے جس میں پرانی مقبول کہانیوں کو دوبارہ پیش کیا جاسکے تو بہت سی شاہکار کہانیوں سے دوبارہ مستفید ہوا جاسکتا ہے۔''

اسلام آباد سے سیدہ ایمانے زارا شاہ کی تنقید نگاری ''عید کیا آتی ہے ہم اسلام آباد والوں کی شامت آجاتی ہے جیسے گرمیوں میں اسکول ویران ہوجاتے ہیں ویسے ہی اسلام آباد کے بازار و مارکیٹوں میں اُلّو بولتے نظر آتے ہیں اس لیے جاسوسی قدرے تاخیر سے ملا۔ جاسوسی کا ٹائٹل شمارے کے حساب سے موزوں ہی لگا بس آج تک یہ گتھی نہیں سلجھا پایا کہ ہر قسم کے میگزینز کے ٹائٹل پر خواتین کیوں براجمان ہوتی ہیں؟ نہیں پتا نا آپ کو بھی! (جی ہم بھی لاعلم ہیں) مدیر صاحب خوب کہا آپ نے...... غرور کا سر نیچا ہی ہوتا ہے سو انڈیا کا غرور کچھ ایسا ٹوٹا ہے کہ اس کی کرچیاں... طول و عرض میں برسوں چبھتی رہیں گی۔ یہ ہمارے لیے ایک کرکٹ میچ سے بڑھ کر تھا۔ کرکٹ ٹیم نے ہمارے پاکستان کی لاج رکھی اور سرفخر سے بلند کرنے کا شاندار موقع دیا۔ آئندہ بھی ایسی فتوحات نصیب ہوں آمین! چینی نکتہ چینی میں اس مرتبہ تقریباً سارے جانے پہچانے نام تھے۔ طلعت مسعود کا شاندار تبصرہ تھا۔ عائشہ الحمیرا اور انصر علی نے بھی خوب انٹری دی ہے، لکھتے رہنا اب آپ دونوں۔ جام مقصود اویسی اپنا تبصرہ دیکھ کر آپ کی حیرت یقیناً ختم ہوگئی ہوگی کہ کیسے سب لکھ لیتے۔ اعتزاز وزریاب ہر دفعہ ایسے براجمان ہوتے ہیں جیسے بچپن میں کلاس میں آگے بیٹھنے کے چکر میں اپنا بیگ رکھا کرتے تھے۔ نوار گل اور مومنہ کشف کے تبصرے اچھے تھے ہلکے پھلکے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے ایچ اقبال کی پُرخار راستے پڑھی...... تاج ور جیسے ذہین دماغ ایسے ہی ضائع ہوتے ہیں اور مافیاز ہر دور میں یونہی سرگرم رہتے ہیں۔ مجموعی طور پہ کہانی پسند آئی لیکن ایک مزے کی چیز میں پھر بھی نظرانداز نہیں کرسکی۔ آخری سطور میں کرنل کا باقی سب کو تحویل میں لینے کے بعد شیریں کا سیل فون نہ لینا ایک جاسوسی طرز کی کہانی میں ایسے بھلکو برداشت نہیں ہوتے نہ ہی ہماری فوج کو بچوں کا کھلونا دکھایا کریں۔ گمشدہ اور احتیاط بہت دلچسپ کہانیاں لگیں جن میں آخر تک سسپنس برقرار رہا۔ کبیر عباسی اس مرتبہ دوسرا کیس لے کر آئے۔ کہانی مجموعی طور پہ ٹھیک لگی، اگر شروع کے بے جا طوالت دینے والے مکالمے حذف کر دیے جائیں خاص کر بالی وڈ موویز کی طرح فلرٹ قسم کے ڈائیلاگز کو آئٹم سونگ کے طور پر نہ

شامل کیا کریں، کیا ہی اچھا ہو۔ اگر سسپنس زیادہ کر دیا جائے جس سے کہانی میں دلچسپی مزید بڑھے گی۔ تجربے کی ذہانت، واہ انگریزوں کے تو ساس سسر کا بھی استاد ماغ چلتا، تجربہ رنگ لایا اور مجرم شکنجے میں آیا۔ ویلڈن ایڈ گر۔ فقیرانہ آئے منظر امام نے فارسی ہی سکھانے کی کوشش کی ہے جو کم از کم مجھے نہیں سمجھ آئی۔ بھلا ہوان کے شاگرد کا وہ ترجمہ نہ کرتا تو مجھے کچھ پلے نہ پڑتا بس یہ پتا چل گیا استاد محترم کا ضمیر بلا وجہ بیدار ہو گیا تھا۔ ان سے کوئی قتل وتل نہیں ہوا تھا۔ مشکلات بھی بھلا آسان ہوا کرتی ہیں مظہر سلیم ہاشمی؟ آسان مشکل سے کافی اچھی انٹری دی ہے خوش آمدید۔ امید ہے نیکسٹ ٹائم ہم آپ کے قلم سے اپنے ماحول و کرداروں پہ مشتمل کہانی پڑھیں گے۔ سوگ وزیاں کی نسبت، دہشت نگر بہتر رہی بس آخر میں شادی نہ کروائی جاتی۔ اچھی خاصی کہانی میں یہ عجیب ہی لگتا ہے۔ بلکہ خاصا بے تکا وہی روایتی کہانیوں والا ٹچ ...... سوگ وزیاں میں سسپنس ڈالنے کی کوشش تو بہت کی گئی مگر بے سود! اچھا آغاز تھا مگر اختتام متاثر کرنے میں ناکام رہا۔“

ہری پور سے شاہد ذوالفقار کے دوسری دفعہ پراٹھے ”اس دفعہ پہلی بار جاسوسی ڈائجسٹ کا بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ پہلی بار تبصرہ جو بھیجا تھا۔ چوبیس تاریخ کو فیس بک پر کسی نے پوسٹ لگائی کہ ڈائجسٹ آ گیا ہے تو دل دھک سے رہ گیا۔ ہم نے تبصرہ لکھنے میں عجلت دکھائی تو آپ نے جاسوسی چھاپنے میں عجلت دکھا دی۔ بہت اچھے بہت اچھے بھئی ...... دھڑکتے دل کے ساتھ بک اسٹال پر پہنچے تو دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔ خیر اگلے دن ڈائجسٹ مل ہی گیا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ لڑکی کی شکل ایک پاکستانی اداکارہ سے ملتی جلتی تھی، پتا نہیں کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔ تبصرے سارے بہت اچھے تھے۔ اتنے اچھے اچھے تبصروں میں میرا تبصرہ کسی کھاتے میں ہی نہیں لگ رہا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پہلا رنگ پڑھا۔ بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ پڑھتے ہوئے ادھر ادھر کا ہوش ہی نہیں رہا۔ دوسرا رنگ بھی زبردست تھا بس پہلے سے کچھ کم تھا۔ پہلی کہانی شروع میں اچھی لگی مگر آگے جا کے بوریت ہونا شروع ہو گئی۔ یہ کہانی جتنے صفحوں پر تھی اس سے آدھے صفحوں پر ہوتی تو کافی بہتر ہوتی۔ (آئندہ مصنف کو تنبیہ کر دیں گے) عام طور پر میرا ڈائجسٹ تو ادھر ہی ختم ہو جاتا ہے مگر اس بار دو چھوٹی کہانیاں بھی پڑھیں۔ مظہر سلیم کی کہانی دیکھی۔ کہانی کا پہلا لفظ سان فرانسسکو پڑھ کے کہانی پڑھنے کا شوق کم ہو گیا کیونکہ مجھے انگلش کہانیوں کی سمجھ مشکل سے ہی آتی ہے۔ (تو اپنی سمجھ کو بڑھائیں نا!) یہ کہانی بھی پڑھ تو لی مگر سمجھ کم ہی آ سکی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کہانی اچھی نہیں تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدھی چھوٹی کہانیاں اردو والی ہوں اور آدھی بے شک انگلش؟ (کہانی تو کہانی ہوتی ہے۔ محض اردو انگریزی ناموں سے کہانی سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے؟) دوسرا کیس بہت مزے کی کہانی تھی، ہنس ہنس کے میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ واقعی ہر بار پراٹھے نہیں ملتے۔ (شکر ہے آپ کو یہ کہانی سمجھ میں آ گئی!) یہ محاورہ ہمارے ہاں بھی بولا جاتا ہے۔ میرا پہلا تبصرہ شائع ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں ہر بار پراٹھے نہیں ملتے مگر پھر بھی امید ہے ہر بار نہ سہی دوسری بار پراٹھے ضرور ملیں گے۔ یعنی میرا تبصرہ شائع ہو جائے گا۔“

لاہور سے انیلا ظفر کی تند و تیز رائے ”عید کی شام جولائی کا جاسوسی تھرل کے سارے رنگوں سے مہکتے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ پچھلے تبصرے میں برملا تنقید کو شامل کر کے آپ نے دل خوش کر دیا اور مجھے دوبارہ تبصرے کی تحریک بھی ملی۔ لڑکی کے بال کسی عمدہ اسٹریٹنر سے اسٹریٹ کیے ہوئے ہیں جو کسی برانڈڈ پارلر کی کارگزاری ہے۔ اوپر والے صاحب کسی انہونی پر ہنس رہے ہیں۔ اس عمر میں انہونی باتیں ہی ہونٹوں پہ ہنسی لا سکتی ہیں۔ فہرست پہ نظر دوڑاتے ہوئے اس محفل میں پہنچی جو دنیا بھر سے بھیجے گئے ان ناموں سے سجی ہے جن کو قیامت کے نامے کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی انڈیا سے تاریخی فتح پہ آپ کے تاثرات سے وہ لمحے دوبارہ تازہ ہو گئے۔ طلعت مسعود، انصر علی، ایمانے زارا، اعتزاز اور زریاب وصلی، سب کے نام اور نامے دل خوش کر گئے۔ کیونکہ فیس بک پر سب لوگ جے ڈی پی کے لیے بہت متحرک لوگ ہیں تو ان کے ناموں سے اپنائیت ہی کا تاثر آتا ہے۔ اب بات کرتے ہیں ان شاہکاروں کی جو آپ کا انتخاب تھے۔ ہم سب کی تفریح طبع کے لیے ابتدائی صفحات پر جو کہانی دی گئی وہ ایچ اقبال کی کہانی تھی۔ پُرخار راستے ایک ایسی کہانی لگی جس کا مقصد میری ناقص سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس ٹائپ کی کوئی ہزار ہا کہانیاں آ چکی ہیں اور لڑکیوں کی یہ نایاب قسم ...... توبہ۔ ابتدائی صفحات پر پر ماتما ہی دوبارہ لگا دیں اور ابتدائی کہانی اور سرورق کے رنگ، ان کی سلیکشن کرتے ہوئے ذرا بھی ہتھ ہولا نہ رکھا کریں۔ سرورق کا پہلا رنگ سوگ وزیاں روبینہ رشید نے لکھا اور کیا خوب لکھا۔ یہی ہوتے ہیں وہ رنگ جو صفحہ سے نظر نہیں ہٹانے دیتے۔ اعلیٰ بہادر عورتوں کی کہانیاں بہت مزہ دیتی ہیں اور اگر انداز تحریر بھی شاندار ہو تو کیا کہنے۔ دوسرا رنگ اسما قادری نے لکھا۔ کہانی اچھی تھی لیکن ایک کمی تھی) کہ سادہ انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ آغاز سے ہی انجام کا اندازہ ہو گیا تھا، مطلب سسپنس سے عاری تھی۔ پھر بھی اچھی کہانی کہی جا سکتی ہے۔ انگارے کی اس قسط کو بے شک ایک لہو گرماتی تحریر کہا جا سکتا ہے۔ تشدد کے اتنے طریقے پڑھ کے میرا تو دل دہل گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہیرو اپنوں میں پہنچ گیا۔ آوارہ گرد میں نے ایک عرصہ کے بعد پڑھی اور سرزمین سندھ کے مخصوص عوامل دیکھ کر اچھا لگا۔ شاید یہ انجام کی طرف قدم ہے۔ شارٹ اسٹوریز میں سب سے پہلے آسان مشکل پڑھی۔ سب سے پہلے مظہر سلیم ہاشمی کو رائٹرز کی صف میں قدم رکھنا مبارک ہو۔ اللہ کرے اچھا اضافہ ثابت ہوں۔ گمشدہ، ایک گمشدگی کو اتنے سال بعد بھی اتنی اہمیت ملنا حیران کن ہے۔ گڑھا کا اینڈ بھی دل دکھانے والا تھا۔ کتنی بدتر ہوتی ہے وہ زندگی جس سے موت زیادہ دلکش لگتی ہے۔ کبیر عباسی کی دوسرا کیس پرانے کردار نئی تفتیش کے ساتھ سامنے آئے۔ کرداروں کی زبان اچھی ہے اور کافی چلتی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ سردیوں میں بھی اسلام آباد میں مچھروں کی تباہ کاریاں پڑھ کے شکر کیا کہ ہم لاہور کے باسی ہیں۔ تجربے کی ذہانت فاروق انجم ساحلی کی کہانی مجھے بھی پسند آئی۔ اندازِ قتل اور اندازِ تفتیش دونوں ہی شاندار تھے۔ منظر امام اپنی اسی لایعنی اردو کے ساتھ موجود تھے جو انہی کا خاصہ ہے۔ بور کہانی۔ پہلی غلطی بھی عجیب سی کہانی تھی۔ بے ربط سی۔ ممنوعہ علاقہ

اور احتیاط ابھی نہیں پڑھیں سو رائے دینے سے قاصر ہوں۔''

نوارگل کی گوجرخان سے تبصرہ نگاری ''اس بار جاسوسی کافی لیٹ ملا، کیسے ملا یہ ایک الگ داستان ہے۔ سرِ ورق پر نظر ڈالی تو سب سے پہلے عید کی مبارک پر نظر پڑی، جی خیر مبارک، اور محفل کو میری طرف سے بھی عید مبارک۔ جب سرورق پر بھرپور نظر ڈالی تو ایک چھوٹی خالہ جی ترچھی نگاہ سے گھور رہی تھیں، اور ان کی دیکھا دیکھی ایک چاچا جی شرما رہے تھے، ایک کالا چور کسی بے چارے کو چاقو مار کر اس کا بیگ چھین رہا تھا، لگتا ہے عید اچھی بنانا چاہ رہا تھا۔ لسٹ دیکھ کر احساس ہوا کہ اس بار کا جاسوسی زبردست رہے گا۔ چینی نکتہ چینی میں ادارے کی طرف سے پاکستان کی فتح کا ذکر تھا، پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اللہ پاک ہماری اس پاک سرزمین کو سلامت رکھے اور اسی طرح خوشیاں نصیب بنتی رہیں آمین۔ محفل میں پہنچی تو عاصم جٹ کو براجمان پایا۔ مبارک ہو بھائی۔ آگے بڑھی تو طلعت مسعود نے زبردست رنگ جمایا ہوا تھا۔ اچھا تبصرہ لکھا۔ ایمانے زارا شاہ کی آمد بہت بھلی لگی۔ مقصود احمد اویسی کی پہلی بار آمد۔ خوش آمدید! شاہد ذوالفقار لالچ اچھا نہیں ہوتا۔ ارے واہ آگے تو عابد دولت کا اپنا تبصرہ تھا۔ میمونہ کاشف اب کیا کریں ذاکر انکل کو ہمارے جیسی کوئی معصوم لڑکی نظر آئے تب نا۔ اسد عباس کچھ جلدی ہی مل گیا جاسوسی۔ توصیف علی جاندار تبصرہ۔ فاروق انجم آپ تو بہت پرانے لگتے ہیں۔ محفل کے بعد کہانیوں کی ابتدا کی۔ ایچ اقبال کی پُرخار راستے سب سے پہلے پڑھی، جو کہ ہمارے ملک کے موجودہ حالات سے مطابقت رکھتی ہے۔ جب تک نا انصافی ہو گی تاجو جیسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے۔ انگارے اور آوارہ گرد پر ابھی سرسری نگاہ ڈالی ہے امید ہے پچھلی قسط کی طرح اچھی ہوں گی۔ پہلا رنگ روبینہ رشید کی تحریر سوگ وزیاں پڑھی، ایک باہمت لڑکی کی داستاں جو انسانی اعضا کی تجارت کرنے والے گھناؤنے کرداروں کو ان کے انجام تک پہنچاتی ہے۔ اسما قادری کا دوسرا رنگ دہشت نگر، امید کے مطابق زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ یہ تینوں کہانیاں پڑھنے پر احساس ہوا کہ یہ تینوں ہی ہمارے ملکی حالات کی مختلف انداز میں عکاسی کرتی ہیں۔ اس پر ایک مصرعہ یاد آتا ہے۔ جانے کب ہوں گے کم، اس دنیا کے غم۔ کبیر عباسی کے سلسلہ وار کیس کا دوسرا کیس، سیدھے سادے لوگوں کو نوکری کا جھانسا دینے والے نوسربازوں کے بارے میں ایک زبردست تحریر، اور آپ جو دارالحکومت کے آس پاس کے مناظر بیان کرتے ہیں اس لیے آپ کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ مظہر سلیم ہاشمی کی آسان مشکل ایک اچھا اضافہ ثابت ہوئی۔ جاسوسی میں پہلی حاضری پر ڈھیروں مبارک باد۔ چونکہ جاسوسی دیر سے ملا اس لیے جتنا پڑھ پائی ان کا تبصرہ حاضرِ خدمت ہے۔''

تاندلیانوالہ سے اعتزاز اینڈ زریاب وصلی کی حاضری ''جولائی کا شمارہ یکم جولائی کو بادلوں اور ٹھنڈی ہوا کے ساتھ وارد ہوا۔ ٹائٹل پر سر کے ذریعے عید مبارک دیتی قاتل حسینہ نظر آئی۔ حسینہ کی دراز زلفوں کے سائے تلے ایک نامعلوم قاتل کسی معصوم کو قتل کر چکا تھا۔ اوپر والے بھائی صاحب تمام صورتِ حال سے خوش دکھائی دیے۔ ٹائٹل پہ غور و فکر کے بعد پہنچے پیاری محفل چینی نکتہ چینی میں جہاں مدیرِ اعلیٰ صاحب ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح پاکستان کرکٹ ٹیم کی جیت سے خوش دکھائی دیے۔ بے شک آپ نے ٹھیک کہا غرور کا سر نیچا۔ اولین تبصرہ ہمارے پڑوسی شہر سے عاصم جٹ کا تھا۔ طلعت مسعود کے خوب صورت الفاظ نے خوش کر دیا۔ ہمارے شبراتی نیوز کے اینکر انصر علی کے تبصرے نے حیران کر دیا۔ بہت ہی شاندار انداز ہے آپ کا انصر برادر۔ ایمانے زارا شاہ کی انٹری بھی خوب رہی۔ مومنہ آنٹی کی باتوں کا کوئی برا نہ منائے کیونکہ بڑھتی عمر کے ساتھ انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے اور آپ معصوم نہیں معصوم خان ہیں جو کہ دراصل معصوم نہیں۔ ہمارے کرکٹ گروپ کی ایڈمن عائشہ الحمیر اسمیت نوارگل، جام مقصود، اشفاق شاہین اور شاہد ذوالفقار کو محفل میں خوش آمدید۔ باقی تبصروں میں صفدر معاویہ اور رانا بشیر احمد ایاز کا تبصرہ پسند آیا۔ کہانیوں میں آغاز کیا انگارے سے جس میں شاہ زیب آخر کار قید سے رہا ہو گیا۔ تاجور کی اچانک انٹری نے حیران کر دیا۔ سجاول اور انیق بھی شاہی سے آن ملے۔ اب دیکھتے ہیں کیا کمال دکھاتے ہیں ایسٹرن اور اس کے ساتھی۔ اس قسط میں شاہ زیب کا اتنی آسانی سے رہا ہو جانا اور پوری حکومت کا یوں بے بس ہو جانا عجیب لگا۔ آوارہ گرد میں شہزی ایک بار پھر مشکلات کا شکار ہو گیا۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ کہاں بلیوٹلسی اور انڈین کمانڈو شہزی کا کے کے سامنے بے بس تھے اور کہاں یہ معمولی ڈاکوؤں نے اسے زیر کر لیا۔ کہانی کا سب سے خوب صورت پارٹ سندھ کا ماحول ہے جسے بھٹی صاحب بہت خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ (اتنا عرصہ اس دشت کی سیاحی جو کی ہے) اولین صفحات پر ایچ اقبال پُرخار راستے کے ساتھ حاضر تھے۔ کہانی نے مزہ نہیں دیا۔ روایتی پلاٹ کی یہ تحریر خاص نہیں رہی۔ سسپنس اور ایچ اقبال صاحب کا وہ انداز جو قاری کو سحر میں جکڑ لیتا ہے، شدید کمی محسوس ہوئی دونوں چیزوں کی۔ رنگوں میں پہلا رنگ مضبوط پلاٹ کی تحریر تھی اور مصنفہ کے خوب صورت انداز کی بدولت بہت خوب رہا۔ دوسرا رنگ ایک سیدھی سیدھی تحریر ثابت ہوئی۔ اسما قادری اس بار اپنے قلم کا جادو نہیں چلا سکیں۔ باقی کہانیوں میں منظر امام استاد نرالے عالم کے ساتھ حاضر ہوئے۔ یہ تحریر پہلے بھی ایک بار جاسوسی کی زینت بن چکی ہے یا مجھے غلط فہمی ہے؟ (آپ کی غلط فہمی ہے) دوسرا کیس کبیر عباسی کے قلم سے لکھا گیا۔ تحریر میں دلچسپی کا مواد بہت کم تھا۔ صرف ہلکے پھلکے مزاح نے مزہ دیا ورنہ ایک بورنگ تحریر ہوتی۔ آسان مشکل ایک خوب صورت تحریر تھی، پسند آئی۔ باقی کہانیوں میں ممنوعہ علاقہ اور تجربے کی ذہانت اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر عید نمبر درمیانے درجے کا تھا۔''

گوجرانوالہ سے آصف محمود کی شکر گزاری ''ٹائٹل حسبِ حال زبردست رہا۔ سرورق کا چہرہ مردانہ حسن رکھتا تھا۔ حسینہ نہ رو رہی ہے اور نہ ہنس رہی ہے۔ صرف نازکی ان کے لب کی کیا کہیے۔ پنکھڑی ایک گلاب کی سی بنانے کی کوشش ذاکر صاحب نے کی ہے مگر سرخی سے ہی لب لتھڑ گئے تو ان کا کیا قصور۔ جاسوسی کے سرورق کا مردان شاہ دانتوں سے تو ہنستا لگ رہا ہے اور آنکھوں سے تکلیف میں۔ ٹائٹل میں صرف بیگ چھینتا

قاتل اور مقتول پہچان سے باہر ہیں۔ رمضان شریف تھے، گرمیوں کے روزے اوپر سے شوگر کا غلبہ...... خیر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی اس نے روزے رکھوا دیے۔ (شکر الحمدللہ) رمضان میں وقت نکال کر صرف طاہر جاوید مغل کی انگارے ہی پڑھ سکا ہوں۔ کیونکہ اس کا انتظار رہتا ہے۔ مادام ہاناوانی کی تیلی پیٹھی کو شاہ زیب نے زبردست شکست دے کر اسپتال کی سیر کروادی۔ تبارک بھی جان سے گیا۔ سیف کی بھی جان لے لی۔ تاجور سے ملاقات کا راستہ صاف۔ مگر سرکردہ افراد قسطینا، ابراہیم وغیرہ کے بچاؤ کے لیے ایسا کرنا کہانی کی ڈیمانڈ تھی۔ شاہ زیب پر جو تشدد ہوا، اس کی برداشت عقل سے ماوراء ہے پھر بھی وہ ثابت قدم رہا مگر جب اس کی رہائی کا وقت آیا تو مکھن سے بال کی طرح رہا ہو گیا۔ یہاں طاہر جاوید مغل صاحب کو اسپتال میں اسپتال کی کھڑکیوں کے شیشے توڑنا، اسپتال پر فائرنگ، گارڈز اور اسپتال کے کئی عملے کے ارکان کو زخمی کروانا چاہیے تھا اور ہاناوانی مادام کو مار دینے یا وسیس پر اسپتال میں عوام الناس کو داخل ہو کر مارنے کی دھمکی دینا چاہیے تھی۔ عوام الناس کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سامنے اسپتال کے کرتا دھرتاؤں کی بے بسی اور مذاکرات کے بعد شاہ زیب کو عوام کے حوالے کروانا چاہیے تھا۔ رمضان شریف کی وجہ سے دیگر کہانیوں تک رسائی ناممکن رہی، اب پڑھوں گا۔“

اسلام آباد سے انور یوسف کی واپسی ”طویل غیر حاضری کے بعد گزشتہ ماہ ایک مختصر سا تبصرہ ارسال کیا تھا جو آپ کو نہ مل سکا۔ غیر حاضری کی وجہ شریکِ حیات کی علالت اور پھر رحلت تھی۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ (بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ہمیں بھی آپ کے غیاب پر تشویش تھی۔ اللہ اس غم کو سہنے میں ہمت دے) محفل سے اس بار بھی بہت سے مستقل لکھنے والے غائب تھے۔ وڈے شاہ جی اور بی بی طاہرہ گلزار شاہ زیادہ ہی مصروف ہیں۔ قسط وار کہانیاں انگارے اور آوارہ گرد اب شاید اختتامی مراحل میں ہیں۔ انگارے میں اب صرف شاہ زیب کو تاجور ملنا باقی ہے۔ قسطینا کا کردار بے حد جاندار رہا۔ آوارہ گرد میں شہزی بخیر و عافیت پاکستان اپنے ساتھیوں سمیت پہنچ چکا ہے۔ دیکھیں اب وہ عابدہ کی رہائی کے لیے کیا اقدام کرتا ہے۔ مغربی کہانیوں میں یاسر اعوان کی چہرہ ساز بہتر رہی اور پہلی طویل کہانی جنگِ دل ربا اس شمارے کی بہترین کہانی تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں منصوبہ ساز اور زن آہن بس گزارے لائق تھیں۔ پورے شمارے میں کارٹون غائب تھے اور کترنیں بے جان۔“

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی عنایت ”جاسوسی کا ٹائٹل اس مرتبہ دلکش اور سنسنی خیز تھا۔ خطوط کی محفل خوب ہری بھری تھی۔ گڑھا اچھی کاوش ہے۔ پُرخار راستے کا آغاز سنسنی خیز تھا اس لیے پورے ناول کا مطالعہ دلچسپی سے کیا۔ انگارے اور آوارہ گرد اچھے انداز سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ فقیرانہ آئے کا اختتام خوب ہے۔ سوگ وزیاں اچھی کاوش ہے۔ گمشدہ بھی خوب تھی۔ پرچے میں کارٹون لگانے سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کچھ تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

رانا بشیر احمد ایاز کا احسان پور ضلع رحیم یار خان سے کڑواسچ ”جولائی کا شمارہ ماہِ صیام کے آخری روزے کو موصول ہوا تو گویا عید کا چاند دوپہر میں ہی نظر آ گیا۔ ماہِ صیام میں اللہ رب العزت کی خصوصی رحمتوں کا نزول جاری رہا اور بائیسویں روزے یعنی 18 جون کو گرین شرٹس نے اپنے روایتی حریف بھارت کو آئی سی سی چیمپئنز ٹرافی کے فائنل میں خاک چٹا کر تاریخ رقم کر دی۔ سب پاکستانیوں کو بہت مبارک ہو۔ لیکن اس مقدس مہینے کے آخر میں ایک ایسا عظیم سانحہ پیش آیا جس نے ملک کے ہر باشندے کی آنکھ لہو رنگ کر دی بلکہ عید کے رنگ بھی پھیکے پڑ گئے۔ بہاولپور میں آئل ٹینکر کو لگنے والی آگ نے سیکڑوں خاندان جلا کر خاکستر کر دیے۔ پتا نہیں یہ معاشرہ کہاں جا رہا ہے اور عوام کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ صرف 70 روپے لیٹر پیٹرول کے لیے اپنی زندگیوں کو آگ کے جہنم میں جھونک دیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے، پولیس، ٹریفک پولیس، سول ڈیفنس پتا نہیں کس مرض کی دوا ہیں۔ اللہ پاک ہمارے حکمرانوں کو ہدایت دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرنے کے ساتھ جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت فرمائے۔ سرورق پر عید مبارک۔ پڑھتے ہوئے سیدھا اپنی محفلِ رنگ و بو میں تشریف لائے جہاں اس دفعہ ساہیوال سے عاصم جٹ میرِ محفل بنے بیٹھے تھے۔ مختصر لیکن اچھا تبصرہ تھا۔ وہ بھی فرمائشوں سے بھرپور۔ مومنہ کشف ہر دفعہ کی طرح اپنی تعریفوں کے پل باندھنے میں مگن تھیں اور مومنہ جی غور سے دیکھیں۔ ڈاکر انکل ٹائٹل پر ہر دفعہ آپ ہی کو پینٹ کرتے ہیں۔ لگتا ہے چشمہ کہیں گم کر دیا ہے آپ نے۔ اولیا کے شہر ملتان سے عائشہ الحمیر اموسٹ ویلکم! بہت اچھا لگا آپ کا تبصرہ۔ مستقل آتی رہا کریں۔ باقی تبصرہ نگار طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی، محمد صفدر معاویہ، سید عبادت کاظمی، سجاد احمد ساحر محفل سے غائب ہیں ابھی سب جلدی سے حاضری لگوائیں۔ ایچ اقبال پُرخار راستوں پر سفر کرتے نظر آئے۔ وہی روایتی پولیس گردی کا شکار نوجوان تاجور سے تاجو بن گیا۔ اور اپنے سب اگلے پچھلے حساب چکانے لگا اور آخر میں وہی بے موت مارا گیا۔ کافی بورنگ کہانی رہی۔ لگتا ہے اقبال صاحب کا قلم ست پڑ گیا ہے۔ اپنے مغل اعظم صاحب نے انگاروں کو اور زیادہ بھڑکا دیا ہے۔ ایسٹرن نے جتنی چھیتیں کھائی ہے، اس کا نام گنیز بک میں سنہرے الفاظ میں لکھنا چاہیے۔ مادام ہاناوانی کو شکستِ فاش دی ہے اپنے ایسٹرن نے۔ شکیل دار اب انتہائی مکار اور خبیث نکلا اور پاکستان سے تاجور کو بلا لیا۔ چلو یہ تو اچھا ہوا کہ ایسٹرن کو اپنی چاہت اتنے قریب مل گئی۔ اینق اور امریش پوری نے نہایت دلیری سے کام لے کر شاہ زیب کی جان بچالی۔ اب لوگوں نے شاہ زیب کے ساتھ تاجور سے بھی امیدیں باندھ لی ہیں۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ کبیر عباسی دوسرے کیس کو حل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پچھلی دفعہ پہلے کیس میں پانچ لاکھ ملنے کے بعد ہیرو صاحب نے سوچا کہ اس دفعہ بھی چھکا لگ جائے گا مگر جناب اس مرتبہ خود در گڑے میں آ گئے اور ایس ایس پی کزن نے آ کر جان چھڑائی۔ مناسب کہانی تھی۔ استاد نرالے عالم اس دفعہ فقیرانہ آئے اور دعا کر چلے۔ استاد صاحب نے جلال میں آ کر پہلے فقیر کے سر میں اینٹ مار کر اس کا سر کھول دیا اور بعد میں ضمیر کے ستانے پر کفارہ ادا کرنے پر تل گئے۔ بہت دلچسپ کہانی رہی۔ سرورق پر پہلے رنگ کے ساتھ روبینہ رشید موجود تھیں۔ بس ایویں سی کہانی تھی۔ دوسرا رنگ اسما قادری کے

قلم سے لکھا گیا شاہکار ملکی حالات کا مکمل عکاس تھا۔ خاص طور پر ولی جیسے کردار جب تک موجود ہیں ملک محفوظ ہاتھوں میں رہے گا۔ باقی کہانیوں میں مغربی کہانیاں بس ٹھیک ہی تھیں اور آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی کہ آج کل جاسوسی کا وہ مزہ نہیں رہا۔ نہ سرورق رنگ میں کوئی سسپنس ہے نہ کردار نگاری میں کوئی دم خم ہے۔ کوئی بھی رائٹر اس ٹریک کو لے کر نہیں چل رہا۔ سرورق پر محی الدین نواب، کاشف زبیر جیسے رائٹر لکھا کرتے تھے مگر اب کوئی ویسی چیز پڑھنے کو نہیں مل رہی۔ میری ادارے سے درخواست ہے کہ اگر نئے رائٹرز سے ویسا کچھ نہیں لکھا جا رہا تو نوے کی دہائی میں شائع ہونے والی کہانیاں بطور سرورق کے رنگ کے شامل کر دیں۔ خاص طور پر حسام بٹ اور نواب صاحب کی یادگار تحریریں۔ امید ہے اس کڑوے سچ کو ادارہ قابلِ غور جانے گا۔‘‘

کراچی سے ادریس احمد خان کی توصیف پسندی ’’جاسوسی ڈائجسٹ موصول ہوا اور سہانے موسم اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں میں مطالعہ جاسوسی پُرلطف رہا۔ اللہ جب دینے پر آتا ہے تو جو مانگیں وہ بھی دے دیتا ہے اور جو نہ مانگیں وہ بھی بے حساب دیتا ہے۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ رمضان شریف میں برکتوں اور نعمتوں کے در وا کر دیے۔ رمضان شریف میں پاکستان کو بے مثال کامیابی عطا فرمائی اور سالوں سے خوشی کی نوید سننے کو ترسنے والی قوم کو اتنی بڑی کامیابی کی نوید گویا عید سے پہلے عید ہوگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عید کی خوشیاں دیں۔ اسی دوران اللہ نے برسوں سے ترسی ہوئی دھرتی کو بارشوں سے سیراب کیا۔ تو ہم اس کا شکر ہی ادا کر سکتے ہیں جس کے لیے ہمارے الفاظ ناکافی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہم اس رب کریم کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے جس نے نعمتیں ہی نعمتیں دی ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ نے بھی عید کی خوشیوں میں حصہ ملایا اور عید کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ سرورق کے بعد اداریہ اور دیگر قارئین کے خطوط سے محظوظ ہوئے۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں نئے و پرانے دوست آراء سے آگاہی دے رہے تھے۔ پہلی کہانی ایچ اقبال کی پُرخار راستے۔ ظاہر ہے جب ایچ اقبال کے قلم سے لکھی ہوگی تو اچھی ہی لگے گی۔ گمشدہ اور گڑھا بھی اچھی لگیں۔ اس سے آگے بڑھے تو مغل صاحب کی انگارے نے بھی کافی محظوظ کیا۔ اس قسط میں کافی مزہ آیا امید ہے سلسلہ ابھی اور آگے چلے گا۔ باقی یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر کہانی کا اینڈ تو ہوتا ہی ہے۔ دوسرا کیس اور تجربے کی ذہانت بھی بہتر انداز میں لکھی اچھی کہانیاں تھیں۔ منظر امام کی فقیرانہ آئے سبق آموز کہانی تھی۔ پہلی غلطی، آسان مشکل، ممنوعہ علاقہ، احتیاط، سوگ وزیاں، دہشت گرد بھی اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر جاسوسی بہت اچھا تھا۔ کترنیں بھی مزہ دے گئیں۔‘‘

خواب نگر سے دشتِ دل کے پھپھولے ’’مئی کا جاسوسی تپتی سہ پہر میں بہار کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح لگا۔ ٹائٹل اچھا نہیں تھا۔ مس سرورق کے چہرے کی چکناہٹ ذرا نہ بھائی۔ اداریے میں موذی کے کمینے پن کا تذکرہ تھا۔ خط سب کے نائس تھے۔ اسماعیل خان کا محبت نامہ پسند آیا کیونکہ ان کا اور میرا درد مشترک ہے یعنی محبت۔ اس بار میرے آنے کا مقصد احتجاج ہے، ہاں جی۔ آپ نے میرے خط کا صرف دسواں حصہ شائع کیا اور بقیہ نو حصے اپنی لاڈلی (ردی کی ٹوکری) کی نذر کر دیے؟ کیوں؟ کیا ہمارا جاسوسی پر کوئی حق نہیں؟ مانا کہ خط لکھنے کا اتنا موقع نہ مل سکا لیکن جاسوسی کے فین تو ہم تب سے ہیں جب آتش فشاں جوان تھا۔ پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ جیسا کہ موذی سرکار کرتے ہیں؟ آپ نے میرے معصوم سے لفظوں کا خون کر دیا؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ لفظ بے جان ہوتے ہیں؟ نہیں جی، لفظوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کبھی یہ کسی کا سیروں خون بڑھاتے ہیں تو کبھی ساتویں آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ کبھی مایوسی کی اندھی گہرائیوں میں، پاتال میں پھینک دیتے ہیں تو کبھی خود اپنی ہی نظروں سے گرا دیتے ہیں۔ کبھی دلِ بسمل کو زندگی عطا کر دیتے ہیں تو کبھی زندگی کو بے جان کر دیتے ہیں۔ اب تو مانیں گے نا کہ لفظ جاندار ہوتے ہیں؟ اگرچہ سانس نہیں لیتے مگر سانسوں پر حاوی ہوتے ہیں اور آپ نے ان کو قتل کر دیا؟ کیوں؟ احتجاج، احتجاج، احتجاج...... اب آپ پر قصاص واجب ہے۔ زنجیرِ انصاف ہلا تو ڈالی میں نے مگر...... انصاف تو اس دور میں بکتا ہے نا؟ انگارے...... زبردست! قسطینا اور فارس، اب مغلِ اعظم داستان کو یوٹرن دے رہے ہیں۔ حشمت راہی کے محاوروں کی ٹوٹی ہڈیوں کو مس کیا۔ آوارہ گرد نہایت بور۔ ختم کریں اسے اب۔ بروقت اچھی رہی۔ جھوٹ میں جھوٹ جلد ہی پکڑا گیا۔ مرگِ ناگہاں میں طوفان کا انجام اچھا ہی تھا۔‘‘

محمد اقبال، کراچی سے ’’جولائی کا جاسوسی عید کے تیسرے دن ہاتھ آیا۔ سرورق پر حسینہ بڑی ادا سے آنکھیں گھما کر شاید پُراسرار قتل کا سین دیکھ رہی تھی، اسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہاں سے گزرتے ہوئے اداریے کی طرف چل دیے جہاں مدیر صاحب کرکٹ ٹیم کی جیت کی خوشی شیئر کر رہے تھے۔ ہمیں بھی دیگر تمام پاکستانیوں کی طرح بے حد خوشی ہوئی، اس طرح کی خوشیاں قوموں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ میری جانب سے تمام پاکستانیوں کو مبارک باد اور پوری قومی ٹیم، سلیکٹرز، کوچ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہاں ایک تلخ حقیقت بھی شیئر کرنا چاہوں گا پچھلے دنوں ہاکی اسٹیڈیم کراچی میں چند انٹرنیشنل فٹ بالرز کو بلا کر پاکستانی انٹرنیشنل کھلاڑیوں کے ساتھ ٹیمیں بنا کر فٹ بال کے فروغ کے لیے میچ کرایا گیا اور اس کے بعد لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں میچ کرایا گیا گو کہ فٹ بال کے فروغ کے لیے ایک اچھی کوشش تھی اور اسے سراہا جانا بھی ضروری ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں مایوسی بھی ہوئی کہ ہاکی اور کرکٹ کے گراؤنڈز میں فٹ بال کے میچ۔ جس طرح کرکٹ کے فروغ کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں اور انعامات کی بارشیں ہو رہی ہیں اگر اسی طرح ہاکی کے فروغ کے لیے کھلاڑیوں کو اچھی اور پُرکشش جاب اور مراعات دی جائیں تو کوئی مشکل نہیں کہ ہماری ہاکی ٹیم پھر سے دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہ کر سکے۔ محفلِ خطوط میں پہلے نمبر پر عاصم جٹ صاحب اپنے تبصرے کے ساتھ موجود تھے مبارک ہو۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید کی انگارے پڑھی۔ جہاں ہیرو شاہ زیب پر ظلم کی انتہا کر دی گئی مگر دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اتنے کڑے ظلم کے

امتحان کے بعد شاہ زیب کو نتیجے میں خوشی بھی تو تاجور کی صورت میں ملی، یہ الگ بات ہے کہ دونوں ہیرو، ہیروئن صاف چھپتے بھی نہیں اور کھل کر اظہارِ محبت بھی نہیں کرتے۔ بہرحال مزہ آیا۔ آوارہ گرد میں شہزی کی دھواں دھار دشمنوں کو خاک چٹا کر واپسی ہوئی اور یہاں آکر ایسا لگا کہ شہزی کو خود خاک چاٹنی پڑ گئی۔ بھٹی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ سارا مزہ کرکرا کر دیا اس سے تو بہتر ہے کہ کہانی کو مختصر کرکے ختم کر دیں۔ ایچ اقبال کی پُرخار راستے بھی مناسب ہی تھی۔ اسما قادری کی کہانی سسپنس سے عاری تھی، متاثر نہ کر سکی۔ انجم فاروق ساحلی کی تجربے کی ذہانت بہتر رہی۔ منظر امام کی فقیرانہ آئے دلچسپ رہی۔ دیگر کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی حاضری ''جولائی کا ماہنامہ 4 تاریخ کو خانیوال شہر سے جا کر خریدا۔ سرورق کو ایک لیڈی اور تین بندوں سے سجایا گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ پاکستان ٹیم نے دل خوش کر دیا۔ ہر شعبے میں بھارت کو آؤٹ کلاس کر دیا۔ بہت ہی مزہ آیا۔ بھارت کو پتا چل گیا کہ باپ کون ہے اور پھر باپ تو باپ ہوتا ہے۔ انشاءاللہ اس ملک نے قیامت تک قائم و دائم رہنا ہے کیونکہ اس ملک میں بسنے والے چاہے آپس میں جتنے اختلاف رکھتے ہوں پر جب بات ملک کی ہو تو پھر یکجا ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں عاصم جٹ اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئے مبارک ہو بھائی۔ باقی دوستوں کے تبصرے ابھی پڑھنے باقی ہیں۔ کہانیوں میں ایچ اقبال کی پُرخار راستے پڑھی۔ تاجور اس ملک کے غلط قانون کی نذر ہو کر تاج ور سے تاجو بن گیا اگر ہمارا قانون امیر غریب کے لیے ایک جیسا ہو جائے تو پھر کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔ شیریں کا کردار بھی کافی جاندار رہا اس نے محبت اور وفا کی انتہا کر دی تاجور کی خاطر۔ ویری نائس تحریر۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے پڑھی جہاں پر ہر ظلم آزمایا گیا شاہ زیب پر باقی ساتھیوں کا پتا اگلوانے کے لیے پھر نا کامی مقدر رہی رائے زل گروپ کے لیے، ساتھ میں ڈرامائی انٹری دی تاجور کی اور پھر شاہ زیب کو آخر کار رہائی ملی اور انیق اور سجاول کا کردار جاندار رہا اس معاملے میں۔ آخر میں پھر تاجور کو سامنے کر دیا گیا۔ پھر بھٹی صاحب کی آوارہ گردی پڑھی۔ جو موضوع سے تھوڑی ہٹ گئی ہے پر بھٹی صاحب بہتر جانتے ہیں کہ شہزی کو ڈاکوؤں کے پاس کیوں پہنچایا گیا۔ قسط بہرحال کافی جاندار رہی۔ روبینہ رشید کے قلم سے سرورق کا پہلا رنگ سوگ وزیاں اور دوسرا رنگ اسما قادری کے قلم سے دہشت نگر دونوں عمدہ رہے۔ دونوں میں ملکی عزت و وقار کے لیے جان کی بازی لگا دی گئی اور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

گوجر خان سے حفصہ طارق کی جواب طلبیاں ''آج دوسری بار جاسوسی میں شرکت کی جسارت کر رہی ہوں۔ پہلی بار تو جانے کیوں میری میل ہی غائب کر دی گئی تھی۔ میں کافی عرصے تک خواتین کے شمارے پڑھ پڑھ کر ان سے بور ہو چکی تھی کہ ایسے میں ایک دوست نے جاسوسی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے مشورے پر عمل کیا تو افسوس ہوا کہ اتنے دلچسپ ڈائجسٹ کی رفاقت سے میں پہلے کیوں محروم رہی۔ (عقل آتے آتے ہی آتی ہے) وہ دن اور آج کا دن میں جاسوسی ریگولر پڑھ رہی ہوں۔ میں نے جب جاسوسی کا مطالعہ شروع کیا تو انگارے کی تیسری قسط چل رہی تھی۔ مجھے یہ کہانی اتنی اچھی لگی کہ پچھلے دو شمارے بھی اس کے لیے خریدنے پڑے۔ (کوئی بات نہیں نیک کام میں دیر کیسی!) انگارے کی قسط پڑھ کر تو میں جھرجھری لے کے رہ گئی۔ اُف...... اتنا تشدد...... شاہ زیب پہ بہت ترس آیا۔ تاجور کی انٹری مزیدار رہی۔ آوارہ گرد میرے ذوق کے مطابق نہیں تھی۔ اس لیے چند اقساط پڑھ کے ہی وہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ دیگر کہانیوں میں سب سے پہلے کبیر عباسی کی دوسرا کیس پڑھی، کیونکہ چند ماہ پہلے ہی پہلا کیس کے نام سے ایک تحریر آئی تھی جو مجھے بہت پسند آئی تھی۔ کیس تو مجموعی طور پر پہلے کیس کی نسبت قدرے ماٹھا رہا کیونکہ یہ حل کرنے کے لیے حنان کو اپنی ذہانت استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تاہم مزاح اور دلچسپ پیشکش نے اسے مزے دار بنا دیا۔ ویسے اسلام آباد میں کیا سردیوں میں بھی مچھر ہوتے ہیں؟ اس سیریز کے اگلے کیس کا انتظار رہے گا۔ منظر امام کی فقیرانہ آئے کا مرکزی خیال تو اچھا تھا مگر عجیب و غریب زبان نے دماغ کا دہی بنا دیا۔ انجم فاروق ساحلی کی تجربے کی ذہانت کافی دلچسپ تحریر رہی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی آسان مشکل بھی بہتر تھی، دیگر مختصر تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ روبینہ رشید نے تحریر کیا۔ کیا ہی دلچسپ تحریر تھی۔ ایسی ہی تحریروں نے مجھے جاسوسی کا گرویدہ بنایا ہے۔ اسما قادری بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہیں۔ ایک بات میں نے محسوس کی کہ شاید غلطی سے دونوں کہانیوں کے نام غلط پرنٹ ہو گئے کیونکہ روبینہ رشید کی تحریر کے ساتھ دہشت نگر زیادہ سوٹ کرتا تھا جبکہ اسما قادری کی تحریر کے ساتھ سوگ وزیاں۔ (جی ہاں ٹائٹل پر اسٹوری لکھوائی جاتی ہیں) اولین صفحات پر ایچ اقبال راہِ پُرخار کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ تحریر ہمارے لیے راہ پُرخار ہی ثابت ہوئی۔ اُف...... اتنا بور اندازِ تحریر اور اوپر سے مجرم گروہ اور اس کی سرگرمیوں کو اتنے بچگانہ اور فلمی سے انداز میں پیش کیا گیا کہ کوفت کے مارے برا حال ہو گیا۔ بڑی مشکل سے صفحات گن گن کر یہ کہانی مکمل کی۔ محفلِ چیں نکتہ چینی کا میں پہلے مطالعہ نہیں کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایسے ہی سرسری انداز میں تبصرے پڑھنے لگی تو افسوس ہوا کہ میں اتنی دلچسپ محفل سے پہلے کیوں محروم رہی۔ اس بار بھی سب تبصرے بہت مزے کے لگے۔ اس محفل میں مجھے بس ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ کسی تبصرے پر بھی ایڈیٹر کی طرف سے جواب نہیں دیا جاتا حالانکہ میرے خیال میں ہر تبصرے پر ایڈیٹر کا جواب ہونا ضروری ہے۔ امید ہے اس بات کا جواب ضرور دیا جائے گا۔'' (جواب طلب بات کا جواب ضرور دیا جاتا ہے)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

عمران جمال، لاہور۔ جنید ملک، کراچی۔ فرح شکیل، کوٹری۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ آفتاب احمد، حیدر آباد۔ شہناز اقبال، کراچی۔ حرا مختار، کراچی۔ محمد شعیب جامی، ملتان۔

دوراہے

کبیر عباسی

کرۂ ارض پر جہاں کہیں جو کچھ ہوتا ہے... ہم کو معلوم ہو جاتا ہے... نہ صرف معلوم ہو جاتا ہے بلکہ دکھائی بھی دے جاتا ہے... گویا ہر واقعہ ہمارے قریب کا واقعہ اور ہر منظر سامنے کا منظر ہو گیا ہے... دنیا ہمارے سامنے بدل رہی ہے... عالمی منظر نامے کی ہر تبدیلی ہماری آنکھوں دیکھی تبدیلی ہو گئی ہے... ہمیں سب کی خبر ہے... یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ ہماری زندگی کو بھی بُری طرح متاثر کررہا ہے... اخلاقی... سماجی... سیاسی اور مذہبی طور پر ہمارے مسائل کا تجزیہ اوران کے حل کی تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر شخص فکر کے میدانوں میں تگ و تاز کرتے ہوئے دیکھتا ہے کہ مستقبل غیریقینی... مگر اس کا تاریک ہونا یقینی ہے... جو کچھ ہورہا ہے، وہ اچھا نہیں ہے... آگے کیا ہو گا؟ اسے معلوم نہیں... موجودہ حالات میں وہ خود کو نامعلوم خطروں میں گِھرا ہوا محسوس کرتا ہے... مگر ان خطرات بھرے حالات اور مایوس کن مستقبل میں امید و فکر کی بازگشت ہے جو کبھی معدوم نہیں ہوئی۔آگے بڑھتے رہنا ہی زندگی ہے... اور زندگی کے حالات سنوارنے کا خیال کبھی دم نہیں توڑتا... تبدیلی کے راستوں سے گزرتی ایک ایسی ہی امید افزا کہانی... جہاں سب کچھ خراب ہے مگر ناامیدی کے اندھیروں میں ایک کرن نمودار ہو رہی ہے کچھ ایسی اَن دیکھی ہستیاں ہیں جو اپنے حصے کا قرض ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں... اسی تناظر میں راستوں کا انتخاب کرواتی داستانِ حیات...

قاری کو قریہ بہ قریہ...... کوچہ بہ کوچہ...... چہرہ بہ چہرہ روشناس کراتے نئے آہنگ

وارث علی بے حد خوش تھا۔ آج اس کا پہلا کالم ایک کثیر الاشاعت روزنامے میں چھپا تھا۔ اس کے لیے یہ صرف ایک کالم نہیں تھا، بدلہ تھا جس کے لیے وہ ایک عرصے سے تڑپ رہا تھا۔ وہ پتھر تھا جو اس نے اینٹ کے جواب میں اپنے مخالف پر پھینکا تھا۔

اس کی عمر چھبیس سال تھی۔ دیکھنے میں وہ قدرے لاابالی اور بے پروا سا لگتا تھا مگر درحقیقت وہ انتہائی حساس اور ذمے دار تھا۔ چھریرا جسم، تیکھے نقوش اور گوری رنگت کے ساتھ اس کی شخصیت خاصی دلکش لگتی تھی۔

وہ ترنگ میں بائک چلاتا جارہا تھا۔ ساتھ ہی گنگنا بھی رہا تھا۔

''ایک بات کہوں میں آپ سے، نہیں ڈرتا کسی کے باپ سے......''

سناٹے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ بائک کی پھٹ پھٹ بیک گراؤنڈ میوزک کا کام دے رہی تھی۔

اس کا گھر شہر کے ایک نواحی علاقے میں تھا۔ رات کافی ہوچکی تھی۔ گلیاں سنسان نظر آرہی تھیں۔ وہ گردوپیش سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مگن چلا جارہا تھا۔ اسے نہ ویرانی کی پروا تھی نہ اندھیرے کی۔ اچانک اسے گلی کے درمیان کسی شخص کا ہیولا نظر آیا۔ وہ چونک گیا۔

اس نے بائک کی رفتار تھوڑی سست کرلی۔
وہ شخص گلی کے وسط میں کھڑا بے فکری سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں کچھ اٹھایا ہوا تھا۔ وارث نے غور کیا مگر اس نے وہ ہاتھ اپنے جسم کی اوٹ میں کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے کچھ اندازہ نہیں ہو پایا۔
وہ اس کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ ایک سریا تھا جو اس نے یکدم ہی بائک کے آگے رکھ دیا۔ بائک سریے سے ٹکرائی۔ وارث ہوا میں اُڑا۔ اگلے ہی پل وہ قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ اس کی بائک گر چکی تھی۔ گرنے سے اس کی ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ فضا میں صرف بائک کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
وارث نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ اور گھٹنے بری طرح چھل چکے تھے لیکن خیریت گزری۔ اس کا سر بچ گیا تھا۔ ورنہ اس نے تو ہیلمٹ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔
وہ بمشکل سیدھا ہوا۔ اس نے ایک ہیولا اپنی طرف سرکتا دیکھا۔ وہ انتہائی سکون سے نپے تلے قدموں کے ساتھ اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ جب سگریٹ کا کش لگاتا تو اس کے منہ کے پاس ایک جگنو سا ٹمٹماتا۔ وارث نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں پھیلائیں۔ چند لمحے اندھیرے میں دیکھنے کے بعد اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ دور اسٹریٹ لائٹس کی ہلکی ہلکی روشنیاں منظر کو کسی حد تک واضح کررہی تھیں۔
وہ شخص اب اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ قریب آجاتا تو وارث کے لیے اس سے اپنی جان بچانا مشکل ہوجاتا۔ اس نے یہ سوچتے ہی اٹھ کے بھاگنا شروع کردیا۔ اس کے گھٹنوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں مگر وہ رکا نہیں۔ چند قدم بھاگنے کے بعد اس نے مڑ کے پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے سگریٹ کے کش لگاتا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے جیسے وارث سے کوئی سروکار نہیں تھا۔
وہ چہرے پر الجھن لیے واپس مڑا ہی تھا کہ اچانک ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ اس شخص نے اسے اپنے ہاتھوں میں تھام کے گرنے سے بچالیا۔
''دیکھ کے بھائی۔ کدھر بھاگے جا رہے ہو؟'' وہ آرام سے بولا۔
وارث کو اس کی آواز شناسا سی لگی مگر وہ اسے اندھیرے میں دیکھنے سے قاصر تھا۔ شاید یہ میرے محلے کا کوئی شخص ہے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔

''وہ...... وہ ایک آدمی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔'' وہ ہکلایا۔
''میری جان، ایک آدمی تیرے پیچھے لگا ہے۔ تو اس سے ڈر رہا ہے۔ ایک آدمی تیرے آگے بھی تو لگا ہے، تو اس سے کیوں نہیں ڈر رہا۔'' وہ کسی فلمی ولن کی طرح ہنستے ہوئے بولا لیکن اس کی آواز میں ایسی کاٹ تھی کہ وارث کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سے دوڑتی محسوس ہونے لگی۔
اس نے اپنے ہاتھ اس شخص کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے زور لگایا۔
اچانک ہی اس نے وارث کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑا کے پیچھے گر گیا۔ اتنی دیر میں دوسرا شخص اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے وارث کے پھیلے ہوئے بازو پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ بے اختیار چیخا۔
اس شخص نے یکدم ہی بیٹھ کے اس کے منہ پر اپنا چوڑا ہاتھ رکھ دیا۔
''ابے تو، تو کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا، اور ذرا سا تیرے بازو پر ایک پیر کیا آیا۔ زنانیوں کی طرح چیخیں مارنے لگا۔''
وارث کا جبڑا بری طرح سے اس کے ہاتھ میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے جبڑے کی ہڈیاں ٹوٹنے لگی ہیں۔ وہ اوں اوں کی آوازیں نکالتے ہوئے اپنا سر زور زور سے ہلانے لگا۔ پختہ فرش پر سر ہلاتے ہوئے بھی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسے زور لگانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے یکدم ہی اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔
''رب نواز صاحب کے بارے میں آج تو نے جو بکا ہے، اچھا نہیں کیا۔ تیرا کیا خیال تھا تو نے بہت بڑا تیر مارا ہے۔ تو اپنے باپ کا انجام بھول گیا تھا؟'' وہ تنفر سے بولا۔
وارث انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔
''تم اخبار والے ہمارے ساتھ دہری چالیں چل رہے ہو۔ تمہارے ایڈیٹر کو فون کیا تو وہ حرام کا جنا کہنے لگا۔ بچہ ہے جی۔ میرے سمجھانے پر اس نے بہت نرم الفاظ استعمال کیے ہیں ورنہ وہ تو رب نواز کو سب کے سامنے ننگا کرنا چاہ رہا تھا۔ تو...... تو رب نواز کو ننگا کرے گا؟'' وہ پھنکارا۔
وارث کچھ نہیں بولا، وہ بولنا چاہتا بھی تو بول نہیں سکتا تھا۔ اس کے جبڑے پر اس شخص کی گرفت ایک لمحے کے لیے بھی کمزور نہیں ہوئی تھی۔

چند لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر پھنکارا۔ ''تجھے پتا ہے تیرے اس حرام زادے باپ نے اور کیا کہا؟''

وارث ''اوں'' کی آواز ہی نکال سکا۔

''اس نے کہا کہ تم لوگ اگر چاہتے ہو کہ تمہارے باقی کے کرتوتوں کا پردہ رہے تو کوئی پیکٹ شیکٹ تیار کرو، اور وہ بھی پانچ لاکھ کا۔ وارث پانچ لاکھ لے کے خاموش ہو جائے گا ورنہ...... تو پانچ لاکھ لے گا ہم سے تو...... اتنی تیری اوقات ہے؟'' غصے سے وہ اپنے دانت تو پیس ہی رہا تھا، اس کے جبڑا بھی مزید بھینچنے لگا۔

وہ جو ایڈیٹر کی اس حرکت پہ حیران ہو رہا تھا، تکلیف کے مارے ساری حیرت بھول گیا۔

''چل یار جلدی کر۔ کام ختم کر۔ تُو تو ہر جگہ بھاشن دینے لگ جاتا ہے۔'' اس کا ساتھی بیزاری سے بولا۔

''تو کیا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ختم کر اپنا کام۔'' وہ بگڑ کے اپنے ساتھی سے بولا۔

اس کا اتنا کہنا تھا کہ دوسرے شخص نے نیچے گرا ہوا سریا اٹھایا۔ وارث حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے اپنا سریے والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اگلے ہی پل وارث کو اپنی انگلیوں میں ناقابلِ بیان اذیت کا احساس ہوا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس کا منہ بری طرح سے دوسرے شخص کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ معمولی سی آواز تک نہ نکال سکا۔ دوسری بار سریا اسی کی کنپٹی سے ٹکرایا اور وہ پل بھر میں ہی ہوش و حواس سے بیگانا ہو گیا۔

چند لمحوں بعد گلی میں صرف ایک بے ہوش وجود پڑا رہ گیا۔ پاس ہی الٹے پڑے بائیک کی پھٹ پھٹ کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

☆☆☆

وسیم ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ عام سا قد کاٹھ اور شکل و صورت مگر اس کے چہرے میں ایک بہت خاص بات تھی اور وہ تھی اس کی آنکھیں۔ اس کی آنکھیں انتہائی روشن تھیں۔ ستاروں کے مانند روشن اور چمکتی۔ آنکھوں کی وجہ سے وہ بہت منفرد لگتا تھا۔

وہ سرکاری کالج میں معاشیات کا لیکچرار تھا۔ معاشیات میں ماسٹرز کرنے کے بعد کچھ عرصے تک وہ چند نجی کالجز میں پڑھاتا رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سرکاری کالجز میں اکنامکس کے لیکچرز کی بھرتیوں کے لیے اشتہار آیا تو اس نے بھی اپلائی کر دیا۔ بغیر رشوت اور سفارش کے اس نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا تھا۔ ٹیسٹ میں پورے صوبے میں اس نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔

چند دن بعد انٹرویوز شروع ہو چکے تھے۔ وہ انٹرویو میں بھی بہ آسانی کامیاب ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے گھر کے قریب ہی ایک کالج میں اکنامکس کی سیٹ خالی تھی۔ اس نے اسی کا انتخاب کیا۔ وہ خود بھی اسی کالج میں پڑھا تھا۔ اس کے والد وہیں پروفیسر تھے۔ جب وسیم گریجویشن کر رہا تھا تو اس کے والد کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ سانحہ اس کے لیے بہت بڑا تھا مگر اس نے بڑی مشکل سے خود کو بھی سنبھالا اور اپنی ماں کو بھی۔ اب اس کے باپ کی پینشن سے ان کا گزارا ہو رہا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے جاب پر لگتے ہی اس کی ماں اس کا رشتہ ڈھونڈنے لگی مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ ایک رات سوئی تو صبح گھر سے اس کا جنازہ ہی اٹھا۔ وسیم کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ تنہا گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا۔ گھر کے ہر کونے سے اس کی ماں کی یادیں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ ہاسٹل شفٹ ہو گیا۔ اسے کالج میں پڑھاتے اب چھ ماہ ہو چکے تھے۔

بی کام کی نئی کلاس میں آج اس کا تیسرا پیریڈ تھا۔ ابتدائی دو پیریڈز تو تعارف وغیرہ کے مراحل میں ہی گزر گئے تھے۔ کچھ طلبا کے تعارف میں اور کچھ مضمون کے تعارف میں۔ آج اس کا پہلا باقاعدہ لیکچر تھا۔

آج اس کا موضوع تھا۔ ''سرمایہ داریت اور اشتراکیت۔''

اسے سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت تھی۔ اس کے خیال میں اس نظام کا مقصد سرمایہ دار کے سرمائے کے تحفظ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نظام میں عام انسانوں کا کردار تو ان پرزوں کا ہی تھا جن کی بدولت بھاری مشین چلتی ہے۔ جب کوئی پرزہ گھس گیا تو مارکیٹ سے نیا لے آئے۔ بس مشین کا چلنا ضروری تھا۔ مشین رک جاتی تو زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے نزدیک سرمایہ دار ایک مشین تھی جس سے وہ نوٹ چھاپتا تھا مگر صرف اپنے لیے۔

نصاب میں اس نظام کی خوبیوں پر بھی کافی تفصیل موجود تھی مگر اس نے اپنے لیکچر میں اس کی خوبیوں کے بھی بخیے ادھیڑ دیے۔ پوری کلاس میں خاموشی تھی۔ سب بغور اس کا لیکچر سن رہے تھے۔ جب وہ اشتراکیت پر آیا تو اس کے لہجے میں چھپی بیزاری اور نفرت دلچسپی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بڑھ چڑھ کے اس کے حق میں بیان کرنے لگا۔

اچانک کلاس کی پچھلی نشست سے ایک لڑکا اٹھا۔ اس نے چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ حلیے سے وہ کسی مذہبی گھرانے کا لگتا تھا۔

''سر، میرا آپ سے ایک سوال ہے؟'' اس کا لہجہ مہذب ہی لگ رہا تھا مگر وسیم کو لگا کہ وہ قدرے طیش میں ہے۔

''جی، جی شیور۔ آپ سوال پوچھیں۔'' وہ بولا۔

''سر، آپ مسلمان ہیں؟'' اس کا سوال سن کے وسیم ششدر رہ گیا۔ اس نے اپنے اندر ناگواری کی لہر اٹھتی محسوس کی مگر اسے چھپاتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کا سوال یہی ہے تو آپ بیٹھ سکتے ہیں۔ اس سوال کا ہماری کلاس سے کوئی تعلق نہیں سو میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''دیکھا میں نے کہا تھا نا یہ دہریہ ہے۔'' وہ لڑکا ساتھ والے لڑکے سے کافی بلند آواز میں بولا۔

وسیم نے اپنے اندر ابال اٹھتا محسوس کیا۔

''اے، تم نے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟'' وہ انگلی اسی کی طرف کرتے ہوئے طیش کے عالم میں بولا۔

''ہاں تیرے ہی بارے میں بولا ہے۔ تو دہریہ ہے دہریہ۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

وسیم اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکا۔ ''نکل جاؤ میری کلاس سے۔'' وہ چیخا۔

وہ لڑکا اٹھ کے تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''کیوں بے، تیرے باپ کی کلاس ہے جو میں اِدھر سے نکل جاؤں۔ یہ اس ملک کا کالج ہے۔ جو ہم مسلمانوں نے بڑی قربانیوں سے حاصل کیا تھا۔ اس پہ ہم مسلمانوں کا حق ہے۔ تیرے جیسے دہریے کا نہیں۔ جو کمیونزم کا فلسفہ بگھار رہا ہے۔ تو نکل جا اِدھر سے۔'' وہ اس کے ڈائس کے پاس آ کے انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ اس کے ساتھ تین چار لڑکے بھی آ کے کھڑے ہو گئے تھے۔ باقی پوری کلاس خاموشی سے بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی۔

''یو شٹ اپ، اینڈ گیٹ لاسٹ۔'' وسیم انگلی اس کی طرف موڑ کے بولا۔ طیش کی وجہ سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''یو گیٹ لاسٹ۔'' اس لڑکے نے وسیم کا ہاتھ پکڑ کے اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔ اس نے اسی پر موقوف نہیں کیا۔ اس نے اس کی پشت پر ایک لات رسید کی۔ وسیم کھلے دروازے سے باہر جا کے گرا۔ اس کا سر پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے ایک حیران کن منظر اس نے دیکھا تھا۔ وہ چار لڑکے نفرت سے اسے دیکھ رہے تھے جبکہ باقی پوری کلاس خاموش تھی۔ ''خاموش تماشائی......''

☆☆☆

آج جمعے کا دن تھا۔ لوگ تیار ہو کے نماز جمعہ کے لیے مساجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف ایک رونق سی چھائی ہوئی تھی۔ مساجد میں مختلف موضوعات پر تقاریر جاری تھیں۔ کہیں اخلاقیات کا درس دیا جا رہا تھا تو کہیں حضورؐ اور صحابہ اکرام کی زندگیوں کے ایمان افروز قصے سنائے جا رہے تھے۔ ایسے میں کچھ عاقبت نااندیش لوگ ایسے بھی تھے جو مسالک کے درمیان اختلافات کو موضوعِ گفتگو بنائے ہوئے تھے اور حیران کن طور پر ایسی مساجد میں رش زیادہ تھا۔ سچ ہے کہ نفرت آسانی سے بک جاتی ہے جب کہ محبت کا خریدار خال خال ہی ملتا ہے۔

ان تمام مساجد میں سے ایک مسجد ایسی بھی تھی جہاں سب سے مختلف قسم کا درس ہو رہا تھا۔ خطیب صاحب بات کر رہے تھے۔ ''دوستو، ہم محمد صلی اللہ کے حلیے مبارک کے متعلق تو اکثر اوقات سنتے رہتے ہیں۔ ہم ان کے لباس اور پہننے کے طریقوں کے متعلق بھی کافی کچھ جانتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے کون کون سے معرکے لڑے اور کفار کو شکست سے دوچار کیا مگر ان سب کے ساتھ ہم ان کی زندگی کے ایک اہم ترین حصے کے متعلق بہت کم علم رکھتے ہیں۔ وہ ہے ان کی سیاسی زندگی۔ ہم میں سے بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضورؐ صرف ایک اچھے مبلغ نہیں تھے، نہ ہی وہ صرف مصلحِ قوم تھے۔ وہ ایک بہترین خاوند، ایک بہترین باپ، ایک بہترین دوست کے علاوہ ایک بہترین سیاست داں بھی تھے۔'' مفتی توصیف احمد توصی نے اتنا کہہ کے ایک لمحے کا توقف لیا۔ اس دوران میں ان کی نگاہیں مجمع کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

مفتی توصیف کوئی بہت ہی معروف عالمِ دین نہیں تھے۔ انہیں تو ابھی مفتی بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔ وہ اس وقت ایک دور دراز گاؤں کی واحد جامع مسجد میں جمعہ کی تقریر کر رہے تھے۔ اس مسجد کے انتظام و انصرام کو سنبھالے انہیں چند ہی ماہ ہوئے تھے۔

انہوں نے درسِ نظامی کا کورس ملک کے ایک معروف مدرسے سے کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مفتی کا کورس کیا اور چند ماہ پہلے ہی انہیں وفاق المدارس کی جانب

سے مفتی کی ڈگری ملی تھی۔ ڈگری ملنے کے فوراً بعد ان کے ایک استاد نے انہیں اس گاؤں بھیج دیا۔ اس سے پہلے کے جمعے کے خطبات کے دوران میں انہوں نے حضورؐ کے اوصاف اور عائلی زندگی کے متعلق بات کی تھی۔ آج ان کا ارادہ تھا کہ کسی حد تک حضورؐ کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالیں گے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا یہ قدم ان کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہونے والا ہے۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ سادہ لوح تھے۔ وہ مذہبی عقائد کے ساتھ تو چمٹے ہوئے تھے مگر ان عقائد نے ان کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے تاحال منور نہیں کیا تھا۔ وہ بس اپنے باپ دادا کے دیے گئے دین کو لے کے چل رہے تھے۔ اس کے خلاف کوئی بات سننا ان کی سرشت میں ہی شامل نہیں تھا۔ اس حوالے سے وہ انتہائی سخت گیر تھے۔

مفتی توصیف نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''حضورؐ کی زندگی کا ایک اہم حصہ ان کی سیاسی زندگی پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت ہی کی بدولت مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ ان کی سیاست......''

اچانک پیچھے سے ایک شخص اٹھا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سیاہ پڑ رہا تھا۔ ''او ماڑا، یہ تم نے کیا سیاست سیاست کی رٹ لگا رکھی ہے۔ سیاست تو جھوٹ ہے فراڈ ہے۔ تم ہمارے نبیؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ رہے ہو۔'' وہ طیش کے عالم میں چلّایا۔ مسجد میں سناٹا چھا گیا۔

مفتی صاحب نے اس شخص کو اپنی آمد کے بعد پہلی بار مسجد میں دیکھا تھا۔ وہ باقی لوگوں کو خاموش دیکھ کے ہکا بکا رہ گئے۔ باقی لوگ شاید کسی وجہ سے اس سے ڈرتے تھے جس کی وجہ سے وہ اس کی بدتمیزی کے باوجود خاموشی سے بیٹھے تھے۔

''بھائی صاحب، آپ بیٹھیں۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' وہ رسان سے بولے۔

''اوئے تو کیا ہمیں سمجھائے گا۔ ہم کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔'' اچانک پہلی صف میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کے بولا۔

مفتی صاحب بے بسی سے اُسے دیکھتے رہ گئے۔ وہ باقی لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے گہرے دکھ سے دوچار تھے۔

''چل آگے بات کر مگر خبردار جو اب ہمارے نبیؐ کی شان میں گستاخی کی۔'' وہ شخص دوٹوک انداز میں بولا۔

''دیکھیں، آپ سیاست......'' وہ ابھی اتنا ہی بولے تھے کہ اچانک وہ شخص آگے بڑھا۔ اس نے مفتی صاحب کو داڑھی سے پکڑ کے منبر سے نیچے اتار دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ان کی پیشانی پر ایک زوردار پنچ جڑ چکا تھا۔ مفتی صاحب بہت صبر والے تھے مگر وہ اپنی اتنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس شخص کی ٹانگوں سے لپٹ کے اسے گرانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کا ایسا کرنا تھا کہ گاؤں کے لوگ شہد کی مکھیوں کے مانند ان سے چمٹ گئے۔ کچھ دیر میں ہی وہ خون میں لت پت پڑے تھے۔ گاؤں کے تقریباً ہر شخص نے ان کی مرمت میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ وہ یہ سب کرتے ہوئے خانۂ خدا کے تقدس کو بھی بھول گئے تھے۔

☆☆☆

31 دسمبر، 2016ء

ساحلی علاقے میں موجود وہ الگ تھلگ سی بلڈنگ زیادہ تر ویران رہتی تھی۔ دور سے دیکھنے پر وہ اس وقت بھی ویران لگ رہی تھی مگر پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھ کے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بلڈنگ میں اس وقت کچھ لوگ موجود ہیں۔

اس وقت وہاں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کی ذیلی شاخ کا ایک اجلاس جاری تھا۔ اس بڑی طاقت نے آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور یہ سب ایک باقاعدہ حکمتِ عملی سے ہو رہا تھا۔ دنیا کو اپنے زیرِدست رکھنے کے لیے وہ طاقت اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا رہی تھی مگر اس کے باوجود اس کے وسائل تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ تجزیہ نگار ہر جگہ اپنے تجزیوں میں کہتے نظر آتے تھے کہ بس اس طاقت کا سورج بھی اب غروب ہونے کو ہے مگر ہنوز دور دور تک اس چیز کے نشان نظر نہیں آ رہے تھے۔

اس طاقت نے سیاسی ہتھکنڈوں اور طاقت کے بل بوتے پر آدھی سے دنیا کو اپنا غلام بنایا ہوا تھا۔ ان سیاسی ہتھکنڈوں میں اس کا سب سے آزمودہ نسخہ تھا۔ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو۔'' یہ طاقت جہاں بھی گئی وہاں لوگ آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس علاقے میں مذہبی، علاقائی، نسلی غرض ہر طرح کی منافرت بڑھنے لگی۔

اس وقت جو اجلاس جاری تھا، اس میں ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک پر کی گئی ''سرمایہ کاری'' سے ہونے والے نتائج کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ یہ اجلاس ہر سال کے اختتام پر ہوتا تھا مگر شنید تھی کہ اس سال ہونے والا یہ اجلاس اس ملک

سے متعلقہ آخری سالانہ اجلاس ہے۔

کہنے کو وہ ملک چھوٹا سا تھا مگر آبادی کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے دس بڑے ممالک میں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اس بڑی طاقت کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ وہ ہر سال یہاں سے بلینز میں ڈالرز کماتے تھے۔ اس آمدنی کے مقابلے میں ان کی ''سرمایہ کاری'' بہت کم تھی۔

وہ ملک جغرافیائی اعتبار سے بھی ان کے لیے انتہائی اہم تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کے اپنی مخالف قوتوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ اس ملک کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اسے کمزور کرنا ضروری تھا۔

کانفرنس ٹیبل کے سرے پر ایڈم برجر بیٹھا تھا۔ ساڑھے چھ فٹ قد کی وجہ سے وہ بیٹھے ہوئے بھی کھڑا نظر آتا۔ اس نے پورے سر اور چہرے پر بلیڈ پھروا رکھا تھا۔ پتلے ہونٹوں سے سفاکیت جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی ایک طلسمی کشش تھی۔ جو بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتا خود کو بے بس محسوس کرتا۔

کانفرنس ٹیبل کی تیس سے زائد کرسیوں میں سے چند ایک ہی بھری ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے لیپ ٹاپ آگے رکھے باادب بیٹھے تھے۔

ایڈم کی نظر ایک دیوار گیر گھڑی پر تھی۔ گھڑی کی سوئی جیسے ہی اس کے مطلوبہ مقام پر پہنچی وہ یکدم ہی مائک میں بولا۔

''کیا رپورٹ ہے۔'' وہ ایسے ہی مختصر اور نپی تلی گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

اس کی داہنی جانب بیٹھا پہلا شخص جوش و خروش سے اپنی رپورٹ سنانے لگا۔ اس کے سامنے ''پی۔ا'' کی تختی لگی تھی۔ یہ اس کا کوڈ نیم تھا۔ ایڈم کے علاوہ تمام لوگوں کے سامنے ان کے کوڈ نیم ہی کی تختیاں لگی تھیں۔ یہ کوڈ نیم انہیں کسی خاص پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے الاٹ کیے جاتے تھے۔ ہر پروجیکٹ کے لیے الگ سے کوڈ نیم دیا جاتا تھا۔ کسی مجبوری کی وجہ سے فرد بدل بھی جاتا تو کوڈ وہی رہتا تھا۔ گویا کوڈ ''کام'' کی شناخت تھی نہ کہ فرد کی۔

''پی۔ا'' کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔ ''سر، اس ملک سے ہمارے تمام اہداف ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بہ آسانی پورے ہو گئے ہیں۔ میری ذمے داری اس ملک کے سیاسی نظام کو کنٹرول میں رکھنا ہے۔ اس ملک کا سیاسی نظام ہماری پالیسی کے عین مطابق جا رہا ہے۔ ہر حکومت کے دور میں ہم کچھ ایسے ''ایشوز'' کھڑے کر دیتے ہیں جن کی وجہ سے حکومت اور دوسری پارٹیز ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو جاتی ہیں۔ عوام کو امید کے ساتھ تفریح بھی ملتی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں سوشلسٹ قوتوں نے اپنا گیم کھیلنے کی کوشش کی تھی مگر ہم نے مذہب کے کارڈ کو استعمال کر کے وہاں سے سوشلسٹ قوتوں کے قدم ہمیشہ کے لیے اکھاڑ دیے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے مذہبی جماعتوں کو استعمال کیا۔ اس دوران ہم مذہبی جماعتوں سے ایسے کام بھی کراتے رہے کہ لوگوں کا اعتماد ان سے بھی اٹھ چکا ہے۔ اب وہاں کوئی قوت یا جماعت ایسی نہیں جو ہمارے لیے مسائل کھڑے کر سکے۔ میرے خیال میں اب ہم اس نظام سے اپنی ساری ''سرمایہ کاری'' کھینچ کے صرف تماشائی والا کردار بھی ادا کریں تو کم سے کم اگلے تیس سال تک اس ملک کا سیاسی سیٹ اپ ہماری مرضی کے مطابق ہی چلتا رہے گا۔'' وہ اعتماد سے بولا۔ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی۔ اسکرین پر ''ویلکم'' کے الفاظ کی جگہ ایک ''سلائڈ'' چلنے لگی۔ یہ کچھ اعداد و شمار اور رپورٹس پر مشتمل ''پریزنٹیشن'' تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے ویڈیو کلپس بھی موجود تھے۔ ''پی۔ا'' ساتھ ساتھ تفصیل بتانے لگا۔ کمرے میں موجود تمام لوگوں کا رخ اسکرین کی طرف تھا مگر سب کے چہرے سپاٹ تھے بالکل دیوار کی طرح۔

اپنی پریزنٹیشن کے اختتام پر ''پی۔ا'' نے فاتحانہ انداز میں ایڈم کی طرف دیکھا۔

''گڈ۔'' اس نے یک لفظی تعریف پر اکتفا کیا۔ اب اس کی نظر ''پی۔۲'' پر جمی تھی۔

''سر، میرے ذمے مذہبی امور ہیں۔ یہ سب سے مشکل ٹاسک تھا مگر ہمارے پیش رو کی کئی صدیوں کی سرمایہ کاری کے بعد اب نتائج ہمارے حسبِ منشا ہیں۔ پہلے ہمارے پیش روؤں نے ان کے دین کے اس حصے کو جو ہمارے لیے خطرناک تھا، نکال پھینکا۔ اس مقصد کے لیے ہمارے پیش روؤں نے جو علما تیار کر کے ان کے بیچ شامل کیے ہیں۔ ان کی کوششیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔''

اس نے رپورٹ پریزنٹیشن کی صورت میں ایڈم کے سامنے پیش کی۔ ایڈم نے اس پر بھی یک لفظی کمنٹ کیا۔

''گڈ۔''

اب ''پی۔۳'' کی باری تھی۔

''اس ملک کا میڈیا میری نمائندگی کرتا ہے۔'' اس

نے پُرغرور لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا۔

"میڈیا کو اپنی مرضی سے چلانے کے لیے میں اپنی تمام ٹیکنیکس استعمال کرتا ہوں۔ بعض جگہ پر صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور کہیں کچھ ڈوریاں ہلانا پڑتی ہیں۔ پہلے پہل ہمیں اس شعبے پر کافی سرمایہ کاری کرنی پڑی لیکن اب دیگر لوگ بھی میڈیا سے اپنے مفادات حاصل کرنا سیکھ گئے ہیں۔ ہم بس ان کے مفادات کو اپنے مفادات سے نتھی کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد باقی کام وہ خود کر لیتے ہیں۔ سرمایہ کاری بھی خود، جوڑ توڑ اور دوڑ دھوپ بھی خود، لیکن نتائج ہماری مرضی کے۔" وہ اتنا کہہ کے سفاک انداز میں مسکرایا۔

اس کی تفصیلی رپورٹس کے بعد چند مزید لوگوں نے اپنے اپنے شعبوں کے متعلق رپورٹس پیش کیں۔ ان میں سے کوئی این جی اوز کے ذریعے بظاہر اصلاحی کام کرا کے در پردہ اپنے مقاصد پورے کر رہا تھا تو کوئی علاقائی تعصب کو فروغ دے رہا تھا۔ کوئی تعلیمی نظام کو اپنے حسبِ منشا چلا رہا تھا تو کوئی اپنی مرضی کی معاشی اصطلاحات کرا رہا تھا۔ ایک شعبہ دیگر ممالک سے تعلقات کی خرابی پر مامور تھا۔ غرض اس ملک کا ہر شعبہ ان کے قبضے میں تھا۔ ان تمام کا مشترکہ مقصد ایک ہی تھا۔ اپنی ملٹی نیشنل کمپنیز کی مصنوعات کی بغیر رکاوٹ وسیع مارکیٹ کا قیام اور یہاں بیٹھ کے سارے علاقے پر اپنا مکمل کنٹرول۔ ان تمام شعبہ جات میں مکمل تعاون پایا جاتا تھا۔

اب اجلاس سب سے اہم مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مرحلے میں انہیں فیصلہ کرنا تھا کہ کیا اب انہیں اس قوم کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنے کے لیے مزید قوت خرچ کرنے کی ضرورت ہے یا وہ اتنا کام کر چکے ہیں کہ جس کے نتیجے میں یہ قوم اب اپنے "اعمال کے وزن" کے ساتھ خود ہی پستی کی طرف لڑھکتی چلی جائے گی۔

"سر، میں اس حوالے سے بات کرنے سے پہلے آپ کو ایک دلچسپ ویڈیو دکھانا پسند کروں گا۔ اس ویڈیو سے ہمارے بحث میں ضائع ہونے والے کافی وقت کی بچت ہو سکتی ہے۔" "پی۔ا" بولا۔

ایڈم کا سر اثبات میں ہلا۔ کچھ ہی دیر میں اسکرین روشن ہو چکی تھی۔ سب لوگ دلچسپی سے اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

وارث کو کالم لکھنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ دونوں اسے اُدھر ہی بے ہوش چھوڑ گئے تھے۔ اس کی خوش قسمتی کہ اس کے پڑوسی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ وہ اسے بے ہوش دیکھ کے اسپتال لے گیا۔ اس کی انگلیوں میں فریکچر ہوا تھا۔

جب اس شخص نے لوہے کا سریا اس کے ہاتھ پر مارا تھا تو اس نے "ریفلکس ایکشن" کے تحت ہاتھ زمین سے اوپر اٹھا لیا تھا جس کی وجہ سے سریا اس کے ہاتھوں پر لگنے سے اس کی انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اگر وہ ہاتھ اوپر نہ کرتا تو سریا اتنے زور سے مارا گیا تھا کہ اس کی انگلیاں چکنا چور ہو جاتیں۔ اس کے بعد وہ کبھی لکھنے کے قابل نہ رہتا اور شاید یہی ان لوگوں کا مقصد بھی تھا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ لوگ اندھیرے کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اسے کچھ ہی دیر میں ہوش آ گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ سب اسے وہ کالم لکھنے کی وجہ سے بھگتنا پڑا ہے۔

اس کالم میں اس نے ایک مقامی سیاست داں رب نواز شاہ کا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا تھا۔ رب نواز صرف ایک سیاست داں نہیں تھا۔ شہر کے ہر بڑے کاروبار میں اس کا نام تھا۔ چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز۔

کاروبار جائز بھی ہوتا تو اس کا چلانے کا اپنا ہی انداز تھا۔ وہ کوئی بھی کاروبار جائز طریقے سے کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ دیگر بہت سے کاروباروں کی طرح پراپرٹی اور ہاؤسنگ اسکیمز میں بھی وہ سرمایہ کاری کر رہا تھا۔

اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی شہر کے نواح میں ایک بڑا زمین کا ٹکڑا خریدا تھا مگر یہ رقبہ اس کی ہاؤسنگ اسکیم کے لیے پورا نہیں تھا۔ اس نے اردگرد کے پلاٹس بھی خریدنا شروع کر دیے۔ آٹھ دس لوگوں کے پلاٹس کی اس کو ضرورت تھی۔

لوگ اس کی غنڈا فورس سے ڈرتے تھے۔ اس کی غنڈا فورس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ ان کے پاس "فورس تھی" اور نہ ہی قانون ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہاں، وہ اگر اس ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی ٹھان لیتے تو قانون ان کے خلاف ضرور کھڑا ہو جاتا۔

اس نے جو بھی قیمت انہیں دی، سب نے خاموشی سے تھام لی۔ یہ بھی اس کی نیکی تھی۔ وہ یہ بھی نہ کرتا تو وہ چند لوگ اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

بدقسمتی وارث کے ساتھ ہوئی۔ اس کے والد پرانے زمانے کے ایک اصول پرست انسان تھے۔ ان کے اصول تو ایکسپائر ہو چکے تھے سو انہیں بھی ایکسپائر کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا گھر ملک رب نواز کے ہاتھ بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سزا کے حق دار تو تھے ہی۔

وارث نے انہیں سمجھانے کی کوشش بہت کی تھی مگر وہ بڑے میاں ضد پر اڑ گئے تھے۔ وارث کے دل میں ہر وقت ہول اٹھتے رہتے۔

رب نواز کا ایک قول یہ بھی تھا کہ جہاں کام خاموشی سے ہوسکتا ہو وہاں تماشا لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وارث زیادہ خوفزدہ تھا جانے کب وہ چپکے سے وار کرجاتا۔

اس رات بھی وارث کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔ چند لمحے تو وہ دم سادھے لیٹا رہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھ کسی نامانوس قسم کی آواز سے کھلی ہے مگر اب ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اس کی آنکھ دوبارہ لگنے ہی والی تھی کہ اس نے خرخراہٹ کی آواز سنی۔ وہ اٹھ کے اپنے والد کے کمرے کی طرف لپکا۔ اسی لمحے اس نے صحن میں کسی کی جھلک دیکھی۔ اس کے والد گھر کی تمام بتیاں بجھا کر سونے کے عادی تھے۔

وارث اس شخص کا بس ہیولا ہی دیکھ سکا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیولا گیٹ کھول کے باہر چلا گیا۔

وارث دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ بلب کی زرد مدقوق روشنی میں وہ اسے چت لیٹے ہوئے نظر آئے۔ ان کی بے نور آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔ وارث بھاگ کے ان کے پاس پہنچا۔

ان کے سینے پر ایک سفید کاغذ پڑا تھا۔ وارث نے جھپٹ کے وہ اٹھالیا۔ اس پر ایک مختصر سا پیغام درج تھا۔

”انکار ہمیں اچھا نہیں لگتا۔“

کہنے کو تو یہ ایک مختصر سا فقرہ تھا مگر اس مختصر سے فقرے میں صدیوں کی داستانیں درج تھیں۔ وارث بلک بلک کے رونے لگا۔ اس کی ماں اور بھائی دوڑے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر میں پورا گھر آہ و بکا سے گونجنے لگا۔

سوم کے بعد وارث نے اپنا گھر کچھ ضروری کاغذی کارروائیوں کے بعد رب نواز کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ فی الحال بے بس تھا مگر وہ رب نواز کا یہ ظلم بھولا نہیں تھا۔ پہلے وہ اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتا تھا۔

غنڈا گردی رب نواز کا میدان تھا، وہ اس میدان میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اسے اپنی مرضی کے میدان میں لائے گا اور وہاں اسے خاک چاٹنے پر مجبور کردے گا۔

وہ جرنلزم میں ماسٹرز کررہا تھا۔ اس کا آخری سیمسٹر چل رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ لکھنے لکھانے کا شوق بھی رکھتا تھا۔ دوسرے درجے کے روزناموں میں اس کے کالمز چھپتے رہتے تھے۔ اس کے ابو ایک پرائیویٹ نوکری کرتے تھے۔ اب ان کی کمائی کا سہارا بھی چھن گیا تھا۔ اس نے ہوم ٹیوشنز پڑھانا شروع کردیں۔ اتنی مصروفیت کے باعث اسے ماں اور بھائی کو وقت دینا مسئلہ بن گیا تھا۔

مکان بیچ کے اس نے اپنے ماموں کے گھر کے پاس ایک نیا گھر لے لیا۔ یہاں سے اسے یونیورسٹی دور پڑتی تھی مگر اتنے پیسوں میں اسے اس کے سوا کہیں اور گھر نہیں مل سکتا تھا۔ یہاں اسے اپنے ماموں کی وجہ سے اپنی ماں کی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ اس کا بھائی تھرڈ ائیر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ قدرے لاابالی سی طبیعت کا مالک تھا۔ زمانہ خراب تھا وارث کو اپنے بھائی کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ماموں کی وجہ سے اسے کافی سہارا ہوگیا۔

پڑھائی کے بعد اس نے ایک اخبار میں بطور رپورٹر جاب کرلی تھی۔ دیگر رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ وہ رب نواز پر بھی کام کررہا تھا۔ وقت اور وسائل کی کمی کے باعث یہ کام اس کی توقع سے بھی دشوار ثابت ہوا۔ سالوں کی محنت کے بعد وہ رب نواز کے حوالے سے کافی مواد اور ثبوت اکٹھے کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے وہ سارا مواد اپنے نیوز ایڈیٹر کو پیش کیا۔ جسے دیکھ کے وہ خوش ہوگیا۔

”بیٹا، کام تو تم نے بہت شاندار کیا ہے مگر یہ بطور خبر دینے سے ہمیں کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ رب نواز کا نام لیے بغیر تم ایک کالم میں اس کا کچا چٹھا کھول کے بیان کردو۔ ویسے بھی خبر سے زیادہ کالم کا اثر ہوتا ہے۔ یہی دیکھ لو کے نامی گرامی کالم نگاروں ...کو پورا ملک جانتا ہے جبکہ رپورٹرز کو دوسرے اخبار والے بھی نہیں جانتے۔ تم اچھا سا کالم لکھو، یہ تمہارے کیریئر کے لیے کافی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔“ اس نے وارث کو رسان سے سمجھایا۔

وارث کو مایوسی تو ہوئی مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ایڈیٹر سے اس نے سوچ بچار کے لیے وقت مانگا تھا۔

ایڈیٹر نے وہ تمام ثبوت اپنے پاس رکھ لیے۔ وارث اس سے وہ واپس مانگنا چاہ رہا تھا مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

کچھ دن سوچ بچار کے بعد اس نے کالم لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے ایک زوردار کالم لکھا۔ اس نے رب نواز کا نام نہیں لکھا تھا مگر کالم کا لفظ لفظ چیخ چیخ کے گواہی دے رہا تھا کہ یہ

کالم رب نواز کے بارے میں ہے۔ وہ بہت خوش تھا مگر اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ایڈیٹر نے اسے استعمال کیا تھا۔ اس نے اس کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی اور شاید وہ سارے ثبوت رب نواز کے ہاتھوں بیچ دیے تھے۔

''آخر کب تک ہم ان ظالموں کے ظلم سہتے رہیں گے۔ کب تک لوگ ہمیں اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔ آخر کونسا ایسا طریقہ ہے جس پر چل کے ہم ان ظالموں کو ان کے کیے کی سزا دے سکتے ہیں۔ اے خدایا، تو نے کوئی تو ایسا طریقہ بنایا ہوگا۔ بس وہ طریقہ مجھے بتا دے۔ میں ساری زندگی ان ظالموں کے خلاف جہاد کرتے گزار دوں گا بس مجھے وہ طریقہ بتا دے۔'' وہ چیخ چیخ کے خدا سے مخاطب تھا۔

کہتے ہیں کہ مظلوم کی آہ آسمان کو ہلا دیتی ہے۔ اس کی آہ میں بھی وہ سوز تھا کہ عرش ہلنے لگا۔ خدا کو اس پر رحم آ گیا تھا...... نہ صرف اس پر بلکہ اس جیسے لاتعداد مظلوموں پر۔

☆☆☆

کانفرنس روم میں موجود تمام نفوس اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ''سر یہ تین حالیہ کیسز ہیں۔ جو پچھلے دنوں میڈیا پر چھائے رہے۔ ان کے متعلق تفصیل جان کر ہم سب یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اہداف پورے ہو چکے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے کی گئی ''سرمایہ کاری'' کی بدولت اب ثمرات سے بغیر کسی زحمت کے فیضیاب ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب ہم نے بس پکی پکائی فصل کاٹنی ہے۔''

ایڈم کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری چھائی ہوئی تھی۔ وہ اتنی لمبی بات کرنے کا عادی نہیں تھا تاہم اس نے ''پی۔ اے.... کو ٹوکا نہیں۔

وہ اسکرین پر نظریں جمایا بولتا جا رہا تھا۔ ''پچھلے دنوں جمعے کی نماز کے دوران ایک مولوی نے اپنے نبیؐ کو سیاست داں کہہ دیا۔ نتیجے میں لوگ اسے مارنے لگے۔ انہوں نے مار مار کے اسے لہولہان کر دیا۔ وہ شخص بڑی مشکل سے شہر پہنچا۔ وہ سیدھا پولیس اسٹیشن گیا۔ پولیس نے اس کی نہ سنی۔ ان کے بقول یہاں ہر گلی کوچے میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہم کس کس کی شکایات سنیں۔ آپ لوگ ایسی باتیں کیا ہی نہ کریں جس سے عوام مشتعل ہو۔

وہاں سے یہ اسٹوری کسی رپورٹر کے ہاتھ لگ گئی۔ دو تین دن تو ہر چینل پر یہی رپورٹ چلتی رہی تھی۔ تجزیہ نگار اپنے تجزیے کر رہے تھے مگر آپ جانتے ہیں، ایسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ عوام کی ایسی انتہا پسندانہ اور محدود سوچ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری اور ہمارے پیش روؤں کی برسوں کی ریاضت اور ''سرمایہ کاری'' رائیگاں نہیں گئی۔'' اس کے لبوں پر ایک کمینی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اسکرین پر اس کیس کے متعلق مزید تفصیلات دکھائی جا رہی تھیں۔ ساری تفصیل جان کر ایڈم کے ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''گڈ، اب ہمیں واقعی انہیں لڑانے کے لیے زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے آج کا سب سے طویل جملہ بولا۔

''سر، آپ دوسرا کیس ملاحظہ کیجیے۔ کالج کا ایک لیکچرر سوشلسٹس نظریات کا حامل تھا۔ اس کے اپنے طلبا نے اس پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا کے اس کی پٹائی کر دی۔ یہ کیس بھی میڈیا نے خوب اچھالا۔ سوشلزم کے حوالے سے لوگوں میں یہ نفرت ہماری محنت کا ہی ثمر ہے۔'' وہ مسکرایا۔

اب سب دوسرے کیس کی تفصیلات دیکھ رہے تھے۔ ان کا انداز لطف لینے والا تھا۔ ان کے انداز میں ایسی ہی تسکین تھی جیسی کسی بیمار ذہنیت کے حامل فرد کو دوسروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کے ہو سکتی ہے۔

کچھ دیر کے بعد اسکرین پر تیسرے کیس کی تفصیلات دکھائی جانے لگیں۔ ''سر، ایک کالم نگار نے ایک سیاست داں کے خلاف ایک کالم لکھ ڈالا۔ اس نے اسے اپنے غنڈوں سے پٹوا دیا۔ وہ فریاد لے کے اپنے اخبار گیا تو ادھر اس کے اپنے اخبار والوں نے اسے مزید ڈرایا دھمکایا.... مخالف چینل والوں کو یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے چینل پر اس کیس کو اچھالا۔ لیکن انہوں نے بھی اس سیاست داں کا نام نہیں لیا صرف اپنے مخالف اخبار کو بدنام کیا۔''

تینوں ویڈیوز کی تفصیلات دیکھنے کے بعد اب سب ایڈم کو دیکھ رہے تھے، جیسے اس کے فیصلے کے منتظر ہوں۔

پی۔ اے اسے سوچتا دیکھ کے پھر بولا۔ ''سر، آپ نے دیکھا کہ وہاں اب نہ مذہبی رواداری رہی ہے، نہ اظہارِ رائے کی آزادی۔ کوئی اگر دوسرے کے نظریات کے خلاف بھی بات کر دے تو وہ مرنے مارنے پہ اتر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے وہاں دیگر اتنے مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ وہ ہمیشہ انہی میں الجھے رہیں گے۔ ہمارے خلاف کبھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں ہمارا کام بس اب تماشا دیکھنا ہے، ہمارے مقاصد میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔'' وہ اب پھر ایڈم کی طرف منتظر نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب ہمیں اس ملک کے حالات کو مزید اپنے موافق بنانے کے لیے مزید ''سرمایہ کاری'' کی ضرورت نہیں۔ یہ اب خود کار طور پر ہی ہماری مرضی کے مطابق چل رہے ہیں۔'' اتنا کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ باقی سب بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر کار آج وہ اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن کیا وہ واقعی کامیاب ہو گئے تھے؟ اس بات کا فیصلہ وقت نے کرنا تھا۔ وہ جو خود کو مطلق العنان سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے اوپر بھی ایک قوت ہے اور وہ زیادہ بااختیار اور باخبر ہے۔

☆☆☆

وارث علی حالات سے مایوس ہو چکا تھا۔ دو تین دن تو میڈیا پر اس کو ٹھیک ٹھاک کوریج ملی مگر نہ رب نواز کا کہیں نام آیا نہ اسے انصاف ملا۔ اس کے جسمانی زخم تو قدرے بھر چکے تھے مگر دل کے زخموں کا اس کے پاس کوئی چارہ گر نہیں تھا۔

اب ہاتھ وہ کافی حد تک ہلا لیتا تھا مگر مکمل ٹھیک ہونے میں اسے اب بھی کافی وقت درکار تھا۔

ظہر کی اذان ہوئی تو وہ کچھ سوچ کے مسجد کی طرف چل پڑا۔ مخلوق سے تو اس نے بہت امیدیں وابستہ کر کے دیکھ لی تھیں۔ اب وہ خالق سے مدد مانگنا چاہ رہا تھا۔

نماز پڑھ کے وہ اُدھر ہی بیٹھا رہا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا مگر اسے یکسوئی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں اِدھر اُدھر کے خیالات گردش کرنے لگ جاتے۔ وہ چہرہ ہاتھوں پر جھکائے کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اچانک اس نے اپنے کندھے پر کسی کا لمس محسوس کیا۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ یہ مفتی توصیف صاحب تھے۔ وہ ان سے بچپن سے واقف تھا۔ وہ اسی مسجد سے ملحقہ مدرسے میں پڑھتے تھے۔ شام کے وقت گراؤنڈ میں وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتے تھے۔ وارث کے ساتھ اُدھر ہی ان کی دعا سلام ہوئی تھی۔

پچھلے دنوں ٹی وی پر ان کا کیس بھی کافی گردش کرتا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' توصیف صاحب نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''سوچ رہا ہوں کہ اس ملک کے حالات کب بدلیں گے، کب یہاں سے ظالموں کا راج ختم ہوگا، کب مظلوموں کو انصاف ملے گا؟'' وہ گہری اُداسی سے بولا۔

وہ دھیمی سی مسکان چہرے پر سجا کے بولے۔ ''جب تم اس کے لیے جہاد یعنی کوشش کرو گے۔'' جہاد کے بارے میں انہوں نے وضاحت ضروری سمجھی۔

''میں اپنے حالات بدل نہیں سکتا، ملک کے حالات کیسے بدلوں گا؟'' وہ مایوسی کی انتہا پر تھا۔

''ہم میں سے ہر شخص کے حالات ملک کے حالات کے ساتھ نتھی ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہی ہے کہ ہم ساری زندگی اپنے حالات کو ہی سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے تب تک ہمارے اپنے حالات بھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔

''بے شمار لوگ اور جماعتیں حالات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر حالات ہیں کہ ٹھیک ہونے کے بجائے روز بروز خراب ہی ہوتے جا رہے ہیں۔'' وہ مکمل طور پر ہارا ہوا شخص لگ رہا تھا۔

''ہاں بہت سے لوگ اور جماعتیں حالات ٹھیک کرنے کی کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں مگر کچھ صرف دعوے ہی کر رہے ہیں۔ ان کے پس پردہ مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں جو مخلص ہیں بھی تو ان کی سمت درست نہیں۔'' وہ اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''مفتی صاحب، آپ نے مکمل دین پڑھا ہے۔ میں بچپن سے سنتا آرہا ہوں کہ دین میں قیامت تک کے انسانوں کے لیے راہنمائی موجود ہے۔ تو کیا دین میں.... ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں؟'' اس نے یکدم ہی چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''کیوں نہیں، بے شک ہمارے دین میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔'' ان کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''تو آپ لوگ پھر یہ مسئلے حل کیوں نہیں کرتے؟'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''آپ'' ''لوگ نہیں ہم سب لوگ ایسا نہیں کر رہے۔'' وہ ''آپ'' پر زور دے کے نرم لہجے میں بولے۔

''میں نے کہا نا کہ ہم سب اپنے ہی مسائل کو حل کرنے میں زندگی گزار دیتے ہیں، قومی مسائل کے لیے ہم کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں حالانکہ ہمیں خود اس بارے میں سوچنا چاہیے، یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے مسائل اصل میں پھوٹ کہاں سے رہے ہیں۔ پھر ان کی جڑیں تلاش کر

ان افراد کی روداد جو ''بے وقت موت'' کا شکار ہوئے لیکن
اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے

سرگزشت کا خاص نمبر
اہمیت کا حامل ہوتا ہے
لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں
تو پہلے آگاہ کردیں تاکہ کوئی دوسرا اس
شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے

کے ان مسائل کے حل کے لیے سوچیں۔'' وہ اس کی جھنجلاہٹ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

''کہاں سے پھوٹ رہے ہیں ہمارے مسائل؟'' وہ اچنبھے سے بولا۔

''اسی پر تو غور وفکر کی ضرورت ہے۔ کل عشا کی نماز کے بعد وسیم صاحب کے ساتھ بھی اس موضوع پر کافی دیر بات ہوئی۔ آج ہمارا پھر عشا کے بعد بیٹھنے کا پروگرام ہے۔ تم بھی آجانا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب اپنے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں غور وفکر کریں۔''

''پروفیسر وسیم صاحب؟ سنا ہے ان کے ساتھ بھی بہت برا ہوا۔''

''جی ہاں، ان کے طلبا نے ان کو پیٹا تھا مگر وہ مایوس یا دل گرفتہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس معاشرے کو ٹھیک کرنے کا عزم کرلیا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ظلم ہوا ہے لیکن مایوس ہونے کے بجائے ہمارا ساتھ دو۔ انشاء اللہ ہم ایک دن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے جہاں کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا، جہاں انصاف ہوگا۔ رواداری ہوگی۔ امن وامان ہوگا۔ بھائی چارہ ہوگا۔'' ان کی آنکھوں میں جذبے بول رہے تھے۔ وارث متاثر ہوا۔

''آپ کے پاس کوئی لائحہ عمل ہے؟'' وہ پُراشتیاق انداز میں بولا۔

''ہاں۔ میرے پاس قرآن ہے۔ نبیؐ ہیں۔ ان کی تعلیمات پر چل کے انشاء اللہ ایک نہ ایک دن ہم ضرور تبدیلی لائیں گے۔'' ان کی آنکھوں میں الوہی سی چمک تھی۔

وارث کی آنکھوں میں خواب چمکنے لگے۔

''انشاء اللہ!'' وہ خوابناک انداز میں بولا تھا۔

☆☆☆

مفتی توصیف احمد توصی کا دنیا میں کوئی خونی رشتے دار نہیں تھا اگر تھا تو وہ لاعلم تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو خود کو ایک مدرسے میں پایا۔ مدرسے میں سیکڑوں طلبہ رہائش پذیر تھے۔ بیشتر طلبہ صرف پڑھائی کی غرض سے ادھر مقیم تھے مگر چند ایک ان کی طرح بے آسرا بھی تھے۔

ان کے اساتذہ انتہائی شفیق تھے۔ مدرسے کے منتظم کا تو نام ہی شفیق تھا۔ وہ لاوارث بچوں کے ساتھ خاص طور پر بہت محبت سے پیش آتے۔ انہوں نے کبھی توصیف احمد کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

مدرسے میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ انہوں نے دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ وہ انتہائی ذہین تھے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد انہوں نے درس نظامی کا کورس کیا۔ ساتھ ہی دنیاوی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انہوں نے پرائیویٹ بی۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

مفتی بننے کے بعد شفیق صاحب نے انہیں ایک دور دراز گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ انہوں نے توصیف صاحب کو نصیحت کی تھی۔ ''بیٹا، میں آپ کو اس لیے بھیج رہا ہوں کہ وہاں کے لوگوں کو شعور کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو شعور دینا ہے۔''

توصیف صاحب نے اپنے استاد کی یہ نصیحت پلّے سے باندھ لی تھی مگر ان لوگوں کو شعور دینے کی کوشش انہیں بہت مہنگی پڑی تھی۔ کچھ وہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پائے تھے جس کی وجہ سے لوگوں نے انہیں بہت بری طرح پیٹا تھا۔

چند خدا ترس لوگوں نے انہیں بڑی مشکل سے بچایا۔ ان لوگوں نے ان کی مرہم پٹی کر کے انہیں شہر جانے والی بس میں سوار کرا دیا۔ وہ اس وقت بھی انتہائی غم وغصے کا شکار تھے۔ شہر پہنچتے ہی انہوں نے پولیس اسٹیشن کا رخ کیا مگر ادھر ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ تھانیدار کا رویہ دیکھ کے انہیں احساس ہوا کہ واقعی عالم دین کی وقعت عام لوگوں کی نظر میں کچھ نہیں رہی۔ ادھر ہی ان کی ملاقات ایک چینل کے رپورٹر سے ہوگئی۔ اسے ان کی اسٹوری پتا چلی تو وہ انہیں ساتھ لے گیا۔ ادھر ان سے کیمرے کے سامنے کئی بار بیانات لیے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں انصاف ملے گا مگر دو تین دن میڈیا پر ان کے کیس کا چرچا تو خوب رہا مگر انہیں انصاف نہیں مل سکا۔ وہ مدرسے میں واپس آگئے۔

وہ ٹوٹ چکے تھے مگر شفیق صاحب نے انہیں سنبھال لیا۔ انہوں نے ان کی راہنمائی کی۔ وہ دوران تعلیم بھی ان کی راہنمائی کرتے رہتے تھے مگر ان کی اس وقت کی کہی گئی باتیں آج ان کی سمجھ میں آرہی تھیں۔

مدرسے میں تعلیم کے ساتھ شعور کی دولت بھی دی جاتی تھی۔ عام لوگوں میں مدارس کے حوالے سے یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہاں انتہا پسندی سکھائی جاتی ہے مگر اس مدرسے میں طلبہ کو تشدد سے مکمل گریز کی تربیت دی جاتی۔ ایک دن شفیق صاحب چند طلبا کے ساتھ بیٹھے اسی موضوع پر بات چیت کررہے تھے۔

''آج کل جہاد کی تعریف کو غلط انداز میں بیان کیا

جاتا ہے۔ کچھ اسلام دشمن قوتوں نے جہاد سے اپنے بہت سے مقاصد حاصل کیے۔ انہوں نے پہلے اپنے مخالفین کو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو استعمال کرتے ہوئے شکست دی پھر جب ان کا مقصد پورا ہو گیا تو انہوں نے جہاد ہی کو بدنام کر دیا۔ درحقیقت یہ اس وقت بھی جہاد نہیں تھا یہ صرف لڑائی تھی اور وہ بھی دوسروں کی۔ ہم لوگ تو صرف کٹھ پتلیاں تھے ہماری ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔ اب بھی بہت سے گروہ اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آج آپ کو بہت سے ایسے گروہ ملیں گے جو جہاد کے نام پر آپ کو اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے ایسے لوگوں سے بچ کے رہنا ہے۔''

''باباجان، ہمارے دشمن ہمیں کمزور کر رہے ہیں تو کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ ہم ان کے خلاف جہاد نہیں کریں گے؟'' توصیف احمد جن کی عمر اس وقت صرف سولہ سال تھی نے سوال کیا۔ شفیق صاحب کو سب بچے باباجان ہی کہتے تھے۔

''جی بیٹا کریں گے مگر موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اس حوالے سے حکمتِ عملی ترتیب دینا ہوگی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

شفیق صاحب نے انہیں وہ ساری حکمتِ عملی بتائی تھی۔ موجود دود کے تمام مسائل کے حل کے حوالے سے انہیں بتایا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً تمام طلبہ کی نظریاتی آبیاری کرتے رہتے تھے لیکن اُس وقت انہیں ان کی باتیں کم ہی سمجھ آتی تھیں۔

عشا کی نماز کے بعد تمام لوگ اپنے گھروں کو جا چکے تھے مگر مسجد کی بتیاں خلافِ معمول آج روشن تھیں۔ اس وقت مسجد کے دروازے پر تالا پڑا ہوتا تھا مگر آج مسجد کا دروازہ کھلا تھا کیوں کہ آج وقت نے تین افراد کو گردش میں گھماتے گھماتے ایک ہی جگہ لا پھینکا تھا۔ یہ تینوں افراد کل تک عام سے فرد تھے مگر وقت نے انہیں عام نہیں رہنے دیا تھا۔ وقت نے ان سے بہت خاص کام لینا تھا سو وہ آج اس خاص رات میں اس خاص جگہ بیٹھے تھے۔

رات بیتی چلی جا رہی تھی اور وہ ایک حکمتِ عملی مرتب کرتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی ان کے چہروں پر اُلجھن کے تاثرات نمودار ہوتے، تو کبھی ان کے چہرے جذبات کی حدت سے دہکنے لگتے۔ کبھی وہ گومگو کیفیت سے دوچار نظر آتے تو پل بھر بعد ہی ان کی آنکھوں سے آہنی عزم جھلکنے لگتا۔ رات بیت گئی۔ سحر کی آمد کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ اٹھے اور تہجد ادا کر کے اپنے ارادوں کی مضبوطی اور اپنے مقصد میں کامیابی کی دعا مانگنے لگے۔ بے شک ہر اندھیرے کے بعد سویرا ہے۔ ظلم کی یہ رات بھی ختم ہونے والی تھی، صبح صادق کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔

☆☆☆

یکم جولائی، 2037ء

وقت دنیا کو بیس سال آگے لے گیا۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے مزید ترقی دیکھنے میں آئی۔ توانائی کے نت نئے ذرائع دریافت ہو گئے۔ آسائشات مزید بڑھ گئیں۔ تعلیم دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی مگر دنیا کے سیاسی حالات جوں کے توں تھے۔ آج بھی دنیا میں ایک بڑی طاقت تھی جو پوری دنیا کے وسائل پر قابض تھی۔ اس کے حلیف وہی تھے اور اس کے مخالف بھی وہی تھے جو بیس سال پہلے تھے۔

سب کچھ وہی تھا لیکن بہت کچھ بدل چکا تھا بس وہ تبدیلی ابھی دنیا نے دیکھی نہیں تھی۔ یہ تبدیلی ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک میں آئی تھی۔ ابھی اس کے آنے کے آثار ہی نظر آنا شروع ہوئے تھے کہ ہر طرف ایک ہلچل مچ گئی۔

''ساحلی علاقے'' میں موجود ''ویران سی عمارت'' کی پارکنگ میں آج کل پھر تواتر سے گاڑیاں کھڑی نظر آنے لگی تھیں۔ چند دیگر بڑے بڑے ممالک کے سرکردہ افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ نئی نئی حکمتِ عملیاں ترتیب دی جا رہی تھیں۔ مشیر اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے۔ ''صدور'' چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات سجائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے چند ایک چہروں سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی تو چند ایک کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ چند ایک تذبذب کا شکار تھے تو چند ایک پُریقین۔

اس ساری ہلچل کا آغاز ایک ملاقات سے ہوا تھا جو انتہائی خفیہ تھی مگر اس کے نتائج منظرِ عام پر نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

یہ ہلچل سب سے پہلے ایشیا کے چھوٹے سے ملک کے آرمی ہیڈ کوارٹر میں مچی تھی۔ جب عوام کا ایک وفد آرمی چیف سے ملاقات کرنے گیا۔

سیکیورٹی پر مامور افراد نے آلات سنبھال لیے۔ ہر طرح کے آلات سے وفد کے ارکان کو مکمل کھنگالنے کے باوجود وہ کچھ کنفیوز تھے۔ ان کے شناختی کاغذات کی ہر طرح سے تسلی تشفی کی جانے لگی۔ اِدھر اُدھر فون گھمائے گئے۔

کمپیوٹرز اور انٹرنیٹ پر موجود دستیاب مواد چیک کیا گیا۔ آخر کار وفد کو سیکیورٹی کلیرنس مل گئی۔

آرمی چیف، جنرل آزاد ہیڈکوارٹر میں بیٹھے تھے جب انہیں انٹرکام پر اطلاع ملی کے عوام کا ایک وفد ان سے ملنے آیا ہے۔ وہ کسی انتہائی خاص موضوع پر مکمل تنہائی میں ان سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ سیکیورٹی پر مامور افراد ان کی طرف سے مطمئن تھے۔

''ان لوگوں نے بتایا نہیں کہ یہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' چیف نے اس سے استفسار کیا۔

''سر، وہ کہتے ہیں کہ کوئی انتہائی خفیہ معاملہ ہے جو وہ صرف آپ کے ساتھ ہی ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان کے متعلق تمام چھان بین کر لی ہے۔ یہ شریف اور معاشرے کے معزز افراد ہیں۔''

''اوکے، ان کے متعلق سارا مواد مجھے بھیج دو۔ میں اس کے بعد ان سے ملنے کے متعلق فیصلہ کروں گا۔'' آرمی چیف نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات تھے۔ عوام کا کوئی وفد اس طرح خفیہ طریقے سے ملنے پہلی بار اُن کے پاس آیا تھا۔ کمرے میں سیکیورٹی کے حوالے سے غیر معمولی انتظامات تھے۔ ان کی ایک انگلی کی معمولی سی جنبش سے کمرے کی دیواروں سے ایسی شعاعیں خارج ہوتیں جو کمرے میں موجود ان کے سوا ہر شخص کو بے حس و حرکت کر دیتیں۔ یہ انتظام چند ماہ پہلے ہی کیا گیا تھا اور وجہ ملک کے حالات تھے۔

جنرل آزاد کو آرمی چیف کا عہدہ سنبھالے دو سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے ملک کے لیے کچھ غیر معمولی کام کیے تھے جن کی وجہ سے وہ بعض ملک دشمن عناصر کی نظر میں کھٹکنے لگے تھے۔ وہ دشمنوں سے خوفزدہ تو نہیں تھے تاہم احتیاط کے تقاضے کو ہمیشہ مدِنظر رکھتے تھے۔

وہ چہرے پر سپاٹ تاثرات سجائے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دروازہ کھلا۔ یہ تین افراد تھے۔ تینوں کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی وہ حلیے سے معزز نظر آتے تھے۔

''میں وسیم احمد ہوں اور یہ میرے ساتھ شامیر حسن اور امیر تیمور ہیں۔'' چمکتی آنکھوں والے ایک شخص نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔

''جی تشریف رکھیں۔'' چیف نے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک ہی نظر میں تینوں کا بغور جائزہ لے چکے تھے اور اب گہری نظروں سے وسیم احمد کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

''بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت عنایت کیا۔ میں تمہید میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور نہ سنی جائے۔ آپ بعد میں خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہاں کی گئی باتیں کس کس کو بتانے کی ضرورت ہے۔'' وسیم نے انتہائی نپے تلے انداز میں کہا۔

''جی آپ اس حوالے سے بے فکر رہیں۔'' چیف نے مختصر الفاظ میں یقین دہانی کرائی۔ ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی بہت ہی خاص بات ہونے والی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اتنی بے چینی ہو رہی تھی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ بے چینی کی وجہ اس شخص کی آنکھیں ہیں، ان لوگوں کا غیر معمولی انداز ہے یا ان کی باتیں؟

''کیا ہمارے حوالے سے آپ کو تمام معلومات مل چکی ہیں؟'' وسیم نے اگلا سوال کیا۔

''جی، بس اب ملاقات کا مقصد جاننا رہ گیا ہے۔'' چیف نے اس بار بھی مختصر جواب دیا۔

وہ اپنی ملاقات کا مقصد بتانے لگے۔ ان کی باتیں سن کے ان کے اندر ہلچل مچ اٹھی تھی مگر وہ چہرے کو سپاٹ رکھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چند منٹ کی گفتگو ہوگی مگر ملاقات میں تین سے زائد گھنٹے گزر گئے تھے۔ یہ گفتگو اتنی اہم تھی کہ اس دوران میں انہوں نے اپنی تمام دیگر مصروفیات ملتوی کر دی تھیں۔

ملاقات ختم ہونے کے بعد وہ تینوں مطمئن انداز میں رخصت ہوئے تھے۔

آرمی چیف نے اُن کے جاتے ہی اگلے دن ہائی کمان کی میٹنگ طلب کر لی۔ اس کے علاوہ انہوں نے چند قابلِ اعتماد لوگوں کو ایک اور اہم کام بھی سونپ دیا۔ اِن کو وہ کام کل کی میٹنگ سے پہلے پہلے پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

وہ ابھی ان لوگوں کی ''قوت'' کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے مگر ان لوگوں میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے بارے میں جو بتایا ہے، درحقیقت یہ اس سے بھی بہت ''آگے کی چیز'' ہیں۔

اس ملاقات نے ان کی آنکھوں میں سپنے سجا دیے تھے۔ وہ جس تبدیلی کا خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھے تھے، اس کی تعبیر اتنی اچانک انہیں مل سکتی ہے، یہ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

ان کی دوسالہ سروس باقی تھی۔ یہ پہلے سے ہی انتہائی سخت تھی مگر اب انہیں لگ رہا تھا کہ جتنی سروس بلکہ جتنی زندگی ان کی باقی ہے، اس میں وہ مقصد کے حصول تک ایک لمحہ بھی چین سے نہیں رہ سکیں گے۔

☆☆☆

ایسے ہی تین وفد تین پڑوسی ممالک میں بھی بھیجے گئے تھے۔ ان پڑوسی ممالک میں سے ایک تو دوست ملک تھا جبکہ دوسرا دشمن ملک سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں ممالک کا شمار دنیا کے بڑے ممالک میں کیا جاتا تھا۔ تیسرا ملک بھی دنیا کی بڑی قوتوں میں سے ایک تھا۔

ان تینوں ممالک میں وفود بھیجنے کا مقصد ملک میں لائی جانے والی تبدیلی کے متعلق اعتماد میں لینا اور ان کی سپورٹ حاصل کرنا تھا۔ یہ تبدیلی ایسی تبدیلی تھی جو اُن تین ممالک کے علاوہ خطے کے باقی ممالک کے لیے بھی فائدہ مند تھی۔ باقی ممالک میں بھی وفد بھیجے جانے تھے تاہم وہ تبدیلی کے آغاز کے بعد بھیجے جانے تھے۔

ان وفود کی وجہ سے اندرونِ خانہ ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ دنیا ایک بڑی تبدیلی کی طرف جانے والی ہے۔ مخالف اور سرمایہ دار قوتیں اس تبدیلی کو کبھی پسند نہیں کرسکتی تھیں۔ اگر اس تبدیلی کو صحیح طور پر ہینڈل نہ کیا جاتا تو دنیا تیسری جنگ عظیم کی طرف جاسکتی تھی۔ جس کے نتیجے میں بے پناہ تباہی آتی۔

بڑے ممالک میں طاقت کے حصول کے لیے ہمیشہ سے جنگ جاری رہی ہے۔ عام طور پر یہ جنگ سرد جنگ ہی رہتی ہے جو اُن ممالک کی خفیہ تنظیموں کے مابین جاری رہتی ہے لیکن بعض اوقات یہ ممالک کسی دوسرے ملک پر اپنی مرضی کی حکومت کے قیام کے لیے اپنی مرضی کے گروپوں کو ہتھیار اور دوسرے وسائل فراہم کرنے لگتے ہیں۔ ہتھیار ان کے استعمال ہوتے ہیں مگر جانیں بے گناہ اور معصوم انسانوں کی ضائع ہوتی ہیں۔

دوسری طرف یہ جنگ میڈیا پر بھی لڑی جاتی ہے۔ اس حوالے سے دنیا پر مغربی ممالک کے میڈیا کا اثر ورسوخ ہے۔ وہ میڈیا پر ایسی پروپیگنڈا مہم چلاتے ہیں کہ ساری دنیا کی ہمدردی ان کے حامی گروپوں کے ساتھ ہوجاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ طاقتوں کی اس حکمتِ عملی کی وجہ سے سوشلسٹ طاقتوں کو پچھلے دور میں ہر محاذ پر شکست کھانا پڑی تھی، سو اس بار وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتے تھے۔ نہیں تو یہ تبدیلی نہ صرف ان کے لیے انتہائی ہولناک ہوتی بلکہ لاکھوں جانوں کے زیاں کا خدشہ بھی موجود تھا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ مخالفین کی ہر حکمتِ عملی کا مناسب جواب دیا جائے۔ اگر یہ لوگ جو تبدیلی لانا چاہتے تھے ویسی تبدیلی آجاتی تو دنیا میں طاقت کا توازن ہی بدل جاتا۔

☆☆☆

دنیا کی ایک بڑی اقتصادی قوت کے پرائم منسٹر ہاؤس میں میٹنگ جاری تھی۔ پچھلے دنوں پڑوس سے ایک دوست ملک کے وفد نے وزیراعظم سے ایک ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں کچھ ایسی بات چیت ہوئی تھی کہ اس ملک کے وزیراعظم کو ایک ہائی لیول میٹنگ کال کرنی پڑی تھی۔ میٹنگ میں وزیراعظم کی پارٹی کے چند افراد کے علاوہ فوج اور انٹیلی جینس کے سربراہان شریک تھے۔

وزیراعظم کی بریفنگ کے بعد وہ اب اس حوالے سے اپنی حکمتِ عملی طے کررہے تھے۔

''اب تک ہم نے اپنے آپ کو اقتصادی طاقت کے طور پر ہی منوایا ہے۔ جیسا کے ہم نے طے کیا تھا کہ ہم تیاری کے بعد عسکری طور پر بھی کھل کر سرمایہ دار طاقتوں کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے دوست ملک کو ہماری ضرورت ہے۔ آپ کیا رائے دیتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا کیا کردار ہونا چاہیے؟'' وزیراعظم نے اپنا موقف بتا کے دیگر افراد سے رائے لی۔

''ہمیں ہر طرح سے ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ جیسا کہ آپ نے بریفنگ میں بتایا کہ ہمارے دوست ملک میں یہ جماعت جو تبدیلی لانا چاہ رہی ہے، اس میں ان کی آرمی ان کے ساتھ ہے۔ میرے خیال میں ہمیں ان کے ساتھ مل کے کام کرنا چاہیے۔ انہیں جتنے ہتھیار کی اور فوج کی ضرورت پڑے، ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں فراہم کریں۔'' آرمی کے سربراہ نے کھل کے اپنی رائے دی۔

''جی بالکل، ہمارے پاس یہ مناسب موقع ہے کہ خطے میں ہم اپنا کنٹرول قائم کرسکیں۔ اس حوالے سے ہماری انٹیلی جینس کو بھی ان کے ساتھ مل کے کام کرنا چاہیے۔'' انٹیلی جینس کے سربراہ کی رائے بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

''یہ تو طے ہوا کہ ہم ان کا ساتھ دیں گے مگر کیا ہمیں کھل کر سامنے آجانا چاہیے یا درپردہ ان کی مدد کرنی چاہیے؟'' وزیراعظم نے اگلا سوال کیا۔

''میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ ہم شروع میں ہی کھل کے سامنے آجائیں۔ جب ہماری مخالف قوت کو علم ہوگا کہ ہم ہر طرح سے ان کا ساتھ دیں گے تو ہوسکتا ہے

وہ ہمارے سامنے آنے کی کوشش ہی نہ کریں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم نے یہاں اپنا رسوخ انتہائی مضبوط کر لیا ہے۔ اب وہ ہمارے مقابلے پر ٹک نہیں پائیں گے۔'' آرمی کے سربراہ نے حالات کا تجزیہ پیش کیا۔

''ہماری انٹیلی جینس رپورٹ کے مطابق وہ پچھلے بیس سال سے بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اس خطے میں اس دوران میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس طرح کی تبدیلی تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگی۔ اگر ہم کھل کے سامنے آجائیں تو میرے خیال میں وہ ہمارے مقابلے پر آنے کی حماقت نہیں کریں گے۔'' انٹیلی جینس کے سربراہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''ایسا ہی ہے۔ آپ آرمی چیف سے ملاقات طے کریں۔ مل کے ضروری معاملات طے کریں۔ دنیا نے سرمایہ داروں کے بہت ظلم سہہ لیے اب دنیا پر سوشلزم کا جھنڈا لہرائے گا۔'' وزیراعظم نے پُرجوش انداز میں اپنے عزائم کا اظہار کیا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا میں کیپٹلزم اور سوشلزم کے علاوہ ایک تیسری طاقت سر ابھارنے والی ہے۔

☆☆☆

انٹیلی جینس چیف نے تمام ضروری معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ اپنی حکمتِ عملی طے کر رہے تھے۔

صدر، وزیر خارجہ اور آرمی چیف کی رائے کے مطابق ان تمام شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے ان کے پاس سنہری موقع تھا انہیں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ یہاں کامیاب ہو جاتے تو دنیا کی قیادت کا سہرا انہی کے سر بندھتا۔

گھنٹوں کی بحث و تمحیص اور صورتِ حال کا ہر طرح سے جائزہ لینے کے بعد وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے لیکن اس فیصلے کے پیچھے ایک لالچ کارفرما تھا۔ ''دنیا کی قیادت کا لالچ......''

☆☆☆

دشمن ہمسایہ ملک میں کئی میٹنگز ہو چکی تھیں مگر وہ کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی جس سے وہ دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اس طاقت سے ان کے بہت سے مفادات وابستہ تھے۔ دوسری طرف ان کے ملک کا امن تھا۔

پڑوس سے آئے وفد نے جو مستقبل کا نقشہ ان کے سامنے رکھا تھا اگر ویسا ہو جاتا تو ان کے دفاعی بجٹ میں اچھی خاصی کمی آجاتی۔ دونوں ممالک کے درمیان شروع سے ہی جو متنازعہ علاقہ تھا اس کے حل کی بھی امید تھی۔ وہ مسئلہ حل ہو جاتا تو وہ ترقی کی شاہراہ پر بہت تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔

اس ملک کے قیام کو پوری صدی گزرنے والی تھی مگر اس دشمنی کے باعث وہ کبھی اپنے ہدف پورے نہیں کر سکے تھے۔ سو سال بعد وہ خود کو جس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے اس مقام پر پہنچنا ان کے لیے ناممکن تھا تاہم اگر اس متنازعہ علاقے کا مسئلہ حل ہو جاتا اور ان کے اپنے پڑوسی ملک سے تعلقات دوستی میں بدل جاتے تو ان کا شمار جلد ہی ترقی یافتہ ممالک میں ہو سکتا تھا۔ سیاسی قیادت اس معاملے میں اپنے پڑوسی ملک کی انقلابی جماعت کی سپورٹ کے حق میں تھی مگر عسکری قیادت ان کے خلاف تھی۔ ان کی سپورٹ سے ان کے ان مفادات کو نقصان پہنچتا جو انہیں بڑی طاقت سے حاصل ہو رہے تھے۔ دفاعی بجٹ میں کمی کو بھی وہ اپنے لیے نقصان وہ سمجھ رہے تھے۔

پڑوسی ملک میں سیاسی ہلچل کا آغاز ہو گیا تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس خطے میں سرگرم عمل ہو چکی تھیں مگر وہ ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

آرمی چیف اور انٹیلی جینس کا ڈائریکٹر دراصل فیصلے پر پہنچ چکے تھے مگر یہ اور بات تھی کہ انہوں نے اپنے فیصلے کو سیاسی قیادت سے خفیہ رکھا تھا۔ وہ انہیں بائی پاس کر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ بڑی طاقت سے بھی رابطے میں تھے۔ ان کا ارادہ بڑی طاقت سے مل کے خطے میں آنے والی اس تبدیلی کو روکنا تھا۔

یہ تبدیلی بڑی طاقت کے لیے انتہائی خطرناک تھی۔ اس تبدیلی سے دنیا کا سیاسی منظرنامہ بدل کے رہ جاتا۔ ایک عرصے تک دنیا پر حکومت کرنے والی طاقت کو اس خطے میں پسپا ہونا پڑتا۔ اسے یہ پسپائی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان کا اس خطے میں مکمل رسوخ تھا لیکن انہوں نے خود ہی یہاں براہِ راست مداخلت کم کی تھی۔ اس کے باوجود اس تبدیلی کو روکنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا مگر اب صورتِ حال یکایک تبدیل ہو چکی تھی۔ دو بڑی طاقتوں کے سرگرم ہونے کی وجہ سے انہیں یہ خطہ اپنے ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں ''دشمن ملک'' سے گٹھ جوڑ کر کے ہی وہ یہاں اپنے قدم پھر سے جما سکتے تھے۔ ان دونوں ممالک کے درمیان دشمنی سے ان کے بہت سے

مفادات وابستہ تھے۔ وہ اس دشمنی کو فروغ دینے کے لیے یہاں اچھی خاص ''سرمایہ کاری'' کرتے رہے تھے۔ اب اس سرمایہ کاری سے منافع حاصل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

یوم آزادی کے موقع پر ملک کے پانچ بڑے شہروں میں ہونے والے جلسوں نے حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچادی تھی۔ انقلابی جماعت اچانک ہی منظر عام پر آئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس جماعت کا نام تک نہیں سنا تھا لیکن بیک وقت پانچ بڑے شہروں میں کامیاب جلسوں کے انعقاد نے حکومت کو باور کرادیا تھا کہ یہ کوئی عام جماعت نہیں۔ یہ پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔

حکومت کو پہلے ہی اپوزیشن کی طرف سے مسائل کا سامنا تھا اب اچانک سے ایک نئی قوت کے اٹھ کھڑے ہونے سے ان کی پریشانی میں یکا یک اضافہ ہوگیا تھا۔

میڈیا نے جلسوں کی بھرپور کوریج کی تھی۔ مجموعی طور پر پانچوں جلسوں میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی تھی۔

میڈیا والے حکومتی ارکان کو لائن پر لے کے ان کی بھی رائے لے رہے تھے۔ ان کے متضاد بیانات سامنے آرہے تھے۔ کچھ لوگ اس جماعت کی طرف سے تبدیلی کے دعوے کو سازش قرار دے رہے تھے تو کچھ لوگ اسے کسی بیرونی طاقت کا ایجنٹ قرار دے رہے تھے۔ انقلابی جماعت کے خلاف حکومتی نمائندوں نے بدتہذیبی کی انتہا کر دی تھی مگر یہ لوگ انتہائی مہذب انداز میں اپنا موقف پیش کر رہے تھے۔ یہ معاشرے کے معزز لوگ تھے۔ ان کا ماضی بے داغ تھا۔ ان کا لہجہ شائستہ تھا اور عزائم بلند۔

یہ وہی جماعت تھی جس کی بنیاد بیس سال قبل صرف تین افراد نے رکھی تھی۔ اس رات مفتی توصیف نے وسیم احمد اور وارث علی کو تبدیلی کے طریقہ کار سے آگاہ کیا تھا۔

مفتی توصیف نے مختصر الفاظ میں اپنا مدعا پیش کر دیا تھا۔ گھنٹوں کی بحث وتمحیص کے بعد وہ اس نکتے پر متفق ہو گئے تھے کہ واقعی یہ نظام اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ اس کی تبدیلی کے سوا اور کوئی حل مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ مفتی توصیف کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ یہ ایک طرح سے غیر رسمی بیعت تھی۔ اب ان تینوں کو تبدیلی کے لیے عملی کوششوں کا آغاز کرنا تھا۔ ان کے ارادے پختہ تھے اور جذبے جوان۔

☆☆☆

اب ان تینوں کا اصل کام شروع ہوگیا تھا اور وہ تھا ایک صالح نظریے پر جماعت کا قیام۔ ان تینوں نے معاشرے کے ایسے باصلاحیت نوجوان جو معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی خواہش رکھتے تھے، ڈھونڈنا شروع کیے۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ احباب میں ایسے تھے۔ مفتی توصیف کے ساتھ پڑھنے والے تو بہت سے نوجوان نظریئے کو بھی کافی حد تک سمجھتے تھے۔ وہ تینوں ایسے نوجوانوں سے ملاقاتیں کر کے انہیں نظریہ سمجھاتے جو لوگ اس بات پر قائل ہو جاتے کہ معاشرے کے مسائل کا حل نظام کی تبدیلی ہے اور یہ نظام خود تبدیل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے ایسی جماعت کی تشکیل ضروری ہے جو اس بوسیدہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے علاوہ نیا نظام چلانے کی بھی اہلیت رکھتی ہو، اپنی جماعت میں شامل کر لیتے۔ اپنی جماعت میں شامل کرنے کے بعد وہ ان کی نظریاتی تربیت شروع کرتے۔ اس تربیت میں موجودہ نظام کی خامیوں اور نئے نظام کی خصوصیات کو زیر بحث لایا جاتا۔ وہ باقاعدہ شیڈول کے تحت تربیتی کلاسز کا انعقاد کرتے۔ ان کلاسز کے موضوعات انہوں نے باقاعدہ طور پر ترتیب دیے ہوئے تھے۔

پہلے ماہ میں ہی تیس سے زائد نوجوان ان کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ پہلے ماہ کے بعد انہوں نے ان لوگوں کے لیے علیحدہ سے دودو کلاسز لینا شروع کردیں۔ ہفتے میں صرف ایک کلاس ہوا کرتی۔

جب ان نوجوانوں کا نظریہ پختہ ہو جاتا اور وہ ان کو اچھی طرح پرکھ لیتے تو وہ ان نوجوانوں کو دعوت کے کام پر لگا دیتے۔ پہلے چھ ماہ میں پورے شہر میں ان کی جماعت کے لوگ پھیل چکے تھے۔

وہ ساتھ ساتھ نئے ''لیکچررز'' بھی تیار کر رہے تھے۔ ان لیکچررز کا کام کلاسز اور سیمینارز میں لیکچرز دینا تھا۔ ان لیکچرز کی باقاعدہ انہیں تیاری کرائی جاتی تھی۔ اس تیاری کی بدولت شہر کی تمام کلاسز میں ایک جیسی بات ہی ڈسکس ہوتی۔

مفتی توصیف تنظیمی کام کے علاوہ اپنے ہی مدرسے میں پڑھا بھی رہے تھے۔ ان کا خاندان تو تھا نہیں، ان کی تنخواہ سے اپنا نظام بخوبی چل رہا تھا۔

وارث علی نے ایک چینل جوائن کرلیا تھا وہ اس کے لیے رپورٹنگ کرتا تھا۔ باقی وقت میں سے وہ سارا وقت تنظیم کو دینے کی کوشش کرتا۔

وسیم احمد مالی لحاظ سے ان دونوں سے بہتر تھے۔

وقت بھی ان کے پاس وافر تھا۔ کالج میں چند پریڈز لینے کے علاوہ باقی سارا وقت وہ تنظیمی کاموں میں ہی لگے رہتے۔

پندرہ سال کے اندر ان کی جماعت ترقی کرتے کرتے پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔

پولیس، وکیل، جج، صحافی غرض ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد ان کی جماعت میں موجود تھے۔

اس دوران میں مفتی توصیف، وارث علی اور وسیم احمد تینوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ بچوں کے بعد ان کی گھریلو ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود تینوں اپنے مشن پر قائم تھے۔

☆☆☆

انقلابی جماعت کی مرکزی قیادت نے مشاورت سے فیصلہ کیا تھا کہ عوام کے سامنے پیش ہونے سے پہلے آرمی اور علاقے کے ممالک کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ اس حوالے سے انہوں نے خطے کے چند بڑے ممالک اور آرمی چیف کے پاس اپنے وفد بھیجے تھے۔ آرمی چیف نے جماعت کا منشور، طریقہ کار اور طاقت دیکھ کے اپنے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ایک پڑوسی دوست ملک نے بھی ہر محاذ پر ان کا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اب ان کا اصل کام شروع ہوگیا تھا۔

انقلابی جماعت نے یوم آزادی کے موقع پر پورے ملک کے پانچ بڑے شہروں میں پانچ بڑے جلسوں کا انعقاد کیا تھا۔ ان جلسوں میں تنظیم کے ہر فرد نے اپنے طور پر لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کسی قسم کی پبلسٹی کے بغیر مجموعی طور پر پانچوں جلسوں میں لاکھوں لوگوں کی شرکت نے حکومت کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔

اگلے الیکشنز صرف چھ ماہ کی دوری پر تھے اور لگ رہا تھا کہ انقلابی جماعت ان الیکشنز میں ایک بڑی جماعت بن کر ابھرے گی مگر یہ سب آسان نہ تھا۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔

☆☆☆

حکومت ابتدائی بوکھلاہٹ کے بعد سنبھل گئی تھی۔ اس نے انقلابی جماعت کی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے ضروری اقدامات شروع کر دیے۔ اسے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی سپورٹ بھی حاصل تھی۔

حکومت نے سب سے پہلا کام میڈیا کو اپنے ہاتھ میں کرنے کا کیا۔ حکومت کی طرف سے ''فنڈز'' ملنے کے بعد میڈیا نے یک دم ہی انقلابی جماعت کے جلسوں کی کوریج روک دی۔ میڈیا چینلز پر انقلابی جماعت کے اراکین کو مدعو کرنے کا سلسلہ بھی یکدم رک گیا۔

انقلابی جماعت حکومت کے ان ہتھکنڈوں سے پہلے سے آگاہ تھی۔ اس نے اس حوالے سے پہلے سے تیاری کی ہوئی تھی۔ وہ پورے ملک کے ہر شخص تک براہِ راست اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ میڈیا کا سہارا لیے بغیر۔ انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق ملک بھر میں جلسے کرنا شروع کر دیے۔ حکومت نے انہیں جلسے کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو انقلابی جماعت نے آرمی کا سہارا لیا۔ حکومت نے سیکیورٹی وجوہات کی وجہ سے بعض جگہوں پر انقلابی جماعت کو جلسے کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آرمی نے حکومت کو سیکیورٹی کے لیے اپنی خدمات کی پیشکش کردی۔ اس سے پہلے آرمی نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا جس سے کسی کو لگتا کہ آرمی انقلابی جماعت کی حامی ہے۔ آرمی کے اس قدم سے حکومت، آرمی اور انقلابی جماعت کے مابین گٹھ جوڑ سے آگاہ ہوگئی۔

آرمی سے براہِ راست مقابلے کی حکومت متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔ اگلے چند دنوں میں ملک کی دو سرحدوں پر یکدم ہی صورتِ حال کشیدہ ہوگئی۔ سرحدی علاقوں میں دو پڑوسی ممالک کی افواج نے گولہ باری شروع کردی۔ آرمی کی توجہ کے ساتھ ساتھ میڈیا نے عوام کی ساری توجہ بھی انقلابی جماعت سے ہٹا کے سرحدوں کی طرف موڑ دی۔

انقلابی جماعت کے خلاف سب یکجا ہوچکے تھے......
مفادات پرستوں کا گروہ اس جماعت کو ناکامی سے دوچار کرنا چاہتا تھا مگر انقلابی جماعت نے بھی اپنے سوشل میڈیا سیل کو متحرک کر دیا۔ اس نے اپنے پرنٹ میڈیا کا سہارا بھی لیا۔ اس جنگ میں عوام ایک بار پھر سے الجھن کا شکار ہونے لگے۔ بڑی طاقت نے عوام کو ہمیشہ سے مختلف مسائل میں الجھائے رکھا تھا، وہ ایک بار پھر انہیں الجھانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔

☆☆☆

اکرام حسین بیگ اٹھائے اندھیرے میں چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ساتھ ہی تیز ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے اندھیرا معمول سے زیادہ گہرا تھا۔ اس وقت بجلی بھی نہیں ہوتی تھی سو بیشتر گھر اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ ویران گلی میں اس کے قدموں کی دھمک عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی وہ بلا رکے اعتماد سے چلتا جا رہا تھا۔

دس منٹ کے پیدل سفر کے بعد وہ ایک دیوار کے ساتھ رک گیا۔ یہ ایک چھ فٹ اونچی دیوار تھی جس کے اوپر خاردار باڑ لگی تھی۔ اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر جھانکا۔ اسے گہرے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

اطراف سے مطمئن ہوکر اس نے جیب سے ایک پنسل ٹارچ نکالی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے بیگ کھول کے ایک ٹارچ لائٹ نما شے نکالی یہ دراصل ایک لیزر بیم لائٹ تھی۔ اس کا شعلہ چند سیکنڈز میں فٹ بھر موٹی فولاد کی چادر تک کاٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیزر بیم آن کر کے اس نے دیوار کے اوپر موجود خاردار باڑ کے نیچے لگایا۔ لیزر بیم کا رخ اس نے عموداً اوپر کی طرف رکھا تھا۔ ایک لمحے میں تار کے تینوں سرے ٹوٹ کر ادھر ہی لٹکنے لگے۔ خاردار تار میں ہر دس فٹ کے فاصلے پر اینگل لگے تھے۔ اس نے اینگل کے پاس سے تار کاٹی تھی۔ آٹھ نو فٹ تار کے گرنے سے معمولی سی آواز پیدا ہوئی۔ جو ہوا کی سرسراہٹ میں دب گئی۔

اس نے بیگ کندھے پر لگا کے دیوار پر ہاتھ جمائے۔ اگلے ہی لمحے وہ چار دیواری کے اندر تھا۔ یہ ایک وسیع وعریض میدان تھا۔ اس نے اردگرد دیکھ کے اپنی مطلوبہ جگہ کا تعین کیا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اپنی مطلوبہ جگہ پر آکے بیٹھ گیا۔

بیگ اس نے کندھے سے اتار کے سامنے رکھ لیا۔ اس بار بیگ سے برآمد ہونے والی شے کھرپی نما تھی۔ یہ دراصل دھات کی بنی ایک الیکٹرک کھرپی تھی۔ جو چارج ایبل تھی۔ اس نے کھرپی کا بٹن پریس کیا تو وہ دھیمی سے... گھر گھر کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے کھرپی زمین کے ساتھ لگا کے آگے دھکیلی۔ پل بھر میں ہی چھ انچ کے قریب زمین کی ایک تہ الگ ہوگئی۔ وہ اسی طرح مٹی اکھیڑ اکھیڑ کے الگ کرنے لگا۔ پانچ منٹ کے اندر ڈیڑھ میٹر کے لگ بھگ گہرا دو بائی دو فٹ کا ایک گڑھا تیار ہو چکا تھا۔

گڑھا کھودنے کے بعد اس نے ایک بار پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ یہ ایک ایک فٹ کے دو سلنڈر نما پیس تھے۔ ایک پیس کا سرا نکیلا تھا۔ اس نے دونوں پیس ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر دیے۔ اب یہ ایک میزائل نما شے لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کے زیرِ لب بولا۔ ''زیٹالیٹ'' اس کے لبوں پر ایک انتہائی سفاک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے وہ میزائل نما شے گڑھے کی طرف بڑھائی ہی تھی کہ... یکایک وہ روشنی میں نہا گیا۔

☆☆☆

عالیہ کی آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اسے اندھیرے سے خوف آتا تھا۔ وہ ہمیشہ لائٹ آن کر کے سونے کی عادی تھی، لائٹ جاتی بھی تو یو پی ایس لائٹ آن رکھتا تھا مگر شاید یو پی ایس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے لائٹ جانے کے بعد خود کار طور پر لائٹ آن نہیں ہوئی تھی۔

عالیہ کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ اس کا شمار حسین عورتوں میں کیا جا سکتا تھا۔

اندھیرا دیکھ کے اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے ٹنٹول کے سائڈ ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا۔ سیل اس نے منہ کے پاس لا کے ایک لفظ کہا۔ ''ٹارچ''۔ سیل ''زبانی ہدایات'' پر بھی عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ٹارچ کی ہدایت سنتے ہی سیل کی ٹارچ آن ہوگئی۔

اس نے بے اختیار ہی سیل کی ٹارچ لائٹ کو اپنے بیڈ کی طرف موڑا۔ خالی بیڈ دیکھ کے اس کے دل میں ہوک اٹھی۔ اس کے شوہر کو قتل ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھا۔ جو گھر میں ہوتا بھی تو آن ڈیوٹی ہی رہتا تھا۔

وہ گھر میں بیٹھے کوئی پروگرام بنا رہے ہوتے تو اچانک اس کا بلاوا آجاتا۔ وہ معذرت خوانہ انداز میں عالیہ کی جانب دیکھتا تو عالیہ سمجھ جاتی کہ اسے جانا پڑے گا۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔ اکثر وہ اس بات پر اسد سے جھگڑا بھی کرتی۔ وہ اس کی نوکری سے سخت نالاں تھی مگر اسد کے لیے یہ صرف نوکری نہیں تھی بلکہ ایک مشن تھا۔

اسد اور اس کی شادی ایک سال تک ہی چلی تھی۔ اسد کا قتل اس کے سامنے ہوئے تھا۔ وہ بالکونی میں کھڑی اسد کا انتظار کر رہی تھی۔ اسد جوں ہی بائیک پر گھر کے سامنے رکا۔ اس کے عقب میں ایک اور بائیک آکر رکی۔ اس پر دو افراد سوار تھے۔ ایک نے تو ہیلمٹ پہن رکھا تھا جبکہ دوسرا ہیلمٹ کے بغیر تھا۔ گیٹ پر لگی لائٹس کی روشنی میں عالیہ کو اس کا چہرہ صاف نظر آیا۔

اپنے پاس ایک بائیک رکتا دیکھ کے اسد اپنے عقب میں مڑا۔ اچانک عالیہ نے اسد کی پیشانی پر خون پھیلتے دیکھا۔ اس کی نظر بے اختیار بائیک سواروں کی طرف اٹھی۔ عقب میں بیٹھا شخص پستول جیب میں رکھ رہا تھا۔ پل بھر میں ہی بائیک اس کی نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی نیچے پہنچی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔
گیٹ کھولتے ہی اس کی نظر چت لیٹے اسد پر پڑی۔ اس کی بے نور آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔ پیشانی سے نکلنے والا خون اس کے چہرے کو بھگوتا زمین پر گر رہا تھا۔ وہ اُدھر ہی ڈھے گئی۔ اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال میں پایا۔ وہ دو دن تک بے ہوش رہی تھی۔ جب بھی اسے ہوش آتا وہ چلانے لگتی۔ ڈاکٹرز اسے پھر سے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیتے۔

اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ اس کے چچا نے اسے پالا تھا۔ اس کی چچی کا سلوک اس سے کبھی اچھا نہیں رہا تھا۔ اس لیے اسد کی موت کے بعد ادھر ہی رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ وہ گھر اس کی ضرورت سے بڑا تھا، وہ اس نے کرائے پر چڑھا دیا اور ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں دو کمرے کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔

وہ اپارٹمنٹ کے ایک کمرے میں تنہا لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ خالی دیکھ کے وہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔ کافی دیر رونے کے بعد اس کے آنسو تو رک گئے مگر اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی اور ٹیرس پر آ گئی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اچانک بجلی چمکی تو اس کی نظر سامنے میدان میں ایک ہیولے پر پڑی۔ وہ چونک گئی۔ رات کے اس پہر بھلا کسی کو میدان میں کیا کام ہوسکتا تھا؟

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنے لگی۔ اچانک پھر سے بجلی چمکی وہ ہیولا بدستور اُدھر ہی موجود تھا۔ اس بار عالیہ نے اسے چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ میدان کی دیوار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

پھر بجلی چمکی تو عالیہ نے اسے دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے ایک شعلہ چمکتا دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ یہ کس قسم کا شعلہ ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ شخص دیوار کے عقب میں غائب ہو چکا تھا۔

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ ٹیرس پر شیڈ تھا مگر ہوا کی وجہ سے بارش اسے بھگونے لگی۔ وہ اندر کی جانب مڑنے ہی لگی تھی کہ لائٹ آ گئی۔ ٹیرس پر اس کے عقب میں روشنی جل رہی تھی اس روشنی کی وجہ سے اس کا لمبا سایہ نیچے دیوار پر پڑ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر نیچے پڑی تو اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ وہ شخص نیچے گلی میں کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

وہ تیزی سے پیچھے پلٹی۔ کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ کے بیٹھ گئی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک پیدا کر رہا تھا۔ اچانک اس نے باہر ایک آواز سنی۔ وہ خوفزدہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اکرام حسین گزشتہ پندرہ سال سے اس ملک میں رہ رہا تھا۔ اس کی بیوی اور ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کے اردگرد کے لوگوں سے اچھے تعلقات تھے۔ وہ سب کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ اگر اس کے متعلق کسی سے رائے لی جاتی تو سب ہی اسے اور اس کی فیملی کے متعلق یہی ریمارکس دیتے کہ یہ انتہائی شریف اور مہذب لوگ ہیں مگر یہ صرف ان کا ''کور'' تھا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں درحقیقت دشمن ملک کی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ تھے۔ اس کا اصل نام راج ملہوترا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی کا نام سونیا تھا۔

اس نے سونیا سے لومیرج کی تھی۔ ابھی ان کی شادی کو چھ ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ انہیں ایجنسی نے ایک نیا ٹاسک سونپ دیا۔ اس ایجنسی کے دیگر کافی ایجنٹس بھی اس ملک میں کام کرتے تھے۔ کچھ عارضی طور پر اور کچھ مستقل طور پر۔ مستقل طور پر رہنے والوں کو ایک ایسے ''کور'' کی ضرورت ہوتی تھی جن پر کوئی شک نہ کر سکے۔ فیملی ''کور'' ایسے مقصد کے لیے بہترین تھا۔ ان کی ایجنسی نے اسی وجہ سے دونوں کو اس ملک میں بھیجا تھا۔

انہوں نے ایک گھر کرائے پر لیا تھا۔ شناختی کاغذات کے مطابق ان دونوں کا تعلق اسی ملک سے تھا۔ ان کے پاس اسی ملک کے تعلیمی اداروں کی اسناد بھی موجود تھیں جو ظاہر ہے جعلی تھیں۔ انہوں نے اپنے پڑوسیوں کو اپنے متعلق ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی تاہم دوسرے لوگوں کو شک تھا کہ یہ دونوں گھر سے بھاگ کے آئے ہیں۔ بہرحال وہ اس طرح کے شکوک کا اظہار ایک دوسرے کے سامنے ہی کرتے تھے، کسی نے ان کے سامنے اس شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔

انہیں اس شہر میں آئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ جو اب پندرہ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ گزشتہ پندرہ سال سے اسی شہر میں رہ رہے تھے۔ انہوں نے اس دوران میں صرف دو گھر بدلے تھے۔ وہ زیادہ تر دوسرے ایجنٹس کو پناہ اور ضروری معلومات دینے کا کام ہی کرتے تھے تاہم بعض اوقات انہیں کوئی کام بھی سونپ دیا جاتا تھا۔ گزشتہ رات بھی ایک ایجنٹ ان کے گھر رکا تھا۔ اس

نے اکرام کو ایک بہت خاص مشن سونپا تھا۔ اس مشن میں استعمال ہونے والے ضروری آلات اور ہتھیار بھی اسے مہیا کردیے گئے تھے۔

رات کے بارہ بجتے ہی اس نے اپنی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک مکمل سیاہ لبادے کا انتخاب کیا تھا۔ سیاہ لبادہ اسے اندھیرے کا حصہ بنا دیتا۔ اس نے اپنا سامان لیا اور باہر نکل آیا۔ سونیا نے اسے دروازے پر ہی الوداع کیا تھا۔ یہ ایک آسان سا مشن تھا جس میں خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے باوجود سونیا فکرمند تھی۔ اکرام نے اسے تسلی دی تاہم اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں فکر کی پرچھائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

سونیا ہمیشہ ہی اسے اکیلے کسی مشن پر جاتے ہوئے فکرمندی کا اظہار... کرتی تھی۔ اس کے غیر معمولی رویے کی وجہ سے اکرام کے لاشعور میں بھی خوف موجود ہوتا تھا لہٰذا جیسے ہی بجلی چمکی تو وہ اپنی جگہ پر ایک لحظہ کے لیے اچھل کر رہ گیا۔ پل بھر میں ہی اندھیرا واپس چھایا تو اسے احساس ہوا کہ بجلی چمکی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے وہ میزائل نما شے زمین میں دبائی۔ اطراف میں پھیلی مٹی سے گڑھا واپس بھرا اور واپسی کے لیے چل پڑا۔

دیوار پر چڑھ کے اس نے تار کے دونوں سرے... جوڑ کے ویلڈنگ ٹارچ سے ٹانکا لگا دیا۔ تار کے تین سرے تھے۔ دیوار پر بیٹھ کے اس نے سکون سے تینوں سرے جوڑے۔ اب کوئی بھی دیکھ کے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تار کاٹی گئی ہے۔

وہ نیچے اتر کے اطمینان سے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ میدان کی دوسری طرف موجود گلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک لائٹ آگئی۔ اطراف میں بنے تمام گھروں کی بتیاں یکدم ہی جل اٹھی تھیں۔ اچانک اس کی نظر دیوار پر موجود سائے پر پڑی۔ اس نے سائے کے تعاقب میں نظر اٹھائی تو اچھل پڑا۔ ایک بلڈنگ کے دوسرے فلور کے ٹیرس پر ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پیچھے کمرے میں غائب ہوگئی۔

اس نے عمارت کا بغور جائزہ لیا۔ یہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ گیٹ بند تھا تاہم گیٹ پر چوکیدار کی موجودگی یقینی تھی۔ اس نے کچھ سوچا پھر یکایک ہی وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

جب وہ میدان میں تھا، اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا اس لیے اس کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میدان میں کارروائی کرتے ہوئے اسے کسی نے دیکھا ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ اطمینان سے گھر کی جانب روانہ ہوگیا جہاں سونیا اُس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

عالیہ کو خوفزدہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھتے کافی دیر گزر گئی۔ اس ایک آواز کے بعد پھر کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ شخص میدان میں رات کے اس پہر کیا کر رہا تھا؟ یہ خیال اسے کافی دیر تک تنگ کرتا رہا مگر آخرکار اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح اس کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ باہر کافی شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو میدان میں چہل پہل تھی۔ اس وقت میدان عام طور پر خالی ہی ہوتا تھا۔ شام کو بچے یہاں کھیلتے تھے۔

عالیہ نیوز چینلز کم ہی دیکھتی تھی اس لیے اس کی سیاسی حالات پر کوئی نظر نہیں تھی۔ نہ ہی اسے علم تھا کہ آج اس میدان میں ایک بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد پھر ٹیرس پر آگئی۔ میدان کے ایک طرف اسٹیج تیار کیا جا رہا تھا۔ اچانک ہی اسے رات والے واقعے کا خیال آیا۔ جہاں اسٹیج تیار کیا جا رہا تھا۔ اسی جگہ اس نے رات کو اس شخص کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ بے چین ہوگئی۔ کیا وہ شخص کوئی تخریب کاری کی کارروائی کرنے رات کو ادھر آیا تھا؟ یہ خیال اسے پریشان کرنے لگا۔

شاید اس شخص نے رات کو اس جگہ کوئی بم دبایا ہو جو جلسے کے دوران میں پھٹ جاتا۔ اس وقت جلسے میں بے شمار لوگ ہوتے۔ دھماکے سے سیکڑوں اموات ہوسکتی ہیں۔ وہ ذہن میں کڑیوں سے کڑیاں ملانے لگی۔

بہرحال جو بھی ہو، میں اس حوالے سے کیا کرسکتی ہوں؟ اس نے سر جھٹکا اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

احسن بیگ جلسے کی سیکیورٹی ٹیم کا انچارج تھا۔ وہ دراصل انقلابی جماعت کا رکن بھی تھا اس لیے سیکیورٹی کا اس نے خاص انتظام کیا تھا۔ اس کے ساتھ سیکیورٹی پر مامور دوسرے افراد کے علاوہ چند انقلابی جماعت کے رکن بھی تھے۔

میدان کے تین اطراف گیٹ لگے تھے۔ وہ صبح ہی اپنی ٹیم کے ساتھ میدان میں پہنچ چکا تھا۔ وہ سیکیورٹی کے لیے درکار مختلف آلات ساتھ لے کے آئے تھے۔

سب سے پہلے اس نے مختلف قسم کے اسکینگ

آلات کی مدد سے میدان کو کھنگالا۔ یہ آلات دس فٹ گہرائی تک بھی کسی بھی قسم کی دھات یا بارود کی موجودگی کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ یہ کام اس کی ٹیم کے افراد کر رہے تھے، وہ ان کے ساتھ موجود اپنی نگرانی میں یہ کام کرا رہا تھا۔

میدان کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ باہر آ کے اس نے اپنی نگرانی میں تینوں گیٹس پر اسکینگ مشینیں نصب کرائیں۔

یہ بڑی خاص مشینیں تھیں۔ جو ہر طرح کی چیز کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ گیٹ سے جو بھی گزرتا، اس شخص کی جیبوں میں موجود تمام اشیا کی لسٹ اس کی تصویر کے ساتھ سسٹم میں محفوظ ہو جاتی۔ مشینیوں کے سسٹم میں خطرناک اور ممنوعہ اشیا کی لسٹ بھی محفوظ تھی۔ وہ نہ صرف لوگوں کے پاس موجود اشیا کی لسٹ محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں بلکہ وہ ان اشیا کا موازنہ اپنے سسٹم میں موجود خطرناک اشیا سے کرتیں۔

لسٹ بی کی خطرناک شے کسی کے جسم میں موجود ہوتی تو مشین پر ایک خاص قسم کی بیپ بجتی، اس کے ساتھ ہی گیٹ خودکار طور پر بند ہو جاتا۔ سیکیورٹی پر مامور فرد اس شخص سے وہ چیز لے لیتا اور مناسب سمجھتا تو اس شخص کو اندر جانے دیتا یا پھر باہر ہی روک لیتا۔

لسٹ اے کی خطرناک اشیا میں ہر طرح کے آتشیں ہتھیار شامل تھے۔ ایسے ہتھیار کی موجودگی ظاہر ہوتے ہی مشین کے اوپر والے سرے سے ایک گیس اسپرے ہو کے اس شخص کو بے ہوش کر دیتی۔ سیکیورٹی پر مامور افراد ایسے شخص کو فوراً اپنی کسٹڈی میں لے لیتے۔

سیکیورٹی پر مامور افراد کو جو چیزیں پاس رکھنے کی اجازت تھی، ان اشیا اور افراد کی لسٹ بھی مشینیوں کے سسٹم میں محفوظ تھی اس لیے ان کے اندر جاتے ہوئے مشینیں خاموش رہتی تھیں تاہم ان اشیا کے علاوہ کسی کے پاس کوئی خطرناک شے ہوتی تو مشینیں اسی طرح اپنا کام کرتی تھیں جس طرح دیگر افراد کے اندر داخل ہوتے ہوئے کرتی تھیں۔

سیکیورٹی کا یہ نظام گزشتہ پانچ سال سے ملک میں رائج تھا اور انتہائی سیکیورٹی والے علاقے میں اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔

جلسے میں لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ احسن بیگ سیکیورٹی سسٹم کی کڑی نگرانی کر رہا تھا۔ میدان میں پچاس ہزار کے لگ بھگ لوگوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔

کچھ ہی دیر میں میدان لوگوں سے بھر گیا لیکن لوگ تھے کہ امڈے پڑ رہے تھے۔ احسن بیگ کو لگ رہا تھا کہ جلد ہی اسے گیٹ بند کرنا پڑے گا۔

اسٹیج کے سامنے کرسیوں کی ایک قطار لگی تھی۔ اس کے علاوہ تمام لوگ کھڑے ہوتے۔ اسٹیج کے چاروں اطراف اور چھت پر بلٹ پروف شفاف شیشہ لگا تھا۔ شیشہ اتنا شفاف تھا کہ اس کی موجودگی محسوس کرنا بھی انتہائی مشکل تھا۔ شیشے کے داخلی دروازے پر ''Enter'' کے الفاظ کندہ تھے۔ ان الفاظ کی وجہ سے ہی شیشے کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس انتظام کی وجہ سے کسی اسنائپر گن کے ساتھ اسٹیج پر موجود کسی بھی شخص کو نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔

مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے جماعت کے قائدین بھی پہنچ گئے۔ ان میں مفتی توصیف کے علاوہ کچھ صوبائی، ریجنل اور زونل صدور بھی تھے جنہیں جلسے میں تقاریر کرنی تھیں۔

احسن بیگ انہیں اپنی نگرانی میں لے کے اسٹیج تک گیا۔ مقررہ وقت پر جلسے کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ میدان میں سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ احسن بیگ اسٹیج کے ایک سرے پر کھڑا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں نے ایک منظر کو فوکس کیا۔ وہ حیرانی سے اس منظر کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اکرام حسین کا ایک پڑوسی انقلابی جماعت کا رکن تھا اس نے دیگر بہت سے افراد کی طرح اسے بھی جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس نے ہامی تو بھر لی تھی مگر اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

جلسے کا وقت قریب آیا تو اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ ''زیٹالٹ'' سے ہونے والی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سونیا کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور جلسہ گاہ کی طرف چل پڑا۔ جلسے کا انتظام انتہائی منظم انداز میں کیا گیا تھا۔ جس ملک میں دس لوگ کہیں اکٹھے ہوتے تو بدنظمی پھیل جاتی تھی، اس ملک میں اتنا بڑا جلسہ اتنے منظم انداز میں دیکھ کے وہ حیران رہ گیا۔

سیکیورٹی اس کی توقع سے بھی سخت تھی۔ اسکیننگ مشینوں کا تو اسے پہلے سے علم تھا مگر سیکیورٹی پر مامور افراد کا چوکنا پن دیکھ کے اسے حیرت ہوئی۔ وردی میں موجود افراد کے علاوہ اس کے تربیت یافتہ ذہن نے سادہ لباس میں موجود کچھ لوگوں کی موجودگی کو بھی محسوس کر لیا۔

وہ جلسہ گاہ میں آکے عقبی سمت میں دیوار کے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا۔

کچھ ہی دیر میں جلسہ شروع ہوگیا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکال کر وقت دیکھا۔ جلسہ گاہ میں ”بدنظمی“ پھیلنے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

اچانک اس کی نظر اسٹیج پر موجود سیکیورٹی انچارج پر پڑی۔ وہ اس کے سامنے ہی تقریباً بھاگتا ہوا اسٹیج سے اتر کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس کا غیر معمولی انداز دیکھ کے چونک گیا۔

اسے اپنے اردگرد خطرے کی بُو محسوس ہونے لگی۔ کچھ لوگ گیٹ سے باہر بھی جارہے تھے۔ وہ غیر محسوس انداز میں گیٹ کی طرف کھسکنے لگا۔

☆☆☆

عالیہ نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف کرنے کی کوشش کی مگر بار بار اس کے ذہن میں جلسے اور اس شخص کا خیال آرہا تھا جس نے رات کو میدان میں کوئی کارروائی کی تھی۔ وہ اپنا سر جھٹک کے پھر سے کام میں مصروف ہوجاتی مگر یہ خیال تھا کہ اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

تمہارے شوہر نے اس ملک کے لیے اپنی جان دے دی اور تم اتنی خودغرض ہو کہ ایک ایسی اطلاع جو ہوسکتا ہے سیکڑوں لوگوں کی جان بچاسکے، دیتے ہوئے ڈر رہی ہو، اس کے ضمیر نے اسے جھنجوڑا۔

کیا پتا یہ کوئی خاص اطلاع ہو ہی نہ؟ ویسے بھی میں کسی کو کیا بتاؤں کہ رات کو ایک شخص میدان کی دیوار پھلانگ کے اندر آیا تھا؟ اس سے کوئی کیا نتیجہ اخذ کرسکتا ہے؟ اس کے اندر سے ایک اور آواز ابھری۔

نتیجہ اخذ کرنا ان کی ذمے داری ہے۔ کم سے کم تمہارا ضمیر تو مطمئن ہوجائے گا۔ اگر تم اسی طرح سستی کا مظاہرہ کرتی رہیں اور کچھ بہت برا ہوگیا تو کیا تم اپنے آپ کو معاف کرسکوگی؟

جب اپنے اندر کی آوازیں اسے پریشان کرنے لگیں تو وہ باہر آگئی۔ کھڑکی میں کھڑے ہوکے اس نے باہر جھانکا تو اسے میدان میں ہر طرف سر ہی سر نظر آئے۔

اچانک اس کی نظر گلی میں موجود احسن پر پڑی۔ وہ پولیس کی وردی میں تھا۔ احسن اس کے شوہر کا دوست تھا۔ وہ کئی بار ان کے گھر بھی آچکا تھا۔ اسد کی موت کے بعد وہ اس سے تعزیت کرنے بھی اس کے پاس آیا تھا۔ اس وقت اس نے عالیہ کو اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔ عالیہ نے وہ کارڈ کسی دراز میں ڈال دیا تھا۔ بعد میں جب اس نے گھر شفٹ کیا تو ادھر گلی میں بھی ایک بار اس کی احسن سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت عالیہ نے اسے اپنے گھر کا بھی بتایا تھا اور اسے چلنے کی دعوت بھی دی تھی مگر اس نے معذرت کرلی تھی۔

احسن کو دیکھتے ہی یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں دوڑے۔ وہ شاید گلی کا معائنہ کرنے کے لیے اُدھر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عالیہ اسے آواز دینے لگی مگر اسے احساس ہوا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وہ اسے دیکھنے لگی کہ شاید وہ اس کی طرف مڑے اور وہ اسے اپنی جانب متوجہ کرے مگر وہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گلی کے سرے پر غائب ہوگیا۔

عالیہ مایوس ہوگئی۔ اب اسے نیچے جا کے احسن کو رات والے واقعے کے متعلق بتانا تھا مگر وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی کہ سب کے سامنے جا کے احسن کو یہ سب بتاتی۔ اچانک اسے احسن کے وزیٹنگ کارڈ کا خیال آیا تو اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی چمکی۔ وہ اسے فون کر کے بھی ساری صورتِ حال بتاسکتی تھی۔

وہ بھاگتی ہوئی اندر پہنچی مگر تمام درازیں کھنگالنے کے بعد بھی اسے کارڈ نہیں ملا۔ وہ مایوس ہو کے اس امید کے ساتھ واپس کھڑکی میں آگئی کہ شاید احسن اسے پھر سے نظر آجائے اور وہ کسی طرح اسے اپنی جانب متوجہ کرسکے۔

وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی مگر اسے احسن نظر نہیں آیا۔ جلسہ شروع ہوگیا تھا۔ تلاوت ہورہی تھی۔ اچانک اس کی نظر اسٹیج پر موجود ایک کونے میں کھڑے ایک وردی پوش پر پڑی۔ اسے لگا کہ وہ احسن ہی ہے۔ وہ لگ بھگ اس سے سو فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اتنی دور سے اسے پہچاننا مشکل تھا۔

وہ اندر جا کے دوربین لے آئی۔ دوربین سے اس نے اسٹیج کو پر موجود اس شخص کے چہرے کو فوکس کیا۔ اس کا سائڈ پوز عالیہ کو نظر آرہا تھا تاہم وہ اسے پہچان گئی۔ وہ احسن ہی تھا۔ اس کی ساری توجہ سامنے موجود لوگوں کی طرف تھی۔

اب اسے متوجہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ اسے متوجہ کرنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ وہ اندر سے اپنا ایک سرخ رنگ کا دوپٹا لے آئی۔ وہ ٹیرس پر آکے پوری شدومد سے دوپٹا لہرانے

لگی۔

احسن تمام اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک عالیہ کو محسوس ہوا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے دوربین آنکھوں کے ساتھ لگائی تو وہ واقعی اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عالیہ کو صاف طور پر حیرانی کے ساتھ سنسنی محسوس ہوئی۔ عالیہ دوپٹا چھینک کے گیٹ کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

احسن نے شاید اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ عالیہ نے اسے اسٹیج سے اتر کے گیٹ کی طرف بڑھتا دیکھا۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی بلڈنگ سے باہر آگئی۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

وہ گیٹ پر پہنچی تو.... احسن کو اس نے گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ عالیہ کو دیکھتے ہی سیدھا اس کی طرف لپکا۔

گیٹ سے اِکّادُکّا اور افراد بھی باہر نکل رہے تھے۔ اچانک عالیہ کی نظر احسن کے عقب میں موجود ایک شخص پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کے چونکی۔ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے رات کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

احسن کی نظر کچھ دور موجود ایک بلڈنگ کے ٹیرس پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ ٹیرس پر ایک عورت کھڑی سرخ دوپٹا لہرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرانی ابھری۔ کیا وہ عورت ٹیرس پر دوپٹا پھیلا رہی تھی یا اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

اگلے ہی لمحے وہ عورت دوپٹا چھینک کے ہاتھوں سے اشارے کرنے لگی۔ یکا یک اس کو یاد آیا کہ اسد کی بیوی عالیہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ اسے لگا کہ یہ عورت عالیہ ہی ہے۔

وہ عالیہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج کی عورت تھی۔ اس سے کسی قسم کے مذاق کی توقع وہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اگر سرخ دوپٹا لہرا رہی تھی تو یقیناً کوئی خطرے کی بات تھی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے اسٹیج سے اتر کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

میدان میں اسٹیج سے تینوں گیٹس تک کا راستہ کھلا چھوڑا گیا تھا۔ اس راستے کے گرد رسیاں لگا کے حد بندی کی گئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی نظر عالیہ پر پڑی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس کے عقب میں دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ وہ پیچھے مڑ کے دیکھنے ہی لگا تھا کہ وہ دھیمی آواز میں جلدی سے بولی۔ ''پیچھے مت دیکھنا۔''

وہ ٹھٹھک کے رک گیا۔ وہ اس کے قریب ہو کے بولی۔ ''آپ کی دائیں طرف سفید شرٹ اور بلیک پینٹ میں ایک بندہ جا رہا ہے۔ اسے جانے نہ دینا۔''

وہ اس کی بات سن کے تیزی سے دائیں طرف مڑا۔ سفید شرٹ اور بلیک پینٹ والا شخص اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ احسن کو اس کی پشت نظر آئی۔ ابھی تفصیل پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک گن نکالی۔

اس شخص کی طرف مڑ کے اس نے تیزی سے فائر کیا۔ اگلے ہی پل وہ شخص نیچے گر چکا تھا۔ یہ ایک ڈارٹ گن تھی جو سو فٹ کے فاصلے تک اپنا اثر رکھتی تھی۔ اس سے جو ڈارٹ نکلتا وہ ایک سیکنڈ میں کسی بھی شخص کو بے ہوش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس شخص کے گرتے ہی وہ اس کی طرف لپکا۔ اس کے دو ساتھی بھی اتنی دیر میں اس تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اسے گاڑی میں منتقل کیا۔ احسن نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ فوراً اس شخص کی جامہ تلاشی لیں اور اسے کڑی نگرانی میں رکھیں۔

انہیں ہدایات دے کے وہ واپس عالیہ کی طرف آیا جو ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

عالیہ اسے دیکھتے ہی تیزی سے بولی۔ ''یہ شخص رات کو ایک بجے کے قریب میدان کی دیوار پھلانگ کر آیا تھا اور جس جگہ اسٹیج ہے وہاں بیٹھ کے یہ کچھ کر رہا تھا۔ رات کو میں ٹیرس پر کھڑی تھی اور بجلی چمک رہی تھی، میں اس روشنی میں اتنا ہی دیکھ سکی۔''

احسن کے چہرے پر اس کی اطلاع سن کے ہیجان نظر آنے لگا۔ ''اندھیرے میں اتنی دور سے آپ نے اسے کیسے پہچانا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''یہ دیوار پھلانگ کے میرے گھر کے سامنے سے ہی گزرا تھا۔ میں نے گیٹ پر لگی لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ آپ پلیز یہ سوال جواب بعد میں کر لیتا۔ اس سے پہلے کہ کوئی تباہی پھیلے آپ کوئی احتیاطی تدبیر کر لیں۔'' وہ ہیجان زدہ آواز میں بولی۔

''او کے، آپ گھر پہنچیں میں آپ سے بعد میں ملتا ہوں۔'' وہ تیزی سے کہہ کے پلٹا۔

لمحوں میں ہی اس نے اپنا لائحہ عمل طے کرلیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گاڑی میں پہنچا۔ یہ ایک ہائی روف تھی جس کے شیشے ٹینڈ تھے۔ وہ شخص بدستور بے ہوش پڑا تھا۔

اس کے ایک ساتھی نے اس کی جیبوں سے نکلنے والا سامان اسے دکھانا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔ ''اس کے سامان سے تمہیں جو معلومات ملی ہیں وہ تم زبانی بتا دو مگر ایک منٹ ٹھہرو......'' وہ یہ کہہ کے ایک بیگ کھولنے لگ گیا۔ بیگ سے اس نے ایک انجکشن نکال کے سرنج میں بھرا۔ سرنج بھرتے ہی اس نے اس شخص کو انجکشن لگا دیا۔ اس کی حرکات میں بجلی کی سی پھرتی تھی۔

انجکشن لگانے کے بعد اس نے ایک بوتل اٹھا کے اس شخص کے چہرے پر کوئی دوا اسپرے کی تو وہ چند سیکنڈز میں ہوش میں آ گیا۔ انجکشن کا اثر ہونے میں دو منٹ لگتے۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں اب بتاؤ۔'' وہ مختصراً بولا۔

''اس شخص کا نام اکرام حسین ہے۔ یہ ادھر پیچھے ہی ایک محلے کا رہائشی ہے۔ اس کی جیب سے شناختی کارڈ کے علاوہ ایک سیل فون اور پرس ملا ہے۔ جس میں ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ کے علاوہ پانچ ہزار کے قریب کرنسی ہے۔'' وہ نپے تلے انداز میں بولا۔

اپنے ساتھی سے دی گئی معلومات سن کے اس کے چہرے پر الجھن بھرے تاثرات ابھرے۔ ہوسکتا ہے عالیہ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ ویسے بھی اس نے اسکیننگ آلات سے پورے میدان کو اچھی طرح کھنگالا تھا۔ اگر میدان میں کوئی بم وغیرہ چھپایا گیا ہوتا تو وہ لازماً پکڑا جاتا۔

اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ عالیہ کو واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہو، اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی۔

دو منٹ گزر چکے تھے۔ وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ انجکشن کسی بھی شخص کے دماغ کو اپنی طرف سے سوچنے کے قابل نہیں رہنے دیتا تھا۔ انجکشن کے اثر کے باعث اس شخص سے جو کچھ پوچھا جاتا، وہ خودکار انداز میں بتانے لگتا۔ یہ دوا صرف خفیہ ایجنسی اور آرمی کے پاس تھی اور خاص خاص مواقع پر ہی استعمال کی جاتی تھی۔ احسن کو یہ دوا ایسی ہی کسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے مہیا کی گئی تھی۔ اس دوا کے استعمال کا طریقہ کار اور خصوصیات بھی اسے بتائی گئی تھیں۔

''کل رات کو تم نے میدان میں کیا کیا تھا؟'' احسن نے تیزی سے اس سے سوال کیا۔

''میں نے اُدھر ایک گڑھا کھود کے ایک میزائل دبایا تھا جس میں ''زیٹالٹ'' بھری تھی۔ وہ شخص خمار آلود انداز میں بولا۔

''زیٹالٹ...... یہ کیا ہوتا ہے؟'' احسن نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔

''یہ ایک گیس ہے۔''

''اس کا کیا کام ہے؟''

''یہ پھیپھڑوں کی آکسیجن جذب کرنے کی صلاحیت ختم کر دیتی ہے۔'' وہ شخص دوا کے اثر کی وجہ سے نپا تلا جواب ہی دے رہا تھا۔

''اس میزائل میں کتنی گیس ہے؟'' احسن دوا کے اثر کو جانتا تھا اس لیے کوشش کر رہا تھا کہ ایسے سوال پوچھے جس سے جلد از جلد مطلوبہ معلومات مل جائیں۔

''اتنی کے سو مربع میٹر کے قریب ہر زندہ جسم لمحوں میں مردہ ہو جائے۔'' وہ شخص اسی انداز میں بولا تو احسن اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کے چہروں پر بھی ہیجان نظر آنے لگا تھا۔

''یہ گیس کب نکلے گی؟'' اس بار وہ لرزتی آواز میں بولا۔

''ایک بجے۔''

احسن نے فوراً موبائل پر وقت دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنسنی نمودار ہوئی۔ بارہ بج کے اکیاون منٹ ہو چکے تھے گویا اس کے پاس صرف نو منٹ تھے۔ جن میں سے پانچ منٹ کے قریب تو اسے اسٹیج پر پہنچنے میں ہی لگ جاتے۔ اسٹیج خالی کرتے تو جانے اسے کتنا وقت لگ جاتا۔

''یہ میزائل کہاں دبایا تھا تم نے؟'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''اسٹیج کے نیچے۔''

''اسے ڈی فیوز کرنے کا طریقہ۔''

''میزائل کے نیچے ٹائمر لگا ہے۔ اس پر لگا بٹن پریس کرنے سے وہ آف ہو جائے گا۔''

''تم اِدھر رکو۔ اور تم میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے تیزی سے اپنے ساتھیوں سے کہا اور تیر کی طرح باہر کی طرف لپکا۔ اس کا ایک ساتھی بھی اس کے پیچھے لپکا۔

ان دونوں کو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ بھاگتا دیکھ کے ہر شخص ہراساں نظر آنے لگا۔ کچھ لوگ جلسہ گاہ سے باہر کی طرف لپکے۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی لوگ بھی باہر کی طرف

بھاگنے لگے۔ گیٹ سے ایک وقت میں بمشکل آٹھ دس آدمی ہی گزر سکتے تھے۔ سب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے باہر کی طرف نکلنے لگے۔

احسن اسٹیج تک پہنچا تو پورے میدان میں موجود لوگوں کو کسی خطرے کا پتا چل چکا تھا۔ باقی دونوں گیٹس کی طرف بھی لوگ بھاگنے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ میدان میں پچاس ہزار کے لگ بھگ لوگ موجود تھے۔ گیس سے کوئی ہلاک ہوتا نہ ہوتا، کچلے جانے سے بہت سے لوگوں کی موت یقینی تھی۔

احسن نے اسٹیج کے قریب پہنچ کے وقت دیکھا۔ بارہ بج کر ستاون منٹ ہو چکے تھے، گویا اس کے پاس صرف تین منٹ بچے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ گاڑی میں گیس ماسک موجود تھے مگر اسے جلدی میں نکلتے ہوئے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے بھاگتے دیکھ کے اسٹیج پر موجود لوگوں میں بھی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اس نے اسٹیج پر پہنچتے ہی مائک آف کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی اطلاع لوگوں کو خوفزدہ نہ کر سکے۔ لوگ خوفزدہ ہوتے تو ان میں بھگدڑ مچ جاتی جس سے بہت سے جانی نقصان کا اندیشہ تھا۔ وہ یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ لوگ تو اسے بھاگتے دیکھ کے ہی خوفزدہ ہو چکے ہیں اور ان میں بھگدڑ مچ چکی ہے۔

مائک آف کرتے ہی وہ سب لوگوں سے بولا۔ اسٹیج پر دو منٹ کے اندر ایک گیس بم پھٹنے والا ہے۔ آپ لوگ فوراً باہر نکلیں۔ اسٹیج پر کل چھ افراد موجود تھے۔ یہ سب جماعت کے قائدین میں سے تھے۔ انہوں نے تحمل سے یہ اطلاع سنی اور نپے تلے قدموں سے باہر نکلنے لگے۔

وہ انہیں باہر نکلتا دیکھ کے ڈائس پر آیا۔ باہر لوگوں کو بھاگتے دیکھ کے اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ اس نے مائک کے قریب منہ کیا اور بولا۔

”آپ لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ صرف اسٹیج کے اندر تھا۔ پلیز آپ لوگ اپنے آپ پر قابو رکھیں۔“

اسٹیج کے اطراف اور چھت پر بلٹ پروف شیشہ لگا تھا جس سے کسی بھی گیس کا نکلنا ناممکن تھا۔ دروازہ بھی ایئر ٹائٹ تھا۔ شیشہ اتنا بھاری تھا کہ اس کے نیچے سے بھی گیس کا نکلنا مشکل تھا۔ احسن کے ذہن میں یہ سب تھا اس لیے وہ لوگوں کو رکنے کی تلقین کر رہا تھا مگر لگتا تھا لوگوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ان میں اسی طرح بھگدڑ نظر آ رہی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے مائک آن ہی نہیں کیا۔

اس نے مائک آن کر کے پھر اعلان کیا۔ اس کے اعلان سے لوگوں میں بے چینی تھوڑی سی کم ہوئی۔ وہ چیخ چیخ کے اپنا اعلان دہرانے لگا۔ معاً اسے وقت دیکھنے کا خیال آیا۔ اس نے وقت دیکھا تو بارہ بج کر انسٹھ منٹ ہو چکے تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی اس نے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس کے بالکل پاس اسٹیج کے تختے پھٹے۔ ان میں سے ایک میزائل برآمد ہوتے ہی پھٹ گیا۔ دھویں کا ایک مرغولا اٹھا جو لمحوں میں ہی پورے شیشے کے کیبن میں پھیل گیا۔

شیشے کے اندر دھواں پھیلتے دیکھ کے لوگوں میں چیخ و پکار مچ گئی۔ شیشے کے اندر صرف دھواں ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ احسن کو باہر نکلتا دیکھنا چاہتے تھے مگر کافی دیر گزر گئی مگر نہ دھواں چھٹا اور نہ احسن باہر آیا۔ لوگوں کو بچاتے بچاتے احسن زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

☆☆☆

میڈیا کو انتہائی سنسنی خیز خبر مل گئی تھی۔ جلسے کی کوریج کوئی بھی چینل نہیں کر رہا تھا مگر لوگوں میں بھگدڑ مچنے کی خبر جوں ہی پھیلی، میڈیا والے اپنی گاڑیاں لے کے جائے وقوعہ پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ بھگدڑ میں بہت سے لوگ مر چکے تھے اور بے شمار زخمی ہوئے تھے۔

وہ لوگوں کے بھاگنے کے مناظر لائیو دکھانے لگے۔

ابھی بھی بہت سے لوگ میدان کے اندر موجود تھے۔ جو باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دھواں پھیلنے کے بعد پھر سے بھگدڑ مچی تھی جو احسن کے اعلان کے ساتھ کسی حد تک کم ہوئی تھی۔

کچھ میڈیا والے زخمیوں کے بیانات لے رہے تھے اور ساتھ ہی مرنے والوں کی تعداد کے متعلق اندازے لگا رہے تھے۔ کچھ چینلز پر مرنے والوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ بتائی جا رہی تھی تو کچھ کا اندازہ سو کے لگ بھگ تھا۔ غرض جتنے چینل، اتنے اندازے تھے۔

میڈیا پر عینی شاہدین کے بیانات چلنے لگے۔ انہیں جب عینی شاہدین سے معلوم ہوا کہ اندر میدان میں اسٹیج پر ایک شیشے کا کیبن لگا ہے۔ جس میں گیس کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ مزید براں جب انہیں پتا چلا کہ جب دھواں پھیلا تو ایک پولیس آفیسر بھی شیشے کے کیبن کے اندر موجود تھا تو واقعے کی سنسنی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

کچھ چینلز والے میدان کے اندر کیمرے سنبھال کے پہنچ گئے۔

شیشے میں پھیلا دھواں سب کو ہی خوفزدہ کرر ہا تھا اب تمام چینلز پر شیشے کا کیبن دکھایا جا رہا تھا۔ شیشہ تو شفاف ہونے کی وجہ سے نظر ہی نہیں آ رہا تھا بس اس کے اندر پھیلا دھواں ہی نظر آ رہا تھا۔ میڈیا والے سنسنی خیز انداز میں عوام کو دھوئیں کے متعلق بتانے لگے۔

شیشے کے گرد پولیس کی بھاری نفری بھی نظر آنے لگی تھی، مگر وہ بھی شیشے کے اردگرد کافی دور سے گھوم کے دیکھنے کے علاوہ کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ اگر وہ شیشے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے تو گیس پھیل جاتی۔ جس سے بہت سے لوگوں کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ پولیس والے گیس اور اس کے اثرات کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے تاہم انہیں اتنا اندازہ تھا کہ گیس نقصان دہ ہے اور دروازے کا کھولنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

بھیڑ کم ہونے کے بعد سیکیورٹی پر مامور افراد جماعت کے قائدین کو اپنے ہمراہ نکال کے لے گئے تھے تاہم وہ اپنا ایک نمائندہ ادھر ہی چھوڑ گئے تھے۔ وہ میدان کے اندر ہی موجود تھا میڈیا والوں کے پہنچنے کے بعد اس نے میڈیا والوں سے رابطہ کیا۔ اب اس کا لائیو انٹرویو تمام چینلز پر دکھایا جا رہا تھا۔

''احسن صاحب سیکیورٹی ٹیم کے انچارج تھے، وہ اسٹیج پر کھڑے تھے کہ اچانک ہی اسٹیج سے اتر کے تیزی سے باہر کی جانب لپکے۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی تو وہ بھاگتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور پولیس آفیسر بھی تھا۔ لوگ انہیں بھاگتے دیکھ کے خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ احسن صاحب نے اسٹیج پر آتے ہی سب کو مخاطب کیا اور کہا کہ دو منٹ میں اِدھر ایک گیس کا بم پھٹنے والا ہے۔ آپ لوگ جلد از جلد باہر نکلیں۔ اسٹیج پر موجود تمام افراد کے باہر نکلنے کے بعد وہ مائک پر لوگوں کو ور کنے کی تلقین کرنے لگے۔ وہ لوگوں کو بتا رہے تھے کہ خطرہ صرف اسٹیج کے اندر ہے۔ ابھی وہ یہ اعلان کر ہی رہے تھے کہ ہم سب نے شیشے کے اندر دھواں پھیلتے دیکھا۔ ہم لوگ کافی دیر تک دیکھتے رہے مگر احسن صاحب باہر نہیں نکلے۔'' وہ شخص ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔

''آپ نے بتایا کہ احسن صاحب کے ساتھ ایک اور پولیس آفیسر بھی تھا۔ وہ کہاں گیا؟'' ایک میڈیا والے نے سوال کیا۔

''وہ اسٹیج سے باہر ہی رک گیا تھا۔ لیکن شیشے کے اندر

دھواں پھیلنے کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔‘‘

’’اس طرح کا واقعہ اس سے پہلے کبھی رونما نہیں ہوا۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ یہ کس کی کارروائی ہو سکتی ہے؟‘‘ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

’’یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ یہ کس کی کاروائی ہے مگر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس کارروائی کا مقصد جماعت کے قائدین کی ہلاکت تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے دشمنوں کو اپنے ناپاک عزائم میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جماعت کے قائدین کو بچانے کا سارا سہرا احسن صاحب کے سر جاتا ہے۔ ہم شیشے کے اندر کے حالات نہیں جانتے مگر اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ وہ احسن صاحب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔‘‘ جماعت کا نمائندہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

’’آمین۔ آپ کے خیال میں احسن صاحب کو گیس بم کے پھٹنے کا قبل از وقت کیسے پتا چلا؟‘‘

’’میں اس بارے میں کوئی بھی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ وہ انتہائی ذمے دار اور قابل پولیس آفیسر ہیں۔ انہیں کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے ہی اطلاع ملی ہوگی۔‘‘

میڈیا والوں نے کچھ مزید سوالات کر کے انٹرویو کا اختتام کر دیا اب مختلف چینلز پر تجزیہ نگار واقعے سے متعلق اپنی رائے دے رہے تھے۔

ساتھ ہی بار بار شیشے کے کیبن میں پھیلا دھواں مسلسل دکھایا جا رہا تھا جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے تمام لوگوں کو خوفزدہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

احسن کا ساتھی فرید اس کے اندر جانے کے بعد باہر ہی رک گیا تھا۔ انہیں بھاگتے دیکھ کے کچھ اور سیکیورٹی پر مامور افراد بھی ان کے پاس آ گئے تھے۔ احسن کے اندر جاتے ہی فرید نے سیکیورٹی پر مامور چند دوسرے لوگوں کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ وہ جماعت کا رکن تھا۔ جماعت کے قائدین کے باہر آتے ہی ان لوگوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ تینوں گیٹس پر ابھی بہت زیادہ رش تھا۔ ان کا فی الحال نکلنا انتہائی مشکل تھا۔

فرید نے توصیف صاحب کو پکڑے جانے والے شخص کے متعلق بتایا۔ اسی دوران شیشے میں دھواں پھیلنا شروع ہو گیا۔

سب کے چہروں پر فکرمندی نظر آنے لگی۔ پکڑا جانے والا شخص انتہائی اہم تھا۔ اسی کے ذریعے اب انہیں پتا چل سکتا تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اگر اس شخص کے ساتھیوں کو اس کے پکڑے جانے کا علم ہوتا تو وہ ان کے لیے اس وقت اسے چھڑانے کا آسان موقع تھا۔

انہوں نے آرمی چیف کے دیے گئے نمبر پر کال کر کے فون ریسیو کرنے والے شخص کو ساری صورت حال گوش گزار کر دی۔ آرمی چیف نے انہیں ہدایت کی تھی کہ انہیں کوئی بھی پیغام دینا ہو تو اس نمبر پر دے سکتے ہیں۔

انہیں باہر نکلتے نکلتے پندرہ منٹ کے قریب لگ گئے۔ سیکیورٹی والوں نے بڑی مشکل سے ان کے لیے راستہ کلیئر کیا تھا۔ ان کے باہر پہنچتے پہنچتے آرمی والے اکرام کو لے جا چکے تھے۔

سیکیورٹی والوں نے انہیں ان کی گاڑیوں تک پہنچا کے ان کی منزل کی طرف چل پڑے۔

شام کو انہیں آرمی چیف کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے کچھ ایسے انکشافات کیے کہ مفتی صاحب ہکّا بکّا رہ گئے۔

☆☆☆

آرمی والوں نے اکرام کو پکڑنے کے لیے خفیہ ایجنسی کی مدد لی تھی۔ خفیہ ایجنسی کے لوگ موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے اسے کچھ ہی دیر میں.... پکڑ کے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ مختلف طرح کی اسکیننگ مشینوں کی مدد سے اسے کھنگالا گیا۔ اس کے جسم سے کافی ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جن کی مدد سے وہ خودکشی کر سکتا تھا۔ زیادہ تر چیزیں اس کے جسم کے اندر چھپائی گئی تھیں۔ ان چیزوں کی موجودگی سے ہی وہ جان گئے تھے کہ اس کا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے ہی ہو سکتا ہے۔

گاڑی میں احسن نے اکرام سے جو معلومات حاصل کی تھیں، گاڑی میں موجود پولیس والے نے انہیں اس کی ریکارڈنگ بھی مہیا کر دی تھی۔ احسن کے جانے کے بعد اس پولیس والے نے اکرام کو پھر سے بے ہوش کر دیا تھا۔

انہوں نے اسے ہوش میں لا کے تفتیش کا آغاز کیا تو اس نے تہلکہ خیز انکشافات کیے۔ انہوں نے بھی اس سے معلومات حاصل کرنے کے لیے انجکشن کا سہارا ہی لیا تھا۔

اکرام سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں انہیں علم ہوا تھا کہ وہ دشمن ملک سے تعلق رکھتا ہے۔ گیس کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک نئی ایجاد کردہ گیس ہے جس کا پہلا عملی تجربہ آج ہی کیا گیا تھا۔ گیس جس میزائل میں بند کی گئی تھی اسے ایک ایسے میٹریل سے انسولیٹ کیا گیا تھا کہ کوئی بھی اسکینر مشین اسے پکڑ نہیں سکتی تھی۔ میزائل اپنے مقرر

کردہ وقت میں زمین سے باہر نکلتے ہی پھٹ جاتا۔ جس کے نتیجے میں اسٹیج پر موجود تمام افراد موت کے گھاٹ اتر جاتے اور ان کا مقصد بھی یہی تھا۔ گیس اگر شیشے سے باہر نکلتی تو بے شمار لوگ اس سے موت کے گھاٹ اتر جاتے۔ اس گیس کے چند مالیکیولز بھی سانس کے راستے کسی شخص کے پھیپھڑوں تک پہنچ کے موت کا باعث بننے کے لیے کافی تھے۔

یہ اطلاع ان کے لیے لرزہ خیز تھی۔

انہوں نے فوراً جلسہ گاہ میں موجود سیکیورٹی اہلکاروں کو مطلع کیا کہ شیشے کے کیبن کے قریب سے تمام لوگوں کو ہٹا لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ٹیم کو بھی اس طرف روانہ کر دیا تھا۔ اس ٹیم نے شیشے میں موجود گیس کا انخلا کرنا تھا۔

اکرام نے چند مزید ایجنٹس کی موجودگی کا انکشاف بھی کیا تھا جن میں اس کی بیوی بھی شامل تھی۔ یہ ایجنٹس پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان ایجنٹس کا اس سے فون پر ہی رابطہ تھا چند ایک کے سوا وہ ایک دوسرے کے ٹھکانوں سے بے خبر تھے۔

اس کے موبائل سے ایسے لوگوں کے نمبر حاصل کر لیے گئے۔ نمبرز کے بعد ان کی لوکیشن ٹریس کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایسے تمام ایجنٹس کی گرفتاری کے لیے مختلف ٹیمیں بھیج دی گئیں۔ کچھ ایجنٹس اسی شہر میں موجود تھے جبکہ دیگر شہروں میں موجود ایجنٹس کی گرفتاری کے لیے متعلقہ علاقوں سے ٹیمیں بھیجی گئی تھیں۔ یہ ٹیمیں ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس تھیں۔

ان ایجنٹس کو ان کی مکمل بے خبری میں ہی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اگر انہیں اپنی گرفتاری کا یقین ہو جاتا تو ان کے پاس خودکشی کے بہت سے طریقے تھے۔

اس سارے کام کے لیے کچھ گھنٹے ہی لگے تھے۔ شام تک ٹیموں کی واپسی شروع ہو گئی۔ ان میں سے زیادہ تر کے مطلوبہ ٹارگٹس ان کے ہمراہ تھے۔ جن سے مزید بہت سی معلومات متوقع تھی۔ اگر وہ احتیاط سے اس معاملے کو ہینڈل کرتے تو دشمن ملک کی ایجنسی کی کمر کم سے کم اس ملک میں ٹوٹ کے رہ جاتی۔

☆☆☆

عالیہ، احسن کو اطلاع دے کے اپنے گھر آ گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پر نہیں آئی تھی۔

''یا اللہ، تمام لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔''

اس کے لبوں پر بس اسی دعا کا وِرد جاری تھا۔

گھر آتے ہی وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جلسہ جاری تھا۔ لوگوں کا جوش و خروش اتنے فاصلے سے بھی نظر آ رہا تھا۔ کوئی پتا نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد اس میدان کی کیا حالت ہوتی۔

اسے ادھر کھڑے ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اس نے احسن کو میدان میں بھاگتے دیکھا اس کے ساتھ ایک اور پولیس والا بھی تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن مزید بڑھ گئی۔ اسے بھاگتے دیکھ کے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

کچھ دیر بعد ہی اس نے اسٹیج سے لوگوں کو اترتے دیکھا۔ احسن اب ڈائس پر کھڑا کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کے ٹیرس پر آ گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد اس کی آواز آنے لگی۔ وہ لوگوں کو رکنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شیشے کے اندر خطرہ ہے باہر نہیں۔ وہ حیران ہوئی کیونکہ اسے کوئی شیشہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک اس نے دھواں پھیلتے دیکھا۔ احسن اس دھوئیں میں چھپ گیا تھا۔ وہ احسن کی خیریت کی دعا مانگنے لگی۔ دھوئیں کو ایک ہی جگہ جمع ہوتے دیکھ کے اسے اندازہ ہوا کہ اسٹیج کے اطراف میں کوئی شیشہ لگا ہے۔

کچھ ہی دیر میں اس نے میدان سے باہر میڈیا کی گاڑیاں رکتی دیکھیں۔ اس نے ٹی وی آن کر لیا۔

ٹی وی پر بھگدڑ کے متعلق پٹی چل رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ہی بریکنگ نیوز نشر ہونے لگی۔

''جلسہ گاہ میں اچانک بھگدڑ مچ گئی، بے شمار لوگوں کی جانوں کے ضیاع کا خطرہ۔''

چند لمحوں بعد ہی ٹی وی پر جلسہ گاہ کے مناظر لائیو دکھائے جانے لگے۔ لوگوں میں ہراس چھایا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس کی طرح میدان سے باہر جانا چاہتے تھے۔

شیشے میں پھیلے دھوئیں کو انتہائی سنسنی خیز انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اسے احسن کی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ وہ احسن کی خیریت کی دعا مانگنے لگی، وہ نہیں جانتی تھی کہ احسن دعا کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ ساتھ ہی وہ دل ہی دل میں شکر کر رہی تھی کہ اس نے احسن کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ ورنہ...... اس سے آگے کا تصور ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

جماعت کے نمائندے کے انٹرویو کے بعد اب ایک پولیس والے کا انٹرویو چل رہا تھا۔

''شیشے میں بند دھواں سب کو خوفزدہ کر رہا ہے۔ اس

کے متعلق آپ نے کیا سوچا؟'' ایک میڈیا والے نے سوال پوچھا۔

''دیکھیں جی دھواں نکالنے سے پہلے اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے کہ یہ کس قسم کی گیس ہے۔ ہمارے ماہرین کی ٹیم جلد ہی ادھر پہنچنے والی ہے۔ وہی اسے نکالنے کے متعلق کوئی فیصلہ کریں گے۔ بغیر سوچے سمجھے گیس نکالنے کی کوشش سے بہت سی جانوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔'' پولیس آفیسر نے تلے انداز میں جواب دیا۔

اچانک کال بیل بجنے لگی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اسے دو افراد نظر آئے، ایک کے ہاتھ میں ایک چینل کا مائک تھا۔ وہ انہیں ہکا بکا دیکھنے لگی۔

''میڈم آپ کا گھر جلسہ گاہ کے سامنے ہے۔ ہم آپ سے کچھ معلومات لینا چاہتے ہیں۔''

ایک رپورٹر مہذب انداز میں بولا۔

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگی۔

''میڈم ہم آپ کے صرف دو منٹ لیں گے۔ کیا آپ ہمیں اندر آنے دیں گی؟'' اسے تذبذب کا شکار دیکھ کے رپورٹر بولا۔

وہ کچھ سوچ کے انہیں اندر لے آئی۔

''میڈم ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ ٹیرس پر کھڑی ہو کے سرخ کپڑا لہرا رہی تھیں۔ آپ کو ایسا کرتے دیکھ کے ہی سیکورٹی انچارج باہر کی طرف بھاگا تھا۔ آپ نے ایسا کیا دیکھا تھا؟'' رپورٹر نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

رپورٹر کا سوال سن کے اسے حیرانی ہوئی۔ آج اسے یقین آ گیا تھا کہ میڈیا والے پاتال میں چھپی خبر بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

کیا انہیں اصل بات بتائی جائے؟ اس کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ بولی۔

''میں آپ کو بتا دیتی ہوں مگر میرا کہیں نام نہیں آنا چاہیے۔''

''جی میڈم، آپ بے فکر رہیں۔ ہم ویسے بھی اپنی معلومات کا ذریعہ افشا نہیں کرتے۔'' اس نے عالیہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

عالیہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سوائے اس شخص کے پکڑے جانے کے۔ یہ آج اس نے دوسرا کام عقلمندی کا کیا تھا۔

یہ دونوں افراد دراصل دشمن ملک کے ایجنٹ تھے۔ مائک انہوں نے بھگدڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی رپورٹر سے ہی چھینا تھا تا کہ انہیں مطلوبہ معلومات لینے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جلسہ گاہ میں کی جانے والی کارروائی کی ناکامی کا پتا چلتے ہی انہوں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ لوگوں سے پوچھنے پر انہیں عالیہ کا پتا چلا تھا۔ اس سے مل کے ان کی معلومات میں کچھ اضافہ تو ہوا تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اصل معلومات عالیہ نے ان سے چھپالی تھیں۔

☆☆☆

خفیہ ایجنسی کے لوگوں نے میدان میں پہنچتے ہی تمام لوگوں کو میدان سے باہر نکال دیا۔ وہ گیس کے انخلا کے لیے ضروری سامان لے کے آئے تھے۔

لوگوں کو باہر نکالنے کے بعد دو افراد کچھ آلات لے کے شیشے کے پاس آ گئے۔ ایجنسی کے کچھ لوگ شیشے سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان سب نے چہروں پر گیس ماسک چڑھا رکھے تھے۔

ایک شخص نے ڈرل سے شیشے میں سوراخ کرنا شروع کیا۔ یہ انتہائی طاقتور ڈرل تھی جو بلٹ پروف شیشے کیا فولاد میں بھی سوراخ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

شیشے میں سوراخ کرتے ہی اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور مشین باہر نکال لی۔ دوسرے فرد نے سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں ایک ویکیوم پمپ کا پائپ سوراخ پر لگا دیا۔ ویکیوم پمپ کے سرے پر ایک سلنڈر نصب تھا۔ ویکیوم پمپ گیس کو شیشے سے کھینچ کے سلنڈر میں منتقل کرنے لگا۔

جوں جوں گیس شیشے سے خارج ہو رہی تھی اندر کا منظر صاف نظر آنے لگا تھا۔ اردگرد کی بلڈنگوں کی بالکونیوں اور چھتوں پر لوگوں کا جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ ان کے چہروں پر سنسنی اور اشتیاق تھا۔ کچھ میڈیا والے کیمروں کو زوم کر کے منظر کی عکس بندی کرنے لگے۔

شیشے میں سے آہستہ آہستہ گیس باہر نکل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں اوندھا پڑا احسن نظر آ گیا۔ گیس کے مکمل انخلا کے بعد وہ دروازہ کھول کے اندر آئے۔ اسے سیدھا کرتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ان کی ہر طرح کی مدد سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

ضروری کارروائیوں کے بعد انہوں نے احسن کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔

دو گھنٹوں سے جو شیشے کا کیبن لوگوں کو خوفزدہ کر رہا تھا اب اس کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اسے صاف دیکھ کر ملک کے طول و عرض میں پھیلے لوگوں کا رکا ہوا سانس

بحال ہوا۔

☆☆☆

اگلے دن آرمی چیف نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں انہوں نے دشمن ملک کے ایجنٹوں کی کارروائی اور گرفتاری کے متعلق میڈیا کو آگاہ کر دیا۔انہوں نے تمام ثبوت بھی میڈیا کو دکھائے تھے۔اس پریس کانفرنس نے دشمن ملک کو پوری دنیا میں بدنام کر دیا۔

اس ملک کے وزیراعظم کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنی پارٹی کے سرکردہ لوگوں کی میٹنگ بلوائی۔ باہمی مشاورت سے انہوں نے جو فیصلہ کیا اس نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو ہلا کے رکھ دیا۔

وزیراعظم نے فوری طور پر آرمی چیف اور انٹیلی جینس ڈائریکٹر کو اپنے عہدوں سے معطل کر کے ان کے خلاف تحقیقات شروع کرا دی تھیں۔ان دونوں کی معطلی سے بڑی طاقت کا خطے میں موجود ایک بڑا سہارا چھن گیا تھا۔اس ملک کی حکومت پہلے ہی ان کے خلاف چل رہی تھی۔ان کی پالیسی اپنے پڑوسی ممالک سے تعلقات بڑھا کے بڑی طاقت کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تھی۔

بڑی طاقت کو اب لگ رہا تھا کہ اس خطے سے ان کا بوریا بستر گول ہونے والا ہے اور اس تبدیلی کو روکنے کے لیے انہیں جو کچھ کرنا تھا تن تنہا ہی کرنا تھا۔

اس خطے میں ایک اور ملک میں بھی ان کا اثر ورسوخ تھا مگر اس ملک میں خطے کی تمام طاقتیں سرگرم عمل تھیں جس کی وجہ سے انہیں ادھر بھی اپنے قدم جمائے رکھنا مشکل لگ رہا تھا اور اب اس ملک سے بھی ان کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

انقلابی جماعت کے جلسے بدستور جاری تھے۔ وہ اپنے خلاف کی جانے والی کارروائی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے نتائج دیکھ کے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خدا کی نصرت ان کے ساتھ ہے اور وہ جلد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کارروائی نے ان کی جماعت کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ شاید اس واقعے کے بعد ان کے جلسوں میں شرکا کی تعداد کم ہو جائے مگر ان کی توقع کے برخلاف لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ہر روز ملک کے کئی شہروں میں ان کے جلسے ہوتے۔گزشتہ دو ماہ سے ملک کے آدھے سے زیادہ اضلاع میں ان کی جماعت کے جلسے ہو چکے تھے۔وہ الیکشنز سے پہلے پورے ملک کے عوام تک اپنا پیغام پہنچا دینا چاہتے تھے۔

الیکشنز کے دوران جلسوں کے علاوہ گھر گھر جا کے بھی ان کا اپنی جماعت کا پیغام دینے کا پروگرام تھا۔لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ابھی انہیں اپنی توقع سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆

جمیل اپنے دوستوں میں بجلی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک جیب کترا تھا۔اس کے ہاتھوں میں اتنی صفائی تھی کہ آج تک کبھی جیب کاٹتے وہ پکڑا نہیں گیا تھا۔اس وقت وہ ایک سپر اسٹور میں موجود تھا۔اسٹور میں کافی رش تھا۔اس نے ایک دو چیزیں لیں اور بل بنوانے کاؤنٹر پر آ گیا۔اس سے آگے تین لوگ قطار میں کھڑے تھے۔

زیادہ تر لوگ ڈیبٹ یا کریڈٹ کارڈ سے ہی بل کی ادائیگی کیا کرتے تھے۔ اب کیش کم ہی لوگ پاس رکھتے تھے۔کارڈ سے ادائیگی کرتے ہوئے صرف ''سوائپ'' کا رواج ختم ہو چکا تھا۔اب ہر جگہ ادائیگی کرتے ہوئے خفیہ ''پن کوڈ'' بھی درج کرنا پڑتا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تقریباً ہر جگہ ہی ڈیبٹ یا کریڈٹ کارڈ سے ادائیگی کی جا سکتی تھی۔ کسی کا کارڈ گم یا چوری ہوتا تو اس کارڈ سے ایسی جگہوں سے شاپنگ کی جاتی جہاں کوئی کیمرا وغیرہ نہیں لگا ہوتا تھا۔

بینکوں نے اس چیز سے بچنے کے لیے پن کوڈ کے اندراج کے بغیر کارڈ کے استعمال کی آپشن ختم کر دی تھی۔

جمیل عرف بجلی قطار میں کھڑے لوگوں کو بل کی ادائیگی کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس سے آگے کھڑے ہونے والے تینوں افراد نے کارڈ سے ہی ادائیگی کی تھی۔ کاؤنٹر پر موجود آدمی کارڈ مشین میں ڈالتا تو ادائیگی کرنے والا شخص کوڈ کا اندراج کرتا۔ جمیل نے ان تینوں کے کوڈ نوٹ کر لیے تھے۔ان تینوں نے کافی سامان کی خریداری کی تھی۔

جمیل نے اپنی دونوں چیزوں کی فوراً کیش ادائیگی کی اور ان کے پیچھے لپکا۔ اس کے آگے کھڑے ہونے والے شخص نے جب ادائیگی کی تھی تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پرس میں کافی کیش بھی موجود ہے۔ پرس اس نے ہپ پاکٹ میں رکھا تھا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اس کا پرس نکال لیا۔اس شخص کو خبر تک نہیں ہوئی تھی۔

باہر آ کے اس نے بائک اسٹارٹ کیا اور فوراً اس علاقے سے دور نکل گیا۔ ایک ویران گلی میں پہنچ کے اس

نے پرس نکالا۔ پرس سے ایک آئی ڈی کارڈ، ڈیبٹ کارڈ، جاب کا کارڈ، کچھ وزیٹنگ کارڈز اور بارہ ہزار کے قریب کیش نکلا۔ اس کے علاوہ ابھی اس شخص نے جو شاپنگ کی تھی اس کی رسید بھی موجود تھی۔ اس رسید پر اس دن مزید شاپنگ کی گنجائش کی حد بھی درج ہوتی تھی۔ اس کارڈ سے آج ہی مزید اڑتالیس ہزار کی شاپنگ کی جاسکتی تھی۔ شاپنگ کی حد اور اس کارسید پر اندراج بھی نئی چیزیں تھیں۔

اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے آئی ڈی کارڈ نکال کے اس شخص کا نام پڑھا۔ یہ کسی وارث علی کا آئی ڈی کارڈ تھا۔ جاب کارڈ سے اسے پتا چلا کہ یہ شخص ایک صحافی ہے۔

اس نے پرس سے اپنی مطلوبہ چیزیں نکال کے اپنے پرس میں ٹھونسی اور پرس ایک کوڑے دان میں پھینک دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کے وہ بائک پر بیٹھا اور گنگناتے ہوئے بائک کو کک لگائی۔ اچانک اسے اپنے دل میں تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے دل کو تھام لیا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بائک سے نیچے گر چکا تھا۔ بائک اس کے اوپر آن گری۔

گلی سے گزرتے ہوئے دو لوگ اس کی طرف بھاگے۔ ایک شخص نے بائک اس کی ٹانگوں سے ہٹا دی۔ دوسرا اس کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ تو مر چکا ہے۔ وہ اس... کی نبض چیک کر کے وہ بولا۔

دوسرے شخص نے اِدھر اُدھر دیکھا گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اس کی جیب سے پرس نکال کے اس میں سے کرنسی نوٹ نکالے اور دونوں تیزی سے ایک طرف کو چل پڑے۔

☆☆☆

وسیم احمد اس وقت ایک اسپتال میں موجود تھا۔ وہ اپنے ایک عزیز کی عیادت کے لیے ادھر آیا تھا۔ وہ اکثر اب ٹی وی پر آتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر اس کی تصاویر اور ویڈیوز بھی گردش کرتی رہتی تھیں۔ یوٹیوب اور دیگر ویڈیو... سائٹس پر اس کی تقاریر کی ویڈیوز موجود تھیں جو لاکھوں لوگ دیکھ چکے تھے۔ اس وجہ سے اب شہر میں زیادہ تر لوگ اسے جانتے تھے۔

جماعت کا کوئی بھی فرد کسی قسم کے پروٹوکول کے بغیر ہر جگہ جاتا تھا۔ وہ بھی اکیلا ہی اسپتال آیا تھا۔ لوگ اسے پہچان نہ سکیں اس لیے اس نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہوئی تھی۔ اس نے لمبے بالوں کی وگ لگا کے اوپر ایک ہیٹ رکھ لیا تھا۔

اس کی غیر معمولی چمکتی آنکھیں اس کی پہچان تھیں۔ اس نے کانٹیکٹ لینز کی مدد سے ان کا رنگ تبدیل کر لیا تھا۔ اس حلیے میں اسے پہچاننا آسان نہیں تھا۔

وہ اسپتال کے مطلوبہ حصے میں پہنچ کے ریسپشن کی طرف بڑھا۔

''جی سر، آپ نے کس سے ملنا ہے؟'' اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ وسیم سے استفسار کیا۔

وسیم نے اسے اپنے مطلوبہ شخص کا نام بتایا۔

''کائنڈلی اپنا شناختی کارڈ دیجیے گا۔'' وہ مہذب انداز میں بولی۔

وسیم نے اپنا شناختی کارڈ نکال کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس نے شناختی کارڈ لے کے اسے ایک چھوٹی سی الیکٹرانک مشین میں ڈالا۔ مشین نے شاید مطلوبہ معلومات ''ریڈ'' نہیں کی تھیں۔

اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے کارڈ نکال کے اس کا معائنہ کیا۔ اس پر لگی چھوٹی سی الیکٹرونک چپ پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا۔ اس نے چپ پر ہاتھ پھیر کے اسے صاف کیا اور کارڈ مشین میں واپس ڈال دیا۔ اس بار اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر ابھرتا دیکھ کے وسیم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وہ کافی جلدی میں تھا اور کافی اہم کام چھوڑ کے اپنے اس عزیز کی عیادت کے لیے آیا تھا۔

کارڈ کی چپ میں موجود مواد ریسپشنسٹ کے سامنے رکھے ایک کمپیوٹر میں محفوظ ہو چکا تھا۔ اس چپ اور مشین کی وجہ سے وہ خود سے کمپیوٹر پر مطلوبہ معلومات لکھنے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔ زیادہ تر اداروں میں اب یہی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔

وسیم احمد کارڈ لے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ گارڈ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اچانک اس نے اپنے عقب میں ایک آہٹ سنی۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

ریسپشنسٹ کاؤنٹر پر اوندھی پڑی تھی۔ آواز شاید اس کے گرنے ہی کی آئی تھی۔ وہ تیزی سے پیچھے پلٹا۔ گارڈ کی نظر بھی ریسپشنسٹ پر پڑ چکی تھی۔ وہ بھی اس کے پاس آ گیا۔

وہ بالکل ساکت پڑی تھی۔ وسیم نے اس کا سر سیدھا

کیا تو اسے، اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکتے نظر آئے۔

''نہیں شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ اتنے میں ان کے پاس کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اسپتال کے عملے نے فوراً اسے ایمرجنسی میں پہنچایا۔ وہاں اس کی سانس بحال کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ ہارٹ اٹیک اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

مفتی توصیف اس وقت ایک جلسے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کی جماعت پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی اور ہر جگہ مکمل تربیت یافتہ لوگ موجود تھے۔ عام طور پر کسی بھی جلسے میں ان کی جماعت کے تین افراد آدھے آدھے گھنٹے کی تقاریر کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ عموماً اسی علاقے کے زونل، ریجنل اور صوبائی صدور ہوتے تھے۔

بعض جگہوں پر مفتی توصیف، وارث علی اور وسیم احمد میں سے بھی کوئی ایک موجود ہوتا تھا۔ آج کا جلسہ ان کے اپنے شہر کے ساتھ جڑے ہوئے ایک شہر میں تھا۔ انہوں نے ایک زونل صدر کے ساتھ جلسے میں جانا تھا۔ زونل صدر مالی لحاظ سے کافی بہتر تھا اس کے پاس اچھی گاڑی کے علاوہ ڈرائیور بھی تھا۔

گاڑی مفتی صاحب کے پاس بھی تھی مگر وہ ایک پرانے ماڈل کی ایک چھوٹی سی کار تھی۔ جس سے شہر کے اندر ہی سفر کیا جاسکتا تھا۔ لمبے سفر کے لیے وہ موزوں نہیں تھی۔

انہوں نے کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے اپنی جیبوں میں سے تمام چیزیں نکال کے ایک سائیڈ ٹیبل پر رکھیں اور واش روم میں گھس گئے۔

ان کی بیوی ثمرہ کچن میں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا چھ سالہ بیٹا معاذ بھی موجود تھا۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ ایک دس سال کا معیز اور دوسرا چھ سالہ معاذ۔

آج اتوار تھا اس لیے ان کے دونوں بیٹے گھر ہی تھے۔ مفتی صاحب کے جلسے پر جانے کے بعد اس کا پروگرام اپنے میکے جانے کا تھا۔ جو تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی یہ بات بتا رکھی تھی کہ بابا کے جانے کے بعد انہیں نانو کے گھر لے جائیں گی اس لیے باہر نہ نکلیں۔ معاذ اپنی ماں سے ضد کر رہا تھا کہ نانو کے گھر ابھی چلیں۔

وہ اسے بہلا رہی تھی۔ ''بیٹا، بابا کو بائے بائے کر لیں نا، پھر ہم نانو کے گھر چلیں گے۔''

''بابا کب جائیں گے؟'' اس نے ٹھنکتے ہوئے اپنی ماں سے سوال کیا۔

ثمرہ کچن کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس نے معاذ کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''آؤ، ان سے پوچھتے ہیں۔''

معاذ اس کے ساتھ چل پڑا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر موجود موبائل پر پڑی۔ وہ فوراً موبائل کی طرف دوڑا۔ وہ موبائل اٹھانے لگا تو اس کے ساتھ رکھا شناختی کارڈ نیچے گر گیا۔

ثمرہ نے شناختی کارڈ گرتے دیکھا تو معاذ سے کہا۔ ''بیٹا یہ کارڈ اٹھا کے اوپر رکھو۔''

معاذ نے کارڈ اٹھا کے بے دھیانی میں ٹیبل پر پھینکا۔ کارڈ پھر سے نیچے گر گیا۔ اس کی ساری توجہ موبائل کی طرف تھی۔ وہ اپنی مطلوبہ گیم نکال رہا تھا۔ موبائل کی سیکیورٹی کے اب جدید نظام آچکے تھے۔ عام اور سستے سے فونز میں اب ایسا نظام بھی تھا جس کو ایکٹو کر دیا جاتا تو سیل کی اسکرین اس میں محفوظ انگلی کے اشاروں پر ہی چلتی تھی مگر مفتی صاحب نے اپنے سیل کی سیکیورٹی کی کبھی کوئی خاص فکر نہیں کی تھی۔ ان کا موبائل اکثر ان کے بچے استعمال کر لیا کرتے تھے۔ معاذ خاص طور پر اس حوالے سے بہت ضد کیا کرتا تھا۔ مفتی صاحب خاص طور پر معاذ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ اس کی ضد کے آگے ہمیشہ ہتھیار ڈال لیتے تھے۔

ثمرہ نے پھر سے کارڈ گرتے دیکھا تو اس کے چہرے پر غصیلے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے خود پر قابو پا کے کارڈ اٹھایا۔ وہ کارڈ ٹیبل پر رکھنے ہی لگی تھی کہ معاذ چیخا۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔

''ماما یہ دیکھیں۔'' اس نے موبائل ثمرہ کی طرف موڑا۔

ثمرہ چلتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ شناختی کارڈ اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس نے موبائل پر نظر ڈالی ہی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل لینے کی کوشش کی تو معاذ نے موبائل پیچھے کر لیا۔

ثمرہ نے شناختی کارڈ اُدھر ہی بیڈ پر رکھا اور معاذ سے موبائل چھیننے لگی۔

''بیٹا، بابا کی کال ہے۔ سیل اِدھر دو۔''

اس نے سیل ثمرہ کی طرف بڑھانے کے بجائے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگالیا۔

''ہیلو'' کال ریسیو کرتے ہی وہ سیل کان سے لگا کے بولا۔

ثمرہ اسے بے بسی سے دیکھ کے رہ گئی۔ اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا۔ معاذ نے بابا کو دیکھتے ہی سیل ان کی طرف بڑھایا۔

''بابا آپ کی کال ہے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

مفتی صاحب نے اس کے ہاتھ سے سیل لے کے کان کے ساتھ لگا لیا۔ یہ زونل صدر کی کال تھی۔ وہ گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

مفتی صاحب نے جلدی سے جوتے پہنے۔ سائیڈ ٹیبل سے اپنی چیزیں اٹھائیں اور باہر کی طرف چل پڑے۔ ثمرہ اور معاذ ان کے ساتھ تھے۔ معیز بھی انہیں الوداع کرنے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

مفتی صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو پیار کیا اور ثمرہ سے الوداعی جملے بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ثمرہ واپس کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ معاذ چلّایا۔

''ماما، بابا کا شناختی کارڈ یہ پڑا ہے۔'' اس نے بیڈ سے شناختی کارڈ اٹھا کہ ثمرہ کی طرف بڑھایا۔ ثمرہ نے کارڈ اس سے لے لیا۔

اس نے فون اٹھا کہ مفتی صاحب کا نمبر ملایا۔ نمبر ملاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

''آپ کا شناختی کارڈ اِدھر ہی رہ گیا ہے۔'' دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی وہ بولی۔

''میں ابھی گیٹ پر ہی گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ معیز کے ہاتھ کارڈ بھیج دو۔'' دوسری طرف سے آواز ابھری۔

ثمرہ نے کارڈ معوز کو دے کے باہر بھیج دیا۔

مفتی صاحب نے کارڈ لے کے جیب میں رکھا اور ڈرائیور سے بولے۔ ''چلیں۔''

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ ثمرہ کی پھر سے کال آنے لگی۔ ان کے چہرے پر الجھن بھرے تاثرات ابھرے۔

''ایک منٹ ٹھہریں۔'' انہوں نے ڈرائیور سے کہتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''معاذ کو کچھ ہو گیا ہے۔ آپ جلدی آئیں۔'' وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

مفتی صاحب کا چہرہ پریشانی کی آماجگاہ بن گیا۔

''معاذ کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں ابھی اسے دیکھ کے آیا۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے زونل صدر سے بولے۔ گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

زونل صدر بھی ان کا غیر معمولی انداز دیکھ کے گاڑی سے باہر آ گیا۔

مفتی صاحب گیٹ سے اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ انہوں نے ثمرہ کو بھاگ کے باہر آتے دیکھا۔ اس نے معاذ کو اٹھا رکھا تھا جو اس کی گود میں بالکل ساکت لگ رہا تھا۔

ثمرہ انہیں دیکھتے ہی رونے لگ گئی۔ انہوں نے معاذ کو اٹھایا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے تھے اور وہ بے ہوش لگ رہا تھا۔ انہوں نے اسے فوراً گاڑی میں ڈالا اور ڈرائیور سے بولے۔

''جلد از جلد کسی قریبی اسپتال چلو۔''

ثمرہ اور معیز بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ ثمرہ معاذ کا سر گود میں رکھے ہچکیاں لے لے کے رو رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ دعائیں کر رہی تھی۔ ''یا اللہ، میرے بچے کو سلامت رکھنا۔'' اسے روتا دیکھ کے معیز بھی رونے لگ گیا۔

مفتی صاحب کی حالت ثمرہ سے بھی دگرگوں تھی مگر انہوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ اسے تسلی دینے لگے۔

''پلیز ثمرہ خود کو سنبھالو۔ انشاءاللہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

''انشاءاللہ۔'' وہ زیرِ لب بولی۔

''یہ کیسے بے ہوش ہوا؟'' مفتی صاحب نے پوچھا۔

''پتا نہیں میں معیز کو شناختی کارڈ دے کے اندر گئی تو یہ نیچے پڑا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً آپ کو کال کر دی۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

زونل صدر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ وہ بولے۔

''یہ تو ہارٹ اٹیک کی علامت لگتی ہے۔ آپ پلیز اسے مصنوعی سانس دینے کی کوشش کریں۔''

مفتی صاحب اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ لگا کے اس کا سانس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اتنے میں وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں پہنچ چکے تھے۔ وہ اسے اٹھا کے اندر دوڑے۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں اسے دیکھتے ہی مایوسی کے تاثرات ابھرے تھے تاہم اس نے معاذ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''آئی ایم سوری۔ ہی از نو مور۔''

مفتی صاحب سکتے میں رہ گئے۔ وہ زیرِ لب بولے۔

''اللہ کی چیز تھی اس نے لے لی۔'' وہ خود کو تسلی دے رہے تھے مگر یہ آسان نہیں تھا۔

ان کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا اور ان کی داڑھی میں جذب ہو گیا۔

☆☆☆

مائیکل وان اسی شہر کے ایک بنگلے میں موجود تھا۔ اس نے اپنا کام مکمل کر کے سکون کا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اب اسے نتیجے کا انتظار تھا۔

اس نے وھسکی کی ایک بوتل نکالی اور اپنے لیے پیگ تیار کرنے لگا۔ اچانک اس کا سیل بجا۔

اس نے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگا لیا۔

''کیا رہا؟'' دوسری طرف سے مختصراً پوچھا گیا۔

''کام ہو گیا ہے اب رزلٹ کا انتظار ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔

''او کے۔'' دوسری طرف سے اتنا سنتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

اس نے پاس رکھا ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کیا۔ اس نے ایک نیوز چینل لگایا تھا۔ ساتھ ہی وہ شراب سے شغل کرنے لگا۔

وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ تھا۔ اس کی چالیس سالہ زندگی کا زیادہ حصہ اسی ملک میں گزرا تھا۔ وہ اس خطے میں بولی جانے والی تمام زبانیں بولنے کے علاوہ لکھنا پڑھنا بھی جانتا تھا۔

وہ اس ملک میں اپنے ملک کے سفارت کار کے طور پر رہتا تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ بھی سفارت کار تھا مگر اس کی اصل حیثیت بھی جاسوس کی تھی۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے ملک میں چلا گیا تھا۔ مائیکل نے بیوی بچوں کا جھنجٹ نہیں پالا تھا۔ اسے اپنی ایجنسی کے لیے خدمات دیتے پندرہ سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اسے سوائے اس ملک کے حالات پر نظر رکھنے کے.... کوئی خاص کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

دو دن پہلے ہی اسے ایک خاص کام سونپا گیا تھا۔

اس کے حوالے ایک خاص ڈیوائس کی گئی تھی۔ یہ ڈیوائس پوری دنیا میں صرف اسی ایجنسی کے پاس موجود تھی اور خاص خاص مواقع پر استعمال کی جاتی تھی۔ اس ڈیوائس سے گھر بیٹھے کسی بھی شخص کو قتل کیا جا سکتا تھا مگر سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس قتل کو کسی طرح بھی قتل ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس ملک میں بھی اب ہر شخص کے شناختی کارڈ میں ایک الیکٹرونک چپ پیوست ہوتی تھی۔ اس چپ سے اس شخص کی لوکیشن ٹریس کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس شخص کی شناخت کے متعلق تمام مواد بھی اس میں محفوظ ہوتا تھا۔ اسے اپنے ٹارگٹس کے شناختی کارڈ نمبر بھی مہیا کر دیے گئے تھے۔

مائیکل کے پاس جو ڈیوائس تھی اس سے کسی بھی شناختی کارڈ کی لوکیشن ٹریس کی جا سکتی تھی یہی نہیں اس کی مدد سے اس چپ میں ایسی شعاعیں بھیجی جا سکتی تھیں جو چپ میں جا کے محفوظ ہو جاتیں۔ ان شعاعوں کو جوں ہی کسی زندہ جسم کی حرارت ملتی یہ اس کے خون میں شامل ہو کے چند سیکنڈز میں ہی ہارٹ اٹیک کا باعث بن جاتی تھیں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی ظاہر ہوتا کہ شریانوں میں رکاوٹ پیدا ہونے کے باعث ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔

یہ ڈیوائس پانچ کلومیٹر تک موجود کسی بھی شناختی کارڈ کی الیکٹرانک چپ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مائیکل نے اس میں اپنے تینوں مطلوبہ شناختی کارڈ نمبرز محفوظ کر دیے تھے۔ ان کارڈز میں سے جوں ہی کوئی کارڈ ڈیوائس کی رینج میں آتا اس کی بیپ بجنے لگتی۔ اس میں صرف تین شعاعیں ہی محفوظ کی جا سکتی تھیں اور اس کے ٹارگٹ بھی تین ہی تھے۔

مائیکل نے شناختی کارڈ نمبر محفوظ کر کے اس کا ٹریکنگ سسٹم آن کیا ہی تھا کہ وہ بیپ بجنے لگی۔ مائیکل نے چیک کیا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کے تینوں ٹارگٹس اس کی رینج میں تھے۔

اس نے تینوں ٹارگٹس پر قاتل شعاعیں بھیج دیں۔

سیکیورٹی کی وجہ سے ہر شخص کا شناختی کارڈ دن میں کئی بار چیک کیا جاتا تھا۔ اس لیے لوگ شناختی کارڈ زیادہ تر ہر وقت اپنی جیب میں ہی رکھتے تھے۔ اس نے دن کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس وقت تینوں کے شناختی کارڈز ان کی جیب میں ہونا یقینی تھا۔

بڑی طاقت نے جماعت کو نقصان پہنچانے کے لیے پہلے اس ملک کی دشمن ملک کی ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں مگر وہ نہ صرف اپنی کوشش میں ناکام ہوئے تھے بلکہ ان کے بے شمار ایجنٹس پکڑے بھی گئے تھے۔ پوری دنیا میں ان کی بدنامی الگ ہوئی تھی۔

ناکامی کے بعد انہوں نے خود اس معاملے کو دیکھنے کا

فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ اگر جماعت کے تینوں قائدین کی ہارٹ اٹیک سے موت واقع ہو جاتی تو کوئی اسے قتل ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک ہی دن تینوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تینوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے، ان کے گھر قریب تھے اس لیے ایک ہی دن انہیں قتل کرنا مشکل بھی نہیں تھا۔

تینوں قائدین کی موت ایک ہی دن ہوتی تو ان کی موت سب کے لیے معما بن کے رہ جاتی۔ اس ملک کی ایجنسیاں اپنا سر پیٹ کے رہ جاتیں مگر ان کے ہاتھ کوئی کلیو نہ آتا۔ اس کے علاوہ جماعت کے دیگر قائدین اَن دیکھی موت سے ہر وقت خوفزدہ رہتے۔ جس جماعت کا چیئرمین، صدر اور نائب صدر بیک وقت موت سے ہمکنار ہو جاتے اور باقی قائدین بھی خود کو ہر وقت خطرے میں محسوس کر رہے ہوتے، وہ جماعت بھلا کیسے تبدیلی لا سکتی تھی؟

ان کا منصوبہ ہر طرح سے پرفیکٹ تھا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اوپر والے نے کوئی اور ہی منصوبہ بنا رکھا ہے۔ یہ جتنے بھی بااختیار ہو جاتے اوپر والے کے منصوبے کو نہیں بدل سکتے تھے۔

☆☆☆

مفتی صاحب کے گھر سوگ کا عالم تھا۔ خبر میڈیا پر بھی آ چکی تھی۔ پورا شہران کے گھر اُمڈ پڑا تھا۔ ساتھ والے کچھ گھروں میں بھی مہمانوں کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ مفتی صاحب نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ ثمرہ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

رات تک تدفین کر دی گئی۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔

سوم کے بعد وسیم احمد اور وارث دونوں مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب سے واقعے کی تفصیل پوچھی، جب مفتی صاحب نے تفصیل بتائی تو وہ دونوں اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔

”یہ تو انتہائی حیران کن بات ہے۔ اسی دن میرے ساتھ بھی ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ میں اس دن اپنے ایک عزیز کی عیادت کے لیے ایک اسپتال گیا تھا۔ ریسپشنسٹ نے مجھ سے کارڈ طلب کیا۔ وہ بالکل نارمل لگ رہی تھی۔ میں اس سے شناختی کارڈ لے کے جوں ہی پلٹا۔ وہ اپنی جگہ لڑھک گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

وارث، وسیم کی بات سن کے اور حیران نظر آنے لگا۔

”کیا؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”اس سے ملتا جلتا واقعہ اسی دن میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ میری جیب کٹ گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ مجھے پرس کی گمشدگی کا احساس ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے کے بعد میں نے پرس جیب میں ڈالا تھا۔ میں دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو ایک شخص تیزی سے میرے پاس سے گزرا تھا۔ مجھے اسی پر شک تھا کہ اس نے میرا پرس نکالا ہو گا۔

میں سیدھا اس کی رپورٹ کرانے قریبی تھانے چلا گیا۔ میں وہاں بیٹھا تھا کہ ایک پولیس اہلکار اندر داخل ہوا۔ اس نے تھانہ انچارج کو اطلاع دی کہ قریب ہی ایک گلی سے ایک شخص کی لاش ملی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اس کی جیب سے شناختی کاغذات کے علاوہ یہ ڈیبٹ کارڈ بھی ملا ہے مگر اس کارڈ پر جو نام درج ہے، وہ شناختی کاغذات سے میچ نہیں کر رہا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے کارڈ تھانہ انچارج کی طرف بڑھایا۔ کارڈ دیکھ کے اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ وہ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں یہ کارڈ آپ ہی کا ہے نا؟“

میں نے کارڈ دیکھا تو وہ واقعی میرا تھا۔

پولیس والے نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا کہ اس کارڈ کے علاوہ اس کی جیب میں صرف اس کے اپنے شناختی کاغذات تھے۔ رقم کے نام پر اس کی جیب سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی تھی۔ میرے کاغذات شاید اس نے کہیں پھینک دیے تھے اور رقم کا ہو سکتا تھا کہ پولیس والوں نے خود ضبط کر لی ہو۔

میں نے اس پولیس والے کے ساتھ جا کے لاش کا معائنہ کیا۔ لاش اس وقت تھانے میں ہی رکھی تھی۔ وہاں سے انہوں نے لاش کو اسپتال منتقل کرنا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے اسٹور میں دیکھا تھا اور اس پر جیب کاٹنے کا شک تھا۔ پولیس والے نے میرے پوچھنے پر مجھے اس جگہ کا بتایا جہاں سے اس کی لاش ملی تھی۔ وہ جگہ قریب ہی تھی۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے گلی کے سرے پر ایک کوڑے دان نظر آ گیا۔ اس شخص کے پاس سے میرے دیگر کاغذات یا رقم نہیں ملی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ میرے کاغذات اس نے ادھر ہی پھینکے ہوں۔ میں نے کوڑے دان میں

جھانکا تو وہاں اپنا جاب کارڈ اور شناختی کارڈ پڑا نظر آ گیا۔ اسی وقت مجھے شامیر کی کال آئی تھی۔ اس نے مجھے آپ کے بیٹے کی ڈیتھ کا بتایا تو میں اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ بھول ہی گیا۔"

اس کا بیان سن کے وہ حیران رہ گئے۔

"آپ کا شناختی کارڈ معاذ نے چھوا اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا، میرا شناختی کارڈ ریسپشنسٹ نے چھوا تو اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وارث کا کارڈ جیب کترے نے چھوا تو اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ کیا یہ سب اتفاق ہو سکتا ہے؟" وسیم پُرسوچ انداز میں بولا۔

"ہم سب نے خود بھی تو اپنا کارڈ چھوا تھا اور میرا شناختی کارڈ تو ثمرہ اور معیز نے بھی چھوا تھا اگر کارڈ میں کوئی مسئلہ تھا تو ہمیں یا ان دونوں کو ہارٹ اٹیک کیوں نہیں ہوا؟" مفتی صاحب بولے تو وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔

"میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے۔" وارث بولا تو وہ اسے دیکھنے لگے۔

"دیکھیں جیسے ہی ہم کسی کا موبائل نمبر ملاتے ہیں تو اس کے موبائل کی بیل بجنے لگتی ہے۔ موبائل میں سم ہوتی ہے۔ بالکل ویسی ہی چپ شناختی کارڈز میں بھی پڑی ہوتی ہے۔ جس طرح موبائل پر کسی کو بیل بھیجی جا سکتی ہے کیا اسی طرح شناختی کارڈ نمبر پر موت نہیں بھیجی جا سکتی؟" وارث نے بہت جلدی کھوج لگا لیا تھا۔

اس کی بات سن کر دونوں کے چہرے پر سنسنی خیز تاثرات نمودار ہو گئے۔ انہیں بھی اس کی بات میں حقیقت نظر آ رہی تھی۔

"ایسا عین ممکن ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم تینوں کو نشانہ بنایا گیا تھا مگر ہماری موت ابھی نہیں لکھی تھی سو دوسرے لوگ اس موت کا شکار بن گئے۔" وسیم جوش سے بولا۔

"اور ایسی ٹیکنالوجی کس کے پاس ہو سکتی ہے؟" مفتی صاحب نے پُرسوچ انداز میں سوال کیا۔

"ہمارا دشمن ملک پہلے بھی ہماری جماعت کے قائدین کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر چکا ہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد ہو سکتا ہے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو؟" وارث بولا۔

"میرے خیال میں ہمیں آزاد صاحب کو اس معاملے سے آگاہ کرنا ہوگا۔ وہ اس حوالے سے ہم سے بہتر معلومات رکھتے ہوں گے۔" وسیم کی بات سے ان دونوں کو بھی اتفاق تھا۔

مفتی صاحب نے آزاد صاحب کا دیا ہوا نمبر ملایا اور کال اٹھانے والے شخص سے آزاد صاحب سے جلد از جلد ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پانچ منٹ بعد ان کی آزاد صاحب سے شام کے وقت ملاقات طے ہو چکی تھی۔

☆☆☆

مائیکل کو ان تینوں کو قتل کی کوشش میں ناکامی کے بعد اپنے ملک واپس بلا لیا گیا تھا۔ اسے سفارت کار کے عہدے کے علاوہ ایجنسی سے بھی معطل کر دیا گیا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنے پیشہ ورانہ امور میں غیر ذمے داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے شعاعیں بھیجنے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لینی چاہیے تھی کہ شناختی کارڈز اس کے مطلوبہ ٹارگٹس کے پاس موجود بھی ہیں یا نہیں۔

اتنے پرفیکٹ منصوبے میں مکمل ناکامی سے بڑی طاقت کے اکابرین کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ یہ جماعت ان کے لیے آسان ٹارگٹ نہیں تھی۔

شعاعوں والی ڈیوائسز ان کے پاس محدود مقدار میں تھیں۔ ان کی تیاری آسان نہیں تھی۔ انہوں نے ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بار غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

☆☆☆

چیف سے وہ تینوں وسیم کے گھر ملے تھے۔ وہ وہاں خود چھپ کے آئے تھے۔ وسیم نے جب انہیں اپنے ساتھ بیتے واقعات کے متعلق بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ایسی ٹیکنالوجی تو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے پاس ہی ہے۔ انہوں نے کبھی اس ٹیکنالوجی کو آشکار تو نہیں کیا مگر بعض واقعات کی بنا پر ہمیں پہلے سے ہی شک ہے کہ وہ اس قسم کی ٹیکنالوجی کا خاص خاص مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔

"اوہ، ہمیں تو شک تھا کہ اس کارروائی میں بھی ہمارا پڑوسی ملک ہی ملوث ہوگا۔" وارث بولا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان کی اب اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ان کے جاسوسوں کے پکڑے جانے کے بعد ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ ویسے بھی ان کے پاس اس طرح کی ٹیکنالوجی ہوتی تو

وہ پہلے ہی اس کا استعمال کرتے۔"

"وہ اس طرح کی کارروائی پھر کر سکتے ہیں۔ ہم اس اَن دیکھی موت سے خود کو کیسے بچا سکتے ہیں؟" وسیم احمد نے سوال کیا۔

"آپ تینوں اپنے شناختی کارڈ کی چپس نکال کے مجھے دے دیں۔ ان کی جگہ میں آپ کو عام سی چپس کارڈز میں پیوست کرا دوں گا۔ آپ کی جماعت کے جو دیگر سینئر لوگ ہیں ان سے بھی کہیں کہ وہ اپنے شناختی کارڈز میں سے چپس نکال لیں۔ میں آرمی اور انٹیلی جنس افسران کو بھی اس خطرے سے آگاہ کر دوں گا۔"

"ہمیں تو کافی جگہ اپنے شناختی کارڈ استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ چپس کے بغیر تو ہم مشکوک ہو جائیں گے۔" وارث پریشان ہو گیا۔

"سیکیورٹی اداروں کے لیے میں آپ لوگوں کے لیے ایک اور کارڈ کا بندوبست کرتا ہوں۔ وہ دیکھ کے کوئی آپ سے سوال نہیں کرے گا۔ باقی جگہوں پر زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا۔" انہوں نے وارث کی پریشانی دور کر دی۔

"الیکٹرانک چپ تو شناختی کارڈ کے علاوہ ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈز میں بھی ہوتی ہے اور فون میں سم میں بھی الیکٹرانک چپ ہوتی ہے تو کیا اس کے ذریعے ہمیں نشانہ نہیں بنایا جا سکتا؟" وسیم احمد نے نیا مسئلہ سامنے رکھا۔

"ہو سکتا ہے اس کے ذریعے بھی نشانہ بنایا جا سکتا ہو۔ میں آپ لوگوں کو مشورہ دوں گا کہ ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈز کا استعمال چھوڑ دیں۔ رہی بات موبائل کی تو میں آپ لوگوں کو خاص سم مہیا کر سکتا ہوں۔ ان کی ملکیت کوئی نہیں جان سکے گا مگر ان کا نمبر آپ کے انتہائی قابلِ اعتماد ساتھیوں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہونا چاہیے۔" اس مسئلے کا حل بھی آرمی چیف نے نکال ہی لیا تھا۔

کچھ دیر مزید ملاقات جاری رہی۔ آرمی چیف نے ان کے تحفظ کے لیے چند مزید اقدامات اٹھانے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

اب انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ملک کے قیام کو ایک صدی مکمل ہونے والی تھی مگر اس میں حقیقی تبدیلی کیوں نہیں آسکی تھی۔ اس ملک کی مٹی تو بہت نم تھی، لوگوں نے تبدیلی کی کوشش بھی یقیناً کی ہو گی مگر ان کی مخالف طاقتیں بہت طاقتور تھیں۔ آزاد ملک ہونے کے باوجود انہیں کسی بھی جگہ سے کام کرنے کی آزادی نہ تھی۔

ان مخالف طاقتوں نے ان سے بھی پنجہ لڑا لیا تھا مگر ان کی ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خدا کی مدد و نصرت ان کے ساتھ ہے۔ اس چیز نے ان کے جذبے کو مزید تقویت دی تھی۔

☆☆☆

آرمی چیف نے انقلابی جماعت کے عہدیداران کی سیکیورٹی کی ذمے داری خود لے لی تھی۔ آرمی اور انٹیلی جنس کے نوجوانوں کو ان کی سیکیورٹی پر مامور کر دیا گیا تھا۔ یہ نوجوان سادہ لباس میں ہر وقت ان کے آس پاس رہتے۔ پڑوس میں موجود دونوں بڑی سوشلسٹ طاقتوں سے وہ اس حوالے سے انٹیلی جنس معلومات بھی حاصل کر رہے تھے۔ دنیا کی دوسری بڑی طاقت کی انٹیلی جنس انتہائی مضبوط تھی۔ اس کے ایجنٹس سب سے بڑی طاقت کی انٹیلی جنس ایجنسی میں شامل تھے۔ اکثر اوقات وہ کوئی نہ کوئی خفیہ خبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

آرمی چیف نے ان کے کارڈز کی چپس نکال کے اپنی پالتو بلیوں کے پٹے میں ڈال دی تھیں۔ ایک ہفتے بعد تینوں بلیاں بیک وقت مردہ پائی گئیں۔ انہیں علم ہو گیا کہ ان تینوں کو قتل کرنے کی پھر سے کوشش کی گئی ہے۔ اس واقعے کے بعد وہ مزید محتاط ہو گئے۔

جماعت کے سینئر لوگوں نے اپنی فیملیز کو خفیہ جگہوں پر منتقل کر دیا تھا۔ وہ کہیں بھی جاتے خفیہ ایجنسی کے سادہ لباس والے ان کے اردگرد موجود ہوتے تھے۔

آرمی اور انٹیلی جنس والے انقلابی جماعت کو سیکیورٹی فراہم کرنے کے علاوہ ایک اور اہم کام بھی سرانجام دے رہے تھے۔ یہ سب وہ طے شدہ منصوبے کے تحت کر رہے تھے۔ یہ وہی منصوبہ تھا جو سننے کے بعد انقلابی جماعت نے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے رضامندی کا اظہار کیا تھا۔

☆☆☆

بڑی طاقت کو شعاعوں کے ذریعے ان تینوں کو مارنے میں ایک بار پھر ناکامی کا سامنا پڑا تھا۔ اس بار انہوں نے شناختی کارڈز کی اپنے ٹارگٹس کی جیبوں میں موجودگی کی تصدیق کرنے کے بعد شعاعیں بھیجی تھیں مگر اس کے باوجود وہ تینوں زندہ تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ اس حوالے سے محتاط ہو چکے ہیں اور انہوں نے کوئی حفاظتی پیش بندی کر لی ہے جس کی وجہ سے وہ اس بار بھی موت کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ جماعت ان کے لیے ایک چیلنج بنتی جا رہی تھی۔ انہوں نے دوستوں میں کام کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس بار انتہائی باریک بینی سے منصوبہ تیار کیا تھا۔ اور غلطی کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔

☆☆☆

کارل ہوپر اپنے گھر میں موجود مقررہ وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ پر ایک سائٹ کھول رکھی تھی جو اسے دنیا کا لائیو نقشہ دکھا رہی تھی۔ یہ سائٹ ان کے اپنے سیٹلائٹ سے منسلک تھی۔ اس سیٹلائٹ پر جدید ترین کیمرے موجود تھے جو سیٹلائٹ سے دنیا کے کسی بھی حصے کو اتنا واضح دکھا سکتے تھے جیسا کہ آنکھ اپنے سامنے کے منظر کو واضح دکھاتی ہے۔

اس سائٹ کی مدد سے وہ کسی بھی علاقے کی جاسوسی کر سکتے تھے۔ کارل کے سامنے ایک جلسہ گاہ کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ وہ جلسہ گاہ میں سیکیورٹی سسٹم کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ جلسہ گاہ میں انتہائی منظم انداز میں لوگوں کو بھیجا جا رہا تھا۔

اس نے شہر کے دیگر حصوں کو نقشے میں کھنگالنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنا مطلوبہ منظر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کچھ گاڑیاں تھیں جو اس کی اطلاع کے مطابق جلسہ گاہ کی طرف گامزن تھیں۔ ان گاڑیوں میں اس کا مطلوبہ ٹارگٹ بھی موجود تھا۔ گاڑیاں پانچ منٹ کے اندر جلسہ گاہ پہنچ جاتیں۔ لگ بھگ اسے بھی اتنا ہی وقت درکار تھا۔

وہ ایک ڈیوائس اور لیپ ٹاپ لے کے لان میں آ گیا۔ اس نے ڈیوائس کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی۔ چند لمحوں بعد اس میں سے ایک مکھی نما شے بھنبھناتی ہوئی باہر نکلی اور اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ ایک ڈرون تھا جس میں پن ہول کیمرے کے علاوہ جی پی ایس سسٹم بھی اٹیچ تھا۔ اس ڈرون کو ''بی'' یعنی مکھی ہی کہا جاتا تھا۔ اس کے جی پی ایس سسٹم میں جو لوکیشن محفوظ کی جاتی، یہ اُڑ کے ادھر پہنچ جاتا۔ ڈیوائس کی مدد سے اسے اپنی مطلوبہ جگہ پر لینڈ کرایا جا سکتا تھا۔ ڈرون میں لگا کیمرا سامنے کے منظر کو ڈیوائس کی اسکرین پر دکھاتا تھا۔

اس کے علاوہ ڈرون اپنے ٹارگٹ کو پہچان بھی سکتا تھا۔ اس کے سسٹم میں مفتی توصیف کی تصویر محفوظ تھی۔ کیمرے کے سامنے جوں ہی مفتی توصیف کا چہرہ نظر آتا، وہ ان کے اوپر جا بیٹھتا۔ ان کے اوپر بیٹھتے ہی وہ ڈنک مارنے کے انداز میں ایک پن سے ان کے جسم میں دوا انجیکٹ کر دیتا۔ اس دوا سے پانچ منٹ کے اندر ان کی موت واقع ہو جاتی۔

ڈرون میں توانائی فراہم کرنے کے لیے ایک چارج ایبل چھوٹی سی بیٹری استعمال ہوتی تھی جو گھڑی کے سیل کی طرح ہوتی تھی۔ اس توانائی کی مدد سے وہ سارے کام سر انجام دیتا تھا۔ اس بیٹری میں زیادہ سے زیادہ اتنی ہی توانائی محفوظ ہو سکتی تھی کہ ڈرون ڈیوائس سے نکلنے کے بعد زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ تک کارآمد رہتا۔

کارل نے جلسہ گاہ کے نزدیک ہی ایک گھر کرائے پر حاصل کیا تھا۔ گھر کرائے پر حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک مقامی شخص کی خدمات حاصل کی تھیں۔ مکان اس مقامی شخص کے نام پر ہی حاصل کیا گیا تھا۔ کارل آج ہی اس مکان میں آیا تھا اور اپنا کام کر کے اسے فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔

اسے کل تین ٹارگٹس کو نشانہ بنانا تھا مگر آج صرف مفتی توصیف کو نشانہ بنانے کی ذمے داری تھی۔

اس نے ڈیوائس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ ڈرون جلسہ گاہ کے اوپر اُڑ رہا تھا۔ اس میں یہی پوزیشن محفوظ تھی یہاں سے آگے کارل کو اسے ڈیوائس کی مدد سے کنٹرول کرنا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دیکھا۔ گاڑیاں پارکنگ میں رک چکی تھیں۔ مفتی توصیف اور چند افراد ان میں سے اتر کے اندر کی طرف بڑھنے لگے۔

کارل ڈیوائس کی مدد سے ڈرون کو سامنے راستے میں لایا۔ یہاں سے وہ مفتی توصیف کا چہرہ پہچان کے خود کار طور پر انہیں اپنا نشانہ بناتا۔

مفتی توصیف دیگر لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے راستے سے گزر رہے تھے۔ کچھ پل جاتے تھے کہ ڈرون کے کیمرے کے سامنے ان کا چہرہ دکھائی دینے لگتا۔

کارل پھر سے ڈیوائس کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ ڈرون ان کے سروں پر ساکت کھڑا تھا۔ اس کے کیمرے میں قطار میں چلتے پہلے شخص کا چہرہ نظر آیا۔ کارل کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ڈرون کے کیمرے کے آگے سے تیزی سے افراد گزرنے لگے۔

کارل نے بہت سے مشن سر کیے تھے۔ ہمیشہ اُس کے اعصاب اپنے کنٹرول میں رہے تھے مگر اس وقت وہ ایسی سنسنی محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے اپنے پہلے مشن کے دوران محسوس کی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔

اسکرین پر مفتی توصیف کا چہرہ نمودار ہوا ہی تھا کہ ڈرون تیزی سے نیچے کی طرف گیا۔ اسکرین پر ایسے لگا جیسے مفتی صاحب کا چہرہ کسی نے تیزی سے زوم کیا ہو۔ کارل کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اس کی ساری حسیات ایک ہی

نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ نقطہ اسکرین پر نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

جلسہ گاہ سے کچھ ہی فاصلے پر تین مختلف مقامات پر تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں کچھ افراد تیار بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں گاڑی میں موجود ایک اسکرین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں جو وقت بتایا گیا تھا اس کے قریب آتے ہی وہ تن کے بیٹھ گئے۔ اچانک اسکرین پر ایک نقطہ بلنک کرنے لگا۔ ساتھ ہی ایک مسلسل بیپ بجنا شروع ہوگئی۔

تینوں گاڑیاں بیک وقت چل پڑیں۔ انہوں نے اپنے سفر کا آغاز تین مختلف مقامات سے کیا تھا مگر ان کی منزل ایک تھی۔ چند منٹوں میں ہی ایک گاڑی اپنے مطلوبہ مقام کے نزدیک پہنچ کے رک چکی تھی۔ اس میں سے افراد تیزی سے اتر کے اِدھر اُدھر پھیلنے لگے۔ دو افراد نے ایک گھر کی بیل بجائی۔ اندر سے ایک شخص نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ان میں سے ایک فرد تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولنے والے شخص کے منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔ اس نے اسے ایک طرف لٹا دیا۔

اندر کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں موجود رومال کو جیب میں رکھ لیا۔ اس رومال کو کلوروفارم میں بھگویا گیا تھا۔ گیٹ کے آگے ایک کار پورچ بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف لان تھا جو اس وقت خالی نظر آرہا تھا۔ لان میں سے ایک سیڑھی اوپر کی طرف جارہی تھی۔ یہ ایک منزلہ بنگلا تھا۔ وہ سیڑھی کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت پر پہنچ کے انہوں نے ساتھ والے گھر کی طرف نظر دوڑائی۔ لان میں ایک شخص بیٹھا تھا جس کا صرف سر ہی نظر آرہا تھا۔ اس کے براؤن بال اس کے غیر ملکی ہونے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ان دونوں افراد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس مسکراہٹ سے لگ رہا تھا کہ یہ وہی شخص تھا جس کے لیے انہوں نے اتنی بھاگ دوڑ کی تھی۔

☆☆☆

کارل اچانک ہکا بکا نظر آنے لگا۔ اس کے سامنے موجود ڈیوائس کی اسکرین اچانک ہی تاریک ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ ''پاور سیو موڈ'' پر چلی گئی ہے۔ اس نے ''پاور'' کا بٹن پریس کیا مگر اسکرین بدستور تاریک رہی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ اچانک اسے لیپ ٹاپ کا خیال آیا۔ اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر ڈالی تو اس کی حیرت مزید دوچند ہوگئی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھیں مل مل کے اسے دیکھنے لگا۔

اسے اچانک اتنا شدید جھٹکا لگا تھا کہ اسے اپنی حالت سنبھالنے میں چند لمحے لگ گئے۔ اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تو اس پر ایک منظر نمودار ہو گیا۔ یہ جلسہ گاہ کا بیرونی منظر تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ کے ''ٹچ پیڈ'' کے ذریعے جلسہ گاہ کے منظر کو پھر سے فوکس کیا مگر یہ کیا؟ جلسہ گاہ کے اندر کا منظر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ٹچ پیڈ پر تیزی سے انگلی پھیرنے لگا۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد بھی اسے جلسہ گاہ کے اندر کا کوئی منظر نظر نہیں آیا۔ جبکہ باہر کا سارا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید اس کا ڈرون پکڑا گیا تھا۔ جس کے بعد سیٹلائٹ کے کیمروں کو جلسہ گاہ کے اندر کا منظر دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی' اس کی معلومات کے مطابق اس ملک کے پاس یہ ٹیکنالوجی تو موجود ہی نہیں تھی جو سیٹلائٹ کے کیمروں کو کوئی منظر دکھانے سے روک سکتی۔

وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ اسے اپنی گردن پر چبھن کا احساس ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

انٹیلی جینس چیف کو دنیا کی دوسری بڑی طاقت کی طرف سے ایک خفیہ خبر ملی تھی۔ اس خبر کے مطابق ۲۹ دسمبر کو ہونے والے انقلابی جماعت کے جلسے میں اس کے سربراہ کو ''بی ڈرون'' کے ذریعے شکار کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ اسے اس حملے سے نمٹنے میں مدد کی پیشکش بھی کی گئی تھی۔ اس نے مدد کی پیشکش کرنے والے فرد سے ملاقات کی خواہش کی تو اس نے ہامی بھرلی۔

اس ملک کے پاس ایسی ٹیکنالوجی موجود تھی جو نہ صرف بی ڈرون کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتی تھی بلکہ وہ بی ڈرون کو پکڑنے کے بعد اس کی مدد سے وہ جس ڈیوائس سے کنٹرول کیا جاتا تھا، اس کی لوکیشن ٹریس کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

ان دونوں نے مل کے ایک منصوبہ تیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ ڈرون چھوڑنے کے لیے جلسہ گاہ کے قریب ہی کوئی

جگہ استعمال ہوگی۔ کیونکہ ڈرون صرف پندرہ منٹ تک ایکٹو رہ سکتا تھا۔ انہوں نے جلسہ گاہ کے گرد مختلف مقامات پر تین گاڑیاں تیار حالت میں پہنچا دی تھیں۔ ان گاڑیوں میں انٹیلی جینس کے ایجنٹس موجود تھے۔ یہ گاڑیاں ہر طرح کے ضروری آلات سے لیس تھیں۔

ڈرون جوں ہی مفتی توصیف کی طرف لپکا، وہ ٹریکنگ آلے کی زد میں آ گیا۔ ٹریکنگ آلے نے اپنی میگنیٹک فورس کے باعث اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ڈرون کو پکڑتے ہی اس آلے نے ڈرون کنٹرول کرنے والی ڈیوائس کی لوکیشن نشر کرنا شروع کر دی۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے سیٹلائٹ کے کیمروں کو جلسہ گاہ کا منظر دکھانے سے روکنے والا سسٹم ایکٹو کر دیا۔ تاکہ وہ شخص اس ڈرون کی ناکامی کے بعد دوسرا ڈرون نہ بھیج سکے۔

ان کے اس منصوبے کے باعث وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا پہلا جاسوس پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب اس ملک کے خلاف کھل کے بغاوت کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس طاقت نے ایک طویل عرصے تک انہیں اپنے اشاروں پر چلایا تھا مگر ہر اندھیرے کے بعد سویرا ضرور ہوتا ہے۔ غلامی کی طویل رات کے بعد ان کی آزادی کا سورج بھی طلوع ہونے کا وقت آ چکا تھا۔

☆☆☆

ایک جاسوس کے پکڑے جانے کے بعد ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اس جاسوس کی مدد سے انہیں پتا چل گیا تھا کہ بڑی طاقت کے اس ملک میں موجود سفارت خانے سے ہی خفیہ ایجنٹس کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اگلے دن آرمی نے سفارت خانے پر چھاپا مار کے بہت سے سفارت کاروں کو گرفتار کر لیا۔ سفارت خانہ سیل کر دیا گیا تھا اور اس ملک سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر دیے تھے۔

بڑی طاقت نے بہت شور مچایا۔ اس ملک کو ہر طرح سے دھمکایا بھی گیا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اب ان کی دھمکیوں سے ڈرنے کا وقت گزر چکا۔

آرمی چیف نے پریس کانفرنس کر کے بڑی طاقت کے تمام منصوبوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اب پوری دنیا میں اس طاقت کی جگ ہنسائی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اسی طرح کے ہنگاموں میں دو ماہ گزر گئے۔ حکومت کے پانچ سال پورے ہو چکے تھے۔ عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ عبوری حکومت نے جلد ہی الیکشنز کی تاریخ کا تعین کر دیا۔ اب الیکشن کمیشن امیدواروں کے کاغذات جمع کر رہا تھا۔

تمام سیاسی پارٹیاں شدومد سے الیکشن کی تیاری کر رہی تھیں۔

انقلابی جماعت کے اراکین نے بھی اپنے کاغذات جمع کرانا شروع کیے مگر ان کی توقع کے مطابق انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالف پارٹی کے بااثر امیدواروں نے انہیں الیکشن میں حصہ لینے سے روکنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ بہت سے امیدواروں کو دھمکایا گیا۔ ان کے بچوں کو اغوا کر کے انہیں بلیک میل کیا گیا۔ دو افراد تو قتل بھی ہوئے۔

الیکشن کمیشن نے انقلابی جماعت کے بہت سے امیدواروں کے کاغذات ریجیکٹ کر دیے۔ کاغذات جمع کرانے کی تاریخ گزری تو قومی اسمبلی کی نشست پر انقلابی جماعت کے صرف تینتالیس افراد کو کھڑے ہونے کا موقع ملا۔ جبکہ صوبائی اسمبلیوں میں مجموعی طور پر انقلابی جماعت کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے والوں کی تعداد ایک سو تین تھی۔

یہ سب ان کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا مگر وہ مایوس نہیں تھے۔ وہ اپنا کام کر رہے تھے۔ اسی طرح پورے ملک میں جلسے کر رہے تھے۔ ان کا پیغام ملک کے ہر شخص تک پہنچ چکا تھا۔

آخر الیکشن کا دن بھی آ گیا۔ اس ملک میں آج تک کوئی الیکشن ایسا نہیں ہوا تھا جس پر دھاندلی کے الزامات نہ لگے ہوں۔ حکومت نے الیکشن سے پہلے کھل کے دھاندلی کی تھی تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ الیکشن والے دن دھاندلی نہ ہوتی۔

رات کو غیر حتمی نتائج آنا شروع ہو گئے۔ اگلے دن شام تک یہ نتائج مکمل ہو گئے۔ اس بار ٹرن اوور ستر فیصد سے زیادہ رہا تھا۔ جو ملکی تاریخ میں ایک ریکارڈ تھا۔ حیران کن طور پر جن حلقوں سے انقلابی جماعت کا کوئی امیدوار الیکشن لڑ رہا تھا صرف انہیں حلقوں میں ٹرن اوور زیادہ دیکھا گیا تھا۔

قومی اسمبلی پر کوئی جماعت دو تہائی اکثریت حاصل نہیں کر سکی۔ سب سے زیادہ نشستوں پر پچھلی بار اپوزیشن میں رہنے والی جماعت کامیابی حاصل کر پائی تھی۔ حکومتی جماعت کی نشستیں اس سے کچھ ہی کم تھیں۔ انقلابی جماعت نے بھی ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ رجسٹر ہونے کے صرف چھ ماہ بعد ہونے والے الیکشنز میں انقلابی جماعت قومی اسمبلی کی

بائیس نشستیں اور صوبائی اسمبلی کی باون نشستیں لے اُڑی تھی مگر یہ کامیابی ان کے لیے کامیابی نہیں تھی۔ اب ان کا اصل کام شروع ہونے والا تھا جس سے ملک میں حقیقی تبدیلی کو آنا تھا۔

☆☆☆

قومی اسمبلی میں حلف برداری کی تقریب ہو رہی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں اپوزیشن میں رہنے والی جماعت نے دوسری جماعتوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے نشستیں پوری کی تھیں۔ مگر انقلابی جماعت نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

حلف برداری کی تقریب کو براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ سیکیورٹی کے لیے پولیس کے علاوہ آرمی کے دستے بھی تعینات تھے۔ عوام ٹی وی کے سامنے بیٹھے تقریب دیکھ رہے تھے کہ اچانک تمام چینلز کی نشریات میں تعطل آ گیا۔

چند لمحات کے بعد اینکر پرسن اعلان کر رہا تھا۔

''ناظرین ہم معذرت خواہ ہیں کہ کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے ہمارا رابطہ قومی اسمبلی ہال سے منقطع ہو گیا ہے۔ جوں ہی یہ خرابی دور ہوتی ہے ہم آپ کو واپس ہال میں لیے چلیں گے۔ ناظرین، ہم آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ قومی اسمبلی کے نومنتخب ارکان کی حلف برداری کی تقریب جاری ہے۔ ہم آپ کو وہ تقریب لائیو دکھا رہے تھے کہ......''

یہ اعلان کچھ دیر تک دہرایا جاتا رہا۔

لوگوں نے چینلز تبدیل کرنا شروع کر دیے مگر ہر چینل پر یہی صورتِ حال تھی۔

چند لمحات کے بعد اینکر پرسنز نے نیا اعلان کرنا شروع کیا۔

''ناظرین ہمارا کسی نمائندے سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر سیکیورٹی اہلکار کسی کو ایوان کے نزدیک نہیں جانے دے رہے۔ جوں ہی صورتِ حال واضح ہوتی ہے۔ ہم آپ کو ہال میں واپس لیے چلیں گے۔''

میڈیا پر تجزیہ نگار اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ لوگوں میں قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ سوشل میڈیا پر دھڑا دھڑ اس حوالے سے پوسٹس آنا شروع ہو گئیں۔

ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا تھا مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک یہی صورتِ حال رہی۔ ایک گھنٹے بعد تمام چینلز کی نشریات پھر سے شروع ہو گئیں۔ حلف برداری کی تقریب جاری تھی۔ عبوری حکومت کا اسپیکر حلف لے رہا تھا مگر سب لوگ حلف اٹھانے والے شرکا کو دیکھ کے ہکا بکا رہ گئے۔ ایک دفعہ پھر سے چینلز تبدیل ہونے لگے۔ لوگ اس تبدیلی کے متعلق جاننا چاہ رہے تھے مگر کسی نیوز چینلز پر نیچے چلنے والی پٹی پر اس تبدیلی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دکھائی دی جا رہی تھی۔

جب قومی اسمبلی کے اراکین حلف اٹھا چکے تو وزیراعظم اور چند دیگر وزرا نے بھی اسی وقت حلف اٹھایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ سب پہلے سے طے شدہ ہے۔

جب سب حلف اٹھا چکے تو اسپیکر نے سب لوگوں کو مبارکباد پیش کی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی کر رہا ہے۔ اسپیکر نے مبارکباد کے بعد سب سے پہلے جس شخص کو بیان دینے کے لیے مدعو کیا لوگ اس کا نام سن کے حیران رہ گئے۔

کیا ایک بار پھر حکومت پر آرمی نے قبضہ کر لیا ہے؟ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔

☆☆☆

انقلابی جماعت کی قیادت نے آرمی چیف سے مل کے اپنا لائحہ عمل پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ ان کو حلف برداری کی تقریب والے دن حکومت پر آرمی کے تعاون سے قبضہ کرنا تھا۔

سیکیورٹی کی غرض سے ویسے بھی فوج کے دستے تعینات تھے۔ تقریب شروع ہونے ہی والی تھی کہ ''جیمرز'' کی مدد سے فوج نے تمام چینلز کی نشریات معطل کر دیں۔ ان جیمرز نے موبائل سروس کو بھی معطل کر دیا تھا۔ میڈیا کے تمام نمائندوں کا اپنے اپنے چینلز سے ہر طرح کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

ہال میں قومی اسمبلی کے نومنتخب اراکین کے علاوہ عبوری حکومت کے لوگ، فوج کے لوگ اور کچھ سویلین بھی موجود تھے۔

کچھ دیر میں فورس نے ہال میں داخل ہو کے تمام لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے احتجاج کرنا چاہا مگر وہ اسلحے کے سامنے بے بس تھے۔

انقلابی جماعت کے نومنتخب بائیس اراکین کے علاوہ باقی تمام نومنتخب اراکین کو گرفتار کر کے کسی مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد آرمی چیف ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میڈیا کے نمائندوں کو ایک بریفنگ دی۔ ان کے مطابق عبوری حکومت کو اقتدار اپنی مرضی سے انقلابی جماعت کو منتقل کرنا تھا۔ عبوری حکومت ایسا چاہتی تو نہیں تھی مگر وہ بے بس تھے۔

آرمی چیف نے میڈیا کو باور کرا دیا تھا کہ فی الحال

انہوں نے صرف حلف برداری کی تقریب نشر کرنا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کسی قسم کی کوئی خبر نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ خود اپنی تقریر میں اس ساری صورتِ حال کی وضاحت کرنے والے تھے۔

میڈیا کو یہ ہدایات دے کر نشریات واپس بحال کر دی گئیں۔

انہوں نے وزیراعظم اور دیگر وزرا کا انتخاب بھی پہلے سے کر رکھا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت سب کو ابھی حلف اٹھانا تھا۔

حلف برداری کی تقریب کے بعد اسپیکر نے سب سے پہلے آرمی چیف کو خطاب کی دعوت دی۔

آرمی چیف کا نام سن کے لوگوں کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کہ آرمی چیف کا خطاب سننے لگے۔ اس خطاب سے ہی انہیں تبدیل ہونے والی صورتِ حال کے متعلق معلومات حاصل ہونا تھیں۔

☆☆☆

آرمی چیف کا خطاب تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ ان کا خطاب میں کہنا تھا کہ

"میری قوم کے عظیم لوگو، ابھی جو کچھ آپ نے دیکھا یہ یقیناً آپ کے لیے حیران کن ہوگا۔ آپ پریشان بھی ہوں گے کہ اچانک سے یہ کیا ہو گیا مگر یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ ہماری خواہش تو نہیں تھی کہ سب اس طرح ہو مگر ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں آپ کو اس سب کی وجوہات بتاتا ہوں۔ جب سے یہ ملک بنا ہے، ہم لوگ تبدیلی کے نعرے سن رہے ہیں مگر کبھی کوئی جماعت حقیقی تبدیلی نہیں لا سکی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ اول تو کوئی جماعت حقیقت میں تبدیلی لانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو بس اپنے مفاد کے لیے ہی حکومت میں آتے تھے۔ اگر کوئی جماعت مخلص بھی تھی تو اس کے پاس نہ تربیت یافتہ افراد تھے نہ ان کے پاس درست نظریہ تھا۔ اس لیے تبدیلی کا لفظ صرف ایک نعرے کے طور پر ہی استعمال ہوتا رہا۔ میری طرح ہر محبِ وطن شخص اس ملک میں تبدیلی چاہتا تھا مگر وہ اس کے لیے خود کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی نجات دہندہ کے انتظار میں تھا۔

میں خود اتنا با اختیار ہونے کے باوجود کسی دوسرے ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ میں اس حوالے سے مایوس ہو چکا تھا کہ مجھ سے کچھ لوگ آ کے ملے۔ ان کا نظریہ، ان کی تربیت، جذبہ، طریقہ کار...... سب دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی ہے وہ جماعت جو ملک میں حقیقی تبدیلی لا سکتی ہے۔

اس جماعت کو آپ سب انقلابی جماعت کے نام سے جانتے ہیں۔ اس جماعت کے منظرِ عام پر آتے ہی ہر طرح سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ جماعت کے خلاف ہر محاذ پر پروپیگنڈا کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ جماعت کے قائدین کو قتل کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں مگر اللہ کے فضل سے ہم ہر سازش کو ناکام بنانے میں کامیاب رہے۔

اصل میں انقلابی جماعت آپ عوام کی طاقت سے ہی ملک میں تبدیلی لانا چاہ رہی تھی مگر اسے الیکشن سسٹم پر خدشات تھے۔ انہوں نے ان خدشات کا اظہار مجھ سے بھی کیا مگر میرے پاس ان کا کوئی توڑ نہیں تھا دوسری طرف میں کسی غیر جمہوری انداز میں تبدیلی کے حق میں بھی نہیں تھا۔ میں نے اس جماعت کو الیکشنز میں حصہ لینے پر رضامند کیا مگر توقع کے مطابق اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ انقلابی جماعت کے امیدواروں کو ہراساں کیا گیا۔ ان کے بیوی بچوں کو اغوا کر کے دھمکایا گیا۔ دو امیدواروں کو قتل کر دیا گیا۔ بہت سے امیدواروں کے بغیر کسی وجہ کے کاغذات ہی ریجیکٹ کر دیے گئے۔ ہماری اس ساری صورتِ حال پر کڑی نظر تھی۔ اس دوران ہم نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے تمام سابقہ اور موجودہ اراکین کے خلاف ثبوت حاصل کرنا شروع کر دیے۔

آج میں آپ سب کے سامنے کھڑے ہو کے انتہائی افسوس سے اس بات کا اعلان کر رہا ہوں کہ انقلابی جماعت کے علاوہ قومی اسمبلی کی نشستوں پر جیتنے والے تمام امیدواروں میں سے صرف تین افراد ایسے ہیں جو الیکشن لڑنے کے اہل تھے۔ باقی تمام لوگ ہمارے آئین کی رُو سے ان شرائط پر ہی پورا نہیں اترتے مگر میں نے، آپ نے، ہم سب نے دیکھا کہ الیکشن کمیشن نے نہ صرف ان کے کاغذات قبول کیے بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ الیکشن جیتنے میں بھی کامیاب رہے۔ اب انہی نااہل لوگوں نے پانچ سال حکومت میں رہ کے اپنے مفادات حاصل کرنے تھے اور عوام کے حقوق غصب کرنا تھے۔

اس سے پہلے ہمارے پاس کوئی ایسا آپشن نہیں تھا اس لیے یہ نظام ایسے ہی چل رہا تھا مگر اب الحمدللہ ہمارے پاس ایک ایسی جماعت ہے جو اس ملک کا نظام سب سے بہتر طور پر چلانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس کے تمام افراد تربیت یافتہ

ہیں۔ ان کا منشور واضح ہے۔ جو صرف اور صرف عوام کی فلاح ہے۔ ان کے نظریات اعلیٰ ہیں، ان کا اخلاق بلند ہے۔ یہ جاگیردار، وڈیرے یا سرمایہ دار نہیں۔ یہ آپ سب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے لوگ ہیں۔ آپ سب انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔

ایسی جماعت کے ہوتے ہوئے میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں انہی آزمائے ہوئے چہروں کو ایک بار پھر آپ سب کے حقوق کو غصب کرتے ہوئے دیکھ سکوں۔ انقلابی جماعت الیکشنز کے ذریعے تو حکومت نہیں حاصل کر سکی اور موجودہ الیکشن سسٹم کے ہوتے ہوئے اس کی کامیابی ممکن ہی نہیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے بزور طاقت حکمرانی دی جائے۔

دوسری سیاسی پارٹیوں کے اراکین کبھی یہ نہ ہونے دیتے اس لیے ہم نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں جب تقریباً سب اِدھر موجود تھے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان سب کے خلاف ہمارے پاس ٹھوس ثبوت ہیں۔ باقاعدہ عدالتوں میں ان کا ٹرائل ہوگا اور ہر شخص کو اس کے جرم کے مطابق سزا دی جائے گی۔ سب کے ساتھ انصاف ہوگا کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

انقلابی جماعت کا منشور آپ سب جانتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے منشور کے مطابق کام کرتے ہوئے جلد ہی اس ملک کی حالت تبدیل کر دے گی۔ ہمارا ہر طرح کا تعاون ان کے ساتھ ہوگا اور میں عوام سے بھی امید کرتا ہوں کہ آپ بھی ہر طرح سے ان سے تعاون کریں گے۔

''آؤ اپنے جسم چن دیں، اینٹ پتھر کی طرح بے گھر سہی، یہ گھر اپنا تو ہے۔''

ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ انقلابی جماعت کے حامی اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ پورے ملک میں انقلابی جماعت کے حق میں نعرے لگ رہے تھے۔ دیگر سیاسی پارٹیوں کے زیادہ تر راہنما تو گرفتار ہو چکے تھے۔ باقی رہ جانے والے لوگ تذبذب کا شکار تھے۔ وہ یہ تبدیلی ہضم تو نہیں کر سکتے تھے مگر فوری طور پر اس تبدیلی کے خلاف کچھ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی لائحہ عمل موجود نہیں تھا۔ ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ان کی مجبوری تھی۔

ٹی وی پر اب وزیراعظم کے طور پر منتخب ہونے والے امیر تیمور خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل واضح کیا۔

''میرے عزیز دوستو، بھائیو، بہنو اور بزرگو السلامُ علیکم! میں آرمی چیف کا اپنی جماعت پر اعتماد کا شکر گزار ہوں۔ اس ملک کی تقدیر بدلنا ہمارا مشن ہے۔ ہمیں یہ مشن ہر حال میں مکمل کرنا تھا مگر آرمی چیف کے تعاون کی بدولت یہ کام بغیر کسی خون خرابے کے ہوگیا۔ اس تبدیلی کے دوران ہمیں دو قیمتی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ ایک ایس پی، احسن بیگ کی اور دوسری ہماری جماعت کے چیئرمین جناب مفتی توصیف کے چھ سالہ معصوم بیٹے معاذ کی۔ انشاء اللہ ہم ان کی قربانیوں کو رائگاں نہیں جانے دیں گے۔

ہم گزشتہ بیس سال سے اس ملک کی تقدیر بدلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس دوران ہماری جماعت کے لوگوں نے ان تھک محنت کی اور خود کو اس ملک کو چلانے کے قابل بنایا۔ ہمیں صرف زبانی وعدے کرنے کی عادت نہیں۔ ہمارا کام ہی ہماری پہچان ہوگا جو آپ جلد دیکھ سکیں گے۔

ہماری حکومت کے قیام سے بہت سے لوگوں کو بے چینی لاحق ہوگی۔ میں سب لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ تمام شعبے اپنا کام کرتے رہیں گے۔ ہم آہستہ آہستہ ان میں ضروری تبدیلی لائیں گے۔

ہم معاشی لحاظ سے ایک نیا نظام وضع کریں گے جو سرمایہ دارانہ نظام سے یکسر مختلف ہوگا۔ اس نظام سے امیر اور غریب میں فرق کو کم کیا جائے گا۔ عام افراد کے رہن سہن کو بہتر کرنے کے لیے ہم تمام ضروری اقدامات کریں گے۔

ہم تمام غیر پیدواری اخراجات میں کمی لائیں گے اور اس کی شروعات ہم خود سے کریں گے۔ پارلیمنٹ کے تمام اراکین کی تنخواہ اور دیگر سہولیات وہی ہوں گی جو ایک سرکاری ملازم کو پہلے اسکیل کی پہلی اسٹیج پر ملتی ہیں۔

ہم ایک ایسا تعلیمی نظام نافذ کریں گے جس کا مقصد لوگوں میں شعور اجاگر کرنا ہوگا نہ کہ صرف اور صرف ڈگری کا حصول۔ پورے ملک میں یکساں تعلیمی نظام رائج کیا جائے گا۔

خارجہ پالیسی میں ہم تمام ممالک سے برابر کے تعلقات قائم کریں گے۔ جن ممالک سے ہمارے تنازعات چل رہے ہیں۔ ان کو جلد از جلد حل کیا جائے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ سب لوگ ہمارے شانہ بشانہ کھڑے ہو کے اس ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ وہ دن دور نہیں جب ہمارے ملک کا شمار بھی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوگا۔''

نومنتخب وزیراعظم کی تقریر سن کے لوگوں کا جوش بڑھ

گیا۔ سڑکوں پر نکلنے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ انقلابی جماعت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

میڈیا پر ہر طرح کے تبصرے جاری تھے کہ تمام چینلز پر بریکنگ نیوز کے الفاظ کے ساتھ ہی ایک روح فرسا خبر نشر ہونے لگی۔

ملک کے سب سے بڑے شہر میں جلوس پر ایک جان لیوا گیس ''فائر'' کی گئی تھی۔ جس سے سیکڑوں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

☆☆☆

گیس فائر سے سیکڑوں لوگوں کی ہلاکت سے ملک کے حالات کو ایک بار پھر خرابی کی طرف لے جا کے تبدیلی کو ناکام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انقلابی جماعت بھی جانتی تھی کہ یہ کارستانی کس کی ہے اور فوج بھی اپنی اس مخالف قوت سے آگاہ تھی۔ ایسی حرکتیں پہلے سے متوقع بھی تھیں مگر انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا۔

نئی حکمران جماعت کے نمائندہ نے میڈیا کے ذریعے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ سب لوگ جلوس کی صورت میں سڑکوں پر نہ نکلیں کیونکہ انہیں پھر سے نشانہ بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

ان کے ایسے اعلانات کے بعد جلوس چھٹ گئے تھے۔

فوج اور دیگر سیکیورٹی ادارے محتاط ہو گئے تھے۔ سرحدوں پر سیکیورٹی سخت کر دی گئی۔ عارضی طور پر انہوں نے تمام سرحدیں سیل کر دی تھیں۔ اب کوئی بھی شخص اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شہروں کے اندر بھی سیکیورٹی کو سخت کر دیا گیا۔ شرپسند افراد کو گرفتار کرنا شروع کر دیا گیا مگر اس کے باوجود پورے ملک کے مختلف علاقوں میں تخریب کارانہ کارروائیاں ہونے لگیں۔ کہیں بم دھماکوں سے لوگوں کی جانوں سے کھیلا گیا تو کہیں کیمیائی ہتھیار استعمال کیے گئے۔ تبدیلی کے پہلے دس دنوں میں مجموعی طور پر ایک ہزار کے لگ بھگ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ زخمی ہونے والے افراد کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

یہ تمام حالات بنا کر ''بین الاقوامی فوج'' کو اس ملک میں اتارنے کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ بڑی طاقت کا پرانا ہتھکنڈا تھا جس کے ذریعے وہ بہت سے انقلابات کو ناکام کر چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس بار وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی ہے یا اسے منہ کی کھانا پڑتی ہے۔

☆☆☆

انقلاب کا پہلا ماہ۔

ملک میں امن و امان کی صورت حال ابتر تھی مگر یہ سب توقع کے مطابق تھا۔ اپنے طور پر اس کی پیش بندی کی کوشش تو کی گئی تھی مگر اتنے عرصے سے موجود بڑی طاقت کے رسوخ کا خاتمہ یکدم ممکن نہیں تھا۔

کارل ہوپر کی گرفتاری کے بعد بڑی طاقت کا سفارت خانہ ہی سیل کر دیا گیا تھا اور اس ملک سے ہر طرح کے تعلقات بھی ختم کر دیے گئے تھے مگر اس کے بہت سے ایجنٹس اب بھی خفیہ طور پر موجود تھے۔

دوسرے ممالک کی شہریت کے ساتھ بھی وہ بہت سے ایجنٹس کو مختلف بہروپوں میں اب بھی ادھر بھیج رہے تھے۔ ائرپورٹس پر سختی بڑھا دی گئی تھی مگر اس کے باوجود حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ یہ سب مقامی لوگوں کی مدد سے ہی کر رہے تھے۔

فوج کو ملک کے اندر بھی امن و امان کی صورت حال کنٹرول کرنے کی ذمے داری دے دی گئی تھی۔ فوج دوسرے اداروں کے ساتھ مل کے اپنی سی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے لیے وقت درکار تھا۔

وہ حقیقی تبدیلی جو لوگ دیکھنا چاہتے تھے، پورے ملک میں اس کے پھیلنے کے لیے وقت درکار تھا۔ انقلابی جماعت اسی طرح کام کرتی رہتی تو وہ وقت جلد آ جاتا لیکن مخالف طاقتیں اس تبدیلی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی ایسی کوششوں کی وجہ سے ملک کے حالات تو بہتر ہو رہے تھے مگر امن و امان کی صورت حال مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

حکومت کے چالیس دن پورے ہونے کے بعد پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا گیا تھا۔ اس اجلاس میں چالیس دن کی کارکردگی کا جائزہ لے کے آگے کی پالیسی وضع کی جانی تھی۔ اس کے علاوہ ملک میں امن و امان کی صورت حال پر بات کی جاتی۔ اس اجلاس میں قومی اسمبلی کے تقریباً تمام اراکین شریک تھے۔

بڑی طاقت کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے پوری پارلیمنٹ کو اُڑا دینے کا منصوبہ تیار کیا تھا.... اس ملک کے مغرب میں موجود ایک پڑوسی ملک میں ان کے اڈے موجود تھے۔ ان اڈوں سے وہ خطے کے تمام ممالک کی جاسوسی کا کام سرانجام دیتے رہے تھے۔ جاسوسی کے لیے وہ ڈرون طیارے استعمال کرتے تھے۔

وہ بذریعہ سیٹلائٹ پارلیمنٹ ہاؤس کی نگرانی کر رہے

تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس میں لوگ پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ سیٹلائٹ پر موجود انتہائی طاقتور کیمروں کی مدد سے وہ پارلیمنٹ ہاؤس کو ایسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے وہ سامنے موجود کسی دوسری بلڈنگ کو دیکھ سکتے تھے۔

اجلاس کا جو وقت طے کیا گیا تھا، وہ پورا ہوا ہی تھا کہ سیٹلائٹ پر موجود کیمرے غیر فعال ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس ملک کے پاس کیمروں کو غیر فعال کرنے والی ٹیکنالوجی موجود ہے۔ اس سے پہلے بھی جب کارل ہوپر نے ''بی ڈرون'' کے ذریعے مفتی توصیف کو شکار کرنے کی کوشش کی تھی، یہ ٹیکنالوجی استعمال ہوئی تھی تاہم اس وقت انہیں کیمروں کے غیر فعال ہونے کی توقع نہیں تھی۔ بہرحال یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ کیمروں کی مدد سے وہ جو معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں مل چکی تھیں۔

اجلاس تین گھنٹے تک جاری رہتا۔ انہوں نے آدھا گھنٹا انتظار کیا اور پھر ڈرون کو اُڑا دیا۔ اب وہ ڈرون کو سفر کرتا ہوا اپنے سامنے موجود اسکرینز پر دیکھ رہے تھے۔ ڈرون کو ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچنا تھا۔ وہ بے چینی سے وہ وقت ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ بے چینی کے ساتھ ساتھ ان کے چہروں پر سنسنی کی کیفیت بھی تھی۔ آخر کار وہ وقت آن پہنچا جب ڈرون کے دونوں پروں کے نیچے سے دو میزائل نکلے۔ اب چند سیکنڈز کی بات تھی اور اس کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس ملبے کا ڈھیر بنا ہوتا۔ اس میں موجود کسی ایک شخص کا بھی زندہ بچنا...... ممکن نہیں تھا۔

میزائل پلک جھپکتے میں اپنے ٹارگٹ کی طرف لپکے اور ایسا لگا جیسے وہ کسی تاریک سرنگ میں غائب ہو گئے ہوں۔

پارلیمنٹ ہاؤس اور اس کے اردگرد کا علاقہ، وہ کیمروں کے غیر فعال ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے اب وہ پارلیمنٹ ہاؤس کی تباہی کی خبر کا انتظار ہی کر سکتے تھے۔ وہ بے چینی سے کسی ایسی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

ان کے سامنے ٹی وی اسکرینز پر اس ملک کے چینلز چل رہے تھے۔ وہ ''بریکنگ نیوز'' کے الفاظ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کا انتظار بڑھتا جا رہا تھا۔ ان چینلز پر ان کے معمول کی نشریات جاری تھیں۔ اچانک ایک شخص کی نظر اس اسکرین پر پڑی جس پر وہ ڈرون کو دیکھتے رہے تھے۔ اس کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی۔ باقی دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اتنا حیران نظر آرہا تھا کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ دوسرے افراد نے اس کے اشارے کی سمت نظر دوڑائی تو ان کے بشرے بھی حیرت کی آماجگاہ بن گئے۔ خالی اسکرین ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ ڈرون کو جانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔

☆☆☆

دارالحکومت کے رہائشیوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا تھا۔ آسمان سے دو میزائل لپکے اور سرکاری عمارتوں میں سے ایک عمارت کو انہوں نے ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ بلند و بالا عمارتوں میں موجود لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میزائلوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کا نشانہ بنایا ہے۔

خبروں میں بار بار بتایا جا رہا تھا کہ پارلیمنٹ ہاؤس میں دو بجے ایک اہم اجلاس شروع ہو گا۔ جس میں ساری ''کابینہ'' شریک ہو گی۔ اس ''کابینہ'' کے تمام افراد کا تعلق حکومتی یعنی انقلابی جماعت سے ہی تھا۔ یہ انقلابی جماعت کے حکومت میں شامل تمام اراکین کا پہلا اجلاس تھا جس میں گزشتہ چالیس دن کی کارکردگی کا جائزہ لیا جانا تھا۔

ایسے میں پارلیمنٹ ہاؤس کے ساتھ دو میزائل ٹکرانے کا سیدھا سا مطلب تھا کہ انقلابی جماعت کی اعلیٰ قیادت موت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ لوگوں میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ جائے وقوعہ کی طرف دوڑے مگر سیکیورٹی پر مامور افراد نے انہیں اس طرف جانے سے روک دیا۔ عوام کے پوچھنے پر بھی وہ کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے مگر لب خاموش۔

ٹی وی پر بھی معمول کی نشریات جاری تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ خاص ہوا ہی نہ ہو۔

پارلیمنٹ ہاؤس سے دو میزائل ٹکرانے کی خبر معمولی نہ تھی۔ پل پل کی خبر دینے والے میڈیا جانے کیوں خاموش تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میڈیا کو اس اہم ترین خبر کے متعلق علم ہی نہ ہوا ہو۔

ہر طرف عجیب سا سماں تھا لوگوں میں خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ کچھ لوگ تو دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ جبکہ کچھ سرخ آنکھوں کے ساتھ ضبط کی تصویر بنے نظر آرہے تھے۔ ہر شخص کے دل میں ایک ہی سوال تھا کہ آزادی کو..... تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد انہیں جو حقیقی آزادی ملی تھی، کیا اس کے دن اتنے تھوڑے تھے؟ کیا وہ بس ایک سراب تھا۔ ان کے دلوں میں اندیشے پل رہے تھے۔ اگر حقیقت یہی تھی تو اس ملک کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا؟ کیا انقلابی جماعت اتنی بڑی

قربانی دینے کے بعد بھی ملک کو پھر سے بحال سکے گی؟ یا پھر سے حکومت مفاد پرست ٹولے کے ہاتھ میں آجائے گی اور پہلے جیسی صورتِ حال پیدا ہوجائے گی؟

لوگ اتنی بری خبر پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ وہ انقلابی جماعت کی عافیت کی دعائیں مانگنے لگے۔

کچھ لوگ سوشل میڈیا پر اس خبر کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انقلابی جماعت کے حکومتی اراکین جاں بحق ہوچکے ہیں مگر لوگوں میں بے چینی نہ پھیلے اس لیے فوج نے اس خبر کو پھیلنے نہیں دیا تھا۔ میڈیا کو بھی اس خبر کی اشاعت سے روک دیا گیا تھا اس لیے میڈیا بھی خاموش تھا۔

☆☆☆

اس ملک کے ایوی ایشن اینڈ ریسرچ سینٹر کے حالات مختلف تھے۔ ان لوگوں نے ڈرون سے نکلنے والے دو میزائل اپنے سامنے موجود اسکرینز پر دیکھے تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ ان میزائلوں کا ہدف پارلیمنٹ ہاؤس ہے اور ان کا اپنے ہدف کو نشانہ بنالینا یقینی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے جوش سے سرخ تھے۔

جس ڈرون نے میزائل پھینکے تھے، اس کے اوپر ان کا اپنا ڈرون اُڑ رہا تھا۔ اس ڈرون کے گرد شعاعوں کا ایسا جال پھیلا تھا کہ اسے سیٹلائٹ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ نہ صرف اس ڈرون کو دیکھنا ممکن نہیں تھا بلکہ اس جال کی وجہ سے وہ اپنے ڈرون کو بھی نہیں دیکھ پارہے تھے۔ اپنے ڈرون کی سیٹلائٹ سے نگرانی کرنے والے افراد اپنے ڈرون کو یکدم غائب دیکھ کے اپنا سر پیٹ کے رہ گئے تھے۔

میزائل پھینکنے کے بعد اب ڈرون واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔ اس نے واپسی کے سفر میں لوکیشن کے لیے اپنے سیٹلائٹ سے سگنل لینا شروع کردیے تھے۔ یہ سگنل پکڑ لیے گئے تھے۔ اب بڑی طاقت کے ڈرون کا اپنے سیٹلائٹ سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔

رابطہ منقطع کرانے کے بعد وہ اس پر اپنے سگنل بھیجنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ڈرون ان سگنلز کو کیچ نہیں کررہا تھا۔ یہ کام سائبر ماہرین کررہے تھے۔ ان کے پاس ڈرون کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے صرف ایک گھنٹا بچا تھا۔ اگر وہ اتنے وقت میں ڈرون کو اپنے کنٹرول میں نہ کرپاتے تو وہ دوسرے ملک کی سرحد پار کرجاتا۔ ان کا مقصد ڈرون کو ہائی جیک کرکے اپنے ہی ملک میں اتار لینا تھا۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو یہ بڑی طاقت کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوتا۔ تبدیلی کے فوراً بعد ہی اس ملک کی دھاک ان پر بیٹھ جاتی۔

ڈرون میں واپسی کا راستہ بھی ایک پروگرام کی صورت میں پہلے سے فیڈ تھا۔ وہ اپنے فیڈ شدہ پروگرام پر ہی عمل پیرا تھا۔ اس کا اپنے سیٹلائٹ سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا لیکن فی الحال اسے اس رابطے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے لینڈنگ کے لیے درست لوکیشن درکار ہوتی جو اسے اپنے سیٹلائٹ سے ہی مل سکتی تھی۔

فی الحال تو انہوں نے اپنے ڈرون کے ذریعے اس ڈرون کا رابطہ سیٹلائٹ سے منقطع کیا ہوا تھا مگر وہ اس کے پیچھے دوسرے ملک میں نہیں جاسکتے تھے۔ وہاں پہنچ کے سیٹلائٹ اپنے ڈرون سے واپس رابطہ بحال کرسکتا تھا اس لیے ان کی کوشش تھی کہ جلد از جلد اسے اپنے کنٹرول میں کرلیا جائے۔

سائبر ماہرین پوری تندہی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ آدھا کام کرچکے تھے جبکہ آدھا کام باقی تھا۔ ڈرون میں ایک خودکار نظام ہوتا ہے۔ اگر اسے ''ڈی ٹریک'' کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اپنے آپ کو تباہ کرلیتا ہے۔ انہوں نے اپنے الیکٹرانک سسٹم سے ڈرون کے اس سسٹم کو ناکارہ بنادیا تھا لیکن اس کے بعد ڈرون ان کی طرف سے بھیجے جانے والی ہدایات کو قبول نہیں کررہا تھا۔

ان کے چہروں پر امید اور ناامیدی کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ان کے چہروں پر ناامیدی بڑھتی جارہی تھی۔ ڈرون صرف پانچ منٹ بعد دوسرے ملک کی سرحد پار کرنے والا تھا۔ انہوں نے ایک آخری کوشش کی۔ اچانک ان کے چہروں پر جوش کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ڈرون نے ان کے بھیجے جانے والے سگنل کیچ کرلیے تھے۔ چند لمحات کے بعد ہی وہ اپنی سمت تبدیل کررہا تھا۔ اب وہ ان کی ہدایات کے زیرِاثر آچکا تھا۔

ایوی ایشن اینڈ ریسرچ سینٹر میں موجود بیسیوں لوگوں کے چہرے جوش کی آماجگاہ بن گئے۔ کسی جوشیلے شخص نے نعرہ تکبیر بلند کیا تو سینٹر کی دیواریں اللہ اکبر کی آواز سے گونج اٹھیں۔ ایک طویل عرصے تک بڑی طاقت کی غلامی میں رہنے کے بعد آج وہ اس حد تک آزاد ہوچکے تھے کہ اس کا ڈرون ہائی جیک کرکے اپنے علاقے میں اتارنے میں کامیاب رہے تھے۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ۔ لوگوں میں بے چینی حد سے زیادہ بڑھ جاتی، انہیں حالات سے باخبر کرنے کے متعلق فیصلہ کرلیا

گیا۔ وہ ڈرون کے پکڑے جانے کے انتظار میں تھے۔ اس کے بعد دونوں خبریں اکٹھی دی جاتیں۔ ایک بری خبر کے ساتھ۔ اچھی خبر سے بری خبر کا اثر زائل کیا جاسکتا تھا۔

اچانک تمام چینلز پر ایک پٹی چلنے لگی۔

''کچھ ہی دیر میں آپ آرمی چیف کا براہِ راست خطاب سن سکیں گے۔ اس خطاب میں وہ پارلیمنٹ ہاؤس کو نشانہ بنائے جانے کے بعد کی صورتِ حال کے متعلق بریفنگ دیں گے۔''

لوگ بے چینی سے وہ ''کچھ وقت'' ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں سرکتے لمحے بھی گھنٹوں کے برابر لگ رہے تھے۔ آخر کار وہ ''کچھ وقت'' بھی بیت گیا۔ تمام چینلز پر آرمی چیف کے چہرے کے نمودار ہوتے ہی لوگوں نے اپنی تمام حسیات ایک ہی جانب مرکوز کرلیں۔ آرمی چیف نہ صرف درست صورتِ حال کے متعلق انہیں بریف کرنے والے تھے بلکہ وہ ایک طرح سے پورے ملک کی عوام کے مستقبل کا فیصلہ انہیں سنانے والے تھے۔ ان کے دل اتنی تیزی سے دھڑک رہے تھے جیسے پسلیوں کے پنجرے سے باہر آنے کو بیتاب ہوں۔

آرمی چیف کہہ رہے تھے۔

''السلام علیکم، اس وقت پورے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ میں عوام سے گزارش کروں گا کہ وہ تسلی رکھیں۔ میں تمہید میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ یقیناً آپ لوگ بھی جلد از جلد وہ خبر سننے کے متمنی ہوں گے جس نے پورے ملک میں بے چینی پھیلا دی ہے۔

تقریباً ایک گھنٹا پہلے فضا سے دو میزائل پارلیمنٹ ہاؤس پر گرائے گئے۔ پارلیمنٹ ہاؤس کی پوری بلڈنگ ملبے کا ڈھیر بن گئی ہے مگر الحمدللہ، کسی قسم کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔''

لوگوں کے چہرے اتنا سن کے ہی خوشی سے چمک اٹھے۔ ان کے دل سے شکر کا کلمہ نکلا۔ لیکن یہ ہوا کیسے تھا؟ اس سوال کا جواب سننے کے لیے وہ پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''یہ حملہ پہلے سے متوقع تھا اور اس کی تیاری ہم نے پہلے سے کر رکھی تھی۔ ہماری مخالف طاقت پارلیمنٹ ہاؤس کی سیٹلائٹ سے نگرانی کر رہی تھی۔ اس لیے ہم نے حکومتی اراکین کو پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل... کرا کے اپنی مخالف قوت کو یہ تاثر دیا کہ اجلاس شروع ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا وہ نظام ایکٹو کر دیا جس کی بدولت پارلیمنٹ ہاؤس اور اس کے اردگرد کا علاقہ ان کے سیٹلائٹ کے کیمروں سے اوجھل ہوگیا۔ پارلیمنٹ ہاؤس اور اس کے اردگرد کی عمارتوں کو جلد از جلد خالی کرالیا گیا۔

ہم جانتے تھے کہ ہماری مخالف قوت ایسے ڈرون کے ذریعے حملہ کرے گی جسے ہم نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں جب یہ خبر ملی تھی تو اس کے بعد اتنا وقت نہیں تھا کہ ڈرون سے نکلنے والے میزائل کو جام کرنے والا نظام پارلیمنٹ ہاؤس میں نصب کیا جاسکتا۔ اس لیے پارلیمنٹ ہاؤس کی بلڈنگ کی قربانی دینا ہماری مجبوری تھا۔

ہم نے دہرا منصوبہ تیار کیا ہوا تھا ایک طرف ہم نے ان کے حملے کو ناکام کرنا تھا تو دوسری طرف ہم نے ان کا ڈرون ہائی جیک کرنے کا منصوبہ بھی تیار کرلیا تھا۔ آپ سب کے لیے یقیناً یہ خبر انتہائی مسرت کا باعث ہوگی کہ ہمارے سائبر ماہرین ان کا ڈرون ہائی جیک کر کے اپنے ایک ہیلی پیڈ پر بحفاظت اتارنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔''

اس خبر کا سننا تھا کہ لوگ خوشی سے بے قابو ہوگئے۔ ہر طرف فوج اور انقلابی جماعت .... زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔

''میں خود کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہنے والوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں تر نوالہ نہ سمجھیں۔ اب نہ ہم کمزور رہے ہیں نہ اُن کے غلام۔ اب ہم اپنے ملک کی طرف اٹھنے والی ہر میلی آنکھ کو پھوڑ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم ملکی سالمیت پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اب اگر ہمارے خلاف کسی کارروائی کی کوشش کی گئی تو ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ ہم انہیں ایسی کسی کارروائی کے جواب میں دندان شکن جواب دیں گے۔''

آرمی چیف نے کچھ ایسی ہی مزید باتوں کے بعد اپنے خطاب کا اختتام کردیا۔

آج کی رات عوام کے لیے خوشیوں کی رات تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ بے یقینی کا شکار تھے مگر ایک خطاب نے ہی نہ صرف ان کی بے یقینی دور کردی تھی بلکہ انہیں یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ اب وہ واقعی ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔

☆☆☆

بڑی طاقت کے ڈرون کے ہائی جیک ہونے کی خبر پوری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ ان کی پوری دنیا میں سبکی ہوئی تھی کہ کل تک جو ملک ان کا غلام تھا اس نے آزاد ہوتے ہی ان پر کیسا بھرپور وار کیا تھا۔

حکومت پارلیمنٹ ہاؤس کو نشانہ بنانے کا معاملہ بین الاقوامی عدالت میں لے گئی تھی مگر ان کی توقع کے مطابق وہاں ان کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عدالت صیہونی طاقتوں ہی کے زیرِ اثر تھی وہ کیسے ان کے خلاف کوئی فیصلہ کرسکتی تھی۔ بین الاقوامی عدالت نے یہ ماننے سے انکار کردیا تھا کہ وہ ڈرون بڑی طاقت کا ہی تھا یا اس کی ایما پر چھوڑا گیا تھا۔ اس نے شواہد کو ناکافی قرار دے کے مقدمہ خارج کردیا تھا۔

اس خطے میں بڑی طاقت کے زیرِ اثر بس ایک ہی ملک رہ گیا تھا۔ اس میں موجود اڈوں سے بڑی طاقت پھر سے انہیں نشانہ بنا سکتی تھی۔ چنانچہ خطے کے ممالک نے مل کے اپنی فوجیں اس ملک میں داخل کردی تھیں۔ کچھ عرصہ جنگ جاری رہی لیکن اب بڑی طاقت اس خطے میں تنہا تھی۔ وہ زیادہ عرصے تک مزاحمت نہیں کرسکی اور جلد ہی وہ اس خطے میں موجود اپنے آخری اڈے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔

بڑی طاقت کے اس خطے سے نکلتے ہی اس ملک میں امن قائم ہوگیا۔ اب وہ سکون سے اپنی عوام کی فلاح کے لیے کام کرسکتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں عوام تک اس تبدیلی کے ثمرات پہنچنا شروع ہوگئے۔

اس ملک میں آنے والی تبدیلی رکی نہیں تھی۔ بڑی طاقت کو اس ملک سے نکالنے کے بعد وہاں انقلابی جماعت نے اپنی مرضی کی حکومت قائم کی تھی۔ اس حکومت کو انقلابی جماعت نے نیا نظام دیا اور اس نظام کو چلانے کی تربیت بھی۔ اس نظام کی بدولت کچھ عرصے میں ہی ایک طویل عرصے تک جنگ زدہ رہنے والے ملک میں بھی آخرکار امن قائم ہو ہی گیا تھا۔

دشمن ملک میں بھی اس تبدیلی کے اثرات پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ عوام نے وہاں بھی ویسے ہی نظام کی تشکیل کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔ وہاں کی حکومت جانتی تھی کہ زیادہ عرصے تک وہ عوام کو روک نہیں سکیں گے۔ اگر وہ اپنے ملک میں نظام کو درست کردیتے تو ایک طویل عرصے تک ان کی حکومت قائم رہ سکتی تھی۔ انہوں نے بھی سرمایہ داریت سے جان چھڑا کے وہاں اسلامی معاشی نظام کے اصولوں پر مشتمل معاشی نظام رائج کردیا۔

اب اس خطے میں کوئی بھی سرمایہ دارانہ بلاک سے تعلق رکھنے والا ملک نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ سوشلسٹ ممالک تیزی سے پھیلنے والے اسلامی نظام کو اپنے نظام کے خلاف خطرہ محسوس کرنے لگتے، انقلابی جماعت نے بین الاقوامی انقلاب کی طرف اپنا اگلا قدم بڑھا دیا۔ اس قدم سے یہ تمام ممالک ایک مٹھی کے مانند ہوجاتے۔ ان کے مفادات اس طرح ایک دوسرے سے مشترک ہوجاتے کہ وہ ایک دوسرے سے دشمنی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس تبدیلی کے بعد وہاں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

یکم جنوری، 2042ء

تبدیلی کو تقریباً پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ان پانچ سالوں میں یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوچکا تھا۔ اس عرصے میں انقلابی جماعت ہی ملک کی حکمران رہی تھی اور ابھی کچھ عرصے تک اس ملک میں پارٹی ڈکٹیٹرشپ ہی نے قائم رہنا تھا۔ جب لوگوں میں مکمل طور پر شعور پیدا ہوجاتا تو الیکشنز کرائے جاتے۔

دارالحکومت کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ پورے شہر میں چراغاں کیا گیا تھا جس نے شہر کی خوبصورتی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ ہر طرف اپنے ملک کی جھنڈیوں کے ساتھ بیشتر ایشیائی ممالک کی جھنڈیاں لہلہا رہی تھیں۔ ان جھنڈیوں کے مرکز میں ایک نئی جھنڈی لگی تھی۔ جو سائز میں سب سے بڑی تھی۔ یہ جھنڈی ایک نئے ادارے ''ایشیاٹک فیڈریشن'' کی تھی۔

یہ سارا اہتمام خطے کے تمام ممالک کے وزرائے اعظم کے استقبال کے لیے کیا گیا تھا۔ آج یہاں ''ایشیاٹک فیڈریشن'' کا پہلا اجلاس ہونے والا تھا۔ اس ادارے کے اراکین خطے کے ایسے تمام ممالک تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ اس ادارے کا مقصد ان تمام ممالک میں ہر طرح کے تعاون کو فروغ دینا تھا۔ اس ادارے کے قیام سے اس کے تمام اراکین ایک ملک کے مانند ہوجاتے۔ اس ادارے کا اپنا ایک بینک اور کرنسی تھی۔ یہ تمام ممالک ایک دوسرے سے آزادانہ تجارت کرسکتے تھے۔ اب انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی صیہونی ملک کی ضرورت نہیں تھی۔

ایشیاٹک فیڈریشن کا آئیڈیا انقلابی جماعت نے ہی پیش کیا تھا۔ اس ادارے کے قیام کے بعد خطہ حقیقی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط سے آزاد ہوگیا تھا۔

دنیا آہستہ آہستہ تبدیلی کی طرف جا رہی تھی۔ جماعت کا اصل مقصد بین الاقوامی انقلاب تھا۔ اس نے اس سمت میں اپنا سفر شروع کردیا تھا۔ اب امید کی جاسکتی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب پوری دنیا میں پھر سے اسلام کا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ انشاء اللہ!

للکار

تمکین رضا

ہوسِ اقتدار کی خاطر لوگ دوسروں کی جانوں سے کھیل جاتے ہیں۔ اس نے بھی سوچا اور بہترین حکمتِ عملی اپناتے ہوئے اپنی بازی کھیل گیا...

اس مجرم کا قصہ جو پولیس کو للکار بیٹھا تھا

سراغ رساں شرمین خود کو اعزاز یافتہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ پولیس کمشنر اس کے وجود سے واقف ہوگا۔ اس وقت وہ پولیس کے سب سے بڑے عہدے دار کے سامنے براجمان تھا۔ پولیس کمشنر الیگزینڈر اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔

''سارجنٹ ولسن نے بتایا ہے کہ تم کئی ایک کیسز حل کرنے میں اس کی مدد کر چکے ہو۔ شاید تم اس کیس میں بھی ہمیں اپنا تازہ ترین نقطہ نظر پیش کر سکتے ہو۔''

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' شرمین نے منکسر المزاجی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ!'' کمشنر الیگزینڈر نے میز پر موجود نوٹس پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''کل سہ پہر تین بجے کاؤنٹی لین روڈ پر ایک جاگنگ کرنے والے شخص نے ایک فائر کی آواز سنی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور 911 پر فون کر دیا۔ چند منٹ بعد جب پولیس کی ایک پیٹرول کار اس علاقے میں پہنچی تو انہیں وہاں ایک لاش پڑی ہوئی ملی۔ لاش اینڈی پنٹو کی تھی جو مجرموں کے گروہ کا ایک رکن تھا۔ ہم ایک بڑی مچھلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔ اس کی لاش کے نیچے ہمارے لڑکوں کو ایک سگریٹ لائٹر دبا ہوا ملا۔ سونے کا بنا ہوا لائٹر جس پر بی ایف کے الفاظ کندہ تھے۔''

شرمین کو اپنے ذہن پر زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ ''بی ایف سے مراد مجرموں کے گروہ کے باس برونو فرینڈلی سے ہے۔''

''بالکل درست۔ برونو کی انگلیوں کے نشانات لائٹر پر موجود ہیں۔ ہم بالآخر یہی سمجھے کہ ہم نے مجرموں کے گروہ کے باس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے، سوائے ایک بات کے۔'' پولیس کمشنر نے کہا۔

''اور وہ یہ کہ برونو فرینڈلی کے پاس سہ پہر تین بجے جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت ہے؟'' شرمین نے خیال ظاہر کیا۔

کمشنر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''دوپہر دو بجے سے سہ

پہر تین بجے تک برونو ہمیشہ تنہا ہوتا ہے اور قیلولہ کرتا ہے۔ میرے سراغ رسانوں کی ایک جوڑی نے فیصلہ کیا کہ یہ اس سے ملاقات کرنے کا ایک بہترین وقت ہے تاکہ اس کی قمار بازی کے کاروبار کے سلسلے میں اس پر کچھ دباؤ ڈالا جاسکے۔ وہ دونوں سراغ رساں اس وقت برونو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے جب اینڈی پنٹو مارا گیا۔''

''سو پولیس نے مہربانی کرتے ہوئے برونو کو جائے واردات سے عدم موجودگی کا مضبوط ترین ثبوت فراہم کردیا۔'' شرمین کے لہجے میں قدرے طنز شامل تھا۔ ''برونو نے لاش کے نیچے پائے جانے والے اپنے سگریٹ لائٹر کے بارے میں کیا توضیح پیش کی ہے؟''

''برونو کا کہنا ہے کہ اس روز صبح ناشتے پر اپنے تین معاونین کے ہمراہ میٹنگ کے دوران اس نے وہ لائٹر استعمال کیا تھا۔ جب میرے سراغ رساں سہ پہر برونو کے ساتھ تھے تو اس نے یہ تذکرہ کیا تھا کہ اسے اپنا سنہری سگریٹ لائٹر نہیں مل رہا ہے۔''

''برونو کے قائم مقام ساتھیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جنہوں نے ناشتے کی میز پر اس سے میٹنگ کی تھی؟ کیا ان میں سے کسی ایک نے اس قتل کا ارتکاب کیا ہے؟'' شرمین نے پوچھا۔

کمشنر نے اپنی میز پر نوٹس چیک کرتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ''ان تینوں میں سے کسی کے پاس بھی موقع واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت نہیں ہے۔ جب ہمارے سراغ رساں وہاں پہنچے تھے تو ان قائم مقاموں میں سے ایک میکس اے برونو کے گھر پر موجود تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے بعد وہ مارکیٹ چلا گیا تھا، اس نے وہاں سے نقد کچھ سودا لیا اور پھر سیدھا گھر چلا گیا۔

''دوسرے قائم مقام جوائے بی نے دوپہر ڈھائی بجے کے بعد برونو کو فون کیا تھا۔ اس وقت میرے سراغ رساں برونو کے پاس موجود تھے۔ برونو نے اسے بتایا کہ اس کے پاس غیر متوقع مہمان آئے ہوئے ہیں لیکن مہمانوں کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی۔ جوائے بی نے اپنے سیل فون سے کال کی تھی۔ لہٰذا وہ کہیں بھی ہوسکتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی ماں کے گھر پر تھا اور زیٹی میکرونی کی ڈش بیک کررہا تھا۔

''اور تیسرا قائم مقام؟''

''وہ کارل سی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ دو بجے سے چار بجے تک ایک فلم کا میٹنی شو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس سینما کے ٹکٹ کا بچا ہوا حصہ موجود ہے اور وہ فلم کے پلاٹ سے بھی واقف ہے لیکن یہ موقع واردات سے عدم موجودگی کا کوئی حقیقی ثبوت نہیں ہے۔'' پولیس کمشنر نے اپنی میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ ''برونو کے سگریٹ لائٹر کے بارے میں ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ لوگ ہمارے ساتھ کھیل کھیل رہے ہیں، ہمیں جتا رہے ہیں کہ یہ کام انہوں نے کیا ہے اور ہمیں للکار رہے ہیں کہ ہم انہیں پکڑ کر دکھا دیں۔''

شرمین اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ ''اگر آپ برونو کو جیل میں ڈال دیں تو کیا اس کا کاروبار ختم ہوجائے گا؟''

''کاش ایسا ہوسکتا۔'' پولیس کمشنر غصے میں بڑبڑایا۔ ''لیکن ایسا نہیں ہے۔ برونو کے جیل جانے سے اقتدار کا ایک عارضی خلا پیدا ہوجائے گا لیکن چند ہی ہفتوں میں برونو کے قائم مقاموں میں سے کوئی ایک اس کی جگہ گروہ کا اقتدار سنبھال لے گا۔''

''میرے خیال میں ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے یعنی اسے باز رکھ سکتے ہیں۔''

پولیس کمشنر، شرمین کی یہ بات سن کر قدرے کنفیوز سا ہوگیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نے قتل کا مسئلہ حل کرلیا ہے؟''

''جی ہاں۔ باہر سے دیکھنے پر یہ بالکل سہل معاملہ ہے۔''

پولیس کمشنر یہ سن کر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم اس مسئلے کو حل کرسکتے ہو۔ وہ کون ہے؟''

شرمین نے مصلحت پسندی سے جواب دینے کی کوشش کی۔ ''اس میں احساس برتری یا شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ آپ کو للکار رہے ہیں۔ کسی نے بھی کسی کو للکارا نہیں ہے۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارا مطلب ہے کہ برونو کے اپنے قائم مقاموں میں سے کوئی ایک اس قتل کے الزام میں برونو کو پھانسنے کی کوشش کررہا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ صرف وہ تینوں ہی تھے جو اس روز صبح برونو کے گھر سے اس کا سگریٹ لائٹر اٹھا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اینڈی کو قتل کیا، اس کی لاش کے نیچے برونو کا لائٹر رکھ دیا اور یہ آس لگالی کہ باس کے جیل جاتے ہی وہ باس کی جگہ اقتدار سنبھال لے گا۔''

''عمدہ تھیوری ہے۔'' پولیس کمشنر الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہمارے پاس اب بھی تین مشتبہ افراد رہ جاتے ہیں۔''

''نہیں، صرف ایک۔'' شرمین نے جواب دیا۔

''وہ کون ہے؟'' کمشنر نے بےتابی سے پوچھا۔

''قائم مقام کارل سی! باقی دونوں قائم مقاموں کو برونو کے غیر متوقع مہمانوں کے بارے میں علم تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک اینڈی کو قتل کرنے کی پلاننگ کیے ہوئے ہوتا تو وہ اس قتل کو کسی اور دن تک کے لیے مؤخر کردیتا۔ کارل سی ہی وہ قائم مقام تھا جس کی رسائی برونو کے سگریٹ لائٹر تک تھی اور جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ برونو کے پاس موقع واردات سے عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت موجود ہوگا۔''

کمشنر الیگزینڈر شرمین کی ذہانت پر اَش اَش کر اٹھا۔ **

جولیس کسی میگزین کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اس نے شاید سوچا ہوگا کہ میں اسے کسی امکانی کیس کے بارے میں ترغیب دے رہا ہوں کیونکہ ان دنوں اس کے اکاؤنٹ میں کافی پیسے تھے اور اسے کوئی غیر معمولی خرچ بھی نہیں کرنا تھا۔ اس لیے وہ فی الوقت کسی کام کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ بہرحال میں کوشش کرتا رہا اور اسے بتا دیا کہ کریمر کو قتل کے الزام میں

کبھی کبھی ایسے جرم کی سزا بھی مقدر بن جاتی ہے... جو سرے سے سرزد ہی نہ ہوا ہو... وہ پولیس کا اہم افسر تھا... اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اصولوں کا پکا ہے... معمولی سی بے اعتدالی و بے ایمانی اس کی برداشت سے باہر تھی... مگر بے قصور ہوتے ہوئے بھی وہ قتل کا مجرم ٹھہرایا جا چکا تھا...

ایک ہی جگہ کام کرنے والوں کے درمیان پائی جانے والی باہمی چپقلش کا دلچسپ ماجرا

گرفتار کرلیا گیا ہے۔

جولیس نے پھر بھی میگزین پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ بس اتنا کہا۔ ”یہ بعید از قیاس ہے۔“

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن خبر میں یہی بتایا گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ دو دن قبل چیسٹر ہوسکو نامی شخص کو مشرقی بوسٹن میں گولی ماردی گئی۔ تاہم دو گولیاں سینے پر کھانے کے باوجود وہ نائن ون ون کو فون کرنے کے قابل ہو گیا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ پولیس نے کریمر کو ویڈیو دیکھ کر گرفتار کیا۔“

”یہ بھی احمقانہ بات ہے۔“

”چلو مان لیا کہ ایسا ہی ہے۔“

اس مرتبہ جولیس نے میگزین اپنی نظروں سے ہٹایا اور بولا۔ ”اگر یہ کوئی مذاق ہے تو میں اسے گھٹیا ہی کہوں گا۔ میں چاہوں گا کہ تم اپنے اعصابی نظام کی دوبارہ پروگرامنگ کرو تاکہ مستقبل میں ایسا مذاق کرنے کی نوبت نہ آئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو خود دیکھ لو۔ تمام لوکل نیوز اور ویب سائٹس پر یہی خبر چل رہی ہے۔“

جولیس لمحہ بھر کو ہچکچایا پھر اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ ایک مقامی اسٹیشن سے وہی حقائق بتائے جا رہے تھے جن کا میں نے خلاصہ پیش کیا تھا۔ اب میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس خبر پر اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ سراغ رساں مارک کریمر اس گرفتاری سے پہلے قتل کے کئی کیس حل کر چکا تھا اور اس نے ماضی میں جولیس کے ساتھ مل کر قتل کے سات مقدمات کی تحقیقات کی تھیں۔

”یہ بالکل احمقانہ حرکت ہے۔“ جولیس نے پوری خبر سننے کے بعد کہا۔ ”آرچی، معلوم کرو کہ اس وقت وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔“

میں نہیں جانتا تھا کہ جولیس نے یہ سوال کیوں پوچھا لیکن میں نے تھوڑی سی ہیکنگ کر کے اس کا جواب معلوم کر لیا۔ ”اسے آج صبح گرفتار کیا گیا اور اس وقت وہ نوشوا اسٹریٹ جیل کی ایک کوٹھری میں بیٹھا ہوا ہے۔“

جولیس چند لمحوں تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا اور جب وہ اس کیفیت سے باہر آیا تو اس نے مجھے ایک ٹیکسی بلانے کے لیے کہا تاکہ وہ جیل جا سکے۔

”اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے تمہیں کریمر کے بارے میں بتا کر... فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ تمام خبروں کے مطابق ویڈیو ریکارڈنگ اس کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کا بینک اکاؤنٹ بھی چیک کیا ہے۔ اس میں اتنی رقم نہیں کہ وہ تمہاری فیس دے سکے۔“

”تم ٹیکسی کے لیے فون کرو۔“

یہ سن کر میں حیران رہ گیا جبکہ ماضی میں جولیس کے ساتھ کریمر کا جارحانہ رویہ بعض اوقات انتہائی بے ہودہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس تلخی کے باوجود جولیس اس سے ملنے جائے گا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس نے بلویڈر کلب میں سہ پہر گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ مجھے بہت عجیب اور اس کے مزاج کے خلاف لگا لیکن اس کے بعد میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور وہی کیا جو وہ کہہ رہا تھا۔

وہ قارئین جو میرے اور جولیس کے بارے میں نہیں جانتے، وہ یقیناً میرے اعصابی نظام کے بارے میں اس کے تبصرے پر حیران ہو رہے ہوں گے۔ میں اس کا معاون ہونے کے ساتھ اس کا اکاؤنٹنٹ، غیر سرکاری سوانح نگار اور دیگر متفرق کام انجام دینے والا شخص ہوں لیکن میں گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ دو انچ لمبا مستطیل ٹکڑا ہوں جسے غیر معمولی ٹیکنالوجی کے ذریعے بولنے، سننے، محسوس کرنے اور دیگر صلاحیتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جولیس مجھے ایک ٹائی پن کی طرح استعمال کرتا ہے لہٰذا جب میں نے اسے بتایا کہ ایک ٹیکسی اس کے دروازے پر آگئی ہے تو وہ مجھے لے کر کریمر سے ملنے جیل روانہ ہو گیا۔

ملاقاتی کمرے میں جولیس کے ساتھ بیٹھا ہوا کریمر بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو جیل کا لباس ہو سکتی ہے۔ اس نے سوٹ کے بجائے جیل سے ملی ہوئی نیلی قمیص اور ڈانگری پہن رکھی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی ایک وجہ تھی۔ کریمر بھاری تن و توش اور طویل قامت شخص تھا اور اپنے تند و تیز رویے کی وجہ سے اور زیادہ لحیم شحیم لگتا تھا لیکن اس وقت وہ بہت مختصر لگ رہا تھا جیسے سکڑ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کرختگی رہتی تھی لیکن اس وقت وہ مرجھایا ہوا لگ رہا تھا البتہ جولیس کے ساتھ وہ اب بھی بدمزاجی سے پیش آیا۔

”گویا تم مجھے اس حال میں دیکھ کر خوش ہونے آئے ہو؟“ اس نے کہا۔

”نہیں۔“ جولیس متانت سے بولا۔ ”کیا تم نے چیسٹر ہوسکو کو قتل کیا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دو۔ کم از کم یہ معلوم ہو جائے کہ تم بے گناہ ہو اور اگر تم نے جرم کیا ہے تب بھی

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘

اس کی آنکھوں میں جو چمک اُبھری۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ جولیس کو کوئی بہت ہی مختلف بات بتانا چاہتا ہے لیکن اس نے صرف اتنا کہا کہ اس نے ہوسکو یا کسی اور کو قتل نہیں کیا ہے۔

جولیس پوکر کا ماہر کھلاڑی ہے اور اگر کوئی اس کے ساتھ فریب کرے تو فوراً سمجھ جاتا ہے اور اس کے چہرے پر ایک بناوٹی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ لہٰذا جب کریمر نے اپنی بے گناہی کا دعویٰ کیا تو جولیس کے چہرے پر ایسی کوئی مسکراہٹ نظر نہیں آئی اور میں سمجھ گیا کہ کریمر نے ہوسکو کو قتل نہیں کیا۔

’’تم ہوسکو کے گھر کیوں گئے تھے جب یہ قتل ہوا؟‘‘

’’پھر تم میری بات کا یقین کرلو گے؟‘‘

’’مجھے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ یقین نہ کروں۔ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دو۔‘‘

کریمر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’ایک مخبر نے مجھے بتایا تھا کہ ہوسکو کے پاس ایک جیولری کی دکان پر ہونے والی ڈکیتی کے بارے میں معلومات ہیں۔‘‘

’’اس مخبر کا نام بتاؤ۔‘‘

کریمر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اس سے تمہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ میرے دفتر کے ساتھی اسے تلاش کررہے ہیں لیکن وہ نہیں مل رہا۔‘‘

’’گویا وہ روپوش ہے یا مر گیا ہے؟‘‘

کریمر نے اُداسی سے سر ہلا دیا۔

’’اس کے باوجود میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں اور تمہارے ان ساتھی افسروں کے بھی جو اسے تلاش کررہے ہیں۔‘‘

کریمر کو یہ بات پسند نہیں آئی لیکن اس نے ان لوگوں کے نام بتادیے۔

’’خبروں میں بتایا جارہا ہے کہ ویڈیو کی شہادت تمہارے خلاف ہے۔‘‘

کریمر نے کہا۔ ’’کرائم ٹاسک فورس نے ہوسکو کے گھر کی نگرانی کے لیے کیمرے نصب کررکھے تھے۔ انہوں نے مجھے مکان میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے تین منٹ بعد ہوسکو نے نو گیارہ کو فون ملایا۔ اس نے مجھے ڈکیتی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جب میں اس کے گھر سے نکلا تو وہ زندہ تھا۔‘‘

’’لگتا ہے کہ تمہیں پھنسایا گیا ہے۔‘‘

کریمر نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ ’’یہ کوئین کی حرکت معلوم ہوتی ہے تاکہ میری گواہی کے بغیر میگوئر آزاد ہوجائے۔ اس سازش کا یہی مقصد ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے مجھے پوری طرح لپیٹ لیا ہے۔‘‘

جس میگوئر کا وہ حوالہ دے رہا تھا، اس کا پورا نام والٹر میگوئر تھا اور اس کا شمار بلی کوئین کے قابلِ اعتماد ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ اسے کریمر نے پورٹر اسکوائر سیونگز اور لون کو لوٹنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور اس کا مقدمہ دو ہفتے میں شروع ہونے والا تھا۔ اگر کریمر پر قتل کا الزام عائد ہوجاتا تو میگوئر کے خلاف اس کی گواہی ناقابلِ قبول ہوتی اور عدم ثبوت کی بنا پر وہ بری ہوجاتا۔ بلی کوئین بوسٹن کا بدنام ترین جرم کا بادشاہ تھا۔ اب میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ جولیس کا کھیل کیا ہوگا۔ بلاشبہ وہ کریمر کو انصاف دلانے کی خاطر لڑ سکتا ہے لیکن یہ بھی چاہے گا کہ اسے اس کوشش کا معقول معاوضہ ملے جبکہ کریمر سے اسے زیادہ فیس ملنے کی امید نہیں تھی۔

جولیس نے پوچھا۔ ’’تمہارے خیال میں کیا ہوا ہوگا؟‘‘

کریمر نے جولیس کو بتایا کہ قاتل ضرور ہوسکو کے گھر میں چھپا ہوا تھا جب وہ وہاں گیا۔ ’’پولیس کے آنے سے پہلے وہ وہاں سے چلا گیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو یہی ہوا ہے۔‘‘ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’دیکھو جولیس۔ کم از کم تم تو یہ سمجھتے ہو کہ میں اس بارے میں سچ بول رہا ہوں لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہاری فیس ادا کرسکوں۔‘‘

’’میں تم سے فیس نہیں مانگ رہا۔‘‘

کریمر نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ’’لیکن میں تمہارا احسان بھی لینا نہیں چاہتا۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو۔‘‘

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہا۔‘‘

سراغ رساں مائیک جیف اس قتل کے کیس میں سراغ رساں ٹیم کی سربراہی کررہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس قتل کی اطلاع ملنے کے بعد سے وہ ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکا تھا۔ جولیس نے اس کے سامنے کافی کا کپ اور اطالوی بسکٹ رکھے۔ اس نے بسکٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

’’مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا جب کوئی پولیس آفیسر جرم کرے۔‘‘

’’کریمر کا کہنا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔‘‘

’’اس کا کوئی امکان نہیں۔‘‘ اس نے تھیلے میں سے ایک بسکٹ نکالا اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ’’اب وہ تم سے کہہ رہا ہے کہ اسے بے گناہ ثابت کرو۔‘‘

اس نے اپنی میز پر سے ایک فولڈر اٹھایا اور اس میں سے دو تصویریں نکال کر جولیس کو دیتے ہوئے کہا۔ ''متوفی چیسٹر ہوسکو ان مکانوں کی درمیانی قطار میں رہتا تھا جو پہلی تصویر میں نظر آرہی ہے۔ اس میں صرف سامنے اور عقب سے آنا جانا ہوسکتا ہے۔ اطراف میں کوئی کھڑکی نہیں جس سے آنا جانا ممکن ہو۔ ویڈیو کیمرے انہی راستوں پر لگے ہوئے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو واحد شخص ہوسکو کو قتل کرسکتا ہے وہ کریمر ہی ہے۔''

''کریمر کا کہنا یہ ہے کہ قاتل پہلے سے مکان میں چھپا ہوا تھا اور بعد میں فرار ہوگیا۔''

جیف مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ایسا نہیں ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ کوئی بڑا مکان نہیں ہے، اس کا رقبہ بمشکل تیرہ سو مربع فٹ ہوگا اور میں نے اسے پوری طرح چیک کیا تھا۔ یہاں تک کہ میں ایک کتے کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں کوئی چھپا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اس گھر میں باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہے۔''

''تمہارے خیال میں اس قتل کا محرک کیا ہوسکتا ہے؟ کیا وہ بلی کوئین کی وجہ سے مارا گیا؟''

''ممکن ہے لیکن میرا خیال ہے کہ غالباً کوئین کے دشمنوں نے اس کا حکم دیا ہوگا کیونکہ وہ اس کا خاص آدمی تھا۔ حالانکہ بے چارے چیسٹر کے حالات بہت خراب تھے اور میں نے یہاں تک سنا ہے کہ کوئین اس سے ناراض رہنے لگا تھا۔''

''اگر یہ قتل معاوضہ لے کر کیا گیا ہے تو کریمر کے پاس وہ رقم ہوگی۔''

''وہ بہت ہوشیار ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اس نے رقم کہیں چھپادی ہے۔ منصوبہ برا نہیں تھا البتہ قسمت خراب تھی کہ ہوسکو کی نگرانی کے لیے کیمرے لگے ہوئے تھے ورنہ وہ قتل کرکے نکل جاتا۔ میں ابھی تک یہ پتا نہیں لگا سکا کہ اس نے آلۂ قتل کہاں پھینکا ہے۔''

''کون سا آلہ؟''

جیف نے ایک اور بسکٹ اٹھایا اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''گولیوں کے خول مل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واردات میں اے۔ چالیس کا ریوالور استعمال کیا گیا ہے۔ کسی پڑوسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی جس کا مطلب ہے کہ ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔ ''تم اس کیس میں اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔''

''ہوسکو کا قتل دو روز پہلے ہوا۔ اگر اخباری اطلاعات کو درست مان لیا جائے تو نو گیارہ، نو بج کر سینتالیس منٹ پر فون کیا گیا لیکن کریمر کو تم نے گزشتہ شب گرفتار کیا۔ اس میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟''

''ٹاسک فورس نے گزشتہ روز دو بجے ویڈیو کے بارے میں مجھ سے رابطہ کیا۔ اسے دیکھنے کے بعد میں نے مزید آٹھ گھنٹے گزار دیے کیونکہ معاملہ ایک پولیس آفیسر کی گرفتاری کا تھا لیکن یہ تاخیر کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔''

''کیا میں وہ ریکارڈنگ دیکھ سکتا ہوں؟''

جیف نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تمہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اگر تم سوچ رہے ہو کہ قاتل ہمارے پہنچنے کے بعد بھیس بدل کر وہاں سے چلا گیا تو ایسا نہیں ہوا۔ میں نے چیک کیا ہے اور ہر اس شخص پر نظر رکھی جو وہاں سے گیا۔''

''اس کے باوجود مجھے اس ویڈیو سے کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے۔''

جیف نے مزید بحث نہیں کی اور جب اس نے اپنے کمپیوٹر میں وہ ویڈیو لگائی تو جولیس نے لکھنے کے لیے کاغذ مانگا۔ اس نے پہلا نوٹ میرے لیے لکھا۔ ''چیک کرو کہ ویڈیو میں کوئی ردوبدل تو نہیں کیا گیا۔''

''تم کیا چاہتے ہو۔ میں ویڈیو کہاں سے شروع کروں۔'' جیف نے پوچھا۔ ''کیسا رہے گا اگر میں کریمر کے وہاں پہنچنے سے آغاز کروں؟''

''یہی ٹھیک رہے گا۔''

جیف نے مطلوبہ جگہ تلاش کرکے ویڈیو چلادی۔ جب کیمرا مکان کے سامنے والے حصے کو فوکس کررہا تھا تو کریمر کی صرف پشت نظر آئی۔ وہ فرنٹ ڈور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس ویڈیو کے مطابق اس وقت نو بج کر اکتیس منٹ اور بیالیس سیکنڈ ہوئے تھے۔ تیس سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور وہ مکان کے اندر چلا گیا۔ اگلے بارہ منٹ اور آٹھ سیکنڈ تک کوئی قابلِ ذکر بات نظر نہیں آئی پھر نو بج کر چوالیس منٹ اور تیرہ سیکنڈ پر کریمر باہر آیا۔ اب اس کے چہرے کا رخ کیمرے کے سامنے تھا۔ اس کے بعد نو بج کر چوالیس منٹ اور اکیس سیکنڈ پر کریمر ویڈیو سے غائب ہوگیا پھر میں نے نو بج کر چھیالیس منٹ اور تین سیکنڈ پر جولیس کو ویڈیو میں تیئس ملی سیکنڈ کے وقفے کے بارے میں بتایا۔ ''گو کہ یہ کوئی بڑا وقفہ نہیں ہے لیکن اس کا ہونا معنی رکھتا ہے۔''

جولیس نے ایک اور نوٹ لکھا۔ ”بہت اچھے، اب دوسرا کلپ دیکھو۔“

اس کی توقع کے مطابق نو بج کر اڑتالیس منٹ اور اٹھارہ سیکنڈ پر دوسرا وقفہ بھی نظر آ گیا۔ پہلے کی طرح یہ بھی بہت چھوٹا یعنی صرف ایک ملی سیکنڈ کا تھا اور ویڈیو کے فارنسک تجزیے کے بغیرا سے کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جولیس کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”کسی نے اس ویڈیو کی ایڈیٹنگ کی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان دونوں وقفوں کے درمیان کی ویڈیو کسی دوسری سے تبدیل کی گئی ہے جو کسی اور رات اسی وقت چل رہی تھی۔ بہر حال یہ کام بڑی صفائی سے کیا گیا ہے۔“

جولیس نے ایک گہرا سانس لیا اور جیف سے کہا کہ وہ ویڈیو روک دے پھر اس نے اس سیل فون کے بارے میں پوچھا جو ہوسکو نے نائن الیون فون کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ”اخباری اطلاع کے مطابق اس نے ڈسپوزیبل فون استعمال کیا تھا۔“

”کیا واقعی اخبار میں یہ لکھا ہے؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“ جولیس نے کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ مجھ سے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“

”نہیں، تم نے کچھ غلط نہیں سنا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ خبر ان تک کیسے پہنچ گئی۔ ہاں، اس نے برنر فون استعمال کیا تھا اور یہ واحد چیز ہے جس پر اس کی انگلیوں کے نشان ہیں۔“

”تمہاری تھیوری یہ ہے کہ اس کے پاس یہ ڈسپوزیبل فون تھا اور گولی لگنے کے باوجود وہ اس قابل تھا کہ جیب سے فون نکال کر نو گیارہ کو فون کر سکے لیکن کچھ کہے بغیر ہی اس نے دم توڑ دیا۔“

”ہاں، میری یہی تھیوری ہے۔“

”کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگی کہ اس نے اسمارٹ فون کے بجائے برنر فون کا استعمال کیا، اس کی عمر صرف تینتیس سال تھی اور اس عمر کے لوگ عام طور پر اسمارٹ فون رکھتے ہیں۔ آج کل تو یہ لازمی ہو گیا ہے۔“

”ضروری نہیں ہے۔ وہ ایک چھوٹے درجے کا بدمعاش تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس برنر پر کسی کے فون کا انتظار کر رہا ہو۔“

”کیا اس کے پاس یا گھر میں اسمارٹ فون ہے؟“

جیف نے پہلے تو اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ وہ اسے غیر متعلق سمجھ رہا تھا پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنی میز سے ایک فولڈر نکالا اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے بولا۔ ”اس کے پاس اسمارٹ فون نہیں تھا اور نہ ہی ہمیں جائے وقوعہ سے کوئی فون ملا۔ میں اس کے گھر باوردی پولیس والے بھیجوں گا تاکہ وہ ایسا فون تلاش کر سکیں۔ تم سوچ رہے ہو کہ کریمر نے اس کا اسمارٹ فون لے لیا کیونکہ اس میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے اس پر الزام آ سکتا تھا۔“

”اگر ہوسکو کے پاس اسمارٹ فون ہے اور اب وہ غائب ہے تو لگتا ہے کہ کوئی اسی وجہ سے اسے اپنے ساتھ لے گیا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہ کریمر تھا۔“

میں جولیس کا اشارہ سمجھ گیا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ہوسکو کے پاس اسمارٹ فون تھا یا نہیں۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں تین سو ملی سیکنڈ لگے کہ اس کے پاس اسمارٹ فون تھا۔

جیف نے کہا۔ ”میں تم سے متفق ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہوسکو کے پاس اسمارٹ فون تھا تو اب وہ کہاں ہے۔ تمہارا کہنا صحیح ہے۔ اس میں کوئی مفید معلومات ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس سے کریمر کی موجودہ حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”بشرطیکہ ویڈیو میں تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ ایک فارنسک اسپیشلسٹ ہی تمہیں اس بارے میں بتا سکتا ہے۔“ جولیس نے کہا۔

تین گھنٹے بعد جولیس، جیف اور کرائم ٹاسک فورس کے تین اراکین پولیس اسٹیشن کے کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تین اراکین کے نام کارل گراہم، سارہ فسکی اور ایڈورڈ لینڈرین تھے۔ گراہم کی عمر سینتالیس سال تھی۔ اسے پولیس کی ملازمت کرتے ہوئے بیس سال ہو گئے تھے جن میں بارہ سال اس نے سراغ رساں کی حیثیت سے کام کیا۔ سارہ چونتیس سال کی تھی۔ اس کے بال سیاہ اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ کسی اداکارہ کی طرح پرکشش تھی۔ وہ بھی چھ سال سے سراغ رساں کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ایڈورڈ انتالیس سال کا تھا۔ اس نے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا اور وہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ویڈیو ٹیکنیشن کے طور پر کام کر رہا تھا۔

سارہ اور ایڈورڈ میز پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ کارل گراہم دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا ہوا جیف کو گھور رہا تھا جیسے وہ اپنے خیالات اس کے دماغ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تم ہمیں یہ بتانے جا رہے ہو کہ کریمر بے گناہ ہے۔“ گراہم نے کرخت آواز میں کہا۔ ”ہم نے تمہیں وہ ویڈیو اس لیے دی تھی کہ تم اس کیس کو نمٹا سکو اور تم ہمیں یہ بتا رہے ہو؟“ اس نے دونوں ہاتھ سینے سے ہٹا لیے اور غصے سے مٹھیاں بھینچ

لیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جیف بلکہ جولیس پر بھی حملہ کرنے والا ہے۔ شاید وہ ایسا کر گزرتا اگر سارہ اسے پُرسکون رہنے کے لیے نہ کہتی۔

''کارل، ہمیں ان کی بات بھی سننی چاہیے۔''

''تم مذاق کر رہی ہو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے ان دونوں جوکروں نے ہمیں یہاں آنے کا حکم دیا۔''

''ہم نے تمہارے آفیسر سے درخواست کی تھی کہ تم اپنی دستیابی کو یقینی بناؤ۔'' جیف نے جواب دیا۔

''اور پھر ہمیں بتاؤ کہ کریمر بے گناہ ہے اور ہم پر ویڈیو میں جعل سازی کا الزام لگاؤ۔''

جولیس نے کہا۔ ''میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم تم پر ویڈیو میں جعل سازی کا الزام نہیں لگا رہے۔ سراغ رساں کریمر درحقیقت ہوسکو کے گھر میں داخل ہوا اور چلا گیا جیسا کہ ویڈیو میں دکھایا گیا ہے لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ویڈیو میں تبدیلی کی گئی ہے۔''

گراہم نے غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں کہ تم کس طرح کھیلتے ہو۔ کریمر نے تمہیں کوڑے کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا ہے۔''

''اور وہ کوڑا کیا ہو سکتا ہے؟''

گراہم غصے سے بولا۔ ''تم ہوسکو کا قتل ہم پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

جولیس نے جیف کی طرف دیکھا پھر کارل گراہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ تم سب پر نہیں۔ فی الحال فرض کر لیتے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایک اس کا ذمے دار ہے۔ حالانکہ سراغ رساں جف کو اس امکان پر غور کرنا چاہیے کہ تم میں سے دو یا تین لوگوں نے ان کے قتل کی سازش کی۔ میں نے جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کیا کہ صرف چیسٹر ہوسکو کا ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ولی میک کارلے نام کا ایک خفیہ مخبر بھی مارا گیا۔ چالیس منٹ پہلے اس کی لاش ایک چرائی ہوئی کار کی ڈکی سے ملی ہے جو کہ لینڈ ایونیو پر کھڑی ہوئی تھی اس کے سینے میں بھی دو گولیاں ماری گئیں کیونکہ میک کارلے نے ہی کریمر کو ہوسکو کے مکان پر بھیجا تھا۔ اس لیے بظاہر یہی لگتا ہے کہ ہوسکو کے قاتل نے ہی اسے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا اور پھر اسے بھی قتل کر دیا تا کہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے۔''

''تم جھوٹے مکار شخص......''

سارہ نے اپنے ساتھی کو روکا اور بولی۔ ''ویڈیو کیسے تبدیل کی گئی؟''

''دو منٹ اور بارہ سیکنڈ کی جگہ کسی اور رات کی ویڈیو کا ٹکڑا لگا دیا گیا۔ تبدیل شدہ ویڈیو کریمر کی روانگی کے ایک منٹ پچاس سیکنڈ بعد شروع ہوتی ہے گو کہ وقفے کا وقت ملی سیکنڈ میں ہے لیکن فارنسک کے ماہرین کے لیے کافی ہے۔''

''تم سمجھ رہے ہو کہ کسی نے ایڈیٹنگ کر کے اصل قاتل کو ویڈیو سے نکال دیا ہے؟''

جولیس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔''

''اور تمہارا خیال ہے کہ وہ ہم تینوں میں سے کوئی ایک ہے؟''

جولیس نے ایک بار پھر کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ کام ہوا تو صرف تم تینوں ہی کی اس ویڈیو تک رسائی تھی۔''

ایڈورڈ بولا۔ ''میں نے یہ کام نہیں کیا۔ اس ویڈیو کو ایڈٹ کرنے کے لیے کسی ماہر کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہی کہنا چاہ رہا تھا۔''

سارہ بولی۔ ''اگر ایسا ہوا تو کریمر پر الزام کیوں آیا؟''

''تا کہ سراغ رساں کریمر گواہی دینے کے قابل نہ رہے اور والٹر میگویئر دو ہفتے بعد جیل سے باہر آ جائے۔ بظاہر یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بلی کوئین نے اپنے دستِ راست کو بینک لوٹنے کے الزام سے بچانے کے لیے یہ انتظام کیا ہے۔''

''بہت خوب! گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم میں سے کوئی ایک کوئین کے لیے کام کر رہا ہے۔''

''ہاں، کسی شبے کے بغیر میں کہہ سکتا ہوں کہ سراغ رساں جیف تم میں سے کسی ایک کا تعلق کوئین کے ساتھ تلاش کرے گا۔ چاہے وہ شخص کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو۔ خوش قسمتی سے اس کیس کو حل کرنے کا ایک تیز رفتار طریقہ بھی ہے۔ قاتل نے ہوسکو کو گولی مارنے کے بعد مختلف بہانے تلاش کیے۔ وہ اپنے ساتھ اس کا اسمارٹ فون بھی لے گیا تا کہ سب یہی سمجھتے رہیں کہ اس کے پاس فون نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے برزفون سے نو گیارہ کو کال ملائی۔ بعد میں اس نے اسمارٹ فون توڑ کر واشنگٹن اسٹریٹ کے پیچھے کوڑے دان میں پھینک دیا لیکن وہ پوری طرح بیکار نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس نے سم کارڈ نکالا تھا۔ اسی لیے جیف اسے ڈھونڈنے کے قابل ہو سکا۔''

جیف نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فارنسک کے لوگ اس کا معائنہ کر رہے ہیں اور اس سے ہونے والے یا

موصول شدہ تمام پیغامات اور فون کالز کی فہرست مرتب کی جارہی ہے۔''

''اگر تم اس سے بھی کوئین کے آلۂ کار تک نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا؟'' سارہ نے پوچھا۔

جولیس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''قاتل نے فون پھینکتے ہوئے ایک بڑی سنگین غلطی کی تھی۔ جیف! کیا تم اس کی وضاحت کرنا پسند کرو گے؟''

جیف نے سر ہلایا اور باری باری تینوں اراکین کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم میں سے جس کسی نے بھی فون پھینکا۔ اس نے اس جگہ کا انتخاب اسی لیے کیا کہ وہاں نگرانی کے لیے کیمرے نصب نہیں ہیں لیکن ایک پان شاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سیکیورٹی کیمرے کی زد میں آگیا۔ اس وقت میرا ایک افسر اس سیکیورٹی ریکارڈنگ کو دیکھ رہا ہے۔''

اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''وہ کسی وقت بھی مجھے فون کر کے بتائے گا کہ تم میں سے کون کیمرا چھیننے اس علاقے میں گیا تھا۔''

سارہ نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے گھوم کر گراہم کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے تھے۔

''وہ تم تھے۔'' سارہ نے کہا۔

گراہم نے کئی بارہ پلکیں جھپکائیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کیسی باتیں کررہی ہو؟''

''تم کوئین کے لیے کام کرتے رہے ہو۔ جب کبھی کوئی موقع آیا تو تم غائب ہوگئے اور کوئین ہم سے آگے نکل گیا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے یہی ہورہا ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

گراہم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟''

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی لیکن لڑکھڑا گئی یا کم از کم اس نے ایسا ظاہر کیا۔ دراصل وہ اپنا کولٹ اعشاریہ پچیس کا آٹومیٹک ریوالور نکال رہی تھی جو اس نے اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے ہولسٹر میں چھپا رکھا تھا۔ گراہم اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالتی، جولیس اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے پل بھر میں اسے قابو کرلیا۔ وہ دونوں اگلے پانچ سیکنڈ تک فرش پر گتھم گتھا رہے جب تک کہ اس نے سارہ کو ریوالور سے دور نہیں کردیا۔ پھر گراہم آگے بڑھا اور اس نے سارہ کے ہاتھ پشت سے باندھ دیے پھر جولیس کے ساتھ مل کر اسے اپنے قدموں پر کھڑا کیا اور بولا۔

''جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، کیا وہ سچ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''تم ایک پولیس آفیسر کو پھنسانے اور کوئین کے لیے قتل کرنے کی مرتکب ہوئی ہو؟''

سارہ نے ایسے منہ بنایا جیسے وہ اس کے منہ پر تھوکنا چاہ رہی ہو۔ اس وقت اس کے چہرے کی ساری کشش غائب ہو چکی تھی۔ ''تم اپنے قد سے بڑی باتیں کررہے ہو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

اس رات جولیس اپنے لیے سینڈوچ تیار کررہا تھا جبکہ میں کئی گھنٹوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ اگر جولیس پھرتی دکھا کر سارہ کو گن سے دور نہ کرتا تو وہ کیا کرنے والی تھی۔ بالآخر میں نے جولیس سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا وہ تم سب کو گولی ماردیتی؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''فرض کرلیتے ہیں کہ وہ گولی چلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ پھر کیا ہوتا؟ اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ پولیس والوں کا گھیرا توڑ کر نکل جائے گی؟''

''وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک ایسے گھبرائے ہوئے جانور کی طرح لگ رہی تھی جو اپنی جان بچانے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ اگر تم اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی خونخواری دیکھ لیتے جب میں اس سے ریوالور چھیننے کی کوشش کررہا تھا۔''

جولیس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ سکا جو جولیس بتا رہا تھا کیونکہ جب جولیس فرش پر گرا تو سارہ کا جسم میرے سامنے آگیا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ اس نے تمہارے جھوٹ پر یقین کرلیا۔''

جولیس نے کہا۔ ''وہ ایک جوا تھا لیکن اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہمیں ہوسکو کا فون مل گیا ہے۔ اسے یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ پان شاپ کے سامنے سے گزری تھی اور یہ کہ ہم نے وہاں پر نصب سیکیورٹی کیمرے کے بارے میں سچ بولا تھا۔''

''اگر وہ تمہارا جھوٹ پکڑ لیتی تو کیا ہوتا؟''

''ممکنہ طور پر اس اسمارٹ فون میں ایسی باتیں تھیں جن سے اس کی جانب اشارہ مل سکتا تھا۔ ورنہ گراہم اپنی طرف سے یہ جاننے کی ضرور کوشش کرتا کہ ان میں سے قاتل کون ہے۔ شاید وہ کوئی گواہ تلاش کرلیتا جس نے میک کارلے کو قتل ہوتے دیکھا ہو یا کسی نے اس کی لاش کو کار میں رکھتے دیکھا ہو جو کہ لینڈ ایونیو پر کھڑی ہوئی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں ہے شاید

کوئین نے اپنے کسی ساتھی کے ذریعے میک کارلے کو قتل کروایا ہو۔ جیف کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کوئین نے سارہ کو مختلف اوقات میں کتنی رقم دی جسے ثابت کرنا مشکل ہوسکتا ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم اس معاملے میں کیوں پڑ گئے؟"

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ میں نے پہلے بتایا تھا کہ کریمر کا قاتل ہونا بعید از قیاس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مان لیا کہ تم سچ کہہ رہے ہو لیکن تم ہمیشہ اپنی دماغی صلاحیتوں کے استعمال کا معقول معاوضہ لیتے ہو لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس بار یہ ممکن ہوگا۔"

"آرچی، میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کریمر نے اس شخص کو قتل نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ اسے پھنسایا جا رہا تھا اور میرے لیے یہ خیال ہی اتنا ناگوار تھا کہ میں اس کیس میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ ایک مخبر نے اسے ہوسکو کے مکان پر بھیجا تھا تو میں سمجھ گیا کہ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اگر اس نے قتل کیا ہوتا تو وہ مجھے میک کارلے کا نام بتانے سے انکار کر دیتا۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس نے میک کارلے کا نام اس لیے لیا ہوتا کہ ہوسکو کے گھر جانے کا جواز پیش کر سکے۔"

"ایسا کر کے وہ میک...... کو بلیک میل کرنے کا موقع دیتا۔ اگر کریمر قصوروار ہوتا تو وہ کسی کو بھی ہوسکو کے گھر جانے کے بارے میں نہ بتاتا اور نہ ہی مجھے اس مخبر کا نام بتاتا جو اس کی تردید کر سکتا تھا۔ جب میں اس حقیقت کو جان گیا کہ کریمر بے گناہ ہے تو میں اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوگیا۔"

میں کچھ کہنے والا تھا کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے ویب کام سے دیکھا اور بولا۔

"کریمر آیا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیے کوئی تحفہ لے کر آیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کاغذ کا تھیلا ہے لیکن وہ ایسے شخص کے مانند خوش نظر نہیں آیا جسے الزام سے بری کر دیا گیا ہو۔"

کریمر نے اپنا وہی سوٹ پہن رکھا تھا جس میں اسے ہمیشہ میں نے دیکھا۔ وہ کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا۔ اس کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

"مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی کریمر۔"

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔" اس نے جولیس کی طرف تھیلا بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں تمہاری پسندیدہ کافی ہے۔"

"شکریہ۔ میں اسے ڈنر کے بعد پیوں گا۔ کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گے؟"

"نہیں شکریہ۔ پچھلے چوبیس گھنٹے مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ اب میں آرام کروں گا۔ میں صرف تمہارا شکریہ ادا کرنے اور یہ کہنے آیا ہوں کہ تمہاری پوری فیس ادا کر دوں گا ممکن ہے کہ قسطوں میں دینا پڑے۔"

"اس میں میرا کچھ خرچ نہیں ہوا۔ نہ ہی مجھے زیادہ محنت کرنا پڑی پھر ہمارے درمیان کوئی معاوضہ طے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے کوئی امید نہیں لگائی اور نہ ہی میں کچھ قبول کروں گا۔ سوائے اس تحفے کے جو تم میرے لیے لائے ہو۔"

کریمر نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہارا کوئی احسان نہیں لوں گا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

کریمر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم معاوضہ نہیں لینا چاہتے کا رڈ مجھے بل بھیج دینا، میں اس کے لیے تمہاری خوشامد نہیں کروں گا۔"

کریمر جانے کے لیے مڑا پھر رکتے ہوئے بولا۔ "جیف نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم نے یہ کیس کس طرح حل کیا اور یہ میرے سینے پر بوجھ ہے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ تم جیف کے پاس جانے سے پہلے اس ویڈیو کی کاپی حاصل کر چکے تھے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں بھی یہ ثابت کر سکا کہ تم نے کسی ذریعے سے یہ ویڈیو حاصل کی تھی تو تمہیں پولیس کی شہادت چرانے کے الزام میں جیل بھیج دوں گا۔"

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ "ضرور، تم جو چاہو کرو۔"

"دیکھا جائے گا۔" کریمر جاتے جاتے ایک بار پھر مڑ گیا۔ "دفع کرو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے ساتھ ڈنر ضرور کروں گا۔ کیا تمہارے پاس بیئر ہے۔ میں شراب نہیں پیتا۔"

"بالکل ہے۔" جولیس نے کہا اور اسے لے کر اندر آ گیا۔ جولیس میں یہی خوبی ہے کہ اسے لوگوں کو رام کرنے کا فن آتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی بھی کریمر جیسے ٹیڑھے اور بااصول شخص کی مدد نہ کرتا اور کریمر ایک ایسے جرم کی سزا بھگت رہا ہوتا جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ میرا اس معاملے میں کہیں ذکر نہیں آیا جبکہ میں نے ہی ویڈیو میں تبدیلی کی نشاندہی کی تھی ورنہ کوئی بھی اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔

فراڈ و بلیک میلنگ کی سازش میں ملوث افراد کی گھناؤنی کارروائیاں......

سودے بازی ایک فن ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں... جرم کرنے کے لیے ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے... ان لوگوں نے بھی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے نہایت شاطرانہ منصوبہ بندی کی تھی... ان کا کھیل بڑی کامیابی سے جاری و ساری تھا مگر بالآخر ایک سوداگر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا...

سودا

تنویر ریاض
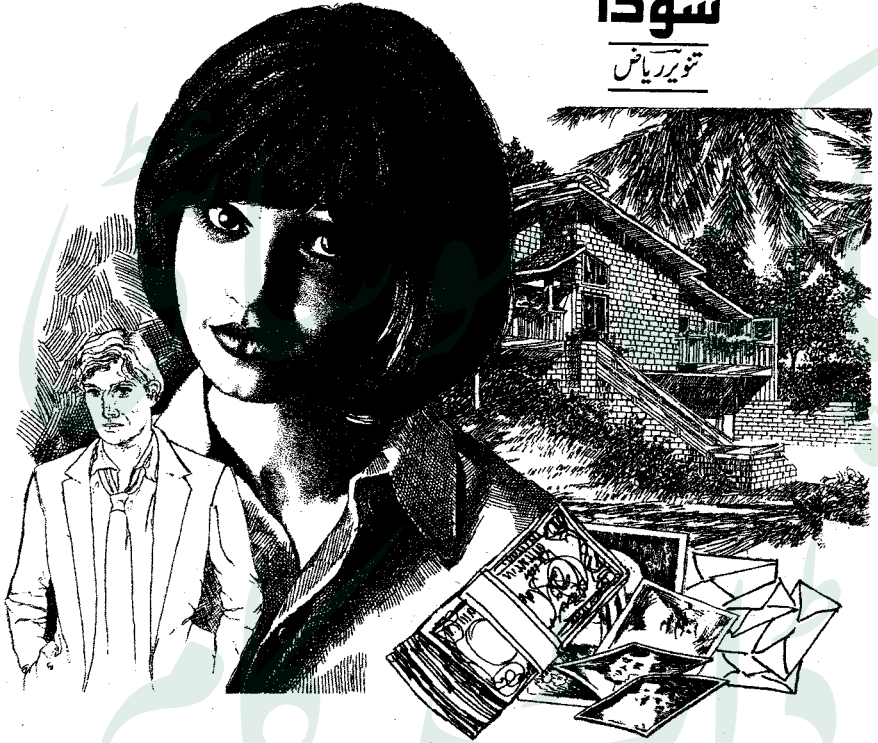
بوبی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کون سی مجبوری ہینک لینگبورن کو سمز انوسٹی گیشن کے دروازے پر لے آئی تھی۔ سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی زوردار دھمک نے بوبی کو دوپہر کی نیند سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک زوردار جمائی لی اور میز کے نیچے سے بوٹ نکال کر پہن لیے اور ٹھنڈی کافی کا گھونٹ لے کر دروازے پر نظریں جما دیں۔ ایک آدمی آدھی آستینوں کی سفید قمیص اور نئی جینز پہنے اندر داخل ہوا۔ بوبی اسے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور

مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔
''خوش آمدید ہنک! کیسے ہو؟''
آنے والے ملاقاتی کا جسم پہلے کے مقابلے میں سکڑ گیا تھا لیکن اس کے ہاتھوں کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔
بوبی نے اسے تین سال پہلے دیکھا تھا لیکن اب اس کا وزن پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی بیماری اسے اندر ہی اندر گھلا رہی ہے۔
''ان سیڑھیوں پر چڑھنا کسی مشقت سے کم نہیں۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔ ''لفٹ کیوں کام نہیں کر رہی؟''
''جارج مچھلیاں پکڑنے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس کے آنے پر ہی یہ لفٹ ٹھیک ہو گی۔ یہ کہہ کر اس نے ہنک کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اپنی کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔
''میں ایک مشکل میں ہوں۔'' ہنک نے کہا۔
''میں نہیں سمجھتا کہ تم صرف کافی پینے یہاں آئے ہو گے۔''
''ہاں، کافی ٹھیک رہے گی۔''
بوبی نے کافی کا برتن دھوتے ہوئے پوچھا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟''
''ایک عفریت میری چھت پر بیٹھ گیا ہے۔''
بوبی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم نے ماسٹر پیس تھیٹر دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''
''یہ کوئی پرانی کہانی نہیں بلکہ اصلی عفریت ہے۔ اس سے بھی بدتر۔ اور یہ جو کوئی بھی ہے، میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک لفافہ نکالا اور بولا۔ ''یہ دیکھو۔''
بوبی نے لفافے میں رکھی چیزیں میز پر پھیلا دیں۔ وہ سب مختلف کاغذات کی نقول تھیں۔ ان میں سے پہلا کاغذ لیجر میں شائع ہونے والا ایک مضمون تھا جس میں ایک نوجوان لڑکا سائیکل چلاتے ہوئے کسی گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہو گیا تھا۔ اس پر سرخ روشنائی سے سیلینا اور اس کے آگے سوالیہ نشان لگا ہوا تھا۔
''سیلینا تمہاری نواسی ہے۔''
''ہاں، ابھی وہ صرف بارہ سال کی ہوئی ہے۔''
دوسری تصویر میں ایک نوجوان لڑکی ہیلمٹ لگائے سڑک پر بائیک چلا رہی تھی۔ تیسرا کاغذ بھی لیجر میں چھپنے والا ایک مضمون تھا جس میں ایک بارہ سالہ لڑکے کے بارے میں بتایا گیا تھا جو اپنے خاندانی تالاب میں بجلی کا جھٹکا لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی کی تصویر پن کی گئی تھی جو تالاب کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس پر بھی سرخ روشنائی سے سیلینا کا نام اور سوالیہ نشان لگا ہوا تھا۔ چوتھی تصویر بھی اسی لڑکی کی تھی جس نے پارٹی ڈریس پہن رکھا تھا اور وہ کچھ تھوک رہی تھی۔ اس پر بھی سرخ روشنائی سے پیغام درج تھا۔ ''اگلی بار اسے زہر دیا جائے گا۔ ورنہ ایک لاکھ ڈالر اسی جگہ اور اسی وقت رکھ دو۔''
''سیلینا کو تیز مسالے دار چٹنی کے ساتھ چاکلیٹ کھانے کی عادت تھی۔ یہ آخری خط تین دن پہلے ملا ہے لیکن کیرول نے مجھے آج صبح دکھایا۔ اسی وقت سے مراد ہفتے کی صبح ہے۔''
''آج جمعرات ہے۔ اس لحاظ سے تو مجھے بہت کم وقت مل رہا ہے۔''
''جو کچھ بھی ہو لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ کیرول اس سے پہلے دو مرتبہ ادائیگی کر چکی ہے گو کہ وہ چھوٹی رقمیں تھیں۔ ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری بار اس نے بیس ہزار ڈالر دیے۔''
''مضمون کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کی ٹکر والا معاملہ دو سال پرانا ہے تو کیا یہ سلسلہ اسی وقت شروع ہو گیا تھا؟''
''اس کے تین ماہ بعد کیرول کو یہ مضمون اور سیلینا کی بائیک چلاتے ہوئے تصویر ملی۔ اس کے ساتھ ہی دس ہزار ڈالر نقد کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا جو اس نے پورا کر دیا۔ گزشتہ موسم گرما میں بیس ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ تصویر انکل ٹیٹ کے مکان پر چار جولائی کو لی گئی تھی۔ کیرول نے وہ رقم بھی ادا کر دی۔ آخری تصویر ہمارے گھر لی گئی جو سیلینا کی بارھویں سالگرہ کی ہے۔ اب وہ کمینہ ایک لاکھ ڈالر مانگ رہا ہے۔''
''تم دیگر خطوط اور مطالبات کے بارے میں نہیں جانتے؟''
''کیرول کے پاس اپنا پیسا بہت ہے۔ کیوٹا کی ڈیلر شپ اسی کے نام پر ہے اور وہ اپنے معاملات میں بہت ہوشیار ہے۔ اگر وہ مجھے اسی وقت بتا دیتی جب پہلا خط ملا تھا تو یہ نوبت نہیں آتی۔''
''کیا وجہ تھی۔ اس نے تمہیں کیوں نہیں بتایا؟''
''اس نے سوچا ہو گا کہ میں کسی کو گولی نہ مار دوں یا زنجیر سے مارنا شروع نہ کر دوں، جب میں غصے میں ہوتا ہوں تو وہ میرے بارے میں ایسی ہی باتیں سوچتی ہے۔''
''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

”معلوم کر کے مجھے بتاؤ کہ یہ کون کر رہا ہے؟“
بوبی نے ایک نگاہ تصویروں پر ڈالی پھر اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی شخص کو مرنے کے لیے تلاش نہیں کر سکتا۔“
”میں اسے قتل نہیں کروں گا۔“
”اور بھی کئی طریقے ہیں۔ مثلاً وہ غائب ہو جائے یا اسے کوئی حادثہ پیش آجائے۔“
”میری طرف سے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم سے زیادہ یہاں کے لوگوں کو کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی کوئی اس کام کو خاموشی سے کرے گا۔ اگر میں شیرف کو یہ سب بتا دوں تو کل کے اخبار سے مجھے ڈھیروں شہرت مل جائے گی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا اور نہ ہی اسے برداشت کر سکتا ہوں۔“
”تم شیرف کے دفتر میں ریے بس سے بات کرو۔ وہ اس کی پبلسٹی نہیں ہونے دے گا۔“
”بوبی، میں مر رہا ہوں۔ مجھے ہڈیوں کا کینسر ہو گیا ہے۔ گزشتہ ہفتے میری ایک پسلی میں کریک آگیا۔ کسی بھی لمحے بستر سے لگ سکتا ہوں۔“
بوبی نے کم از کم کینسر کی حد تک اس کی بات پر یقین کر لیا اور بولا۔ ”میں نے کسی سے نہیں سنا کہ تم مرنے والے ہو۔“
”ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ میرے پتے کا آپریشن بگڑ گیا لیکن مجھے ان باتوں کی پروا نہیں۔“
بوبی نے کافی کے کپ دوبارہ بھرے اور بولا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کون یہ سب کر رہا ہے؟“
”کوئی ایسا شخص جو سیلینا کی برتھ ڈے پارٹی میں شریک تھا۔ شاید کیرول کے دوستوں میں سے کوئی ایک جن کی وہ بہت زیادہ طرف داری کرتی ہے۔“
”کوئی ایسا شخص جو تم سے نفرت کرتا ہو؟“
”میں نے کسی کی محبت پر ڈاکا نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی کے ساتھ نفرت کا رشتہ ہے۔“
”اگر محبت اور نفرت کو نکال دیا جائے تو بات پیسوں پر آکر رک جاتی ہے۔“
”بالکل، شیطان کو بھی پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔“
”پارٹی میں کون کون آیا تھا؟“
”کیرول نے تمہارے لیے ان لوگوں کی فہرست بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ تم سہ پہر میں گھر آجاؤ اور اسے یقین دلا دو کہ اس شخص کو تلاش کرنے میں تم سے جو ہو سکا وہ کرو گے پھر وہ اپنی کہانی بیان کرنے کے بعد خاموش ہو جائے گی۔ تم یہ کاغذات رکھ سکتے ہو۔ میرے پاس ان کی نقول ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر بوبی کے سامنے رکھ دی۔
”یہ تو بہت زیادہ لگ رہے ہیں۔“ بوبی نے کہا۔
”تم جو خریدنا چاہو یا جسے خریدنا ضروری سمجھو۔ اگر مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ لیکن یہ کام تیزی سے اور خاموشی سے ہونا چاہیے۔“
اس کے جانے کے بعد بوبی نے معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے بہترین ذرائع استعمال کرنا شروع کیے۔ اس نے پہلا فون آرنی کو کیا جو اسٹیٹ انشورنس میں کلیم منیجر تھا۔
”ہائے بوبی، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“
”میں تمہیں دو نام دے رہا ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے آرنی کو ان دونوں مرنے والے لڑکوں کے نام دے دیے۔
آرنی نے کمپیوٹر سے چیک کرنے کے بعد بتایا۔ ”ان میں سے ایک کے والدین نے ہمارے ساتھ گھر کا بیمہ کروا رکھا ہے لیکن تم حادثاتی اموات پر کیوں توجہ دے رہے ہو؟“
”میں اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا۔ ان کے حادثاتی ہونے پر کوئی سوال نہیں اٹھا؟“
”کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی کو اس سے فائدہ پہنچا۔ میں دوسری کمپنیوں تک رسائی نہیں رکھتا لیکن بہت سی باتیں ہم شیئر کر لیتے ہیں۔“
دوسرا فون اس نے شیرف کے دفتر میں لیفٹیننٹ ریے بس کو کیا۔ دونوں اموات اسی کاؤنٹی میں ہوئی تھیں اور بس کے پاس ان کے بارے میں مکمل معلومات ہوں گی لیکن اس وقت وہ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ بوبی نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور ہینک کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں تیس منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ ایک لمبے قد اور درمیانی عمر والی خادمہ نے دروازہ کھولا۔
”کیسی ہو تھیوڈورا؟“
”میں بالکل ٹھیک ہوں سارجنٹ سمز۔ تم کیسے ہو؟“
”اب میں صرف بوبی ہوں۔ تمہاری مالکن کا کیا حال ہے؟“
”یہ ایک غم زدہ گھر ہے سارجنٹ۔ وہ بوڑھا قریب المرگ ہے اور مسز کیرول کو یہی غم کھائے جا رہا ہے۔“

وہ اسے لے کر مکان کے جنوبی حصے میں آئی جہاں کیرول اس کی منتظر تھی۔ اس نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بوبی کا استقبال کیا اور بولی۔ ''ہم کافی عرصے بعد مل رہے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ یہ ملاقات اچھے حالات میں ہوتی۔ کیا تم کافی پینا پسند کرو گے؟''

''بلیک۔'' بوبی نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے کہ ہماری ملاقات کنٹری کلب میں جونیئر لیگ کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے موقع پر ہوئی تھی۔''

''اور اس رات ہم نے باسٹھ ہزار ڈالر جمع کیے جو ابھی تک ایک ریکارڈ ہے۔''

تھیوڈورا چاندی کی ٹرے اور کافی پاٹ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک پلیٹ میں کیک بسکٹ بھی تھے۔ اس نے پیالیوں میں کافی انڈیلی اور چلی گئی۔ بوبی نے اپنے بریف کیس سے لفافہ نکالا اور بولا۔ ''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

''کیا ہینک نے کچھ نہیں بتایا؟''

''تم دوبارہ بتاؤ۔ خاص طور پر وہ باتیں جو وہ بتانا بھول گیا تھا۔''

کیرول نے اخبار میں شائع ہونے والا مضمون ہاتھ میں پکڑا اور بولنے لگی۔ ابتدا میں اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی لیکن پھر اس کا لہجہ مضبوط ہو گیا۔ وہ مختلف باتوں کی وضاحت کرتی رہی جب اس کی کافی ختم ہو گئی تو اس نے دوبارہ پیالی بھر لی۔

''تم نے اس وقت ہینک کو یہ بات کیوں نہیں بتائی جب پہلی بار یہ مطالبہ ہوا تھا؟''

''میں نے سوچا کہ کہیں کسی کا خون نہ ہو جائے۔ میری پوتی، ہینک یا یہ مخلوق۔ ایسی صورت میں ہینک جیل چلا جاتا۔ مجھے یہ غیر حقیقی خطرہ لگا اور پھر یہ کہ میں پیسوں کا انتظام کر سکتی تھی۔''

''پھر یہ تبدیلی کیسے آئی؟''

''جب بہت زیادہ رقم کا مطالبہ کیا گیا۔ میرے لیے اس کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ہینک سے کہا کہ تمہاری خدمات حاصل کی جائیں۔ میں اس مسئلے کو تنہا حل نہیں کر سکتی اور نہ ہی ہینک البتہ ہم تینوں مل کر شاید کچھ کر سکیں۔''

''تم یہ رقم کہاں پہنچاتی ہو؟''

''ونٹر ہیون پبلک لائبریری۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اس کے مغربی حصے میں عقبی جانب ایک شیلف ہے۔ اس کے پیچھے لفافہ رکھنے کی جگہ مقرر ہے۔ یہ رقم ہمیشہ سو ڈالر کے نوٹوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ میں وہاں رک کر دیکھنا چاہتی تھی کہ لفافہ لینے کون آتا ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ حماقت ہو گی۔ یہ کوئی ایسا فرد ہے جس کا میرے گھر میں آنا جانا ہے۔''

''رقم کس طرح پیک کی جاتی ہے؟''

کیرول نے کاؤچ کے نیچے سے ایک جوتے کا ڈبا نکالا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہینک کل رات ہی یہ لے کر آیا ہے۔ اس میں ربڑ سے بندھے ہوئے نوٹ ہیں۔''

''کیا تم اس رقم کے ساتھ جانا چاہو گی؟ ہم نوٹوں کے بجائے کاغذ کے ٹکڑے استعمال کر سکتے ہیں۔''

''نہیں۔ ہمیں نوٹ ہی رکھنا ہوں گے۔ تم لائبریری میں بیٹھ کر دیکھنا کہ یہ رقم لینے کون آتا ہے؟''

''گھات لگانا میری خصوصیت ہے لیکن میرے پاس ایک اور آئیڈیا بھی ہے۔''

کیرول نے اسے ان مہمانوں کی فہرست دی جو سالگرہ پارٹی میں آئے تھے۔ دونوں نے اس فہرست کا بغور جائزہ لیا۔ چھوٹے بچوں کو نکالنے کے بعد اس میں پچاس بالغ افراد بچتے تھے۔

''یہ کسی بھی گھریلو پارٹی کے لیے ایک روایتی گروپ تھا۔ اس میں ہماری بیٹیاں، داماد، نواسے، نواسیاں، میری بہنیں اور ان کے متعلقین، کزنز، آنٹیاں، آیائیں، انکل، خاندان کے بزرگ، سہیلیاں اور ہینک کے کاروباری دوست شامل تھے۔''

کیرول نے چھ ایسے لوگوں کی نشاندہی کی جنہیں بوبی پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اس نے بیس سال تک اس کاؤنٹی میں پٹرولنگ کی تھی۔ اس لیے وہ پارٹی میں شریک ہونے والے بیشتر لوگوں کو پہچان گیا۔ کیرول ان میں سے کسی ایک پر بھی شبہ نہیں کر سکتی تھی لیکن ان میں سے کسی ایک نے ہی تصویر بنانے کے لیے چاکلیٹ کا ڈبا وہاں رکھا تھا۔

''گھر کے ملازمین کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' بوبی نے پوچھا۔

''ناممکن۔ تھیوڈورا گھر کے فرد کی طرح ہے۔ ہم دونوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ساتھ گزارا۔ ہمارا مالی اس کا بھانجا ہے اور اس کا اپنا بھی کاروبار ہے۔ جز وقتی طور پر صفائی کا کام کرنے والی لڑکیاں بھی اس کی رشتے دار ہیں اور وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتیں۔''

''یہ کسی اجنبی کا کام نہیں۔ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو تم

سب کو اچھی طرح جانتا ہے اور تمہارے ردِعمل کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ تھیوڈ ورا نہیں ہو سکتی۔''

کافی پاٹ خالی ہونے تک بوبی کیک بسکٹ اور اپنے سوالات ختم کر چکا تھا۔ انہوں نے منصوبہ بنایا کہ بوبی جمعے کے روز تین بجے لائبریری جائے گا جبکہ کیرول ہفتے کی صبح دس بجے پیکٹ لے کر مقررہ جگہ پر رکھ دے گی۔ اس کے بعد بوبی کا کام شروع ہوگا۔

بوبی نے لیفٹیننٹ بس کو فون کیا جب وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا اور اسے اوک ہل کے قبرستان پر ملنے کے لیے آمادہ کر لیا جو ہائی وے 98 پر واقع تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بس بھی آ گیا اور بولا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

بوبی نے اسے لیجر میں شائع ہونے والا مضمون پکڑا دیا اور بولا۔ ''تم مجھے اس حادثے کے بارے میں بتاؤ۔''

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''کیا یہ قتل تھا؟''

''نہیں، وہ نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یہ ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں اگلے ہفتے بتاؤں گا۔''

''آج ہی بتا دو۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ قتلِ عمد نہیں تھا؟''

''میں جانتا ہوں کہ یہ کس نے کیا۔ اس کی کار اسی روز بعد میں ایک درخت سے ٹکرا کر شعلوں کی نذر ہو گئی۔ جب گشت کرنے والا سپاہی وہاں پہنچا تو اس وقت بھی وہ نشے میں تھا۔''

''اخبار نے اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا۔''

بوبی بولا۔ ''واقعی وہ ایک حادثہ تھا یا کسی کو مارنے کے لیے جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی؟''

''وہ حادثہ ہی تھا۔''

''تمہیں یقین ہے؟''

''اس گاڑی کا فلٹر پمپ خراب تھا اور اس لڑکے کے باپ نے کچھ پیسے بچانے کی خاطر الیکٹریشن نہیں بلایا بلکہ اس کا تار نکال دیا اور خود ایک پارٹی میں چلا گیا۔ جب لڑکا گاڑی لے کر نکلا تو وہ بری طرح جھٹکے لے رہی تھی۔ اسٹیٹ اٹارنی نے فیصلہ کیا کہ تار نکالنا کوئی ایسا جرم نہیں جس پر

مقدمہ بنتا ہو لیکن تم اس معاملے میں کیوں الجھ گئے؟''
''کچھ لوگ میرے مؤکل کو تنگ کررہے ہیں۔ اس بارے میں کچھ معلوم کرسکا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔''
گھر آنے کے بعد بوبی اپنے گیراج میں گیا اور ہفتے کے لیے ضروری سامان کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی نظر ایک گتے کے بکس پر گئی۔ اس نے اسے کھول کر ایک سفید رنگ کا نلکی نما آلا نکالا۔ اس کے ساتھ ایک اور چھوٹا سیاہ باکس انٹینا کے ساتھ تھا اور دونوں چالو حالت میں لگ رہے تھے۔ اس نے دونوں کی بیٹری چارج کردی۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے ایک بار پھر سالگرہ پارٹی میں شریک ہونے والے مہمانوں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ وہ چھ اجنبی لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ولیم کو فون کرکے کہا۔ ''میں تمہیں چھ آدمیوں کے نام پتے اور فون نمبر دے رہا ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔''
''کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتے ہو؟''
''جرائم، نامناسب رویہ۔ کوئی بے قاعدگی وغیرہ۔''
''کیا تم مجھے کل شام تک کا وقت دے سکتے ہو؟''
''تم ہفتے کی صبح تک بتادو۔''
جمعے کے دن وہ اپنے معمولات سے فارغ ہوکر ہینک کے گھر پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ گتے کا ڈبا اور بریف کیس بھی لے کر آیا تھا۔ ہینک اور کیرول اس کا پورچ میں انتظار کررہے تھے۔ ہینک نے بوبی کے سامان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس کے ذریعے تم اس شخص کو پکڑ سکو گے؟''
''بالواسطہ یہ ایک حساس اسکینر ہے۔ جیسے ہی کوئی اس کے قریب آئے گا، ہمیں ہائی فریکوئنسی سگنل ملنے شروع ہوجائیں گے۔''
''یہ کس طرح ہماری مدد کرے گا؟'' کیرول نے پوچھا۔
بوبی نے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی پٹی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے پیسوں والے لفافے میں رکھ دیا جائے گا۔''
''جیسے ہی وہ شخص لفافہ اٹھائے گا تو الارم بجنا شروع ہوجائے گا اور تم اسے پکڑ لوگے۔'' کیرول نے کہا۔
بوبی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ پولیس اس معاملے میں ملوث ہو۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ ان خطوط میں جن بچوں کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ وہ حادثے کا شکار ہوئے... اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ وہ شخص فرضی خوف پیدا کرکے رقم وصول کررہا ہے۔''
''مسلینا اور چاکلیٹ کے بارے میں کیا کہو گے؟'' کیرول نے کہا۔
''میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ یہ بھی تم پر دباؤ بڑھانے کا ایک طریقہ ہو۔''
''اب تم کیا کرو گے؟''
''سب سے پہلے تو انہیں تلاش کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے۔''
وہاں سے روانہ ہوتے وقت بوبی نے کیرول سے کہا۔ ''میں کل صبح لائبریری کے قریب ہی موجود رہوں گا لیکن تم مجھے بالکل نظر انداز کردینا۔''
دروازے پر اسے تھیوڈورا ملی۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا لفافہ تھا۔ ''یہ بچے ہوئے کیک اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو ایک وقت میں صرف ایک ہی کیک کھاتے ہیں۔''
جب وہ دروازے سے باہر آئے تو تھیوڈورا نے کہا۔ ''سارجنٹ! تم یہاں ان خطوط کے سلسلے میں آئے ہو؟''
''تم ان خطوط کے بارے میں جانتی ہو؟''
''ہاں، میری ماں اس کی ماں کی خادمہ تھی اور پچاس سال تک ان کے لیے کھانا پکاتی رہی۔ میں اس وقت سے کیرول کی خادمہ ہوں جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ بالآخر اس نے ہینک کو ان خطوط کے بارے میں بتادیا۔ وہ گزشتہ ایک سال سے خوف میں مبتلا تھی۔''
''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کون کررہا ہوگا؟''
''نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے خطوط دوسرے لوگوں کو بھی مل رہے ہیں۔ میں نے سرگوشیوں میں سنا ہے کہ اور بھی عورتیں اس کی وجہ سے خوف زدہ ہیں۔ دو ماہ پہلے مسز کینڈل نے اپنی خادمہ کو برطرف کردیا اور وہ بے چاری یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟''
''اس کے علاوہ کوئی اور بات؟''
''فی الحال اور کچھ نہیں ہے۔ تم مجھے افواہیں سننے کے لیے ایک دو دن اور دو۔''
''تم نے یہ بات ہینک کو کیوں نہیں بتائی؟''
''میں اس کی نہیں بلکہ کیرول کی خادمہ ہوں۔ بہت سی باتیں کبھی نہیں بتائی جاتیں۔''
بوبی نے اسے اپنا کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اگر کچھ سنو تو مجھے فون کردینا۔''

رات گئے ولیم نے اسے فون کر کے بتایا کہ ان چھ افراد کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ ان کا ماضی بے داغ ہے اور وہ کسی بے قاعدگی میں بھی ملوث نہیں رہے۔

ہفتے کی صبح نو بج کر پینتالیس منٹ پر بوبی اپنے کتے ایلوس کے ساتھ لائبریری سے پچاس فٹ کے فاصلے پر درخت کے سائے میں ایک سنگی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا باکس اس دیوار کے سہارے رکھ دیا تھا جو لائبریری کے اندر جا رہی تھی۔ کوئی بھی شخص پیسوں کا لفافہ لے کر وہاں سے گزرتا تو الارم بجنے لگتا اور اس کی آواز کتے کے بھونکنے جیسی تھی لہٰذا بوبی کے سوا کوئی بھی اس پر توجہ نہ دیتا۔

دس بجے کے بعد کیرول لائبریری میں جاتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے بوبی اور ایلوس کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ اپنے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑے ہوئے واپس آئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے بوبی اور ایلوس کو دیکھا پھر اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بوبی اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ گیارہ بج کر چند منٹ ہوئے تھے کہ ایلوس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک طویل قامت دبلا پتلا نوجوان بکس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے بغل میں ایک پھولا ہوا لفافہ دبا رکھا تھا۔ اس نے پتلون کی جیب سے چابیاں نکالیں اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ بوبی اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔

''آہستہ سے گھوم جاؤ۔'' بوبی نے کہا۔ ''دروازہ کھولنے یا کوئی اور حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ یہ کتا حملہ کر دے گا۔''

نوجوان اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح کھڑے رہو اور میرے سوالات کے جواب دو۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''تم میرا نام کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''کیونکہ تمہارے پاس جو پیکٹ ہے، وہ تمہارا نہیں۔ نام بتاتے ہو یا پولیس کو بلاؤں۔''

''بینٹن نیل جونیئر۔''

''کیا تم بینٹ کے لڑکے ہو؟''

''ہاں۔''

''تم چاہتے ہو کہ میں اسے فون کروں؟''

''نہیں، بالکل نہیں، تم سارجنٹ سمر ہو نا۔''

اس لڑکے کی شکل بینٹ نیل سے ملتی تھی جو ایک کباڑ خانے کا مالک تھا۔ وہ چوری کی گاڑیوں سے پرزے نکال کر بیچتا تھا لیکن کبھی پکڑا نہیں گیا۔ اس کا کباڑ خانہ ان پرزوں سے بھرا ہوا تھا۔

''اب میں صرف سمر ہوں۔ کیا ہم آپس میں بات کر لیں یا پولیس والوں کا انتظار کریں۔''

''میں ایک شرط پر بات کر سکتا ہوں کہ میرے ڈیڈی کو اس کا پتا نہ چلے۔''

''نہیں بتاؤں گا لیکن اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔''

''میں ڈلیوری بوائے ہوں۔ میرا کام صرف یہ پیکٹ اٹھانا اور اسے آگے دینا ہے۔''

''کسے؟ کہاں؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ میں اسے ہوم ڈپو تک پہنچاتا ہوں۔ یہ ساتواں پیکٹ ہے۔''

''تمہیں یہ پیکٹ کون دیتا ہے؟''

''کیا ہم ٹرک میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟ یہاں کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''پچھلا گیٹ کھول دو۔ یہ پیکٹ کون وصول کرتا ہے؟''

''مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ کیا تم سراغ رساں ہو؟''

''کیا میں تمہارے باپ کو فون کروں؟''

''میں یہ پیکٹ ہوم ڈپو کو جانے والی بکسوں کی قطار کے آخری سرے پر رکھ دیتا ہوں۔ وہاں ایک لفافے میں سو ڈالر کا نوٹ رکھا ہوتا ہے۔ وہ اٹھا کر چلا آتا ہوں۔''

''تمہارے خیال میں اس پیکٹ میں کیا ہو سکتا ہے؟''

''اس میں سے پیسوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ ڈیڈی ہمیشہ کہتے ہیں کہ پیسوں کی خوشبو الگ ہی ہوتی ہے۔''

''تم جو پیکٹ لیے پھر رہے ہو، اس میں سو ڈالر سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں۔ تم وہ کیوں نہیں لے لیتے؟''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟''

''ان کے پاس میری ایک تصویر ہے۔ پتا نہیں ان تک کیسے پہنچ گئی۔ اس تصویر میں ایک لڑکی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں ہوں۔ اگر ڈیڈی نے وہ تصویر دیکھ لی تو مجھے جان سے مار دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم دس منٹ انتظار کرو۔ اس کے بعد ہمیشہ کی طرح یہ پیکٹ بھی اسی جگہ پہنچا دینا۔''

''تمہارے کہنے پر میں آخری بار یہ کام کروں گا، اس کے بعد کبھی نہیں۔''

''اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے تو یہی بہتر ہوگا۔''

بوبی نے اپنا باکس اٹھایا اور کار کی طرف چل دیا۔ اس نے ایلوس کو گھر پر اتارا اور خود ہوم ڈپو کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے وہ بینٹن کو لفافہ رکھتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ چند منٹوں بعد وہ بھی ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا اور مقررہ جگہ پر لفافہ پھینک کر آگے بڑھ گیا۔ چند منٹوں بعد ایک بوڑھی عورت وہاں آئی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھا اور وہاں سے چل دی۔ بوبی نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ وہ مسز ڈورتھی رچرڈسن تھی جسے آنٹی ڈاٹ کہا جاتا تھا۔

بوبی نے اس کا تعاقب شروع کیا۔ آنٹی نے جیسے ہی سڑک پار کی۔ ایک مرسڈیز اس کے پاس آکر رکی اور وہ دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوگئی۔ بوبی نے ڈرائیور کو پہچان لیا۔ وہ آنٹی کی بہن تھی لیکن اس وقت اسے اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ بوبی لپک کر کار کی طرف آیا اور ان کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ جھیل ہوورڈ سے ایک بلاک کے فاصلے پر ایک شاندار دو منزلہ مکان کے ڈرائیووے میں داخل ہوئے۔ دونوں عورتیں کئی پلاسٹک کے تھیلے پکڑے ہوئے گاڑی سے اتریں۔ پیسوں والا لفافہ آنٹی ڈاٹ نے اپنی بغل میں دبایا ہوا تھا۔ بوبی نے اپنی کار مرسڈیز کے پیچھے کھڑی کی اور کار سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں یہ سامان لے جانے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟''

''اوہ بوبی، اندر آجاؤ۔ ہم یہ تھیلے خود بھی لے جا سکتے ہیں۔'' ڈاٹ نے کہا۔ اس کی بہن نے دروازہ کھولا اور وہ ایک چھوٹی سی راہداری میں داخل ہوئے جو کچن کی طرف جا رہی تھی۔

''بیگی، تم بوبی کو نشست گاہ میں لے جاؤ۔ میں کافی بناتی ہوں۔'' ڈاٹ نے کہا اور پیسوں کا لفافہ ناشتے کی میز پر رکھ دیا۔

نشست گاہ بہت خوب صورتی سے آراستہ کی گئی تھی۔ بیگی نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈیڈی کی پسندیدہ کرسی تھی۔''

دس منٹ بعد ڈاٹ ایک ٹرے میں کافی اور کیک پیس لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بیگی نے سب کے لیے کافی بنائی۔ بوبی نے ایک کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولا۔ ''بہت مزے کا ہے۔''

''اس وقت ہم تمہاری یہی خاطر کر سکتے تھے۔'' ڈاٹ نے کہا۔

''تم نے اپنی مدد کے لیے بینٹن نیل کا انتخاب کیوں کیا؟''

دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کندھے اچکا دیے پھر ڈاٹ بولی۔ ''ہمیں اپنی دراز میں کچھ تصویریں ملی تھیں۔ نہیں معلوم کہ کون رکھ گیا تھا لیکن اس کی تصویر ہمارے مطلب کی تھی اور وہ ہمارے کام کے لیے بالکل مناسب تھا۔''

''کچن میں جو فولڈر رکھا ہے، اس میں کیا ہے؟''

''بہتر ہوگا کہ تم بچے ہوئے کیک اپنے ساتھ لے جاؤ اور فولڈر کے بارے میں پریشان مت ہو۔''

''آنٹی ڈاٹ، مجھے پولیس کو فون کرنے پر مجبور مت کرو۔''

''ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے بوبی، لگتا ہے کہ یہ پیالی اور طشتری تمہیں بہت بھاری محسوس ہو رہی ہے۔''

دونوں خواتین مسکرا دیں۔ بوبی کو اپنا چہرہ سرخ ہوتا محسوس ہوا، وہ بولا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

آنٹی ڈاٹ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کہیں پڑھا ہے کہ یہ سیاہ کافی زہر کا کام کرتی ہے۔ تم نے غور کیا ہو گا کہ ہم دونوں نے اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا۔''

بوبی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا تم نے واقعی مجھے زہر دیا ہے؟''

''نہیں۔'' بیگی بولی۔ ''تم ایک اور کیک لے سکتے ہو۔''

''تم ان لوگوں کو کیوں خوف زدہ کر رہی ہو جو تم پر بھروسا کرتے ہیں؟''

''پیسوں کے لیے۔'' بیگی بولی۔ ''ہم کئی برسوں سے معاشی مشکلات کا شکار ہیں۔ بڑی مشکل سے گھر کے خراجات، جیکب کی تنخواہ اور ٹیکسوں کی ادائیگی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے طور پر بھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

''لیکن تم تو امیر ہو۔''

''کبھی تھے۔ ڈیڈی کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ لیکن ہمیں اس کا تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے ڈیڈی کے دوست کے مشورے پر عمل کر کے سارا سرمایہ زمین خریدنے میں لگا دیا۔ بدقسمتی سے ہمیں اس کے اچھے دام نہ مل سکے اور ہم رفتہ رفتہ قلاش ہوتے چلے گئے۔''

''بہر حال تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اب یہ سلسلہ رک جانا چاہیے۔''

”ہمیں معلوم تھا کہ اسے ایک دن اپنے انجام کو پہنچنا ہے۔ خوش قسمتی سے اب ہماری مالی پوزیشن مضبوط ہے۔ اس کی وجہ سے ہم اپنی زندگی کے آخری ایام بہتر طور پر گزار سکیں گے۔“

”مجھے ایک لاکھ ڈالر واپس چاہئیں۔“ بوبی نے کہا۔

”نامنظور۔“ ڈاٹ نے اپنی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہینک نے اوپر جانے کی تیاری مکمل کرلی ہے اور تقریباً سارے کاروبار کو نقد اثاثوں میں تبدیل کرلیا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد بھی کیرول اور اس کی بیٹیاں آرام سے رہ سکیں گی۔“

”کیا میں ہینک کو بتادوں کہ رقم تمہارے پاس ہے؟“

”تم یہی کرسکتے ہو لیکن تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہیے۔“

”تم نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔“

”اگر کوئی غلط کام کرے تو وہ جرم نہیں کہلاتا۔“ بیگی ڈھٹائی سے بولی۔

اچانک بغلی دروازہ کھلا۔ بوبی نے اس جانب دیکھا اور بولا۔ ”ہینک، تم یہاں کیا کررہے ہو؟“

”میں تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ پہلے لائبریری پھر ہوم ڈپو اور اب یہاں۔ لیکن تم آنٹی ڈاٹ اور آنٹی بیگی کے پاس کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟“

یہ کہہ کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور پلیٹ میں سے کیک اٹھا کر کھانے لگا۔

”ہینک، تم کافی پینا پسند کرو گے؟“ آنٹی ڈاٹ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”ضرور۔“ ہینک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری رقم کہاں ہے؟“

”تمہارے ایک لاکھ ڈالر گم ہوگئے ہیں؟“ بیگی بولی۔ ”کچھ یاد ہے کہ کہاں رکھے تھے؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ کیرول نے وہ رقم لائبریری میں رکھی تھی۔ ایک لڑکا وہ لے کر ہوم ڈپو گیا اور بوبی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگیا۔“

”جب تم نے ہوم ڈپو سے وہ فولڈر اٹھایا تو میں نے تمہاری تصویریں لے لی تھیں۔“ بوبی نے جھوٹ بولا۔

”میری رقم دے دو۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ہینک بولا۔

”اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر ہم تمہیں تلاش کرنے کی اجازت دے دیں تو اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور تمہارے اندر اتنی طاقت نہیں ہے۔ کیا تمہارے اطمینان کے لیے اتنا کافی نہیں کہ تمہاری نواسیاں محفوظ ہیں۔“ ڈاٹ نے کہا۔

”کیا تم وہ رقم تلاش کرسکتے ہو بوبی؟“ ہینک نے کہا۔

”میں چاہوں گا کہ پولیس اسے تلاش کرے۔“ بوبی نے کہا۔

”ہینک تمہیں پولیس کو فون نہیں کرنے دے گا۔ اس کے ترکہ میں ایک لاکھ ڈالر گم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”میں پولیس کو فون کروں گا اور وہ یہ رقم تلاش کرلے گی۔“ بوبی نے کہا۔

”کیا واقعی تم ایسا کرو گے؟ کیا تم دو بوڑھی عورتوں کو جیل بھیج دو گے؟“ ڈاٹ نے کہا تو بوبی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر ایک نئی آواز سنائی دی۔ ”پولیس کو بھول جاؤ۔ یہ کام کوئی عورت بھی کرسکتی ہے۔“ کیرول ننگے پاؤں دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے فولڈر اور اونچی ایڑی کے سینڈل بائیں ہاتھ میں اور اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

”پستول کی ضرورت نہیں کیرول۔“ بوبی نے اپنی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے نیچے کرلو۔“

کیرول ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”آنٹی بیگی۔ میں یقین نہیں کرسکتی کہ ان سب واقعات کے پیچھے تم دونوں کا ہاتھ ہوگا۔“

”ہم سب کچھ کرنے پر تیار ہوگئے تھے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ تمہارے پاس نقد رقم ہے۔“

”تم دھوکا دینے کے بجائے مجھ سے مانگ سکتی تھیں آنٹی بیگی۔ ان کشن کے بیچ میں کیا ہے؟ اسے احتیاط سے باہر نکالو۔“

بیگی نے دو انگلیوں کی مدد سے ایک سیمی آٹومیٹک ریوالور نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

”تم کیا کرو گی؟“ آنٹی ڈاٹ نے پوچھا۔

”بہتر ہے کہ تم دونوں کو گولی ماردوں۔“

”ڈارلنگ تم ایسا نہیں کرو گی۔“ ہینک نے کہا۔

”چپ رہو ہینک، تم کچھ کہنے کا حق کھو چکے ہو۔ اب یہ معاملہ میرے اور آنٹیوں کے درمیان ہے۔ میں اسے مارنے کا خواب دیکھ رہی تھی جس نے سیلینا کو زہر دیا۔“

دونوں عورتیں سیدھی ہوکر بیٹھ گئیں۔ کیرول نے کہا۔ ”تم میں سے کوئی ایک جھک کر یہ پستول اٹھائے اور خود کو

گولی مار لے۔ اگر ایک منٹ کے اندر ایسا نہ کیا تو میں تم دونوں کو شوٹ کر دوں گی۔''

وہ چاروں حیران ہو کر کیرول کو دیکھ رہے تھے۔ وہ فرش پر ایڑیاں بجاتی دونوں عورتوں کے عقب میں گئی اور بولی۔ ''تیس سیکنڈ کے بعد تمہیں احساس ہوگا کہ اپنے گھر کے فرد کو قتل کرنا کیا ہوتا ہے۔''

''کیرول، یہ پستول مجھے دو اور تم جاؤ، میں ان دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔'' ہینک نے کہا۔

''تم چپ رہو ہینک۔ تم دونوں میں سے کون آگے بڑھ کر پستول اٹھائے گا۔''

آنٹی ڈاٹ نے جھک کر پستول اٹھا لیا لیکن بیگی نے اس کی کلائی پکڑ لی اور بولی۔ ''نہیں ڈاٹ نہیں۔ یہ آئیڈیا میرا تھا۔ اس لیے میں خود کو گولی ماروں گی۔''

ان دونوں میں پستول کے لیے جدوجہد ہونے لگی۔ بالآخر بیگی نے اسے حاصل کر لیا اور بولی۔ ''ڈاٹ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کیرول۔''

اس نے پستول اوپر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر کیرول کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کیرول اپنا ریوالور نچاتے ہوئے بولی۔ ''جان دینا اتنا آسان نہیں ہے آنٹی بیگی۔ اپنا پستول نیچے کر لو۔'' پھر اس نے اپنا ریوالور بھی نیچے کر لیا اور بولی۔ ''کیسا محسوس ہو رہا تھا؟''

بوبی چلتا ہوا آیا۔ اس نے پہلے پستول اٹھایا پھر کیرول کے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ تماشا پسند نہیں۔ میں شیرف کو فون کرتا ہوں۔''

''تم اس سے کیا کہو گے؟ کوئی بھی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔'' کیرول نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم اور ہینک یہاں سے چلے جاؤ۔ میں ان آنٹیوں سے خود ہی نمٹ لوں گی۔''

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ باہر نکل کر بوبی نے ہینک سے کہا۔ ''تم گھر جاؤ۔ میں یہیں رکوں گا جب تک کیرول یہاں سے بخیر و عافیت نہیں چلی جاتی۔''

کچھ دیر بعد کیرول باہر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں پرس، فولڈر اور ایک پیکٹ تھا۔ اس نے بوبی کو دیکھ کر کہا۔ ''میں جانتی تھی کہ تم یہاں ہو گے۔''

''کیا سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟ میرا مطلب ہے پیسے؟''

''ہاں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور اسے پیکٹ پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''یہ آنٹیوں نے تمہارے لیے دیا ہے۔''

''یہ کیا ہے؟ پہلے انہوں نے تمہیں ڈرایا پھر تمہاری نواسی کو زہر دیا اور اب کسی اور کو پیسوں کے لیے خوف زدہ کرنا چاہتی ہیں؟''

کیرول نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ مکان وقتی طور پر انہیں دے دیا ہے، وہ یہاں کسی مالی پریشانی کے بغیر رہ سکتی ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد یہ مکان میرا ہو جائے گا۔ یہ مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔''

''مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔''

''تمہیں تو یہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔'' یہ کہہ کر کیرول نے ایک بیگ نکالا جس میں بہت سی تصویریں، خطوط اور مختلف کاغذات تھے۔ ''یہ ان کا خزانہ ہے۔''

''تم اس کا کیا کرو گی۔ کیا اس کے ذریعے ونٹر ہیون سوسائٹی کو کنٹرول کرنے کا ارادہ ہے، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

''آنے والے چند مہینوں میں مجھے اس سے زیادہ اہم کام کرنے ہیں۔'' اس نے بیگ بوبی کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ''تم جو مناسب سمجھو وہ کرو۔''

بوبی نے اپنی کار کا دروازہ کھولا تو وہ بولی۔ ''میرا پستول۔''

بوبی نے اپنے کندھے اچکائے اور جیب سے پستول نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ پستول تمہیں واپس کرنا چاہیے۔''

''تمہیں یہ خیال ہونا چاہیے کہ ایک عورت ایک لاکھ ڈالر لے کر جا رہی ہے۔'' کیرول نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پستول برابر والی سیٹ پر ڈال دیا پھر اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔

گھر واپس آتے ہوئے بوبی اپنے آپ کو ایک شکست خوردہ شخص سمجھ رہا تھا جس کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہو۔ بہرحال اسے اطمینان تھا کہ وہ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اگر کیرول تعاون کرتی تو دونوں عورتیں جیل کی ہوا کھا رہی ہوتیں لیکن کیرول کہیں زیادہ ہوشیار نکلی۔ اس نے نہ صرف اپنی رقم واپس لے لی بلکہ ان بوڑھی عورتوں کو پولیس کے حوالے نہ کر کے سودے بازی کے نتیجے میں ان کا مکان بھی اپنے نام کروا لیا اور ساتھ ہی ان پر یہ احسان بھی کر دیا کہ وہ مرتے دم تک اس مکان میں رہ سکتی ہیں۔ بوبی نے اپنی زندگی میں ایسی ہوشیار عورت نہیں دیکھی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹوکن پکڑ رکھا تھا جو اسے پانچ روپے میں دیا گیا تھا۔ یہ ٹوکن کاؤنٹر والے نے دیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "بھائی، ٹوکن تو مل گیا نا تمہیں۔ اب کڈنی وارڈ کے لیے دو سو روپے دو۔"

"کڈنی وارڈ کے لیے؟" حاتم طائی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں۔ میں تو خیراتی اسپتال سمجھ کر آیا تھا۔"

"ارے بھائی، یہ ہے تو خیراتی اسپتال۔ لیکن ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ملیریا وارڈ کے لیے دو سو الگ سے دینے ہوں گے۔ اس کے بعد آنکھوں کا وارڈ ہوگا۔ اس کی ڈونیشن الگ ہوگی۔"

"اور اس کی ڈونیشن کیا ہوگی؟" حاتم نے جل کر پوچھا۔

"اس اسپتال میں چونکہ غریبوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے صرف تین سو روپے لیتے ہیں۔"

کوہِ ندا

منظر امام

اپنی ہی ذات میں پستی کے کھنڈر ملتے ہیں
اپنی ہی ذات میں اک کوہِ ندا رہتا ہے

شاعر نے تو یہ فرمایا تھا... مگر منیر شامی اور حاتم طائی کی جدید کہانی میں ہر بات جداگانہ ہوتی ہے... منیر شامی ایک بار پھر مشکل میں ہیں... ان کے مشکل کشا حاتم نے ایک بار پھر کمر کس لی ہے... وہ کوہِ ندا کی تلاش و جستجو میں مسافتیں طے کررہے ہیں... سیاست درویش اور جمہوریت کے لبادے میں پوشیدہ کوہِ ندا کے نئے در۔

معاشرے کے وہ رنگ ڈھنگ جسے ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ حساس دلوں کے لیے پُرسوچ کہانی

اسی دوران ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''ارے بھائی، کچھ تو خیال کرو۔ میں جب آتا ہوں تم لوگ کسی نہ کسی بہانے پیسے اینٹھ لیتے ہو۔ یہ کس قسم کا خیراتی اسپتال ہے؟''

آواز منیر شامی کی تھی۔ وہ اسپتال کے عملے کے ایک شخص سے الجھا ہوا تھا۔ حاتم اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا منیر بھائی؟''

''کون؟'' منیر نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ ''کون صاحب؟''

''کیا ہوگیا ہے منیر تم کو؟'' حاتم نے پوچھا۔ ''تم حاتم کو نہیں پہچان رہے؟''

''ارے بھائی حاتم۔'' منیر بلکنے لگا..... ''میں تو اب کسی کو بھی پہچاننے کے قابل نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''بھائی، میری آنکھ میں صرف خارش ہوئی تھی۔ میں بدقسمتی سے یہاں علاج کرانے آگیا۔ ایک تو ان لوگوں نے مختلف وارڈ کے چکر میں مجھ سے پیسے بھی لے لیے اور میری آنکھوں کا بھی بیڑا غرق کر دیا۔ پتا نہیں کیسا علاج کیا کہ میری بینائی چلی گئی۔''

''یہ تو بہت بُرا ہوا تمہارے ساتھ۔ چلو میرے ساتھ کہیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر تم اپنا دکھڑا سنا دینا۔''

''میرے بھائی، اب تم آگئے ہو۔ اس لیے اب مجھے پروا نہیں ہے۔ میری بینائی بھی واپس آجائے گی اور سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔''

''کیا مطلب؟ تم پھر کسی سوال کے چکر میں پڑ گئے ہو؟''

''ہاں یار، اسی منحوس حسن بانو کا معاملہ ہے۔ ایک تو یہ کم بخت ہر جنم میں مجھے مل جاتی ہے۔ چلو چل کر کسی ہوٹل میں ناشتا کرواؤ۔ دو دن سے کچھ کھایا نہیں ہے۔''

میں اس کو ہوٹل میں لے آیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس دنیا میں منیر شامی جب بھی ملا بھوکا ہی ملا ہے۔ اس بار تو وہ بھوکا بھی تھا اور اندھا بھی ہو چکا تھا۔ ''بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار حاتم بھائی۔ دو پراٹھے اور چار انڈے فرائی کروالو۔'' اس نے کہا۔ ''بعد میں کڑک چائے کا آرڈر دے دینا۔''

''حد ہوگئی۔ تم چار انڈے اور دو پراٹھے کھا لوگے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار، اندھے ہونے کے بعد میری بھوک بڑھ گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

حاتم ہنستا کر خاموش ہوگیا۔ منیر شامی نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی داستان سنانی شروع کر دی۔ ''میرے بھائی، اس بار بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس بار کیا افتاد پڑ گئی ہے؟''

''جو کوہ ندا کی خبر لا دے۔ وہ اپنی مراد پا وے۔'' منیر شامی نے بتایا۔

''ایک تو یہ کوہ ندا میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' حاتم نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے تم اپنی بپتا سناؤ، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

''بہت ہی درد بھری داستان ہے میرے بھائی۔'' منیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''اسی سے اندازہ کر لو کہ میں اس چکر میں اندھا تک ہوگیا ہوں۔''

''لیکن ہوا کیا ہے۔ پوری بات بتاؤ۔'' حاتم نے کہا۔

''ہوا یہ کہ میں ایک دن ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک حسن بانو کی آواز آئی۔ ''بچاؤ، بچاؤ۔'' میں نے دیکھا کہ حسن بانو کو دو آدمی ایک گاڑی میں زبردستی بٹھا رہے تھے اور اس نے اتفاق سے مجھے دیکھ لیا تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ میں بھی اسی طرف سے گزر رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ میری غیرت بیدار ہوگئی۔ میں بھاگ کر اس گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔

پھر ان میں سے ایک پر حملہ کر دیا جبکہ دوسرے نے میری پھینٹی لگا دی۔ دو اور بھی آگئے۔ ان سبھوں نے مارنا شروع کر دیا۔ جبکہ حسن بانو گاڑی سے نکل کر ہنستی رہی تھی۔''

''ہنستی رہی تھی۔'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھائی۔ کیونکہ وہ ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ حسن بانو نے فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ وہ اغوا ہو رہی ہے اور ایک بندے کا سر پھاڑ دیا۔ جواب میں انہوں نے میری ہڈیاں توڑ دیں۔ بہرحال جب معاملہ کلیئر ہوا تو مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ ہم سب نے ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ وہ کم بخت حسن بانو بھی نہیں تھی۔ اس جیسا میک اَپ کیا ہوا تھا۔ لباس بھی ویسا ہی پہنایا گیا تھا اس کو۔ تم نے حسن بانو کی ڈریسنگ تو دیکھی ہوگی؟''

''ہاں۔ اور مجھے حیرت بھی ہوتی تھی کہ تمہاری حسن بانو اتنی خوب صورت ڈریسنگ کیسے کر لیتی ہے؟''

''اس کا راز یہ تھا کہ اس زمانے کا سب سے مہنگا فیشن

ڈیزائنر اس کا پھوپی زاد بہنوئی تھا۔'' منیر شامی نے بتایا۔

''بہر حال شوٹنگ وغیرہ تو کینسل ہو گئی۔ وہ سب مجھے دفتر لے آئے۔ کیونکہ اس فلم میں ایک ولن کی ضرورت تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ میں زبردست ولن کا کردار کر سکتا ہوں۔''

''کیا وہ لوگ بالکل ہی اندھے تھے؟'' حاتم جل کر بولا۔

''یار حاتم۔ تمہاری یہ جلنے والی عادت نہیں گئی۔ خیر تو میں بھی اس لیے تیار ہو گیا کہ اصل حسن بانو نہ سہی۔ اس جیسی تو ہے۔ اس کی ہم شکل صحیح۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی اس حسن بانو نے کہا۔

''بھائی جان آپ کی ہمت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ورنہ آج کل کے زمانے میں کون کسی کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نیک بخت، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں پہنچتے ہی تم مجھے بھائی جان بولنے لگو گی تو میرا دماغ خراب نہیں تھا کہ میں خوامخواہ اس جھگڑے میں پڑتا۔''

سب ہنسنے لگے۔ میں نے حسن بانو سے کہا۔ ''دیکھو، تم یہ بھائی جان وغیرہ کا تکلف نہ کرو تو میں اس فلم میں کام کرنے کو تیار ہوں۔ کیونکہ تم بالکل حسن بانو کی طرح ہو۔''

''اور یہ حسن بانو کون ہے؟'' سب نے پوچھا۔

''اچھے وقتوں میں وہ میری محبوبہ ہوا کرتی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کی وجہ سے میں نے بھائی حاتم کو تکلیف دی تھی۔ اور سات سوال حل کر کے لے آیا تھا۔''

پہلے تو ان لوگوں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں وہی منیر شامی ہوں۔ بڑی مشکل سے جب یقین آیا تو سب پیچھے پڑ گئے۔ طرح طرح کی باتیں پوچھنے لگے۔ سب سے زیادہ سوالات تمہارے بارے میں کر رہے تھے۔ ''حاتم کیسا ہے؟ اس کی شکل کیسی ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ بھی اس زمانے میں واپس آیا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بتایا کہ میں جب بھی اس دنیا میں واپس آیا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ حاتم بھی کہیں آس پاس ہوتا ہے۔ وہ بھی واپس آ گیا ہوگا۔''

اس فلم کا پروڈیوسر ایک وڈیرا تھا۔ بہت دولت مند۔ وہی فلم کے پیسے لگا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''سائیں! اگر تم اس حاتم کو لے آؤ بابا تو ہم تم کو دس لاکھ روپے دے گا۔''

''کیوں سائیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''حاتم سے تم کو کیا کام پڑ گیا؟''

''بابا! میرے پاس بھی ایک سوال ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے اس کا جواب چاہیے۔''

''کون سا سوال؟'' میں نے پوچھا۔

پھر اس نے اپنی کہانی سنائی جو مختصر یہ تھی کہ اس کا دادا بستر مرگ پر تھا۔ اس کی جان نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اسے اس سوال کا جواب چاہیے کہ کوہِ ندا کی خبر لاوے۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے کوہِ مری دیکھا ہے۔ کوہِ ہمالیہ دیکھا ہے۔ کوہ قاف کا نام سنا ہے۔ یہ کوہِ ندا کیا چیز ہے۔ بس بابا اس سوال کا جواب مل جائے تو دادا کی جان نکل جائے اور اس کی دولت ہمارے پاس آ جائے۔ بس اس لیے حاتم کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے سائیں۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح حاتم کو ڈھونڈ کر تمہارے پاس لے آؤں۔'' میں نے کہا۔

''شاباش بابا۔ اب تم اپنا شوٹنگ اسٹارٹ کرو۔ تم کو ولن بنایا گیا ہے تو ولن بن کر دکھا دو۔ اب انہوں نے مجھے ولن بنانے کے لیے میرا گیٹ اپ شروع کر دیا۔ میرے چہرے کو خوفناک بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب کچھ ہو گیا لیکن آنکھیں خوفناک نہیں ہو سکیں۔ اس پر حسن بانو نے ایک لوشن کا نام لیا کہ اگر اس کے چند قطرے ڈال دیے جائیں تو آنکھیں بھی خوفناک ہو جائیں گی۔ اس نے بتایا کہ اس کے پیر و مرشد بھی اپنی آنکھوں کو پُرکشش بنانے کے لیے وہی لوشن استعمال کرتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس پر اس نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بس اس کا ہاتھ تھامنا تھا کہ میرا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اس کے بعد میں اندھا ہو گیا۔''

''کیا! اس کے بعد ہی تم اندھے ہوئے ہو؟'' حاتم نے پوچھا۔

''ہاں میرے بھائی۔'' منیر شامی گلوگیر ہو کر بولا۔

''ان لوگوں نے کیا کیا۔ تمہارا علاج نہیں کروایا؟''

''نہیں، اس ڈائریکٹر کو تو خوشی ہوئی تھی کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''حسن بانو مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت میرے پاس بیٹھ کر گزارتی تھی۔ وہ کہتی کہ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے جذبات میں آ کر تمہیں بھائی جان کہہ دیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے بھائی جان ہو سکتے ہو۔ میرے بھائی جان تو بہت خوب صورت آدمی ہیں جبکہ تمہارے چہرے پر پھٹکار برستی ہے۔''

''لعنت ہو تم پر۔'' حاتم غصے سے بولا۔ ''یہ سب سُن کر بھی تم اس سے چپکے رہے!''

''کیا کرتا یار۔'' منیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''محبوب کا ملنا تو قیامت ہی ہے لیکن...... ہم صورتِ محبوب کا ملنا بھی قیامت۔''

''اچھا اچھا آگے بتاؤ، آگے کیا ہوا؟'' حاتم نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں؟'' منیر نے پھر ٹھنڈی سانس لینے کی کوشش کی۔ ''اس کے بعد یہ ہوا کہ میں اندھا بنا بھٹکتا پھر رہا ہوں اور کوئی نہیں جو کوہِ ندا کی خبر لے کر آئے۔''

''یار اب کوہِ ندا میں کیا رکھا ہے۔ بھول جاؤ اس کو۔''

''بھول جانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ کوہِ ندا کی خبر اس پروڈیوسر کو بتادی جائے تاکہ اس سے دس لاکھ لے کر اپنی آنکھوں کا علاج کرواؤں۔ ایک ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر اسے پانچ لاکھ مل جائیں تو وہ آنکھوں کا علاج کردے گا۔ میں پھر سے دیکھنے لگوں گا۔ ڈاکٹر کو پانچ لاکھ دینے کے بعد پانچ لاکھ بچیں گے۔ اس میں آدھا تمہارا ہوگا۔ آدھا میرا۔''

''اور حسن بانو کا کیا ہوگا؟''

''لعنت بھیجو اس بے وفا پر۔'' منیر نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ اس نے فلم کے ڈائریکٹر سے شادی کرلی ہے۔''

''چلو میں کوہِ ندا والی مہم پر نکل جاتا ہوں۔ لیکن تم کہاں ملو گے؟''

''اسی خیراتی اسپتال کے سامنے والی فٹ پاتھ پر۔ ایک فقیر سے دوستی کرلی ہے۔ اس نے ترس کھا کر مجھے اپنے پاس جگہ دے دی ہے۔ پارٹ ٹائم میں بھیک بھی مانگ لیتا ہوں۔''

''منیر تمہاری حالت سُن سُن کر افسوس ہو رہا ہے مجھے۔'' حاتم نے کہا۔ ''خدا تم پر رحم کرے۔''

''میرے بھائی، تم اگر کوہِ ندا کو پکڑ لاؤ تو پھر خیر ہی خیر ہوگی۔ جاؤ لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ کوہِ ندا کیا بلا ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم تو نہیں ہے۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ کوئی پہاڑ ہے جس سے آواز آتی ہے۔ خبردار اس طرف نہیں آنا۔ سیدھے چلے جاؤ۔ مڑ کر مت دیکھنا۔ لیکن سنا ہے کہ اس میں اتنی کشش ہے کہ لوگ مڑ کر دیکھتے ہیں اور پتھر کے ہوجاتے ہیں۔''

''خدا کرے کہ وہ کم بخت پروڈیوسر بھی میری پیمنٹ کرنے کے بعد پتھر کا ہوجائے۔'' منیر نے کہا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کوہِ ندا کی طرف۔'' حاتم نے کہا۔ ''دیکھتا ہوں وہ کیا بلا ہے۔''

''ضرور جاؤ۔ اور ہوٹل کے پیسے دیتے جانا۔ اس کے علاوہ تھوڑے پیسے ادھار بھی دے دینا۔ دردانہ کو دینا ہے۔''

''یہ دردانہ کون ہے؟'' حاتم نے پوچھا۔

''اسی اسپتال کی ایک نرس ہے۔'' منیر نے بتایا۔ ''بہت اچھی آواز ہے اس کی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید کوہِ ندا وہی ہے۔''

حاتم اس بار بھنّا گیا تھا۔ ''ابے تم نے مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔ میں تو تمہارے الٹے سیدھے سوالوں کے چکر میں اپنی زندگی برباد کر رہا ہوں اور تم لڑکیوں سے عشق کرتے پھر رہے ہو۔ اب کیا میں اسی کام کا رہ گیا ہوں؟''

''دیکھو حاتم بھائی، اگر تم نے انکار کردیا تو تاریخ میں تمہارا نام بزدل کے طور پر لکھا جائے گا۔ تمہاری حاتم طائیت پر حرف آجائے گا۔ آنے والا مؤرخ یہ لکھے گا کہ ایک بار حاتم طائی نے منیر شامی کی مدد کرنے سے انکار کردیا تھا۔''

''ابے تو ابھی مجھے کون سا فائدہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ جب میں مر ہی چکا ہوں تو جہنم میں جائے تاریخ۔ کچھ بھی لکھتی رہے۔''

''نہیں بھائی۔ ایسا تو مت کہو۔'' منیر نے ہوا میں ہاتھ چلایا۔ ''کہاں ہے تمہارا ہاتھ۔ میں ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔''

حاتم نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ منیر نے ہاتھ تھام لیا۔ ''بھائی، میرا ایک ہی تو سہارا ہے اور وہ تم ہو۔ اگر تم ہی انکار کردو گے تو کون میرا ساتھ دے گا۔ پلیز۔''

''اچھا اچھا، یہ لو'' حاتم نے اس کے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھ دیا۔ ''اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''چلو اتنا ہی بہت ہے۔'' منیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس نرس کے لیے راجا جانی کے پان بندھوا کر لے جاؤں گا۔ بہت شوق سے کھاتی ہے۔''

حاتم اس کو بُرا بھلا کہتا ہوا ہوٹل سے باہر آگیا۔

اب سوال یہ تھا کہ کوہِ ندا کہاں سے تلاش کیا جائے۔ اس نے بھی کئی کوہ کے نام تو سن رکھے تھے لیکن کوہِ ندا نام کی کوئی چیز اس کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایسے موقع پر کوئی نہ کوئی فقیر منش اس کے کام آتا رہا ہے۔ اس نے کسی مستند فقیر کی تلاش شروع کردی جو اس کا معاملہ حل کرسکے۔

ایک جگہ ایک فقیر دکھائی دے گیا جس کے چہرے پر جلال سا تھا۔ اس کی داڑھی بہت بارعب تھی۔ اس نے ایک ایسا چغا پہن رکھا تھا جس میں درجنوں پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ فقیر ایک طرف بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو پروا ہی نہیں تھی کہ کوئی اس کو بھیک دے بھی رہا ہے یا نہیں۔ وہ نظیر

اکبرآبادی کا آدمی نامہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس کی آواز میں بھی درد تھا۔ حاتم کو محسوس ہوا کہ وہ جس مردِ قلندر کی تلاش میں تھا۔ یہ وہی ہے۔ وہ اس فقیر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ فقیر نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرا کر بولا۔ ''کیا بات ہے میاں۔ کیا تم بھی یہاں ٹھیا لگا رہے ہو؟''

''نہیں درویش صاحب۔ میں تو آپ کے دیدار کے لیے آیا ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ آپ فقیر نہیں ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔''

''ارے نہیں بھائی، میں کہاں کا پہنچا ہوا۔'' اس نے انکساری سے کہا۔ ''میں تو ایک عام سا بندہ ہوں ۔ ویسے تم کیوں فقیروں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟''

''جناب، مجھے کوہِ ندا کی تلاش ہے۔'' حاتم نے بتایا۔

''اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے۔''

''اور یہ کوہِ ندا کیا بلا ہے؟''

''جناب یہ ایک پہاڑ ہے۔'' حاتم نے بتایا۔ ''اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کی طرف مڑ کر دیکھ لے وہ پتھر کا ہو جاتا ہے۔ اس میں سے آواز آتی رہتی ہے۔ مڑ کر مت دیکھنا۔ اس کے باوجود اس کی کشش اتنی ہے کہ لوگ مڑ کر دیکھ لیتے ہیں اور پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ میں اسی پہاڑ کی تلاش میں ہوں۔''

''ہوں۔'' مردِ درویش نے ایک ہنکاری بھری۔ ''میرے بھائی، تو کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ خیر میں تجھے اپنے مرشد کے پاس لے چلوں گا۔ میرے مرشد بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ تیسری بار الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اس بار امید ہے کہ وہ جیت جائیں گے۔''

''فقیر بھائی، پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ الیکشن کیا ہے؟'' حاتم نے پوچھا۔ ''اور جیتنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟''

''تو کس زمانے کا آدمی ہے؟'' فقیر نے حیرت سے حاتم کو دیکھا۔ ''تجھے الیکشن بھی نہیں معلوم؟''

''بھائی، یہ سمجھ لو کہ میں ایسی جگہ سے آیا ہوں جہاں اس قسم کی چیزیں نہیں ہوتیں۔ سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے۔ ایک بادشاہ ہوتا ہے جس کے سپاہی عوام کو کوڑے مار مار کر سیدھا رکھتے ہیں۔''

''بس بس۔ اب اتنا ہی سمجھ لو کہ آج کے دور میں ہمارے اوپر کوئی بادشاہ اپنے باپ دادا کی طرف سے مسلط نہیں ہوتا بلکہ جمہوریت کی برکت سے مسلط ہوتا ہے۔''

''کمال ہے۔'' حاتم نے تبصرہ کیا۔ ''اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟''

''اس کے بعد پھر اس کے سپاہی پانچ برسوں تک ڈنڈے مارتے رہتے ہیں۔ ہر پانچ برس کے بعد کسی اور کو موقع دیا جاتا کہ اب وہ ڈنڈے مارے۔''

''کمال ہے... اور لوگ خوش رہتے ہیں؟''

''ہاں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جمہوریت کے نام پر ڈنڈے کھا رہے ہیں۔ اور یہ بہت ثواب کا کام ہے۔''

''تمہارے مرشد کا کیا معاملہ ہے؟''

''مرشد۔ ہر الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں تاکہ عوام انہیں ووٹ دیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ ہر بار ہار جاتے ہیں۔ اس چکر میں وہ برباد ہو کر رہ گئے۔ لیکن چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔''

حاتم اچانک کھڑا ہو گیا۔ ''بھائی فقیر تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ شکریہ تمہارا۔''

''کس طرح حل کر دیا؟''

''کوہِ ندا کا راز سمجھ میں آ گیا ہے۔ آج کے دور میں کوہِ ندا جمہوریت کو کہتے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ فقیر بھی جوش میں کھڑا ہو گیا۔ ''یہ تو تم نے بہت زبردست بات بتا دی ہے۔ واقعی میں مرشد سے کہتا بھی ہوں کہ کن چکروں میں پڑے ہیں۔ لعنت بھیجیں الیکشن پر لیکن وہ نہیں مانتے۔ ہر بار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم کیا جانو کہ اس میں کیا نشہ ہے۔ کیا جادو ہے۔ اب پتا چلا کہ جمہوریت ہی اس دور میں کوہِ ندا ہے۔ خدا تم کو خوش رکھے۔ تم نے تو میری مشکل آسان کر دی ہے۔''

''اے مردِ درویش۔ یہی حال میرا بھی ہے۔'' حاتم نے کہا۔ ''تم نے بھی میری مشکل آسان کر دی ہے۔''

حاتم اس کے بعد منیر شامی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے منیر سے اس کا پتا معلوم نہیں کیا تھا۔

منیر شامی اس کو اس جنم میں دوبارہ نہیں مل سکا۔ لیکن حاتم کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے موجودہ دور کا کوہ ندا دریافت کر لیا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ کسی بھی جنم میں اگر کوئی کام کی بات پتا چل جائے تو سمجھو کہ تم نے دنیا سے کچھ حاصل کر لیا ہے۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

چھبیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
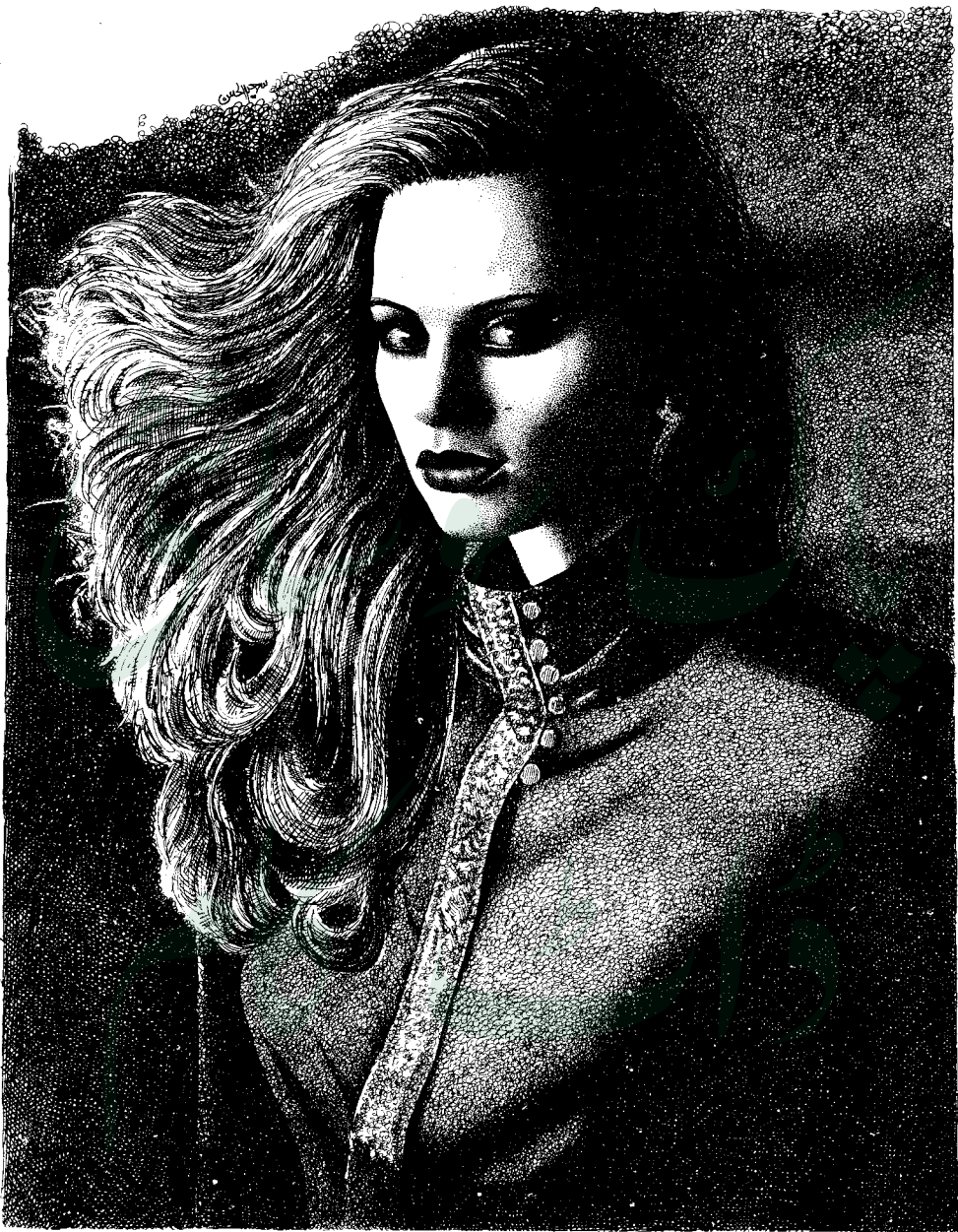
میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچا تا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ناقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پارا ہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ناقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے

میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی پھنگی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور عظمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ بالآخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہم سب زیرزمین پرآسائش تہ خانے میں منتقل ہو چکے تھے...... آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اور میں اس جلسے میں جا پہنچا جہاں رائے زل اور آقا جان کی ٹیم موجود تھی۔ میں نے رائے زل کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور یہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔ ہمارا منصوبہ تقریباً کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ رائے زل بالکل ٹھیک ہے۔ اسٹیج پر اس کی جگہ نقلی رائے زل تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ رائے زل زندہ ہے یہ خبر بہت ہی دل سوز تھی۔ ہم خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک باہر جاتے ہیں مگر پتا چلتا ہے کہ باہر ایجنسی کے لوگ تھے...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی بری حالت تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ ہاناوانی کے ہر جادوئی عمل کو اپنی قوت ارادی سے ناکام کر دیا تھا۔ وہ اپنی ناکامی سے تلملائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر پال میری حالت سے تشویش میں مبتلا تھا۔ تاجور کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا کہ شاید وہ مجھ سے اگلوا سکے مگر ہر صورت میں ناکامی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عورتوں کی تعداد اور ان کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ان میں سے چند عورتیں اندر تاجور کے پاس چلی گئی تھیں، باقیوں نے مکان کو گھیرا ہوا تھا اور نعروں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ کچھ نے اپنے بچے بھی اٹھا رکھے تھے۔ میں اور انیق کھڑکی میں سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا تماشا ہے؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

انیق بولا۔ ''اس تماشے میں میرا اور آپ کا کوئی قصور نہیں۔ مقامی لوگوں میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ رائے زل وغیرہ آپی تاجور کو اسی لیے یہاں جاماجی میں لے کر آئے تھے کہ وہ آپی تاجور کی اہمیت کو سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ان کے ذریعے آپ کو ہر بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے...... اور اب یہی طریقہ یہ لوگ بھی استعمال کرنا چاہ رہے ہیں۔''

عورتوں کی آوازیں کبھی بلند اور کبھی پست ہو جاتی تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد جزیرے کے مقامی باشندوں کی تھی، تاہم برونائی سے منتقل ہو کر یہاں آباد ہونے والے چہرے بھی کثیر تعداد میں نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ہم نے ایک عجیب نظر دیکھا۔ بہت سی عورتیں تاجور کو گھیرے ہوئے ہماری طرف لا رہی تھیں۔ تاجور نے اپنی سرخی مائل اوڑھنی سے اپنا سر اور چہرے کا کچھ حصہ ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ پریشان دکھائی دیتی تھی اور لگا ہے احتجاجی انداز میں عورتوں سے کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ لیکن وہ سب اسے پچکار پچکار کر اور اپنی بانہوں میں لے کر ہماری جانب بڑھتی آ رہی تھیں۔ ان کے انداز میں ایک جوش آمیز محبت تھی۔ یقینی بات تھی کہ ان کی ملائی زبان تاجور کی سمجھ میں نہیں آ رہی اور جو کچھ تاجور کہہ رہی ہے وہ ان کے پلے نہیں پڑ رہا۔ عورتیں اب صحن کے وسط میں پہنچ چکی تھیں۔

انیق نے آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ خیر! اس سیلاب کا رخ آپ کی طرف ہی لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سیکڑوں عورتیں اب آپ اور آپی کے درمیان صلح کرانے کے چکر میں ہیں۔''

''صلح؟'' میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ آپ دونوں ایک

دوسرے سے کچھ خفا ہیں۔ ڈی پیلس میں آپ دونوں کے درمیان جو جھڑپ ہوئی تھی اس کی نیوز بھی کسی طرح ''لیک'' ہو چکی ہے۔ یہاں آزاد میڈیا تقریباً ختم ہو گیا ہے، اس لیے کئی طرح کی افواہیں بھی بہت جلد پھیل جاتی ہیں۔''

پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر جلوس میرے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پندرہ بیس عورتیں تاجور کو لے کر اندر آ گئیں۔ باقی دروازے کے سامنے، صحن میں اور صحن سے باہر کھڑی ہو گئیں۔ عورتوں نے مجھے بڑی محبت سے مخاطب کیا اور ملائی زبان میں پتا نہیں کیا کیا کہنے لگیں، ساتھ ساتھ وہ تاجور کی طرف بھی اشارے کر رہی تھیں۔ تاجور کی خوب صورت آنکھوں میں ہراس اور نمی تھی۔

عورتیں جو کچھ کہہ رہی تھیں ان میں سے بس چند الفاظ ہی میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ مثلاً...... بہت اچھی لڑکی...... آپ بھی بہت اچھے...... قدرت...... بندھن...... محبت...... اچھا شگون وغیرہ۔

دو ادھیڑ عمر عورتوں نے مجھے کندھوں سے تھام کر لکڑی کی منقش چوکی پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں پھر تاجور کو بھی چوکی پر بٹھا دیا گیا اور اس کے ماتھے کو بوسے دیے گئے۔

انیق نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان کی کوئی رسم ہے جو کچھ یہ کہتی ہیں کرتے جائیں، یہی مناسب ہے۔''

لکڑی کی چوکی پر ہمارے درمیان ایک بلوری پیالے میں ڈینی کے بہت سے پھول رکھ دیے گئے اور ہمارے اوپر گلابی رنگ کی ایک چادر ڈال دی گئی۔ میرے اور تاجور کے سر کو آگے کی طرف اس طرح جھکایا گیا کہ ہماری پیشانیاں آپس میں جڑ جائیں۔ تاجور بے بسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی، مجھے بھی الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا سر آگے جھکانے سے انکار کیا تو دو تین بوڑھی عورتوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بے حد منت سے کچھ کہا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ ہم مزاحمت نہ کر سکے۔ میں نے اپنا سر آگے جھکایا، تاجور بھی جھکی اور ہماری پیشانیاں ایک دوسرے سے لگ گئیں۔

درمیانی عمر کی ایک خوش پوش مقامی عورت نے میرا بایاں ہاتھ تاجور کے دائیں ہاتھ میں تھما دیا اور تاجور کا بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں دے دیا۔ ہمیں چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ عورتوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرا۔

وہ منقش چوکی کے اردگرد فرش پر بیٹھ گئیں اور مقامی زبان میں ہم آواز ہو کر کوئی قدیم گیت گانے لگیں۔ عجیب سحر انگیز سی آوازیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر اتار چڑھاؤ میں جیسے محبت کا ایک آبشار بہہ رہا تھا۔ گانے والی عورتیں زیادہ تر جوان ہی تھیں۔

چادر کے اندر تاجور کے سانسوں کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کی قربت کی وہی بھینی بھینی خوشبو نے کبھی مجھے چاند گڑھی میں اور ملنگی ڈیرے پر سرشار کیا تھا۔ میں اس خوشبو کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ کیوں تھا ایسا؟ میں جو یورپ کی حسین ترین دوشیزاؤں کے سحر کا شکار نہیں ہوا تھا کیوں ایک نسبتاً کم خوب صورت دیہی لڑکی کی زلف کا ابدی اسیر ہو گیا تھا؟ یہ کیسا ناتا تھا؟ یہ کب قائم ہوا تھا؟ کیوں ایسے لگتا تھا کہ وہ میرے ہی جسم کا ایک نایاب حصہ ہے۔ جیسے کسی قدیم خزانے کے نقشے کا ایک گمشدہ ٹکڑا۔ یہ وہ سوال تھا جو میں خاموشی کی زبان میں ہزاروں ہی بار اپنے دل سے پوچھ چکا تھا مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے لگا اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی ہے۔ اس نے ہولے سے میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہماری پیشانیاں بدستور اپنی جگہ پر رہیں۔ اس کی آنکھ سے ایک موتی گرا اور اس کی آغوش میں جذب ہو گیا۔

کچھ دیر بعد گیت ختم ہو گیا۔ ہم پر سے گلابی چادر اٹھا دی گئی۔ کچھ بوڑھی عورتوں نے میرا سر چوما اور کچھ نے تاجور کا۔ میرے ہاتھ میں گل داؤدی کی طرح کا ایک پھول دیا گیا جو میں نے تاجور کے ہاتھ میں تھمایا، تاجور کو جو پھول دیا گیا وہ اس نے میرے ہاتھ میں تھمایا۔ یہ رسم...... یا جو کچھ بھی یہ تھا اختتام پذیر ہوا اور عورتیں تاجور کو لے کر مکان کے صحن کی طرف اور پھر اس کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد مرکوزا کا میئر (ناظم) باذان آ دھمکا۔ وہ میرے جسم کے کچھ بگڑے ہوئے زخموں کے لیے ایک مقامی معالج کو لے کر آیا تھا۔ اس نے کچھ دوائیں کھانے کو اور کچھ لگانے کو دیں۔ میرے انگوٹھے کے زخم پر کئی ٹانکے لگے تھے مگر اندر سے زخم ابھی کچا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد معالج چلا گیا تو باذان نے کہا۔ ''شاہ زیب! آپ کے حوالے سے لوگوں میں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں آپ کی صحت کی جلد بحالی کے لیے دعائیں کی جا رہی ہیں۔''

ان دعاؤں کے لیے آپ سب لوگوں کا بہت شکریہ باذان۔ لیکن اگر تم لوگ مجھ سے یہ توقع لگا رہے ہو کہ میں جنگ کی صورت حال میں کسی طرح تم لوگوں کی مدد کرسکوں گا تو یہ خام خیالی ہے۔ میں اس ''فیلڈ'' کا بندہ نہیں ہوں......''

''بات یہ نہیں ہے شاہ زیب صاحب۔'' وہ شستہ رواں انگلش میں بولا۔ ''دراصل آپ نے ایجنسی کے بے انتہا تشدد کے سامنے بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کر کے اور ثابت قدم رہ کر لوگوں کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ بے شک لوگ محترم آدم کی بیٹی قسطینا سے بھی والہانہ پیار کرتے ہیں اور ان کے ایک اشارے پر بے شمار لوگ جانیں دینے پر تیار ہو جاتے ہیں مگر جس قسم کے احساسات وہ آپ کے بارے میں رکھ رہے ہیں، وہ بالکل مختلف ہیں۔''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ خجل ہوئے بغیر بولا۔ ''آپ نے رائے زل اور ایجنسی کی قید میں بہت کچھ سہا ہے شاہ زیب صاحب! لیکن شاید ابھی خود بھی آپ کو کچھ باتوں کا پتا نہیں۔ یہ بات بھی سننے میں آرہی ہے کہ مادام ہاناوانی اگر بیمار ہوئی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے آپ کے حوالے سے خود اپنے ہی طریقہ کار کی خلاف ورزی کی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں باذان!''

''یہ بات اکثر لوگ جانتے ہیں کہ مادام اپنے شکار کو ہپناٹائز کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تین کوششیں کرتی ہے۔ ستر اسی فیصد لوگ تو اس کی پہلی کوشش میں ہی اس کے ''ٹرانس'' میں آجاتے ہیں۔ باقی بیس پچیس فیصد اس کی دوسری کوشش کی تاب نہیں لا پاتے، تیسری کوشش کی نوبت کم کم ہی آتی ہے۔ چند دن پہلے جب آپ کو اس عمل سے گزارنے کے لیے مادام کے پاس لے جایا گیا تو اس نے وقفے وقفے سے آپ پر تین کوششیں کیں اور آپ ان معدودے چند لوگوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے اس کی تینوں کوششوں کو ناکام بنایا مگر مادام سے یہ ناکامی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے اپنے اصول کو خود توڑا۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ...... اس نے مزید کوشش کی؟''

باذان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ بات ہمیں دو روز پہلے ہی معلوم ہوئی ہے کہ اس سے اپنی ناکامی ہضم نہیں ہوئی اور اس نے آپ کو چوتھی بار بھی ہپناٹائز کرنا چاہا۔''

''مگر مجھے تو اس حوالے سے کوئی خبر نہیں۔''

''مادام نے یہ کام اس وقت کیا جب ٹارچر سیل میں ناقابل برداشت حرارت سہنے کے بعد آپ چوتھی یا پانچویں دفعہ بے ہوش ہوئے تھے۔ مادام نے خیال کیا کہ اس صورت حال میں آپ کی قوت مدافعت بہت کمزور ہو چکی ہے۔ آپ کو خاص قسم کے دو انجکشن لگائے گئے اور کہا جاتا ہے کہ مادام نے آپ کو نیم غنودگی کے عالم میں ٹرانس میں لانے کی کوشش کی، مگر پھر ناکام ہوئی اور اس عمل کے دوران میں ہی اس کی اپنی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں بھی شدید تکلیف کی شکایت کی اور اسے فوراً اسپتال روانہ کرنا پڑا، جہاں وہ اب تک موجود ہے۔''

''تم تک یہ باتیں کیسے پہنچیں؟''

''بہت باوثوق ذریعے سے شاہ زیب صاحب، اور مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ حقیقت وہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔''

پتا نہیں کیوں، میرے دل کے اندر سے گواہی سی آنے لگی کہ یہ بندہ درست کہہ رہا ہے۔ میرے اپنے ذہن میں بھی کبھی کبھی ایک دھندلا خاکہ سا بنتا تھا۔ اس خاکے کا تعلق اسی منحوس ٹارچر سیل سے تھا جہاں میں نے زندگی کے بدترین شب و روز گزارے تھے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اس ٹارچر سیل میں نہایت گرم فرش پر لیٹے لیٹے مادام کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ نہایت چمکیلی اور پرہول آنکھیں۔ وہ اپنے ہونٹوں کو عجیب انداز سے ہلا رہی تھی۔ اس وقت بھی شاید میں نے اپنے زخمی انگوٹھے کو کچلا تھا اور ایک ست رنگے بھنور سے دور رہنے کی کوشش کی تھی۔

باذان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ بولا۔ ''مقامی لوگ آپ کو اس حوالے سے بھی بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں کہ آپ نے مادام ہاناوانی کی آنکھوں والے جادو کو ناکام کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا اس جزیرے پر آنا ایک خدائی مدد کی طرح ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے یہ بات بار بار بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں کے لوگ کیا سمجھتے ہیں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ میرے یہاں رہنے سے تم سب لوگوں پر آفت آئے گی اور بہت جلد آئے گی۔''

''لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے شاہ زیب! لوگ بہت بڑی تعداد میں مرکوزا میں اور مرکوزا کے اردگرد موجود ہیں۔ رائے زل اور ایجنسی والے کوئی فوری ایکشن نہیں لیں گے۔ حالات ایسے ہیں کہ وہ اس وقت مزید

بدامنی ''افورڈ'' نہیں کر سکتے۔'' اس نے مزید بھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر رک گیا۔ میرا قیافہ تھا کہ وہ مجھ سے قسطینا اور دیگر لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، میں فی الحال اس بارے میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ باذان کو بھی نہ بتاتا، بہرحال اس نے عقلمندی کی کہ اس حوالے سے کچھ پوچھ کر شرمندہ نہیں ہوا۔

اگلے روز شام تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ دو ڈاکٹرز دن میں دو تین بار مجھے دیکھ رہے تھے اور ضروری طبی امداد فراہم کر رہے تھے۔ وہ بہار کی ایک خوشگوار شام تھی۔ کھڑکی میں سے آسمان کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہاں شفق کی سرخی تھی اور ایک دو ستارے اپنی جھلک دکھا رہے تھے جو ہوا اس گنجان آبادی کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس کمرے تک پہنچ رہی تھی اس میں گلابوں اور ڈیزی کے پھولوں کی مہک تھی۔ میں آرام دہ بستر پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شروع شروع میں مقامی میڈیا نے کچھ آزادانہ صحافت کی تھی مگر اب میڈیا بالکل پالتو دکھائی دے رہا تھا۔ جزیرے کے دونوں اہم چینلز مسلسل رائے زل اور اس کی والدہ کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ بغاوت کرنے والے ''مٹھی بھر'' عناصر کو سختی سے کچل دینے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ میرا ذہن بار بار شکیل داراب کی طرف جاتا تھا اور سینے کی جلن بڑھ جاتی تھی...... لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ میڈیا پر نہ سامنے۔ میرے لیے یہ انکشاف بھی بے حد اہم تھا کہ ہاناوانی نے ٹارچر سیل میں مجھے ایک بار پھر زیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں سوچوں میں گم تھا...... اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ میرا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ ''آجاؤ۔'' میں نے اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں کہا۔

دروازہ کھلا اور تاجور ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ وہ میری عیادت کے لیے آئی تھی لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ روہانسی سی ہوگئی، کہنے لگی۔

''شاہ زیب! یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یہ عورتیں میری جان کو آئی ہوئی ہیں۔ اپنی بات سمجھانے کے لیے کل ایک انڈین لڑکی کو اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ یہ ایسا کیوں سمجھ رہی ہیں کہ میں...... آپ سے سب کچھ منوا سکتی ہوں اور...... آپ میرے کہنے پر یہاں سے جانے کا ارادہ بدل سکتے ہیں، ان لوگوں کی خاطر لڑائی میں حصہ لے سکتے ہیں؟''

''یہ ان لوگوں کی اپنی سوچ ہے تاجور! اس پر میرا اختیار نہیں ہے۔ شاید یہ سمجھتی ہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی قریبی رشتہ ہے۔''

وہ بے دھیانی میں اپنی انگلی کی انگوٹھی کو چھو کر بولی۔ ''میں نے انہیں یہاں تک بتا دیا ہے کہ آپ...... میرے منگیتر نہیں ہیں۔ میری شادی کہیں اور ہونے والی ہے۔ میں جلد از جلد واپس اپنے لوگوں میں جانا چاہتی ہوں۔''

''پھر...... انہوں نے تمہاری بات پر یقین کیا؟''

''نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ سمجھتی ہیں کہ میں آپ سے ناراضگی کی وجہ سے ایسی باتیں کرتی ہوں۔ ورنہ ہم......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں میں بے بسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ویسے، تمہارا اپنا کیا خیال ہے تاجور! مجھے ان لوگوں کی بات ماننی چاہیے یا نہیں؟''

''میں...... کیا بتاؤں لیکن جو کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے وہ تو یہی ہے کہ آپ اپنی جان سخت خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی اپنی لڑائی ہے اور مدت سے چل رہی ہے۔ ہم اس آگ میں کیوں کودیں۔ آپ اپنے دوستوں کو اور مولوی فدا صاحب کی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جائیں۔''

''ان حالات میں ان کا نکلنا بھی تو آسان نہیں ہے تاجور! اس جزیرے کے اور اردگرد کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ یہاں سے آسانی کے ساتھ فرار ہوا جا سکے...... اور بات، ایک اور بھی ہے تاجور!'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس نے میری جانب دیکھا۔ شام اب گہری ہوگئی تھی۔ تاجور کے عقب میں کھڑکی تھی اور اس میں سے چند ستارے جھانک رہے تھے۔ ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے بالوں کی لٹیں تاجور کے چہرے پر بکھیریں جنہیں اس نے چہرے سے ہٹا کر اپنے کانوں کے پیچھے اڑس لیا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! یہ ظالموں اور مظلوموں کی لڑائی ہے اور مظلوموں میں نوّے فیصد مسلمان ہیں۔''

''لیکن آپ ان مسلمانوں کی جو مدد کر سکتے تھے وہ آپ نے کر دی ہے بلکہ اپنی ہمت، طاقت سے زیادہ کی ہے۔ آپ نے ان کی کمانڈر قسطینا وغیرہ کو گرفتاری سے بچانے کے لیے خود کو موت کے منہ میں پہنچایا ہے، اب اگر آپ کو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ملتا ہے تو آپ کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''مگر میں اپنے ساتھیوں اور زینب کے بغیر یہاں

سے کیسے نکل سکتا ہوں تاجور.. اور فی الحال انہیں یہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔''

وہ بے قراری سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ لٹیں پھر اس کی پیشانی پر ڈھلک آئی تھیں۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کی سفید اوڑھنی کے گہرے زرد پھول دمک رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں شاہ زیب! میں تو بس...... یہی کہہ سکتی ہوں کہ اللہ کا نام لے کر مجھے شکیل صاحب کے سپرد کر دیں۔ میں ان کی بیوی کی منت سماجت کروں گی کہ وہ مجھے پاکستان واپس بھجوا دیں اور اگر...... آپ کا خیال ہے کہ شکیل صاحب کے پاس جانا میرے لیے ٹھیک نہیں تو پھر...... مجھے کسی بھی طرح پاکستان بھجوا دیں جو میری قسمت میں لکھا ہوگا وہ مجھے مل جائے گا۔''

اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں پھر پانی کی چمک تھی۔

میں نے اسے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ ''تاجور! کب ہے تمہاری شادی؟''

وہ اس اچانک سوال پر لرز سی گئی پھر سنبھل کر بولی۔ ''تاریخ تو اگلے ماہ کی ہے...... آگے جو اللہ کو منظور۔'' اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! تمہیں شاید ان حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں جن میں اس وقت میں اور تم بلکہ ہم سب گھرے ہوئے ہیں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

''تاجور! اگر میں یہ کہوں کہ تمہاری شادی نہیں ہوسکتی تو پھر؟''

''مم...... میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''تمہارے ہونے والے شوہر کا نام سیف ہے نا؟ وہ کبڈی کا مشہور کھلاڑی بھی ہے؟''

تاجور کے چہرے پر بے پناہ تحیر امڈ آیا۔ ''آ...... آپ کو کیسے پتا؟'' وہ بولی۔

''تمہیں یہ جان کر مزید حیرانی ہوگی کہ میں نہ صرف اسے جانتا ہوں بلکہ وہ کچھ دن پہلے تک جزیرے میں یہاں میرے ساتھ بھی موجود تھا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''یہ ہوا ہے تاجور! اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا ہے۔'' میرے لہجے میں دکھ تھا۔ میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''سیف کو لڑائی بھڑائی بہت پسند تھی نا...... اور اپنے اسی شوق کے لیے وہ ہمارے ساتھ یہاں تک آن پہنچا تھا۔''

''مگر کیسے؟ اور...... اب...... کہاں ہیں وہ؟'' تاجور کی آواز کپکپا رہی تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اب آسمان کا وہ ٹکڑا ستاروں سے جھلملا رہا تھا۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے بار بار کمرے میں گھس آتے تھے، مرکوزا کی گلیوں میں ایک سنسنی سی تیر رہی تھی اور اس سنسنی میں کبھی کبھی نعروں کی مدھم گونج بھی شامل ہو جاتی تھی۔ جب بھی کوئی ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا اس ''ایریا'' کے اوپر سے گزرتا تھا نعروں کی گونج میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

میں نے بڑے محتاط لفظوں میں تاجور کو وہ روداد سنانا شروع کی جس کا تعلق اس کے منگیتر سیف عرف سیفی سے تھا اور جس کے نام کی انگوٹھی اب بھی اس کی انگلی میں چمک رہی تھی۔ میں نے یہ روداد سکھیر اگاؤں میں اپنی آمد سے شروع کی (مگر یہ نہیں بتایا کہ میں پاکستان چھوڑنے سے پہلے اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا اس لیے سکھیرا گاؤں پہنچا تھا) میں نے کہا کہ ایک اہم کام کے سلسلے میں مجھے اس علاقے میں جانا پڑا تھا۔ میں نے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہونے والی اپنی اس لڑائی کا ذکر کیا جس میں سیف بھی شریک تھا۔ اس کے بعد سیف کا میرے پیچھے لیہ پہنچ جانا اور اصرار کرنا کہ میں اسے لڑائی کے داؤ پیچ سکھاؤں، اس کے بعد سیف کا ضد کر کے ہمارے ساتھ یہاں برونائی سے آگے جاماجی پہنچنا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ شروع میں مجھے ہرگز ہرگز یہ پتا نہیں تھا کہ سیف اس کا منگیتر ہے، اس کا پتا بعد میں چلا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ یہاں جاماجی پہنچ کر کس طرح کے غیر متوقع حالات پیش آئے اور وہ لڑائی جسے ہم گروہی مارا ماری سمجھ رہے تھے، کیسے ایک وسیع پیمانے کی جنگ کی صورت میں سامنے آئی، کس طرح حالات نے بتدریج ہمیں اپنے شکنجے میں جکڑا اور کیسے ریان فردوس کی کم ہمتی کے باعث اور آقا جان پر اس کے بے پناہ اعتماد کے باعث شکست ڈی پیلس کا مقدر بن گئی۔ ریان فردوس کی موت کے بعد ہمیں ایک قریبی ٹاپو پر پناہ لینا پڑی اور رائے زل نے امریکیوں کے ساتھ مل کر ہماری تلاش میں جگہ جگہ چھاننا شروع کیا اور پھر ہمیں ڈھونڈ نکالا۔

روداد کے بالکل آخری مرحلے میں پہنچ کر میں نے کہا۔ ''تاجور! زندگی کی کئی حقیقتیں بہت ہی کڑوی اور تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ تم یہ میرا

زخم زخم جسم دیکھ رہی ہو اور تم نے میری زخمی حالت کی وہ ہزاروں تصویریں بھی دیکھی ہوں گی جو یہاں کے گلی کوچوں میں آویزاں ہیں۔ تمہیں اندازہ ہو رہا ہو گا کہ ٹاپو میں امریکن ایجنسی کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد کیپٹن تبارک، سیف اور میرے ساتھ کس طرح کا سلوک ہوا۔ اس غیر انسانی تشدد کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن ہی نہیں۔ پکڑے جانے کے بعد میں نے ہر ہر پل یہی سوچا کہ کاش سیف نے میرے پیچھے پناہ گاہ سے نکلنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔ ہم سے پوچھ گچھ شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم پر کتنی بڑی آفت ٹوٹنے والی ہے اور پھر وہی کچھ ہوا جس کے بدترین اندیشے میرے دل میں موجود تھے۔ یہ وہ مقام تھا تاجور جہاں انسان کو موت، راحت محسوس ہوتی ہے اور وہ زندگی سے چھٹکارے کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگتا ہے۔ کیپٹن تبارک کی تدبیر تو کام کر گئی۔ بے پناہ تشدد سے گزرتے ہوئے اس نے ایک موقع پر امریکن جلاد کو اتنا بھڑکا دیا کہ اس نے اسے موقع پر ہی شوٹ کر ڈالا۔ اس نے الٹا لٹکے لٹکے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ لیکن...... سیف کے لیے...... ایسا کوئی چانس موجود نہیں تھا......'' میری آواز بھرا گئی۔

تاجور سکتے کے عالم میں سُن رہی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ خاموش رہ کر خود کو تھوڑا سا سنبھالا اور آخر وہ جانکاہ خبر تاجور کو سنا دی جس کے لیے میں اسے پچھلے ایک گھنٹے سے بتدریج تیار کر رہا تھا۔

میں نے تاجور کو بتا دیا کہ کس طرح امریکی لونگ کے سخت ترین تشدد کے دوران میں سیف اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک سخت چوٹ اس کے سینے پر لگی، اس نے خون کی ایک بڑی الٹی کی اور بے ہوشی کی حالت میں دم توڑ گیا۔ میں نے زہر والی بات تاجور سے چھپا لی تھی، کیونکہ پتا نہیں تھا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آئے گی یا نہیں۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہ...... لیکن میرا دل تو جانتا تھا کہ میں نے سیفی کو موت کے حوالے کرتے ہوئے کتنا بڑا صدمہ اپنے دل و دماغ پر جھیلا تھا۔ وہ لمحے مجھے بھلائے نہیں بھولتے تھے اور بعد کے واقعات نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ سیف کو اذیت سے نجات دلاتے وقت، جو اندیشے میرے ذہن میں تھے وہ سو فیصد درست تھے۔ اگر درست نہ ہوتے تو میں خود کو دو مرتبہ شدید ترین خطرے بلکہ موت کے منہ میں جھونکنے کی کوشش نہ کرتا۔

تاجور سکتہ زدہ سی تھی۔ کتنی ہی دیر تک اسے سیف کی موت کا یقین نہیں آیا اور جب آ گیا تو اس کا ملیح چہرہ رنج و الم کے تاریک سایوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے ہیں پھر اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دلدوز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے...... اس کی والدہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر پائے گی، وہ تو اس کا نام لے لے کر جیتی ہے۔ دن رات اس کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ وہ تو مر جائے گی، آپ کہہ دیں یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔''

میں خاموش بیٹھا رہا۔ کہتا بھی تو کیا؟ وہ روتی رہی۔ اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے کہا۔ ''تاجور! یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل توقع کے خلاف ہے۔ ہم سب بھی اس وقت موت کے گھیرے میں ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ سیف کی جگہ میں ہوتا اور میری جان جلد چھوٹ گئی ہوتی۔''

وہ سسکی۔ ''وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ان کی زندگی اندھیر ہے۔ اس کی والدہ یہ صدمہ نہیں سہہ پائیں گی۔ میں کتنی بدقسمت ثابت ہوئی ہوں ان کے لیے اچھا ہوتا میں بھی مر گئی ہوتی۔'' صدمے کی شدت میں وہ پتا نہیں کیا، کیا بولتی جا رہی تھی۔

میں نے ملازمہ سے کہہ کر اس کے لیے پانی منگوایا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا مگر صدمہ تازہ تھا، اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، اس کی انگلی میں چمکیلے نگینے والی انگوٹھی حسرت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔

وہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان مجھ سے اس واقعے کی مزید تفصیلات پوچھنے لگی۔ کب ہوا یہ واقعہ؟ وہ کہاں دفن ہیں؟ آخری وقت میں انہوں نے کچھ کہا؟ ان کا ذاتی سامان کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ان سوالات کے جواب اسے دیے۔ رات کا کھانا ہمیں جیسے بھول ہی گیا تھا۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ بازان کی ملازمہ خاص کے ساتھ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

میرا سارا جسم جیسے زخموں کی وجہ سے جل رہا تھا۔ بخار کی کیفیت بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے کچھ زخم اچھے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ کمر اور پہلو کی طرف دو تین جگہ میری جلی ہوئی ''اسکن'' کو کاٹ بھی دیا گیا تھا تاکہ اس کا زہر جسم میں سرایت نہ کرے۔ تاجور کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس بات پر تھوڑی سی خفگی کا اظہار بھی کیا

کہ میں نے وقت پر کھانا اور دوا کیوں نہیں لی اور اپنی پٹیاں کیوں نہیں بدلوائیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ کئی گھنٹوں سے میں کرب کے کس دورانیے سے گزر رہا تھا (دکھ درد کے ایسے ہی دورانیے ہوتے تھے جب میں بے ساختہ اپنے ہاتھ شراب کی طرف بڑھا دیا کرتا تھا مگر اب تو میں اس چیز کو بھی خود سے دور کر چکا تھا)

☆☆☆

ہمیں یہاں مرکوزا میں پانچ چھ دن گزر چکے تھے۔ ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی شہر کے اس علاقے میں کوئی بڑا آپریشن ہو جائے گا جس میں بے تحاشا جانی نقصان ہوگا مگر ابھی تک تو باذان کی بات درست ہی ثابت ہو رہی تھی۔ قابض فوجیوں نے مرکوزا میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ کسی بڑی تیاری میں مصروف تھے۔

انیق اور سجاول نے اپنے حلیے اور نام بدل رکھے تھے۔ صرف باذان کو ان کی اصلیت کا علم تھا۔ وہ دونوں آزادانہ مرکوزا کے اندر گھوم پھر لیتے تھے۔ اس وقت بھی سجاول پربت سنگھ کے روپ میں مرکوزا کی عمومی صورتِ حال کا جائزہ لینے نکلا ہوا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز تھا اور انیق میرے کمرے میں تھا۔ وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی اپنی حسِ مزاح برقرار رکھتا تھا۔ اب بھی وہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ کافی دیر اسی پوزیشن میں رہا تو میں نے کہا۔ ''کیا ناٹک کر رہے ہو؟''

وہ ترنت بولا۔ ''میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے چاند گڑھی میں پہلوان حشمت سے رابطے میں ہوں۔ وہ مجھے اپنا تازہ کلام سنا رہا ہے اور میں اسے یہاں کے تازہ حالات بتا رہا ہوں۔ تازہ بھی اور بے حد حیران کن بھی۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں جناب، یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ یہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پی رہے ہیں۔ یعنی میں اور امریش پوری بہ امرِ مجبوری کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔ کبھی ایسا سوچا نہ تھا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''بکری زیادہ میں، میں کرے گی تو شیر اسے چیر پھاڑ بھی سکتا ہے۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔''

''شیر اپنے آپ کو کہاں تک کنٹرول میں رکھ سکتا ہے جناب۔ ایک نہ ایک دن تو میری برداشت نے جواب دینا ہی ہے۔''

''گویا شیر تم اپنے آپ کو کہہ رہے ہو؟''

''میں کہہ نہیں رہا جناب، میں ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔'' اس نے رونی صورت بنائی۔

میں نے کہا۔ ''اچھا، یہ بکواس بند کرو اور پاس آ کر ایک کام کی بات سنو۔''

اس نے سر کھجایا اور بولا۔ ''اچھا ایک منٹ جناب! میں پہلوان سے اجازت لے لوں۔'' اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

ایسے موقع پر وہ مجھ سے سیدھی لات کھایا کرتا تھا مگر فی الوقت فاصلہ زیادہ تھا اور ویسے بھی میں ''بیڈ ریسٹ'' پر تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ''جاتے جاتے پہلوان جی کیا پھڑکتا ہوا شعر سنا گئے ہیں۔

تیری جدائی کا غم ہم نے، مر مر کر اٹھایا سجناں
چھکی پے گئی چن تاریاں دی لو، توں اجے وی نہ آیا سجناں

''لو...... سمجھتے ہیں نا آپ...... روشنی...... اور چھکی کا مطلب مدھم......''

مجھے کچھ کچھ تاؤ آنے لگا۔ میں نے جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پھدک کر کھڑا ہو گیا۔ دراصل اسے پہلوان حشمت کے درجنوں شعر زبانی یاد تھے اور وہ موقع بے موقع انہیں استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے راہِ راست پر لاتا اور وہ میرے قریب آ کر میری بات سنتا، دروازے پر دستک ہوئی...... اور باذان کے ملازم نے کہا۔ ''کمپاؤنڈر ارکب آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لے آؤ۔''

چند لمحے بعد کمپاؤنڈر ارکب اندر داخل ہوا۔ وہ سفید کوٹ میں تھا۔ اس نے انیق کی طرف دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، پھر میرے کان میں چند سرگوشیاں کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔

''یہ کمپاؤڈر صاحب کون ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''کمپاؤنڈر تو کمپاؤنڈر ہی ہوتا ہے، اس کا شجرۂ نسب تو مجھے معلوم نہیں۔''

''اس نے جس طرح میری موجودگی میں آپ کے کان میں سرگوشیاں کی ہیں میرے اندر زبردست ''جیلسی'' پیدا ہوئی ہے۔ میں نے کہا ہے نا جناب کہ قربِ قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اب آپ چھوٹے چھوٹے لوگوں کو بھی مجھ پر ترجیح دے رہے ہیں۔''

''یہ چھوٹا شخص ہم دونوں سے بہت بڑا ہے انیق!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ کیپٹن تبارک اور بن مشہد کی طرح اپنے مادرِ وطن کے لیے لڑ رہا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میری زخمی حالت کی جو تصویر ٹارچر سیل سے نکلی اور اب جاماجی کی ہر دیوار پر نظر آرہی ہے، کس نے اتاری تھی اور کیسے باہر نکلی تھی؟ وہ اسی کمپاؤنڈر کا کارنامہ ہے۔''

انیق نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ ''اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ صرف کمپاؤنڈر نہیں ہے۔''

''کیا مطلب جناب؟''

میں نے سرگوشی کے لہجے میں انیق کو بتایا۔ ''یہ عام سا نظر آنے والا شخص گرین فورس کا حاضر سروس کرنل ڈاکٹر ہے اور فورس کے لیے کئی کارنامے انجام دے چکا ہے۔''

''حیرت ہے۔ یہ شکل سے تو واقعی کمپاؤنڈر ہی دکھائی دیتا ہے۔''

''شکل سے تو تم بھی الو کے پٹھے نظر آتے ہو۔ مگر مجھے پتا ہے اور کچھ اور لوگ بھی جانتے ہیں کہ تم کیا شے ہو۔ لہٰذا شکلوں پر نہیں جایا کرتے۔ یہ انتہائی کوالیفائڈ شخص ہے۔ کاسمیٹک اور پلاسٹک سرجری ریذیڈنسی کا سفر طے کر چکا ہے..... کرنل احرار۔''

انیق واقعی متاثر نظر آنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ''یہ محترم و معظم کمپاؤنڈر صاحب کیا سرگوشیاں فرما گئے ہیں آپ کے کان میں؟''

''ہم کل یہاں سے نکل رہے ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کہاں سے نکل رہے ہیں؟''

''یہاں سے، اور کہاں سے؟ انٹیلی جنس رپورٹیں یہی بتا رہی ہیں کہ اگر ہم مزید یہاں رہے تو پھر مرکوزا پر ایک نہایت بے رحم آپریشن شروع ہو جائے گا۔''

''یعنی، ہم ڈر کر یہاں سے نکل جائیں گے؟''

''نہیں، ہم یہاں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے اس محفوظ ٹھکانے کو چھوڑ دیں گے۔''

''تو کہاں جائیں گے؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ انتظام ہو چکا ہے۔ کرنل احرار نے ہماری پناہ گاہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم دس پندرہ روز وہاں گزار کر اطمینان سے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ سکتے ہیں۔''

انیق حیران تھا مگر میری بات کافی حد تک اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ہم صاف محسوس کر رہے تھے کہ کشیدگی میں مسلسل اور تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نوگو ایریا کو رائے زل اور ایجنسی والے کسی صورت برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

انیق نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہم کیسے نکلیں گے؟''

''سب انتظام یہ ''معمولی کمپاؤنڈر'' ہی کر رہا ہے۔ صبح چار بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔ یہ بہترین موقع ہوگا۔ مرکوزا کی بیشتر آبادی سو رہی ہوگی۔ کرنل احرار ایک ایمبولینس لے کر آئیں گے۔ تاجور مقامی لباس میں اور چادر پوش ہو کر ایمبولینس میں بیٹھے گی۔ میں ایسے مریض کا کردار ادا کروں گا جو شدید خطرے میں ہے اور جس کے چہرے پر آکسیجن ماسک اور پٹیاں ہیں۔''

''اور ہم دونوں؟''

''تم اور سجاول ایمبولینس کے پیچھے ایک دوسری گاڑی میں رہو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی بغیر کسی رکاوٹ کے ہمارے پیچھے پیچھے نکلتے چلے جاؤ گے۔''

''آپ نے آپی کو یہ سب بتا دیا ہے؟'' (وہ اب تاجور کو بڑی روانی سے آپی کہنے لگا تھا)

''نہیں، یہ ذمے داری تم پر ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تاجور پچھلے چھ روز سے غم کے گھیرے میں تھی۔ سیف کی موت سے بھی زیادہ صدمہ اسے اس بات کا تھا کہ سیف کی ماں پر یہ سب کچھ سن کر کیا بیتے گی۔ وہ اس دن کے بعد مجھ سے بھی نہیں ملی تھی۔ میں بھی اس کے پاس جا کر اسے کسی طرح کے اضطراب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں انیق کو اس کے پاس بھیج رہا تھا۔ میں نے انیق کو بھی بتا دیا تھا کہ سیف کے حوالے سے میرے اور تاجور کے درمیان تکلیف دہ گفتگو ہو چکی ہے۔ انیق کو یہ بھی معلوم تھا کہ بدترین حالات کا شکار ہونے کے بعد مجھے سیف کی زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑا تھا۔

میرے کہنے پر انیق، تاجور کے پاس چلا گیا۔ اسی دوران میں سجاول واپس آ گیا۔ وہ چمکیلے تہبند اور کرتے میں تھا۔ کمر سے کرپان لٹک رہی تھی۔ اس نے بھی آ کر یہی بتایا کہ اگر ہم یہاں ٹکے رہتے ہیں تو لازماً گرے فورس اور ایجنسی کے گارڈز بھرپور کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس نے بتایا کہ آج انتظامیہ کی طرف سے کچھ نوٹس بھی تقسیم

ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ آہنی گیٹ دوروز کے اندر ختم کردیے جائیں ورنہ انہیں سرکاری مشینری کے ذریعے توڑ دیا جائے گا۔ مطلوب لوگوں کو یہ پیشکش بھی کی جارہی تھی کہ اگر وہ ہتھیار پھینک کر گرفتاری دے دیں تو ان سے رعایت کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

اور یہ رات کے چار بجے کا عمل تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مرکوزا کے درودیوار اونگھ رہے تھے اور ان درودیوار کو کہیں کہیں روشن کرنے والی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ باذان کے اس مہمان خانے میں ایک پُراسرار سرگرمی تھی۔ تاجور مقامی لباس اور حجاب میں تھی۔ اس کی آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ کرنل احرار نے میرے ماتھے اور ٹھوڑی وغیرہ کو سفید پٹیوں میں چھپا دیا تھا۔ میں بھی مقامی لباس میں تھا۔ ایمبولینس عقبی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ وہاں موجود تین گارڈز میں سے ایک تو کرنل صاحب کے ساتھ مل گیا تھا۔ باقی دو کو چائے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ انیق اور سجاول کو ایک علیحدہ گاڑی میں جانا تھا۔ مقررہ وقت پر ہم بڑی خاموشی کے ساتھ عقبی دروازے کی طرف بڑھے۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ سجاول ایک جانباز باڈی گارڈ کی طرح میری بائیں جانب چل رہا تھا۔ اس کا صندوق جیسا سینہ اور اس سینے میں دھڑکتا ہوا لوہے کا دل ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ تاجور ہمارے پیچھے تھی اور اس کے پیچھے کرنل احرار آصفی۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ اگر کسی طرح باذان اور اس کے ساتھیوں کو خبر ہو بھی گئی تو ہم اب رکیں گے نہیں۔

ہم عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ چند میٹر کے فاصلے پر ایمبولینس نظر آرہی تھی۔ سڑک دور تک خالی تھی۔ اچانک سڑک کے آخری سرے پر مجھے کچھ لوگ نظر آئے۔ میرے ساتھ ساتھ انیق اور کرنل احرار بھی چونکے۔ اتنے میں ہمارے عین سامنے ایک گھر کا پھاٹک کھلا اور وہاں سے بھی دس پندرہ افراد نکل کر سڑک پر آگئے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کرنل سے پوچھا۔

''ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔'' کرنل متحیر تھا۔

اسی دوران میں گلی کی بائیں جانب بھی آٹھ دس افراد کی ایک ٹولی نظر آئی اور پھر تو جیسے...... یکا یک سیلاب سا آگیا۔ کئی گھروں اور دیگر عمارتوں کے دروازے کھلے۔ بغلی گلیوں میں بھی ہلچل محسوس ہوئی اور پھر لوگ جوق در جوق مین سڑک پر اکٹھا ہونے لگے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان خاموش درودیوار کے پیچھے اتنی بڑی تعداد میں پُرجوش لوگ موجود ہوں گے۔

میں نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ تو کہتے تھے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے۔''

''میری...... سمجھ میں...... کچھ نہیں آرہا۔ یہ تو مخبری والا معاملہ لگتا ہے۔''

یکے بعد دیگرے روشنیاں آن ہو رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات میں دن کا سماں محسوس ہونے لگا۔ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ میں ششدر تھا۔ لہریں لیتے ہجوم میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب شامل تھے۔ وہ بڑی حیران کن رازداری کے ساتھ سیکڑوں کی تعداد میں یہاں جمع ہوئے تھے اور ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اتنے میں ناظم باذان نظر آیا۔ اس کے دو تین قریبی ساتھی بھی اس کے عقب میں تھے، اسے دیکھ کر میرے اندر عجیب سی جھنجلاہٹ پیدا ہوگئی۔ وہ جو کر رہا تھا، غلط تھا۔ تب میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ خوب صورت لڑکیاں، کیلے کا ایک بڑا پتا اٹھائے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ کیلے کا یہ پتا سبز کے بجائے سرخی مائل تھا۔ لڑکیوں کے چہرے پر معصومیت تھی۔ ان کی عمریں بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوں گی یا شاید اس سے بھی کم۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کرنل احرار آصفی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ وہی نواص کی رسم ہے۔''

''نواص؟''

''کنواری لڑکیاں یا کمسن بچے اپنے خون سے کیلے کے پتے کو سرخ کرتے ہیں۔ جب خون سوکھ جاتا ہے تو اس پر اپنے نام لکھتے ہیں اور جب کسی بڑے شخص سے کوئی بات منوانا ہو یا مطالبہ کرنا ہو تو اسے یہ پتا پیش کرتے ہیں۔''

''مطلب یہ ہوا کہ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کیا جارہا ہے؟''

اس سے پہلے کہ کرنل احرار جواب میں کچھ کہتا۔ لڑکیوں نے آگے بڑھ کر یہ پتا مجھے پیش کر دیا۔ پتے پر غالباً کسی پرندے کے پر کے ذریعے باریک لکھائی میں بے شمار نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکی نے کسی بچی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھا اور معصوم، ملتجی لہجے میں بولی۔ ''آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔''

میں نے لڑکیوں کو تو کوئی جواب نہیں دیا تاہم باذان کو آواز دے کر اپنے قریب بلایا۔ ''یہ کیا تماشا ہے

باذان؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

'' آپ یقین کریں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پتا نہیں کہ کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ آپ آج رات پچھلے پہر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کیا، ان لوگوں نے خود ہی کیا ہے۔''

'' اگر تمہاری بات سچ بھی مان لی جائے باذان! تو تم خود کو بے قصور قرار نہیں دے سکتے۔ تم اس صورتِ حال سے مجھ کو آگاہ کرسکتے تھے۔''

'' میں نے کرنا چاہا تھا لیکن نائب ناظموں نے مجھے روک لیا۔'' اس نے دس پندرہ ادھیڑ عمر افراد کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'' باذان! تم ان لوگوں کو میرے راستے سے ہٹاؤ۔ مجھے.... یہاں سے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے۔'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

'' آپ یقین کریں شاہ زیب، میں اس معاملے میں غیر جانب دار ہوں مگر فی الوقت یہ لوگ میری بات نہیں مانیں گے۔''

'' اس کا کیا مطلب؟'' انیق نے تنک کر کہا۔ '' کیا ہم یہ سمجھیں کہ رائے زل کے بعد اب ہم...... تم لوگوں کے گھیرے میں ہیں؟''

'' خدا نہ کرے ایسا ہو۔'' باذان جلدی سے بولا۔ '' لیکن ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ آپ ان کی اور ان کے بچوں کی زندگیاں بچا سکتے ہیں۔''

'' ان کی زندگیاں بچانے کے لیے ہی تو ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ '' اگر ہم یہاں رہے تو اگلے ایک آدھ دن میں وہ لوگ یہاں چڑھ دوڑیں گے۔ تمہارے یہ گیٹ اور گنتی کی رائفلیں تمہاری حفاظت نہیں کرسکیں گی۔''

میں نے دیکھا ہجوم بڑھ رہا ہے۔ بہت سے افراد کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے کتبے تھے اور ان پر میری وہی ٹارچر سیل والی تصویر تھی۔ جسم پر صرف ایک انڈرویئر...... بال منتشر، کھال جگہ جگہ سے جلی ہوئی، زخم اور آبلے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ اس تصویر میں، میں نے سیل کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور چہرہ بے چارگی کا کامل نمونہ تھا۔

ہجوم میں سے ایک پچاس پچپن سالہ شخص آگے آیا۔ وہ شکل سے پڑھا لکھا لگتا تھا۔ اس مقامی شخص کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا ایک بچہ تھا۔ پھولے پھولے گالوں والا یہ معصوم اپنی خوف زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

بڑی عمر کا شخص انگلش میں بولا۔ '' بیٹا! یہاں کے لوگوں نے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کرلی ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ کمانڈر افغانی شہید ہوچکے ہیں۔ ہر ہائی نس قسطینا اور کمانڈر فارس جیسے لوگ اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ایسے میں تم اُمید کے ایک روشن تارے کی طرح ہمارے سامنے آئے ہو۔ ہمارے دل...... گواہی دے رہے ہیں کہ تم...... ہمارے لیے بہت کچھ کرسکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ '' اور انکل جی! میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری اور میرے ساتھیوں کی وجہ سے آپ لوگوں کا بہت زیادہ نقصان ہونے والا ہے۔ فی الحال زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ ہم میں سے کسی کے لیے ٹھیک نہیں۔ ابھی مجھے یہاں سے جانے دیں اور اچھے وقت کا انتظار کریں...... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ وقت بہت زیادہ دور بھی نہیں۔''

بڑی عمر کے شخص کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے، بولا۔ '' یہ دیکھو بیٹا! یہ جو میرے بازو پر ہے، میرا پوتا ہے...... اس سے ڈیڑھ سال بڑا اس کا ایک بھائی بھی تھا۔ وہ میرے دوسرے بازو پر ہوتا تھا۔ اب میرا یہ بازو خالی ہے۔ دو ماہ پہلے ہونے والی لڑائی میں امریکی گارڈز نے ہمارے گھروں پر کئی انچ موٹی کنکریٹ پھاڑنے والی گن سے حملہ کیا تھا جہاں کنکریٹ پھٹ جائے وہاں بچے کے نرم گوشت کا کیا بنتا ہے؟ اب اس کی ننھی سی قبر قبرستان میں ہے۔ میرا ایک بازو خالی ہوچکا ہے۔ کیا میرا دوسرا بازو بھی خالی ہوجائے گا؟'' وہ سسکیوں سے رونے لگا۔

روتے روتے اس نے اپنے ننھے پوتے کے دونوں ہاتھ تھامے اور انہیں میرے سامنے جوڑ دیا۔ دادا کو روتے دیکھ کر بچے نے بھی رونا شروع کردیا تھا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ رو رہا تھا۔

چند منٹ پہلے ہجوم کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اس طرح کے جذباتی مناظر سے واسطہ پڑے گا۔ لہٰذا میں نے اپنا دل سخت کیا ہوا تھا۔ میں نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے دادا سے کہا۔ '' اس بچے کی حفاظت کے لیے اور ایسے بہت سے بچوں کی حفاظت کے لیے ہی، ہم یہاں سے جارہے ہیں، جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں شاید تم لوگ نہیں دیکھ رہے۔''

میرا اشارہ پاکر انیق مجھے سہارا دے کر آگے بڑھنے لگا۔ میرے تلوؤں کے زخم مجھے ابھی تک ٹھیک سے چلنے نہیں دے رہے تھے۔ جوتوں میں خون کی چپچپاہٹ محسوس ہورہی تھی۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر لوگ میرے راستے میں

آ گئے۔ مجھ پر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ میں نے گرج کر کہا۔ ''ہٹ جاؤ راستے سے۔ میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔''

ہجوم کچھ سہما ہوا سا تھا لیکن اپنی جگہ جما رہا۔ میں نے انیق سے کہا۔ ''رکو مت، چلتے جاؤ۔''

ہم آگے بڑھتے گئے۔ آٹومیٹک رائفل سجاول کے ہاتھ میں تھی اور چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ مادام ہاناوانی کے عارضی ''ٹرانس'' سے آزاد ہونے کے بعد وہ اب پھر پہلے جیسا سجاول ہی نظر آتا تھا۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ تاجور اور کرنل ہمارے عقب میں آ رہے تھے۔ کرنل کے لباس کے نیچے بھی پسٹل موجود تھا۔ میں نے تاجور کا چہرہ دیکھا۔ فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں دکھ، رنج اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ شاید روتے ہوئے بچے کے منظر نے اسے بھی غم زدہ کیا تھا۔

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے ایک بار پھر چلا کر کہا۔

لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ جو پیچھے نہیں ہٹے انہیں سجاول نے رائفل کے کندے سے ٹھوکے دیے۔ نعرہ زنی تھم گئی تھی۔ لوگوں کا فالتو جوش وخروش ٹھنڈا محسوس ہونے لگا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھتا گیا۔ میرے مصمم ارادے نے لوگوں کو جیسے مفلوج کر دیا تھا۔ اچانک مجھے پھر رکنا پڑا۔ میرے سامنے ایک چادر پوش کھڑا تھا۔ ہموار سفید داڑھی، سر کے بالوں میں بھی سفیدی کا گہرا شیڈ، اس نے ایک چولا نما سفید لباس پہن رکھا تھا۔ کریم کلر کی چادر اس کے سر اور کندھوں پر تھی۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔

''کون ہیں آپ؟'' انیق نے ملائمی میں پوچھا۔

وہ دھیمی، ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم مجھے نہیں جانتے لیکن تمہارا ساتھی شاہ زیب جانتا ہے۔ میں ذکری ہوں...... حاذق ذکری۔''

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں سناٹے کی کیفیت میں اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھتا چلا گیا۔ نہایت سادگی، عاجزی اور متانت کا پیکر۔ لیکن اس کی سادگی اور عاجزی کے اندر ایک ایسا رعب بھی تھا جو یہاں موجود سیکڑوں لوگوں کی جمعیت میں بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے اکیلا ہی روک رہا تھا اور روکنے میں کامیاب تھا۔

میں نے اس کی سوئی سوئی ہوئی سی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے جیسے اپنا آپ خود سے دور جاتا محسوس ہوا۔ ''آپ ذکری ہیں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ ہولے سے مسکرایا اور اپنے سر کو اثبات میں حرکت دی۔

''آپ کو دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔''

''مجھے بھی۔'' سفید ریش نے کہا اور اپنے ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

میں نے اپنا بازو انیق کے کندھے پر سے اتارا اور بے ساختہ اس شخص کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑی نرمی کے ساتھ مجھے گلے سے لگایا کہ میرے زخموں کو محسوس تک نہ ہوا۔ ایک عجیب سی خوشبو اور توانائی میرے ٹوٹے پھوٹے جسم میں سرایت کر گئی۔ ان لمحوں میں مجھے لگا کہ اگر اس شخص نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں رک جاؤں تو میں کبھی انکار نہیں کر سکوں گا۔

لیکن اس نے نہیں کہا۔ مجھے گلے لگانے کے بعد اس نے انیق اور سجاول سے بھی ایک نرم معانقہ کیا۔ تاجور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہ زیب کیا ہم کہیں بیٹھ کر چند منٹ کے لیے کچھ گفتگو کر سکتے ہیں؟''

میں نے چھوٹے سے توقف کے بعد کہا۔ ''جیسا آپ کہتے ہیں۔''

انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص سے ملائمی میں کہا۔ ''اس بیٹی کو اپنی بیٹی کے پاس لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں تم سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔''

باریش شخص نے ادب سے سر جھکایا۔ تاجور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔ وہ اس شخص کے ساتھ دائیں جانب مڑ گئی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' محترم ذکری نے کہا اور میرے کندھے کو سہلاتے ہوئے ایک دروازے کی طرف بڑھے۔ مجھے ان کے سرخ وسپید ہاتھ میں چھ انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔

خاموش ہجوم میں اب پھر جوش وخروش کی ایک لہر سی نمودار ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ لوگوں کو بھی اس کایا پلٹ کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر نعرہ زنی کرنے لگے۔ مجھے اور محترم ذکری کو دیکھنے کے لیے ہماری طرف امڈنے لگے۔ باذان اور اس کے درجنوں مسلح اہلکاروں نے لوگوں کو ہماری طرف آنے سے روکا۔ محترم حاذق ذکری نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ ان کے اس اشارے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہجوم میں ٹھہراؤ نظر آنے لگا۔ ہم ایک منقش دروازے میں داخل ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ محترم ذکری کے کسی خوش ذوق مرید کی رہائش گاہ ہے۔

☆☆☆

یہ عجیب جادوئی سا ماحول تھا۔ یہ مرکوزا کے متوسط درجے کے گھر کا ایک عام سا کمرا تھا مگر حاذق ذکری کی موجودگی نے اسے عام نہیں رہنے دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک نظر نہ آنے والی روشنی پھوٹ رہی ہے اور ہر شے کو اپنے احاطے میں لے رہی ہے۔ کمرے میں صرف میں اور محترم ذکری موجود تھے۔ ہم لکڑی کے ایک چوکی نما تخت پر بیٹھے تھے۔ اس پر سفید رنگ کا خوش نما نمدہ بچھا ہوا تھا، بلکہ یہاں موجود استعمال کی اکثر اشیا مثلاً پردے، جانماز، تولیا، چادریں سفید یا کریم رنگ کی تھیں۔

میں اپنے چہرے کی فالتو پٹیاں اتار چکا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں میرے اور محترم ذکری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس نے مجھے کافی ذہنی کچوکے لگائے تھے۔ میں خود کو اندر سے بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ حیران کن طور پر وہ شستہ انگلش میں بات کر سکتے تھے۔ اب بھی وہ اپنے نرم لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''میں ہمیشہ جاماجی کی سیاست سے دور رہا ہوں شاہ زیب! اور یہی وجہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگ میری بات سنتے ہیں اور ہر ذات برادری میں ایسے لوگ موجود ہیں جو میری عزت کرتے ہیں۔ بہرحال ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے...... حالات کے ساتھ انسان کو بھی اپنے رویے تبدیل کرنا پڑتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم غیر جانبدار نہیں رہ سکتے...... اور یہی وجہ ہے کہ آج میں یہاں شہر کے اندر موجود ہوں۔''

''کہیں ایسا نہ ہو محترم... کہ آپ کی جان کو خدانخواستہ خطرات لاحق ہو جائیں۔''

''خطرات کا سامنا کیے بغیر تو ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے بیٹا! کیا تم خطرات کا سامنا نہیں کر رہے ہو۔ اگر تم باہر سے آ کر اور اس جزیرے سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے یہاں کے لوگوں کے لیے خود پر مصیبتیں جھیل رہے ہو تو...... میں تو پھر یہاں کا باشندہ ہوں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ہر بات پر بس ''ہاں'' کہنے کو دل چاہتا ہے جناب! لیکن اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم ہر بات بے تکلف کہو۔''

''جناب! آپ نے فرمایا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے مجھ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کے لیے نجات دہندہ ثابت ہونے والا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے محترم کہ میں اپنے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں پاتا۔ لیڈ کرنے کے لیے اور خاص طور پر باقاعدہ جنگ میں لیڈ کرنے کے لیے بہت صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس حوالے سے خود کو صفر پاتا ہوں۔ لوگوں کی توقعات دیکھتا ہوں تو مجھ پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔''

محترم حاذق ذکری نے اطمینان سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''میں تمہارے سوال کے جواب میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں بیٹا جی! یہ قول یونہی نہیں بنا ہوا کہ آوازِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ جب بہت سے لوگ کسی پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں اور اسے رہنمائی کے قابل سمجھتے ہیں تو یہ ایک خدائی اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کی توقع کی جا رہی ہے۔ دوسری بات تم نے جنگ و جدل کے حوالے سے کی ہے...... تو بیٹا جی! یہ کوئی ضروری نہیں کہ جنگ ہی ہو۔''

میں بُری طرح چونکا۔ ''میں سمجھا نہیں محترم! کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جنگ کے بغیر بھی فتح ہو سکتی ہے؟''

''نہیں، میں اور بات کہہ رہا ہوں۔ میری بہن باناوانی اور اس کے بیٹے رائے زل نے جاماجی کی جائز حکومت کو بزورِ بازو ختم کیا ہے۔ ان کی حیثیت قابضین کی ہے۔ اب ان قابضین کے خلاف عام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھنے کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا باہمت شخص جو ان کے دل کی گہرائی کو چھو سکے اور تم نے اپنی بے پناہ برداشت اور استقامت سے ان کے دلوں کو چھوا ہے...... اب وہ جمع ہو رہے ہیں۔ گھروں سے نکلنے کا حوصلہ پا رہے ہیں اور جب صورتِ حال ایسی ہو جائے تو کئی دفعہ خونریز لڑائیوں کے بغیر ہی کامیابیاں مل جاتی ہیں۔''

''آپ نے مجھے اظہارِ رائے کی اجازت دی ہے جناب! اس لیے بہت ادب سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ رائے زل اور اس کے امریکی گماشتے آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ خاص طور سے ان امریکیوں کو جہاں تک میں جانتا ہوں، آسانی سے اپنا قبضہ نہیں چھوڑتے۔ آپ...... تاریخ میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں، ویت نام سے لے کر عراق تک بے شمار مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔''

''قربانیاں تو دینا پڑیں گی شاہ زیب! مگر ہو سکتا ہے کہ وسیع پیمانے پر وہ خونریزی نہ ہو جس کے خدشات ہم سب کے دلوں میں ہیں۔''

کمرے سے باہر نعروں کی گونج مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ترانہ بھی سنائی دیتا تھا...... ہم جاتے

اندھیرے تک لڑیں گے...... ہم سچے سویرے تک لڑیں گے۔

جوں جوں دن کا اجالا پھیل رہا تھا، ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ محترم ذکری نے اپنی گھنی بھوؤں کے نیچے اپنی سوئی سوئی آنکھوں کو حرکت دی، پھر بولے۔ ''ان آوازوں کو سنو۔ ان میں ایک کاٹ ہے۔ ایک پکار اور تڑپ ہے۔ یہ پکار اور تڑپ برسوں سے ان لوگوں کے دلوں میں موجود تھی مگر آج اسے جو زبان ملی ہے، اس کے پیچھے قربانیوں کی داستان ہے اور مجھے یہ بھی کہنے دو کہ اس کے پیچھے...... تم ہو اور تمہاری وہ تصویر ہے جو یہاں چپے چپے پر نظر آ رہی ہے۔ اس تصویر نے مزاحمت کے لفظ کو نئے معنی دیے ہیں۔ یہ جدوجہد کی علامت بن گئی ہے۔ درست کہا جاتا ہے کہ قدرت بڑے بڑے انقلابات کے لیے بعض اوقات ایسے بہانے بھی ڈھونڈ لیتی ہے جو بظاہر چھوٹے نظر آتے ہیں۔''

میں نے محترم ذکری کے نورانی چہرے کی جانب دیکھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے یہاں کے لوگ بہت بڑا پیش گو قرار دیتے تھے اور آج یہ پیش گو کہہ رہا تھا کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ وہ پریشان ضرور تھا مگر اس کی آنکھوں میں امید کی کرنیں بھی تھیں۔

سجاول اور انیق دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ میرے اور محترم ذکری کے درمیان مسلسل بات ہو رہی تھی۔ مادام ہاناوانی کی طرح محترم ذکری نے مجھے کسی ماورائی طاقت کے ذریعے زیر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اپنی دلیلوں سے قائل کرنا چاہ رہے تھے اور یہ دلیلیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔

قیدوبند کے دوران میں بینش نامی لڑکی کے ذریعے، محترم ذکری نے جس طرح میری ہمت بندھائی تھی وہ میرے لیے یادگار تھی۔ میں نے اس پر محترم ذکری کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''شکریے کے لائق تم ہو جو بغیر کسی غرض کے یہاں کے لوگوں کے لیے صعوبتیں جھیل رہے ہو۔'' ہماری گفتگو کے دوران میں ہی محترم ذکری کا ایک باریش ساتھی چھوٹی چھوٹی نفیس پیالیوں میں ہمارے لیے قہوہ لے کر آیا۔ ابھی وہ کمرے میں ہی تھا کہ باہر سے سنائی دینے والی نعروں کی آواز فلک شگاف ہو گئی۔

محترم حاذق ذکری نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے حضرت کہ لوگ محترم شاہ زیب کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔''

حاذق ذکری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے، کہیں پولیس یا فوج کے لوگ تو اندر نہیں آ گئے۔''

اس سے پہلے کہ مخاطب شخص جواب میں کچھ کہتا، للکارے سنائی دیے اور پھر گولی کی آواز کانوں میں پڑی۔

''یا اللہ خیر!'' حاذق ذکری کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ یہاں کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو صورتِ حال تشویشناک نظر آئی۔ گرے فورس اور ایجنسی کے لوگ دندناتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ کافی زیادہ نفری تھی۔ کئی اہلکار ابھی تک ٹرک نما گاڑیوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اُتر رہے تھے۔ اہلکاروں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کے ہیلمٹس کے آگے شیشے کی بڑی بڑی شیلڈز تھیں۔ بہت سوں کے ہاتھوں میں ڈھالیں بھی دکھائی دے رہی تھیں یہ لوگ، مظاہرین پر اندھادھند لاٹھی چارج کر رہے تھے۔

ایک بار پھر کئی فائر ہوئے۔ بے شک یہ ہوائی فائرنگ تھی مگر کسی بھی وقت سیدھی فائرنگ بھی کی جا سکتی تھی۔ ہجوم کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور بھاگ بھی رہے تھے۔ حملہ آوروں نے بڑی پلاننگ کے تحت آگے اور پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ بھگدڑ میں کئی افراد پاؤں تلے روندے گئے۔ ہم سے صرف چالیس پچاس قدم کی دوری پر ایک جواں سال عورت اپنے ڈیڑھ دو سالہ بچے کے ساتھ اوندھے منہ سڑک پر گری۔ اس نے بچے کو بدستور سینے سے چمٹائے رکھا۔ گرے فورس کے سپاہیوں نے عورت پر بے دریغ لاٹھیاں برسانا شروع کیں۔ دو نوجوان گرے سپاہیوں پر جھپٹے اور عورت کو بچانے کی کوشش کی۔ سپاہیوں نے عورت کو تو چھوڑ دیا مگر نوجوانوں کو بُری طرح پیٹنا اور گھسیٹنا شروع کر دیا۔

لوگ بغلی گلیوں میں بھاگ رہے تھے اور سپاہی ان کے تعاقب میں تھے پھر لاٹھی چارج کے علاوہ آنسو گیس بھی استعمال ہونے لگی۔ کچھ باہمت نوجوان اب بھی ٹولیوں کی شکل میں یہاں وہاں موجود تھے اور سپاہیوں پر زبردست پتھراؤ کر رہے تھے۔ پولیس ان کی طرف بھاگتی تھی تو وہ گلیوں میں غائب ہو جاتے تھے لیکن پھر فوراً ہی دوسری طرف سے نمودار ہو کر پتھراؤ کرنے لگتے تھے۔ میدانِ جنگ کا سا منظر تھا۔ جو مظاہرین گرفتار ہو رہے تھے انہیں بیدردی سے گرے فورس اور پولیس کی گاڑیوں میں پھینکا جا رہا تھا۔

میں نے حاذق ذکری سے کہا۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں جناب؟''

''ابھی تو کچھ کرنے کا موقع نہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ان کی نگاہیں بھی دوسروں کی طرح سامنے میدان کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آنسو گیس نے اب ہم پر بھی اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ حاذق ذکری کے میزبان نے کہا۔ ''حضرت! آپ دونوں اندر تشریف لے چلیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کریں۔''

''نہیں، وہ اتنی جلدی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے۔'' حاذق ذکری نے پورے وثوق سے کہا۔

دوسرے شخص نے چند بھیگے ہوئے کپڑے تھام رکھے تھے۔ اس نے ایک کپڑا حاذق ذکری کو اور دوسرا مجھے دے دیا۔ آنسو گیس کے اثرات کم کرنے کے لیے ہم نے یہ کپڑے اپنے چہروں پر رکھ لیے۔

مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر گرے سپاہی اور ایجنسی کے سفید فام گارڈز ایک چودہ پندرہ سالہ خوب صورت لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے سرکاری ٹرک کی طرف لے جا رہے تھے۔ ایک عورت جو بچے کی والدہ تھی اس سے چمٹی ہوئی تھی اور اسے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھی بچے کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ دو تین مظاہرین بھی لڑکے کو چھڑانے کی کوشش میں عورت کا ساتھ دے رہے تھے۔ فورس کے اہلکاروں نے عورت کو اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا مگر وہ لڑکے سے چمٹی رہی۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہ عریاں ہو رہی تھی۔ وہ کبھی چلاتی تھی کبھی اہلکاروں کی منتیں کرنے لگتی تھی۔ اہلکار زخمی لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے ٹرک کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک میں نے سجاول کو دیکھا وہ بھاگتا ہوا ایک جانب سے نکلا اور ٹرک کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے دس پندرہ مظاہرین کی ایک ٹولی تھی۔ یہ لوگ گرے سپاہیوں اور گارڈز پر ٹوٹ پڑے۔ زبردست مارا ماری کے دوران میں دو نوجوان...... لڑکے کو چھڑانے میں کامیاب ہوئے اور اسے بھگاتے ہوئے محفوظ مقام تک لے گئے۔ میں نے سجاول کو دیکھا، وہ بپھرا ہوا تھا۔ اس نے کسی پولیس اہلکار سے لاٹھی چھین لی تھی اور اندھا دھند چلا رہا تھا۔ تین چار مظاہرین بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک امریکن گارڈ جس کا ہیلمٹ گر گیا تھا، سجاول کی زوردار لاٹھی سر پر کھا کر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا۔

''مارو ان حرامیوں کو۔'' سجاول کی گرج ہم تک پہنچی۔ اس نے اپنی کرپان نکال لی تھی۔

سجاول کی زبردست مزاحمت دیکھ کر چند سیکنڈ کے اندر درجنوں مظاہرین اس مقام پر اکٹھے ہو گئے۔ مجھے اب ان میں انیق بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے سجاول کے کندھے سے کندھا ملا رکھا تھا۔ مخدوش صورتِ حال دیکھ کر سپاہی اور سفید فام گارڈز وہاں سے پسپا ہوئے اور اپنے ٹرکوں کے قریب پناہ لے لی۔

زبردست پتھراؤ اور شیلنگ کے دوران میں مظاہرین، لڑکے کی ماں اور دو زخمی مظاہرین کو بھی خطرے کی زد سے نکال لے گئے۔ سجاول اور انیق بھی اپنی چار دیواری کی طرف واپس آ گئے۔ مظاہرین پھر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور اب اس مکان کے اردگرد جمع ہو رہے تھے جہاں میں اور حاذق ذکری وغیرہ موجود تھے۔ اس بات کا خدشہ بالکل درست تھا کہ ہم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ دیکھا دیکھی مظاہرین کی اور کئی ٹولیاں بغلی گلیوں سے برآمد ہوئیں اور مکان کے حفاظتی حصار میں شامل ہو گئیں۔

میرے کہنے پر ایک ملازم سجاول اور انیق کو ہمارے پاس لے آیا۔ سجاول ابھی تک مشتعل نظر آ رہا تھا۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی جو اس نے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ کسی اہلکار کی لاٹھی روکتے ہوئے اس کے ایک ہاتھ پر چوٹ بھی آئی تھی۔

محترم ذکری نے تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تم نے اچھا کیا سجاول! اس سے لوگوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے لڑکے کو چھڑا لیا۔''

سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، اب یہ لڑائی رکنے والی نہیں ہے۔ رائے زل کے پالتو ابھی تو لوگوں کو پکڑ کر واپس چلے گئے ہیں مگر جلد ہی دوبارہ آ جائیں گے۔''

''اندازاً کتنے لوگ گرفتار ہوئے ہوں گے؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''دو بھرے ہوئے ٹرک اور ایک بھری ہوئی ''قیدی گاڑی'' تو میں نے خود دیکھی ہے۔ پکڑے جانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں لیکن ایک خاص بات کا شاید آپ کو پتا نہ ہو۔ ناظم باذان صاحب بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ ٹرک پر چڑھاتے ہوئے ان کے ساتھ بہت مار پیٹ بھی کی گئی ہے۔''

سجاول نے کہا۔ ''اتنے لوگوں کے درمیان سے ان کے لیڈر کو اس طرح پکڑ کر لے جانا، بڑی دیدہ دلیری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے بندوں میں جوش تو بہت زیادہ ہے مگر یہ جوش جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔''

انیق بولا۔ ''اصل میں لوگ لیڈر کے پیچھے لڑتے ہیں۔ ہر ہائی نس قسطینا کے بعد ان میں کوئی لیڈ کرنے والا نظر نہیں آرہا۔''

میں دیکھ کر ٹھٹکا۔ سجاول کی کرپان کے دستے پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ محترم ذکری نے بھی شاید یہ منظر دیکھ لیا تھا اور وہ چونکے ہوئے نظر آئے تھے۔

''کیا تم نے کرپان کسی کو ماری ہے؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''کرپان مارنے کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کسی کا پیٹ تو نہیں پھاڑ دیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جی تو پیٹ پھاڑنے کو ہی چاہ رہا تھا مگر پھر لحاظ کیا۔ ایک گورے کے پٹ (ران) پر ماری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس رائی کو بھی یہ لوگ پہاڑ بنائیں گے۔ گورے کا معاملہ ہے۔''

''پہاڑ تو اب بنا ہی بنا ہے جی۔'' انیق نے کہا۔ ''ویسے پٹ اور پیٹ میں فرق بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے۔''

میں نے حاذق ذکری کو بتایا کہ میرے ساتھی نے کسی کو مارا نہیں ہے۔ صرف ایک امریکی کی ٹانگ زخمی کی ہے۔''

لاٹھی چارج اور شدید آنسو گیس کے بعد منتشر ہو جانے والا ہجوم اب پھر جمع ہو رہا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنیں در و دیوار کو روشن کر رہی تھیں۔ سامنے میدان میں پتھراؤ میں استعمال ہونے والے بے شمار پتھر اور اینٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ ان کے درمیان مظاہرین کی جوتیاں اور ٹوپیاں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں جلے ہوئے ٹائر اور خون کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔

حاذق ذکری کے ایک ساتھی نے آکر ملائی میں بتایا۔ ''حضرت! کم از کم دو سو افراد گرفتار ہوئے ہیں جن میں جناب باذان بھی شامل ہیں۔ لاٹھی چارج سے ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اب تک کی اطلاع کے مطابق دو افراد جاں بحق ہوئے ہیں، زخمی ہونے والوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔''

اسی دوران میں نعروں کی بلند گونج ایک بار پھر ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ یہ آوازیں کچھ اس طرح تھیں۔

......محترم باذان کو رہا کرو

......خون کا بدلہ خون

......ماریں گے مر جائیں گے

ان نعروں اور للکاروں میں وقفے وقفے سے میرا نام بھی سنائی دے رہا تھا۔ حاذق ذکری نے میری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولے۔ ''لوگ بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے ذہن بھی منتشر ہیں۔ انہیں سنبھالا دیے جانے کی ضرورت ہے۔''

میں حاذق ذکری کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ میں لوگوں کے سامنے جاؤں اور انہیں حوصلہ دوں۔

پتا نہیں کیوں، تھوڑی ہی دیر کی ملاقات کے بعد میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ میں حاذق ذکری کی کسی بات پر انکار کروں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انیق نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے سہارا دیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر نکلا اور ایک چبوترہ نما جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم جیسے چور چور تھا۔ بہرحال آج کل میں اپنے کندھے کو بالکل درست محسوس کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے شب و روز نے مجھے ٹمپریچر سیل کی ہولناک اذیت سے تو ضرور گزارا تھا مگر میرے کندھے کو آپریشن کے بعد اچھی ریکوری فراہم کر دی تھی۔ سامنے میدان اور اردگرد کی گلیوں میں لوگ بڑی تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ جا بجا کے دو رنگے جھنڈے کے ساتھ ساتھ کچھ کتبے اور تصویریں بھی لہرائی جا رہی تھیں۔ ان تصویروں میں قسطینا کے علاوہ شہید کمانڈر افغانی کی تصویریں بھی لہرائی جا رہی تھیں۔ مگر جو تصویر بہت بڑی تعداد میں نظر آرہی تھی وہ میری وہی ٹارچر سیل والی تصویر تھی۔

مجھے دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی اور فلک شگاف نعرے لگنے لگے۔ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا لیکن آج اپنی تمام تر نقاہت کے باوجود مجھے تقریر کرنا پڑ رہی تھی۔ آنسو گیس کے اثرات ابھی تک گلے کو متاثر کر رہے تھے۔

میڈیا کے تین چار نمائندے بھی موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے کیمرے آن کر لیے۔ ایک شخص پکار کر بولا۔ ''مائیک لاؤ......جلدی۔''

فوری طور پر مائیک کا انتظام تو نہیں ہوا لیکن ایک طاقتور میگا فون میرے منہ کے سامنے کر دیا گیا۔ بولیے جناب! لوگ آپ کو سننا چاہتے ہیں۔'' ایک شخص نے بڑی ''عقیدت'' سے مجھے مخاطب کیا۔

میں بڑے تحمل سے بات کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

لوگوں کو نظم و ضبط کی ہدایت کروں لیکن پتا نہیں کیا ہوا، میں نے جب بولنا شروع کیا تو جذبات کا دھارا مجھے مختلف سمت میں بہا لے گیا۔ میرے اندر کی کڑھن اور تلخی نے میرے الفاظ کو آتشیں بنا دیا۔ میں نے کچھ فقرے ملائی میں، کچھ انگلش میں اور کچھ شاید اردو میں بھی بول دیے۔ میری تقریر کچھ اس طرح سے تھی۔

''جو لوگ خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہیں ان کی حالت کوئی نہیں بدل سکتا۔ تم لوگ گھروں سے نہیں نکلو گے، اپنی جان ہتھیلیوں پر نہیں رکھو گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر تم لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے مرنا چاہتے ہو اور مجھے بھی مروانا چاہتے ہو...... تو ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ ہم ابھی چل پڑتے ہیں اور اس پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیتے ہیں جہاں محترم باذان کو رکھا گیا ہے۔ میں نے یہاں آ کر بہت کچھ کھویا ہے جو باقی ہے میں وہ بھی گنوانے کے لیے تیار ہوں...... پوری طرح تیار ہوں۔ یہاں کھڑے ہو کر کان پھاڑنے والے نعرے مت لگاؤ۔ آؤ، چلو میرے ساتھ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب ہم پر گولیوں کی بارش ہو گی تو میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا اور ان لوگوں میں شامل ہوں گا جو سب سے پہلے اپنی چھاتی سرخ کریں گے۔ چلو...... آؤ...... آ جاؤ۔''

ہجوم اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ تبارک اور سیف کی موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ کئی لمحے اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ سیکڑوں کا مجمع تھا لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہجوم کے عقب میں فقط کچھ عورتوں کے نوحے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے پیارے جاں بحق یا شدید زخمی ہوئے تھے۔

خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے کہا۔ ''میری بات دھیان سے سنو۔ تمہارے شہر پر قبضہ کیا گیا ہے، تمہاری آزادی چھینی گئی ہے۔ انقلاب چاہتے ہو تو گھروں سے نکلو۔ خوف کی دیواریں گرا دو۔ ہر دروازہ کھل جائے، ہر گلی بھر جائے، جاماجی کی ہر سڑک پر انسانوں کا دریا بہتا نظر آئے۔ اپنے گریبان چاک کر دو، اپنے سینے گولیوں اور سنگینوں کے لیے کھول دو۔ اپنے سروں پر کفن باندھ لو۔ بس یہی ایک راستہ ہے آزادی کا۔ باقی سارے راستے ذلت، بے غیرتی اور غلامی کی طرف جاتے ہیں۔''

سکتہ زدہ سے ہجوم میں ایک لہر پیدا ہوئی۔ بے ساختہ سیکڑوں بازو فضا میں بلند ہوئے اور سیکڑوں لبوں نے حرکت کی۔ نعروں کی گونج سے در و دیوار لرز گئے۔

میں نے کہا۔ ''میں ایک عام ایم ایم اے فائٹر ہوں۔ کوئی سیاسی دانشور یا لیڈر نہیں ہوں لیکن میرا دل ایک گواہی دے رہا ہے اور وہ گواہی یہ ہے کہ جاماجی کی تقدیر کا فیصلہ اگلے ایک یا دو دن میں ہو جانا ہے۔ تخت یا پھر ہمیشہ کے لیے تختہ۔ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ رائے زل اور اس کے غیر ملکی گماشتے یہاں سے نکل بھاگیں۔ تمہاری آزادی تمہیں واپس مل جائے؟''

سیکڑوں لوگوں نے بیک زبان کہا کہ وہ چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''تو پھر ایک بات یاد رکھنا۔ قطرہ جب اکیلا ہوتا ہے تو ایک حقیر بوند کہلاتا ہے۔ لیکن جب وہ اکیلا نہیں رہتا تو پھر دریا اور سمندر کہلاتا ہے۔ اس کے رستے میں آنے والی ہر چیز خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے۔ مجھے بتاؤ...... مجھے بتاؤ کل شام تک اس جگہ چند قطرے ہوں گے یا ایک سمندر ہو گا؟''

میں نے یہ جملے ملائی زبان میں کہے تھے۔ بہت سی آوازوں نے پکار کر جواب دیا۔ ''یہاں ایک سمندر ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر منتشر ہو جاؤ۔ گلی گلی اور کوچے کوچے پھیل جاؤ۔ میری اور محترم حاذق ذکری کی طرف سے یہ پیغام چپے چپے پر اور بچے بچے تک پہنچا دو کہ کل یہاں جاماجی کی تقدیر کا فیصلہ ہو گا، خدا حافظ۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے مجھے جیسے نقاہت کے سبب چکر سے آنے لگے تھے۔ انیق مجھے سہارا دیتا ہوا اندر لے گیا۔ باذان کے محافظوں نے دروازے کے سامنے پوزیشن لے لی۔ میرا دل بے حد شدت سے دھڑک رہا تھا۔ نسوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ محترم ذکری نے میری طرف قدرے حیرت سے دیکھا اور بولے۔ ''تم بہت اچھا بولے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ تم اس انداز میں بات کرو گے۔ میں تم سے کہہ رہا تھا نا کہ جب قدرت کسی پر غیر معمولی ذمے داری ڈالتی ہے تو پھر اسے غیر معمولی توانائی بھی عطا کرتی ہے۔''

میرے اردگرد موجود سب لوگوں کے چہرے جوش سے تمتمائے ہوئے تھے۔ باہر نعروں کی گونج تھی۔ محترم ذکری نے کہا۔ ''شاہ زیب! تم نے ایک طرح سے ٹریگر دبا دیا ہے۔ گولی بیرل سے نکل چکی ہے۔ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔''

میزبان بدرقہ بولے۔ ''میرے اندازے کے مطابق اگلے 18 گھنٹے اب بہت اہم ہیں۔ گرے فورس اور ایجنسی کی پوری کوشش ہو گی کہ لوگ یہاں بڑی تعداد میں جمع

نہ ہونے پائیں۔ وہ ہر حربہ آزمائیں گے۔ چھاپے ماریں گے، مرکوزا کی طرف آنے والے راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کریں گے اور وہ سب کچھ جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔''

محترم ذکری نے سفید داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ ''لیکن اگر ایک بار عوامی ردِعمل کا پہیا حرکت میں آ گیا تو پھر اسے روکنا بہت مشکل ہو گا۔ انسانوں کا سیلاب ہو تو کہاں تک خون بہایا جا سکتا ہے، کہاں تک زندگیاں چھینی جا سکتی ہیں؟ اور مجھے لگتا ہے کہ وہ موقع آ گیا ہے جب جاماجی کے باشندے ایک سیلاب کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ آدم کی شہادت سے لے کر کمال احمد کی موت تک بہت سے ظلم انہوں نے سہے ہیں اور ہر ظلم کا ردِعمل ان میں جمع ہوتا رہا ہے۔ تمہاری زخم زخم تصویر نے اس بکھرے ہوئے ردِعمل کو ایک مرکز فراہم کیا ہے۔''

ایک شخص نے اندر آ کر ادب سے محترم ذکری کو سلام کیا اور بولا۔ ''حضرت! ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ ائرپورٹ کے علاقے میں ایک بہت بڑے جلوس نے گرے فورس کی پوسٹ پر حملہ کیا ہے۔ گرے فورس کی فائرنگ سے دس افراد موقع پر جاں بحق ہوئے ہیں اور بہت سے زخمی ہیں۔''

محترم ذکری جیسے بے دم سے ہو کر نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں دس افراد کی نہیں اپنے دس بچوں کی موت کی خبر ملی ہے۔

دوسرے شخص نے کہا۔ ''بے شمار لوگوں نے میتوں کے ساتھ ڈی پیلس کو جانے والی سڑک پر احتجاج شروع کر دیا ہے۔ صورتِ حال کشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ سٹی سینٹر کی طرف بھی ہنگامے کی اطلاع آئی ہے۔ گرے فورس کی چند فی میل اہلکار ایک خاتون کو گرفتار کرنے کے لیے ایک گھر میں گھسنا چاہ رہی تھیں، ان میں سے دو کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا گیا ہے۔ فورس کی کئی گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔''

ناظم بازان کے نائبین کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ یہ سب بڑی عمر کے جہاندیدہ افراد تھے۔ یہ جان چکے تھے کہ حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ناظم بازان کے بعد مجھے اور محترم ذکری کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان نائبین کے حکم پر پاسبان بریگیڈ کے قریباً دو سو مسلح افراد نے ہماری قیام گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس حفاظتی حصار کے باہر ایک اور حصار تھا اور یہ مظاہرین کا تھا۔ ان کی تعداد بھی دو تین ہزار سے کم نہیں تھی۔

میری درخواست پر حاذق ذکری نے تاجور کو بھی اسی عمارت میں بُلا لیا۔ میں نے اس سے علیحدہ کمرے میں ملاقات کی۔ تازہ ہنگامے کے بعد وہ مزید ڈری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اس لڑائی میں بری طرح الجھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ میری صحت کے حوالے سے بھی بے حد فکرمند تھی، بولی۔ ''آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ کو تیز بخار ہے۔ آپ کے زخم بھی ٹھیک نہیں ہو رہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بھی خود کو سنبھالے رکھو۔ تمہارا پریشان چہرہ دیکھتا ہوں تو خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، ہم کب تک یہاں سے نکل سکیں گے؟''

''مجھے ایسے لگتا ہے تاجور، اب یہ معاملہ کسی طرف لگنے والا ہے۔ لوگوں میں ایک لہر پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں ہی کوئی نتیجہ نکل آئے۔''

وہ غم ناک لہجے میں بولی۔ ''کبھی تو دل چاہتا ہے کہ...... میں یہاں سے واپس ہی نہ جاؤں۔ اسی ہنگامے میں ہی کہیں ختم ہو جاؤں۔ میں اپنے پیدا کرنے والوں کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں لا رہی ہوں...... اور اب تو...... میری وجہ سے ان پر بھی مصیبتیں آ رہی ہیں جن سے میرا ابھی تعلق بھی نہیں بنا۔''

''شاید تم سیف اور اس کے گھر والوں کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے سر جھکا لیا اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک گئے۔ وہ سسکی۔ ''میں خیالوں میں دیکھتی ہوں تو مجھے اس کی ماں نظر آتی ہے جو اب بھی شاید مصلّے پر بیٹھی ہو گی یا پھر اپنے بیٹے کی خیر خیریت کے لیے بچوں میں چاول بانٹ رہی ہو گی۔''

''خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں تاجور! لیکن ہم یہاں سے زندہ واپس چلے گئے تو اس ماں کے دکھوں کا مداوا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''زندہ ہی رہنے کو تو دل نہیں چاہتا اب۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ مایوسی کفر ہے۔''

اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پھر رک گئی۔ میرے دوسرے ہاتھ کو چھو کر

بولی۔ ''آپ کا جسم آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ آپ کی گردن کے زخم بھی اسی طرح بگڑے ہوئے ہیں۔''

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بہار کا موسم ہے۔ شاید میرے زخموں پر بھی بہار آئی ہوئی ہے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا...... اور شاید میری بات کی گہرائی سمجھنے کے بعد میرے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔

رات تک میرا بخار جوں کا توں تھا۔ دو ڈاکٹرز وقفے وقفے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری پسلیوں کے قریب سے کچھ اور متاثرہ جلد کاٹ دی تھی تا کہ وہ باقی جسم میں انفیکشن پیدا نہ کرے۔ مجھے زیادہ فکر اپنے پاؤں کی تھی۔ میں ان پر اپنے جسم کا پورا وزن ڈالنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد مجھے بیٹھنا پڑتا تھا۔ میرے پاؤں کے زخموں پر ڈاکٹروں نے بینڈیج نہیں کی تھی مگر میری پنڈلیاں اور دونوں کلائیاں بدستور پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ کلائیوں کی پٹیاں اسی سنگین واقعے کی نشانی تھیں جب میں نے تاجور کو بدترین تشدد سے بچانے کے لیے اپنی شریانیں کاٹ لی تھیں۔

میں تاجور میں عجیب تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ رات کو بخار تیز ہوا تو اس نے مجھے لیٹنے پر مجبور کر دیا اور میرے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھنے لگی۔ کبھی میرے پاؤں بھگوتی تھی، کبھی چہرے پر گیلا کپڑا پھیرتی تھی۔ نرس اس کی مدد کر رہی تھی۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ ان کوششوں سے میرا بخار کم ہو گیا۔

میرے استفسار پر انیق نے بتایا۔ ''شہر میں ہنگامے پھوٹے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ مظاہرین اور گرے فورس میں جھڑپیں ہوئی ہیں۔ بپھرے ہوئے لوگ ٹولیوں کی شکل میں مرکوزا کی طرف آنا چاہتے ہیں مگر پورے مرکوزا کو گرے فورس اور ایجنسی کے گارڈز نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے...... سخت ترین چیکنگ کے بعد صرف مرکوزا کے رہائشیوں کو ہی اندر آنے دیا جا رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کل یہاں لوگ جمع نہیں ہو سکیں گے؟''

''نہیں...... جمع تو ہوں گے مگر ان کی تعداد شاید دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہو گی۔''

''تو پھر......؟''

''لیکن ایک اچھی خبر یہ ہے کہ جن گروپوں کو مرکوزا کے علاقے میں آنے نہیں دیا جا رہا وہ واپس جانے کے

بجائے وہیں مین سڑک اور اردگرد کی سڑکوں پر جمع ہو رہے ہیں۔''

''محترم ذکری کیا کہتے ہیں؟''

''وہ تو کچھ نہیں کہہ رہے مگر ناظم باذان صاحب کے سارے نائب منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ ان کا پروگرام ہے کہ اگر عام لوگوں کو مرکوزا میں نہ آنے دیا گیا اور یہاں زیادہ لوگ جمع نہ ہو سکے تو پھر یہاں موجود لوگ مرکوزا سے باہر نکلیں گے اور مین روڈ والے ہجوم میں شامل ہو جائیں گے۔ محترم ذکری یہاں مرکوزا میں جمع ہونے والے لوگوں کی قیادت کرنا چاہتے ہیں مگر نائبوں کی جماعت اس بارے میں بڑی سخت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ محترم ذکری اور آپ کو ہر قسم کے خطرے سے دور رکھنے پر متفق ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ محترم ذکری کل اس عمارت سے باہر قدم نکالیں...... اور آپ کی تو حالت ہی ایسی نہیں کہ باہر نکل سکیں۔''

مجھے اپنی جسمانی حالت کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اپنی لاچاری کا رنج تھا۔ ایک اہم ترین موقع پر میں خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''ہمارا یہ اندازہ درست تھا کہ یہ لوگ رائی کا پہاڑ بنائیں گے۔ آقا جان کا ایک مکاری بھرا بیان بار بار ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ اس میں وہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ مرکوزا میں ہماری امن پسندی کا جواب بدمعاشی اور ننگی جارحیت سے دیا گیا ہے۔ لاء انفورس کرنے والی ایجنسیوں کی طرف سے صرف لاٹھی چارج کیا گیا یا آنسو گیس استعمال ہوئی مگر مظاہرین میں مسلح افراد موجود تھے انہوں نے خنجروں اور کرپانوں سے حملے کر کے کئی اہلکاروں کو شدید زخمی کر دیا ہے۔ ہماری شرافت کو کمزوری سمجھا گیا ہے۔ اب ہم شرپسندوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹیں گے۔''

''اس کا عملی مظاہرہ بھی ضرور کیا ہوگا اس خبیث نے؟''

''بالکل جناب، اس بیان کے فوراً بعد ہی مرکوزا کی ناکابندی کی گئی اور سیکڑوں مزید لوگ گرفتار ہوئے۔ مختلف واقعات میں کم و بیش چودہ افراد جاں بحق بھی ہوئے۔ پورے شہر سے آپ کی ٹارچ سیل والی تصویر اتار دی گئی ہے اور اس کو جمع کر کے نذرِ آتش کیا گیا ہے لیکن کہا جا رہا ہے کہ کچھ علاقوں میں پھر وہی تصویر دیواروں پر نظر آ رہی ہے۔''

''آقا جان کا بیان خطرناک ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بہت سخت حکمتِ عملی اپنائے گا۔''

اچانک شہر میں کہیں دور فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پستول اور چھوٹی رائفلوں کے فائر تھے۔ پھر کسی ایم ایم جی کے تین چار برسٹ بھی چلے۔ اس کے فوراً بعد ہی ایمبولینسز کے الارم سنائی دینے لگے۔ یہ سب کچھ شہر میں موجود کشیدگی کی نشاندہی کرتا تھا۔

میرا ذہن بار بار اس ٹاپو کی طرف چلا جاتا تھا جو یہاں سے کئی میل دور کھلے سمندر میں تھا۔ اس ٹاپو میں زیرزمین خلا کے اندر ایک تاریک دریا بہتا تھا اور ایسی سنگلاخ چٹانیں تھیں جنھوں نے کبھی سورج کی روشنی نہ دیکھی تھی۔ اس اندھیری جگہ پر زینب، ابراہیم موجود تھے اور قسطینا بھی اپنے دیگر ساتھیوں سمیت۔ وہ سب لوگ رائے زل کو بے انتہا مطلوب تھے اور ان تک پہنچنے کے لیے وہ ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ پتا نہیں کہ اس وقت وہ لوگ کیا کر رہے تھے، کیا سوچ رہے تھے؟ میرا دل ابراہیم اور زینب کے لیے بے چین ہونے لگا۔ وہ نوخیز پھولوں جیسا معصوم جوڑا۔ مجھے کل انیق نے بتایا تھا کہ ابراہیم کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ آر یا پار کے مقولے پر عمل کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یا تو اس زہر والی مجبوری کو ختم کر دے گا یا پھر خود ختم ہو جائے گا۔

انیق سے یہ سب کچھ سننے کے بعد میری تشویش بڑھ گئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا تھا کہ ابراہیم کی حالت کے بارے میں انیق گھٹا کر بتا رہا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ ہم ان حالات میں اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔

وقت آگے کو سرک رہا تھا۔ رات دھیرے دھیرے سویرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سویرا جو خون رنگ تھا اور جس کے اجالے میں اَن گنت اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ تاجور کئی گھنٹوں سے مسلسل میری دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ کرنل احرار اندر داخل ہوا اس نے تاجور کو چھوٹی بہن کہہ کر مخاطب کیا اور اسے کچھ آرام دینے کے لیے زبردستی میرے پاس سے اٹھا دیا۔ اس نے میرے زخموں کو دیکھا اور مجھ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کرنل تم نے کمپاؤنڈر ارکب کے روپ میں جو کچھ کیا وہ یادگار رہے گا۔ تمہاری اتاری ہوئی تصویر نے جاما جی کے لوگوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کی ہے۔''

''لیکن مسٹر شاہ زیب! اس تصویر کا اصل کریڈٹ تو تم کو ہی جاتا ہے۔ میں تو صرف اتارنے والا ہوں۔''

''تم وہاں تک پہنچے کیسے کرنل؟''

کرنل احرار نے اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں دراصل ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ ڈاکٹر ماریہ کو تو تم جانتے ہو نا مسٹر شاہ؟''

''بہت اچھی طرح، وہی جو آج کل رائے زل کی ذاتی معالج ہے...... اور حقیقت میں اس کی ذاتی KEEP ہے۔''

''ہاں وہی۔ ڈاکٹر ماریہ کو ٹارچر سیل میں تمہارے معائنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ شاید ڈاکٹر ماریہ کو اس سیل میں بھیجنے کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ اپنی آنکھوں سے رائے زل کے مخالفوں کا انجام دیکھ سکے۔ اور یقیناً وہ منظر عبرتناک تھا۔ ہم دونوں ہی کانپ کر رہ گئے تھے۔ مسٹر شاہ! تم نیم بے ہوش تھے۔ تم نے ایک دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور کھسکتے ہوئے ایک جگہ ٹک گئے تھے۔ تمہارے آبلوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ تمہاری جلد نیم روسٹ تھی اور کئی جگہ سے لٹک رہی تھی...... پاؤں کا حال اتنا برا تھا کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ تم غشی کی سی کیفیت میں ہولے ہولے کراہ رہے تھے اور پانی مانگ رہے تھے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر ماریہ کے سیل فون پر کال آگئی، وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہی وقت تھا جب میں نے صفائی کے ساتھ اپنے موبائل پر تمہاری تصویر لے لی۔''

''لیکن کرنل وہاں کلوز سرکٹ کیمرے بھی تھے۔''

''میں نے کیمروں کے زاویے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میری یہ مختصر کارروائی نوٹ نہیں کی جا سکے گی۔''

''اور اگر ہو جاتی؟'' میں نے کہا۔

''پھر وہی جو جاسوسی کی سزا ہوتی ہے۔ بے پناہ تشدد اور پھر موت۔'' وہ زیرِلب مسکرایا۔

کرنل احرار آصفی بھی پاسبان بریگیڈ کے انہی خاص لوگوں میں سے تھا جو مادرِ وطن کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ بے شک ان لوگوں کو ریان فردوس کی شکل میں ایک اچھا رہنما نہیں ملا تھا۔ بے شک آقا جان اور حلمی جیسے غداروں کی وجہ سے ان کو وقتی شکست ہوئی تھی مگر یہ لوگ ناامید نہیں تھے۔ میں نے کرنل سے ڈاکٹر ماریہ کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''اپنے بچے اور قریبی عزیزوں کی خاطر وہ ہر دکھ جھیل رہی ہے۔ کہنے کو وہ رائے زل کی ذاتی معالج ہے مگر اس کی حیثیت ایک رکھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ڈاکٹر ماریہ کو شراب سے ہمیشہ نفرت رہی ہے لیکن وہ ماریہ کو اسی رات اپنی خلوت میں بلاتا ہے جب اس نے شراب میں ڈبکی لگانا ہوتی ہے۔ ماریہ اور اس جیسی نہ جانے اور کتنی عورتیں ہیں جو اس ریچھ کے پنجوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ جنس اس کے لیے ایک من پسند کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔''

اسی اثنا میں کرنل احرار کے سیل فون کا بزر بج اٹھا۔ نائبین کی جماعت اسے مشورے کے لیے بلا رہی تھی۔ وہ مجھ سے ''سوری'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ باہر نکل رہا تھا تو انیق اندر آرہا تھا۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ وہ مجھ سے تازہ ترین صورتِ حال کے حوالے سے بات کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے انیق، کل کچھ ہو سکے گا؟''

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کسی وقت تو لگتا ہے کہ شاید میری کل والی کال لوگوں پر اثر کرے گی اور وہ رکاوٹیں توڑ کر یہاں اس عمارت کے سامنے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جائیں گے، مگر کسی وقت صورتِ حال برعکس بھی لگتی ہے۔''

''ہم اسے ففٹی ففٹی کہہ سکتے ہیں شاہ زیب بھائی، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف رکاوٹوں کو پار کر کے اب یہاں پہنچ رہی ہیں مگر صحیح صورتِ حال کا پتا تو صبح گیارہ بجے کے بعد ہی لگ سکے گا۔''

''میری ایک بات یاد رکھنی ہے انیق، تم نے اور سجاول نے کسی بھی صورت گرفتار نہیں ہونا۔ بے شک تم لوگوں نے حلیے بدل رکھے ہیں مگر ان لوگوں کو یہ جاننے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ تم اصل میں کون ہو...... اور پھر تمہیں تشدد کی اسی چکی میں پیسا جائے گا جس میں سے میں معجزانہ طور پر بچ نکلا ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب۔'' انیق نے بڑے جذبے کے ساتھ اپنی سرخ شرٹ اٹھا کر مجھے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوئی دھماکا خیز بیلٹ دکھائی۔ اس بیلٹ کے ساتھ اوپر کی طرف کھینچی جانے والی ایک سیاہ ڈوری تھی۔ ڈوری کو کھینچتے ہی انیق ناپید ہو جاتا بس گوشت کے کچھ ناقابلِ شناخت ٹکڑے ہی دیواروں سے چپکے رہ جاتے۔ ایسی ہی ایک بیلٹ سجاول کے پیٹ سے بھی بندھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''انیق! میں ٹمپریچر سیل کی جس ہولناک اذیت سے گزرا ہوں اس کے بعد تو میرا دل بھی چاہتا ہے کہ احتیاطاً ایک بیلٹ میں بھی باندھ لوں۔''

''ایسی بیلٹ آپ کو یہاں کہیں نہیں ملے گی شاہ زیب

بھائی! اور انشاء اللہ آپ کو ضرورت بھی نہیں۔ اس عمارت کے گرد رضا کاروں اور مظاہرین کے دو مضبوط حصار ہیں اور اب تو رضا کار دستے بھی اس حصار میں شامل ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ آپ پر اور محترم ذکری پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

☆☆☆

اگلا دن بڑا تہلکہ خیز تھا اور بہت تجسس بھرا بھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ لوگ رکاوٹیں عبور کر کے یہاں جمع ہوتے ہیں یا نہیں؟ دوپہر تک تین چار ہزار افراد تو وہاں جمع ہو گئے مگر پھر اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا۔ یہ صورتِ حال کسی حد تک مایوسی والی تھی۔

باذان کے سینئر نائب جاسم نے کہا۔ ''حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ مرکوزا کے گیٹوں سے باہر جمع ہونے والے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق پندرہ بیس ہزار افراد ہیں اور مزید آ رہے ہیں۔''

''تو کیا فیصلہ ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم لوگ مرکوزا سے نکل کر ان کے ساتھ مل جائیں گے۔'' جاسم نے جواب دیا۔

''لیڈ کون کرے گا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''لیڈ تو محترم ذکری ہی کرنا چاہتے تھے مگر ہم انہیں کسی ایسے خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ طے ہوا ہے کہ وہ مرکوزا کے گیٹس تک جلوس کے ساتھ جائیں گے اور پھر ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے واپس آ جائیں گے۔ اس سے آگے کمانڈر افغانی شہید کی بیوہ محترمہ عارفہ جان جلوس کی قیادت کریں گی۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ان کی آواز پر بھی لبیک کہتی ہے۔''

سہ پہر کے بعد ہماری قیام گاہ کے سامنے جمع ہونے والے چار پانچ ہزار افراد میں سے تقریباً نصف شہر کے مرکزی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی افراد نے ہماری قیام گاہ کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا۔ ان میں بہت سے مسلح افراد بھی تھے اور کٹ مرنے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ پاسبان بریگیڈ کے سیکڑوں افراد بھی ہمارے حفاظتی حصار میں شامل تھے۔

سیل فونز کے ذریعے پل پل کی خبریں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ گیٹس تک پہنچنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق محترم ذکری اور ان کے دو معمر ساتھیوں کو گارڈز کے ساتھ ایک گاڑی میں واپس بھیج دیا گیا اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ان کے واپس آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد، مرکوزا سے باہر نکلتے

وقت جلوس کو روک دیا گیا۔ یہاں مظاہرین اور رائے زل کی فورس میں زبردست جھڑپ ہوئی۔ کئی افراد شدید زخمی ہوئے مگر مظاہرین گیٹس کھول کر بڑے جلوس کے ساتھ مل گئے۔

اس ملاپ نے شہر کے طول و عرض میں زبردست جوش پیدا کیا۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مظاہرین کی تعداد دگنی ہو گئی۔ لوگ جیسے دیوانہ وار گھروں سے نکل آئے اور اس کشادہ شاہراہ پر جمع ہو گئے جو ڈی پیلس کی طرف جاتی تھی۔

شام سے کچھ دیر پہلے جب مظاہرین نے ڈی پیلس کی طرف بڑھنا چاہا تو رائے زل کی فورس اور ایجنسی گارڈز نے انہیں فائنل وارننگ دے دی۔

انیق بھی اس عظیم الشان جلوس میں موجود تھا۔ وہ میرے لیے رپورٹر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ اس نے بذریعہ سیل فون اطلاع دی۔ ''یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے جناب! محترمہ عارفہ خاتون نے ملائی زبان میں ایک پُرجوش تقریر کی ہے اور اب لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔''

''کتنی تعداد ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بڑی تعداد ہے جی۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے ہیں۔ جلوس کے پچھلے حصے میں عورتیں اور بچے بھی موجود ہیں۔''

اسی دوران میں آنسو گیس کی شیلنگ اور ہوائی فائرنگ سنائی دینے لگی۔ انیق سے میرا رابطہ کٹ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد رابطہ دوبارہ قائم ہوا تو وہ بُری طرح کھانس رہا تھا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے آقا جان کو ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ خبیث خود موقع پر موجود ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس نے کیا ہے، اس نے کرایا ہے۔'' وہ پھر بری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگا۔

چند سیکنڈ بعد اس کی آواز دوبارہ اُبھری۔ اس کے اردگرد صرف رونے چلانے کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایمبولینسز اور فائر بریگیڈز کے ہوٹر اودھم مچا رہے تھے۔

انیق نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''یہ فائرنگ آقا جان نے خود کروائی ہے۔ بڑی بیدردی سے نہتے لوگوں پر گولیاں چلائی گئی ہیں۔ ہر طرف لاشیں اور زخمی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''جلوس کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''جلوس تو تقریباً منتشر ہو چکا ہے جناب، بس چند سو لوگ رہ گئے ہیں۔ وہ بھی ٹولیوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ گرفتار ہوئے ہیں۔ وہ حرامی ٹھیک ہی کہتا

تھا کہ میں آہنی ہاتھوں کے ساتھ نمٹوں گا۔''

ہم نے ٹی وی آن کیا۔ وہاں اب حکومت کی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ فائرنگ اور ہلاکتوں کا ذکر الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہو رہا تھا مگر انداز مختلف تھا۔ رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ''زیادہ ہلاکتیں بھگدڑ کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد 100 کے لگ بھگ ہے مگر ان میں سے گولیاں شاید آٹھ دس کو ہی لگی ہوں گی۔ باقی لوگ پاؤں تلے کچلے گئے ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ''جلوس کے شرکا کی تعداد کیا ہو گی؟''

رپورٹر بولا۔ ''کچھ لوگ اسے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں مگر غیر جانبداری سے بات کی جائے تو مرکوز اسے نکل کر یہاں آنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ کوئی چار پانچ ہزار لوگ یہاں شاہراہ پر موجود ہوں گے لیکن اب چھوٹی چھوٹی چند ٹولیاں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔''

نیوز کاسٹر بولا۔ ''کہا جا رہا ہے کہ کمانڈر افغانی کی بیوہ عارفہ خاتون بھی زخمی ہوئی ہیں۔''

''نہیں...... یہ اطلاع درست نہیں۔ وہ آنسو گیس کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹرز ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ شاید وہ اسی کو اپنی کامیابی سمجھ رہی ہیں کہ گرفتاری سے بچ گئی ہیں۔''

محترم ذکری کے میزبان بدرقہ نے دانت پیس کر کہا۔ ''یہ سب جھوٹ اور اندھیرے کی پیداوار ہیں، بکواس کر رہے ہیں۔'' اور اس کے ساتھ ہی ٹی وی آف کر دیا۔

میں نے انیق سے ایک بار پھر رابطہ کیا۔ اس کی آواز میں اب پھر تھوڑا سا جوش تھا، بولا۔ ''لوگ اب پھر جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ ہلاکتوں پر بے حد مشتعل ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ عارفہ بی بی کے سر پر گہرا زخم آیا ہے اور وہ اسپتال میں ابھی تک بے ہوش ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میرا بخار پھر تیز تھا۔ زخم دہک رہے تھے۔ ہماری قیام گاہ کے اردگرد خاصی بڑی تعداد میں مسلح رضا کار اور مظاہرین موجود تھے۔ وہ گاہے بگاہے زبردست نعرہ زنی بھی کرتے تھے۔ دوسری طرف شہر کے مرکز سے جو اطلاعات آ رہی تھیں ان کے مطابق ایک بار پھر مین روڈ پر جم غفیر تھا۔ لوگ ہلاکتوں پر شدید احتجاج کر رہے تھے۔ ہلاکتوں کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ لوگ پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ وہ ڈی پیلس کی طرف مارچ کریں گے اور قاتلوں کے گریبان پکڑیں گے۔ کہا جا رہا تھا کہ اب بہت سے مسلح رضا کار بھی اس اجتماع میں شامل ہو چکے ہیں اور خطرناک تصادم کا خطرہ ہے۔

رات قریباً بارہ بجے تک میں شدید اضطراب میں رہا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ تاجور میرے سرہانے بیٹھی تھی اور میرے سر پر برف کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کی قربت کبھی مجھے مہکا دیا کرتی تھی لیکن اس وقت میری ساری حسیات کند تھیں۔ ذہن میں صرف ایک ہی تصور تھا۔ ہزاروں لوگ غم و غصے سے بھرے ہوئے مگر انجام سے سہمے ہوئے...... پیچھے ہٹتے تھے تو ہزیمت تھی، ذلت اور غلامی تھی۔ آگے بڑھتے تھے تو آقا جان اور اس کے حواریوں کی آگ اگلتی رائفلیں تھیں۔ یہ گوشت اور لوہے کا ٹکراؤ تھا۔

میں نے تاجور کا ہاتھ ہولے سے اپنی پیشانی سے ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے شاہ زیب؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''ایک کام کرو۔ وہ سامنے الماری میں سے مجھے وہ اسپرے پکڑاؤ۔'' میں نے سُن کرنے والے اسپرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا زیادہ درد ہو رہا ہے پاؤں میں؟''

''سمجھو کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ الماری میں سے سن کرنے والا NUMBING اسپرے اٹھا لائی۔ میں نے اپنے دونوں پاؤں پر اچھی طرح اسپرے کے کئی پف مارے اور پھر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا درد کش انجکشن سرنج میں بھر لیا۔ ''اسے میرے بازو پر لگا لو گی؟''

اس نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہو گا شاہ زیب۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔''

''نہیں، وہ سارا دن میرے ساتھ ہی ہلکان ہوتے رہے ہیں۔ اب انہیں سونے دو۔ میں خود ہی لگا لیتا ہوں۔''

اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے انجکشن اپنے بازو میں لگایا۔ سرنج کو واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ دودھ والا کپ میرے ٹراؤزر پر الٹ گیا۔ دودھ تو ٹھنڈا تھا مگر ٹراؤزر گیلا ہو گیا۔ میں نے تاجور سے کہا کہ میں ٹراؤزر بدل لوں...... سامنے ہی کمرے کے دروازے سے باہر باذان کے مسلح سیکیورٹی گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ کسی وقت ان کی جھلک کھڑکی میں بھی

دکھائی دے جاتی تھی۔ میں نے تاجور سے کہا۔ ''کسی گارڈ کو دو منٹ کے لیے اندر بُلالو۔''

وہ سمجھ گئی کہ میں ٹراؤزر بدلنے میں گارڈ کی مدد چاہتا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد مسلح گارڈ اندر اور تاجور کمرے سے باہر تھی۔ انجکشن اور اسپرے سے میری حالت عارضی طور پر کافی بہتر ہوگئی تھی مگر میں نے یہ بہتری ظاہر نہیں ہونے دی۔ جب خوش اخلاق گارڈ ٹراؤزر کی تبدیلی میں میری مدد کررہا تھا میں نے اچانک اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ ''سوری ڈیئر۔'' میں نے کہا۔ اور اس کی توانا گردن کے مخصوص حصے پر دفعتاً دباؤ ڈال کر اسے اناٹغفیل کردیا۔ وہ پوری طرح مسلح تھا۔ اس کے سینے سے چھوٹی نال کی رائفل آویزاں تھی۔ وہ بلٹ پروف جیکٹ اور سیفٹی ہیلمٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے فل بوٹ نصف پنڈلیوں تک پہنچ رہے تھے۔ اسے کھینچ کر واش روم کی طرف لے جانے اور اس کا لباس پہننے میں مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیکٹ کے تسمے پشت پر تھے اس لیے وہ میں نے نہیں پہنی۔

تاجور کو آواز دی تو وہ ساتھ والے کمرے سے نکل آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا خوب صورت منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اسی دوران میں تاجور کی نگاہ واش روم کے ادھ کھلے دروازے سے نیم برہنہ گارڈ پر پڑ گئی۔ اس کے جسم پر فقط میرا ٹراؤزر تھا۔ وہ مزید حیرت زدہ ہوئی۔

''یہ سب کیا ہے شاہ زیب؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

''تاجور۔'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر میں آج یہاں سے نہ نکل سکا اور ان لوگوں کے درمیان نہ پہنچ سکا جو رائے زل کی فورس اور امریکی گارڈز کے سامنے کھڑے ہیں تو پھر سمجھو کہ اب تک کی ساری جدوجہد اور سب قربانیاں رائگاں گئیں اور میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔''

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ ہوش میں تو ہیں۔ آپ نے اپنی حالت دیکھی ہے؟ اور...... آپ کیا سمجھ رہے ہیں کہ جو لوگ آپ کی حفاظت کے لیے یہاں کھڑے ہیں، وہ آپ کو یہاں سے نکلنے دیں گے۔''

''میں ٹھیک ہوں تاجور...... اور گھبراؤ مت، یہ لوگ بھی مجھے نکلنے دیں گے۔ تم...... تم بس خود کو سنبھالو اور میری تھوڑی سی مدد کرو...... پلیز۔''

وہ بے حرکت کھڑی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ ان لمحوں میں وہ اپنی لٹیں بھی پیشانی سے ہٹانا بھول گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کی خطرناکی بھی پوری طرح جان گئی تھی...... اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میں اب اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

گارڈ کو اندر آئے ہوئے اب دس منٹ کے قریب ہو چکے تھے۔ باہر سے دروازے پر مدھم دستک دی گئی۔

''کون؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا اور قریبی کھڑکی کا پردہ برابر کردیا۔

''کسی مدد کی ضرورت تو نہیں جناب؟'' انگلش میں پوچھا گیا۔

''نہیں شکریہ...... بس ہم دو چار منٹ میں فارغ ہو جاتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں سر، ہم آپ کی سروس پر ہیں۔'' شائستہ لہجے میں جواب ملا۔

میں نے اشک بار تاجور کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا۔ ''تاجور! اگر تکلیف نہ ہو تو یہ جوتے پہننے میں میری مدد کردو۔''

اس نے ایک طویل دکھ بھری سانس لی اور سر جھکا کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے کمر جھکانے میں شدید تکلیف ہوتی تھی۔ میں اپنے ہاتھ جوتوں تک بمشکل پہنچا پارہا تھا۔ تاجور نے جوتے چڑھانے اور تسمے باندھنے میں میری مدد کی پھر میں کھڑا ہوگیا اور بلٹ پروف جیکٹ میں اپنے بازو ڈال دیے۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے عقب سے جیکٹ کے اسٹریپس باندھنے ہیں۔

وہ لرزاں ہاتھوں سے یہ کام کرنے لگی۔ میں نے سیفٹی ہیلمٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔ ان لمحوں میں مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں قدیم زمانے کا کوئی کردار ہوں۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے میری پیاری ہستی مجھے اپنے ہاتھوں سے تیار کررہی ہے اور خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہے...... بہت بڑے خطرے کی طرف جارہے ہو۔ جس طرح اس وقت اپنی پشت دکھا رہے ہو، اسی طرح اپنا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دکھانا۔ میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں......

وہ عجیب لمحے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھ سکیں گے یا نہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج کی ان گنت ہلاکتوں کے بعد کل کا معرکہ زندگی اور موت کا معرکہ بن چکا ہے۔ وقفے وقفے سے شہر میں کسی نہ کسی جانب سے فائرنگ کی آواز بھی آجاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کشادہ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں فراٹے بھر رہی ہیں اور

فضا میں ہیلی کاپٹر نگرانی کی پروازیں کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا تھا کہ کل آقا جان کے حکم پر جو قتل عام ہوا ہے اس میں ہلاکتوں کی تعداد تین سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ جاماجی کے ان گنت گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے...... اور بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں خون کے آنسو ہیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں نیم گنجے سر اور شیطانی آنکھوں والے آقا جان کو دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ ''میں آ رہا ہوں آقا جان۔''

تاجور میری پشت پر تھی اور بلٹ پروف جیکٹ کو درست کر رہی تھی۔ اس کی مدھم اشک بار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو گیا شاہ زیب! تو...... میں کہاں جاؤں گی؟''

''انیق اور سجاول تمہارے لیے بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کر سکتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے تاجور۔''

''لیکن...... وہ بھی تو...... وہیں ہیں، جہاں آپ جا رہے ہیں۔''

''تو پھر محترم ذکری ہیں۔ ان کے جاں نثار مرید ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی پناہ میں لیا ہے، اور بیٹی کہا ہے۔''

وہ میرے عقب میں تھی۔ میرے کندھے پر اس کے ہاتھ کی گرفت بے ساختہ سخت ہو گئی۔ ''آپ نہ جائیں شاہ زیب۔'' اس نے بہت بوجھل آواز میں کہا۔ ''آپ اپنی حالت دیکھیں۔''

''مجھے کمزور نہ کرو تاجور! مجھے نیک دعا کے ساتھ رخصت کرو۔ اوپر والے نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ سیفٹی جیکٹ کا ایک بکل بند نہیں ہو رہا تھا۔ تاجور نے اسے بمشکل بند کیا۔ گارڈ کے جوتے مجھے تھوڑے سے تنگ تھے اور مجھے جوتوں میں اپنے خون کی ''چپچپاہٹ'' محسوس ہونے لگی تھی۔ تاہم میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی۔

''آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' تاجور عجیب سے لہجے میں بولی۔ وہ ابھی تک میرے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر تھے۔

میں نے اس کی طرف مڑنا چاہا تو اس نے کندھوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر مجھے روک دیا۔ ''نہیں شاہ زیب! آپ اپنا منہ ادھر ہی رکھیں۔''

''کیا مطلب تاجور؟''

''میں ایسے ہی بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ معصوم انداز میں بولی۔

''کہو تاجور۔'' میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''سجاول کے ڈیرے پر ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے...... آپ خود مجھے میرے گاؤں تک چھوڑنے گئے۔ سارے راستے آپ سوچتے رہے کہ شاید میں آپ سے کچھ کہوں گی لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ یہاں تک کہ گاؤں آ گیا۔ میں اتر کر چلی گئی۔ میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا...... مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ دیکھ سکتی...... میں نے آپ کو دکھ پہنچایا نا...... بہت تکلیف دی نا؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور اس کی ناک میری کمر کے بالائی حصے کو چھو رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں شاہ زیب۔'' اس نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔

میں نے خود کو بمشکل بولنے کے لیے تیار کیا۔ ''تم بھی مجھے معاف کر دو تاجور! میں نے بھی تو تمہیں دکھ پہنچایا نا۔ میں بھی تو خاموش ہی رہا نا......''

ہم ساکت کھڑے رہے۔ باہر للکارے تھے۔ مظاہرین کی کوئی ٹولی ہم آواز ہو کر جاماجی کا مقبول ترانہ پڑھ رہی تھی اور مدھم آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

جس دشمن نے ہمارے بچوں کی مسکراہٹ چھینی
جس دشمن نے ہم پر زندگی حرام کی
ہم اس سے لڑیں گے
آخری گولی تک اور آخری سر تک
ہم پیچھا کریں گے اس کا قبر تک......

میرے عقب میں تاجور نے اپنا سر میری گردن کے نچلے حصے سے ٹکا دیا پھر جیسے سسک کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا شاہ زیب، میں کیا کروں؟ میرے اندر جیسے فیصلہ کرنے کی ہمت ختم ہو گئی ہے۔ کسی وقت دل چاہتا ہے کہ...... سب کچھ آپ پر چھوڑ دوں۔ آپ جیسا کہتے جائیں...... ویسے کرتی جاؤں۔'' وہ سچ مچ سسک پڑی۔

میں نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا...... اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس نے اپنی بھیگی پلکوں کی چلمن گرا لی۔ ناک سرخ ہو رہی تھی۔ جی چاہا سب اندیشے اور مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا لوں مگر

جب میں نے ایسا سوچا میری نگاہوں کے سامنے فلیشز سے نمودار ہوئے۔ کچھ پُرہول جھلکیاں، یورپ کا خطرناک ترین گینگسٹر جان ڈیرک...... اس کے سفاک کارندے جو ہر صبح پیاسے اٹھتے تھے اور ہر شام انسانی خون پی کر سکون پاتے تھے...... وہ بھاگ رہے تھے...... میری طرف آرہے تھے...... ان کے پس منظر میں ایک لڑکے کی لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اس کا پیٹ چاک اور انتڑیوں کا منظر برف کی تہ پر، ہولناک نظارہ پیش کررہا تھا۔

میں نے تاجور کے دونوں ہاتھوں کو اکٹھا کیا اور اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ ''تاجور! میری بات کا یقین رکھو۔ تمہارے لیے سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ سب دکھ دور ہوں گے۔ آزمائش کی گھڑیاں اب زیادہ لمبی نہیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''آپ...... یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ تمہارے لیے سب ٹھیک ہوجائے گا؟ آپ کے لیے ٹھیک کیوں نہیں ہو گا۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کو محبت سے دبایا۔ ''میرے لیے بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ امید ہے کہ ہم یہاں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔''

''آپ...... رک نہیں سکتے؟'' اس نے عجیب التجا آمیز آواز میں کہا۔

''پلیز تاجور! مجھے ان آخری لمحوں میں کمزور نہ کرو۔''

اس نے آنسو پونچھ کر اثبات میں سرہلایا۔

میرے پاؤں بُری طرح جل رہے تھے۔ میں نے ایک اور ہائی ڈوز دردکش انجکشن تیار کیا اور خود ہی بازو میں لگا لیا۔

پھر میں بڑی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا۔ میں جانتا تھا مجھے کہاں جانا ہے۔ میں ایک سینئر گارڈ روحیل کی یونیفارم میں تھا اور وہ ایک ہیوی موٹر بائیک پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ جب میں تیزی کے ساتھ باقی گارڈز کے درمیان سے گزرا تو وہ کچھ چونکے مگر میرا انداز اتنا عجلت کا تھا کہ کسی کو کوئی سوال پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں چار پانچ زینے اتر کر ایک دروازے تک پہنچا۔ باہر رضا کاروں اور مظاہرین کا جم غفیر تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہونے والا تھا مگر عمارت سے باہر جیسے دن کا سماں تھا۔ پھریرے لہرا رہے تھے اور پُرجوش تقریریں ہورہی تھیں۔ میں نیچے جانے والی سیڑھیوں پر پہنچا۔ یہ سیڑھیاں پارکنگ لاٹ میں اترتی تھیں۔ گارڈ روحیل کی پانچ ہارس پاور موٹر بائیک پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی لیکن جب میں نے اسے چابی لگائی اور اسٹارٹ کرنا چاہا تو ناکامی ہوئی۔

مجھے پتا چلا کہ یہ موٹر بائیک اسی ٹائپ کی ہے جسے چابی کے علاوہ فنگر پرنٹس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حلمی کی ہلاکت کے موقع پر میں نے جلسہ گاہ میں جانے کے لیے ایک ایسی ہی بائیک پر سواری کی تھی۔ اس وقت بائیک والے کا کٹا ہوا انگوٹھا میری جیب میں تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں موٹر بائیک کے ''فنگر پرنٹ سینسر'' کو مطمئن نہیں کرسکتا۔

میں موٹر بائیک سے اتر آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر اس زمین دوز پارکنگ لاٹ میں مجھے کھلی چھت والی ایک پرائیویٹ کار کھڑی نظر آئی۔ یہ نیلے رنگ کی سیڈان تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اسے پارک کرنے کے بعد لاک کررہی تھی۔ میں نے اس سے چابی لے لی اور بڑے تحکم سے اسے بتایا کہ کسی شخص کے پیچھے جانے کے لیے یہ کار درکار ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میرا چہرہ ابھی تک ہیلمٹ میں چھپا تھا۔ معمر عورت گومگو کی کیفیت میں تھی تاہم میری یونیفارم دیکھ کر اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں دکھائی۔ میں اس کی نیلی سیڈان لے کر تیزی سے باہر سڑک پر آیا اور مرکوزا کے بیرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذہن میں اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ مجھے کسی بھی طرح اس مین شاہراہ پر پہنچنا ہے جہاں جاماجی کے لوگ احتجاج کررہے ہیں۔

مرکوزا کا علاقہ شہر کے جنوبی حصے میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں دس پندرہ منٹ کے اندر شاہراہ پر پہنچ سکتا ہوں۔ مرکوزا کی اندرونی سڑکوں پر رش تھا۔ مظاہرین نے بینرز اور کتبے اٹھا رکھے تھے اور ہر طرف چکرا رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس نیلی سیڈان کی ونڈ اسکرین پر بھی میری ٹارچر سیل والی تصویر کا اسٹیکر لگا تھا یعنی جس معمر عورت سے میں نے کار حاصل کی تھی، میں اس سے جھوٹ نہ بھی بولتا اور اپنا چہرہ دکھا دیتا تو وہ مجھے بخوشی کار دے دیتی۔

ایک جگہ گاڑی کو روکا گیا۔ مظاہرین نے وکٹری کے نشان بنائے۔ کچھ نے گاڑی کے اوپر جھک کر نعرے لگائے۔ ''جاماجی زندہ باد...... قسطینا زندہ باد...... ایسٹرن زندہ باد...... عارفہ بی بی زندہ باد۔''

اپنے نام کا پرجوش نعرہ سن کر بڑا عجیب احساس ہوا۔ ''فتح ہماری ہوگی۔'' میں نے بھی وکٹری کا نشان بناتے

ہوئے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے ہیلمٹ اور نیم تاریکی کے سبب کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔ شاید کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں جو شدید زخمی حالت میں ڈاکٹروں کی زیر نگرانی بستر پر پڑا ہوں، یہاں ایک سڑک پر گاڑی میں نظر آؤں گا۔

جلد ہی میں ایک ایسے گیٹ تک پہنچ گیا جو مرکوزا کے علاقے کو مین شہر سے جدا کرتا تھا، یہ گیٹ غالباً کل والے ہنگامے میں مسمار کیا جا چکا تھا مگر یہاں گرے فورس کا ناکا موجود تھا اور وہ احتیاط سے گاڑیوں کی چیکنگ کر رہے تھے۔ مجھ سے آگے دو گاڑیاں تھیں۔ میری دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں یہاں رک گیا تو شاید یہیں پر میرے سفر کو فل اسٹاپ لگ جائے گا۔

جونہی گرے فوجی میری جانب آئے۔ میں نے کلچ چھوڑ کر ایکسلیریٹر کو فرش سے لگا دیا۔ گاڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح بڑھی اور رکاوٹی بانس کو توڑتی ہوئی نکلتی چلی گئی۔

''ہالٹ...... بھاگو...... پکڑو۔'' کی ملی جلی آوازیں آئیں۔

پھر دو فائر ہوئے۔ میں نے خود کو حتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیا تھا۔ گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں۔ میں نے برق رفتاری سے سیڈان کو ایک بغلی سڑک پر موڑا۔ مجھے اپنے عقب میں ہیوی موٹر بائیکس کے ہوٹر سنائی دیے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، کم از کم دو بائیکس میرے عقب میں تھیں۔ ایک پولیس کار بھی تیزی سے یوٹرن لے رہی تھی۔ ڈنمارک میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے مار اماری کے دوران میں کئی مواقع ایسے آئے تھے جب اس طرح کے خطرناک CHASE سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ گاڑی کو بھگانا اور اڑانا مجھے اچھی طرح آتا تھا۔ لیکن یہاں مجھے یہ احتیاط بھی کرنا تھی کہ کوئی بے گناہ میری ٹکر سے جانی نقصان نہ اٹھائے۔ اگلے تین چار منٹ خاصے دھواں دھار تھے۔ رات کے پچھلے پہر جا ماجی کی نیم سنسان سڑکوں پر یہ بڑا خطرناک ''چیز'' تھا۔ میں نے پولیس کی ایک پٹرولنگ کار کو سائڈ مار کر ''اوور برج'' سے نیچے گرا دیا اور اس نے آگ کے گولے کی شکل اختیار کی۔ ایک بائیک سوار کو بھی میرے قریب آنے پر اچھا خاصا ''سبق'' ملا۔

قریباً دس منٹ بعد اسپیشل ماڈل نیلی سیڈان اس شاہراہ پر پہنچ گئی جہاں جگہ جگہ ٹائر جل رہے تھے اور پتھروں اینٹوں کے سبب راستے بلاک تھے۔ میں ان جلتے ٹائروں اور بکھری ہوئی اینٹوں کے درمیان سے گاڑی بھگاتا چلا گیا اور مظاہرین کے درمیان پہنچ گیا۔

اب تعاقب کرنے والوں کے لیے مجھ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں بیسیوں مظاہرین نے مجھے گھیر لیا۔ یہ دراصل اس عظیم الشان جلوس کا عقبی حصہ تھا جو ڈی پیلس کی طرف مارچ کرنا چاہتا تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

''کیا ہوا ہے آفیسر؟'' ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے عارفہ بی بی یا نائب جاسم صاحب تک پہنچاؤ۔ یہ ضروری ہے۔''

''لیکن آپ......؟'' وہ شخص الجھن میں نظر آ رہا تھا اور وہی نہیں اردگرد موجود سارے افراد چونکے ہوئے تھے۔ میری گردن اور کلائیوں وغیرہ کے زخم دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ میری صورت دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو سناٹا چھا گیا پھر ایسے پُرجوش نعرے سنائی دیے کہ قرب وجوار لرز گئے۔

دس پندرہ سیکنڈ کے اندر ہی سیکڑوں افراد یوں میری طرف کھنچے جیسے لوہ چون، مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ ہجوم میں سے لٹھ برداروں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پھر راستہ بنا کر مجھے ایک بند جیپ میں سوار کر دیا۔ اس جیپ کے اوپر بھی میری اور قسطینا کی تصویر موجود تھی بلکہ میری دو تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ وہی زخموں سے چور اور بے بسی کی انتہا کو چھوتی ہوئی تصویر۔

میرا پورا جسم درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے پتا چل رہا تھا کہ میرے جوتوں میں میرے ہی زخموں سے رسنے والا خون جمع ہو چکا ہے مگر پتا نہیں کیوں اب ذہن اتنی اذیت محسوس نہیں کر رہا تھا جتنی بند کمرے میں آرام دہ بستر پر کرتا رہا تھا۔

جیپ میں بیٹھا ہوا ایک باریش نوجوان سیل فون پر بلند پرجوش آواز میں بول رہا تھا۔ ''جی جناب...... جی جاسم صاحب...... میں حافظ بول رہا ہوں۔ ایک بہت بڑی خبر ہے جی...... جناب شاہ زیب صاحب، اس وقت ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ ہم...... آپ کی طرف آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

دوسری طرف سے جاسم کی آواز فون کے اسپیکر پر سنائی دی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو، شاہ زیب صاحب یہاں کیسے آسکتے ہیں؟ کون ہے یہ؟''

''آپ خود ان سے بات کریں۔'' حافظ نامی نوجوان

نے سیل فون میری طرف بڑھایا اور خود جیپ کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر مظاہرین پر چلانے لگا کہ وہ جیپ کو راستہ دیں۔

میں نے سیل فون پر کہا۔ ''ہیلو مسٹر جاسم! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔ میرا یہاں پہنچنا بہت ضروری تھا اور میں آرہا ہوں لیکن اس خبر کو ابھی عام نہ کیا جائے۔''

''اوہ مائی گاڈ! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ آپ اس حالت میں یہاں؟ آپ نکلے کیسے؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

لوگ جیپ پر اُمڈے پڑ رہے تھے۔ میں اب چونکہ سیفٹی ہیلمٹ اتار چکا تھا اس لیے ہر نگاہ مجھے پہچان رہی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ جیپ کے اندر گھس آتے۔ سیکڑوں لوگوں کے درمیان جیپ رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایم ایم اے کے فائٹر کی حیثیت سے بھی میں اپنے مداحوں میں گھرا کرتا تھا اور اپنے لیے لوگوں کا جوش و جذبہ دیکھتا تھا مگر آج جو کچھ میری نظریں دیکھ رہی تھیں وہ بیان سے باہر تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے رہنما سے عملی جدوجہد اور قربانی مانگتے ہیں اور جب وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو پھر اپنا تن من اس پر نچھاور کرنے لگتے ہیں۔

چونکہ یہ جلوس کا عقبی اور درمیانی حصہ تھا لہٰذا اس میں بہت سی خواتین اور کہیں کہیں بچے بھی دکھائی دیتے تھے۔ سیکڑوں پرچموں اور کتبوں کے درمیان مجھے ایک دو جگہ کیلئے کا ویسا ہی سرخ پتا بھی لہراتا نظر آیا جو کل مجھے کچھ بچیوں نے پیش کیا تھا اور مجھ سے رکنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے ایک جواں سال ملائی عورت کو دیکھا، اس نے پانچ چھ سالہ بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اس بچے کی شرٹ پر میری زخمی تصویر پرنٹ تھی۔ اس شرٹ کو دیکھ کر میرے دل کے اندر ایک لہر سی اٹھی۔ میرے دل و دماغ نے گواہی دی کہ اب کچھ نہ کچھ ہوگا۔ بے شک میں اس قابل نہیں تھا، بے شک میں اس طرح کے حالات کو زیادہ اچھی طرح سے نہیں سمجھتا تھا...... اور بلاشبہ میں ان لوگوں کی زبان تک پوری طرح نہیں جانتا تھا مگر ہمارے خون کا رنگ ایک تھا۔ ان لوگوں کی روح نے میری روح سے بات کی تھی اور ان کے دل و دماغ نے اپنی محبتیں میرے نام کی تھیں۔ مجھے اپنے اندر جہاں بے پناہ توانائی محسوس ہوئی وہاں اپنے کندھوں پر بے پناہ بوجھ بھی محسوس ہوا۔

پانچ منٹ کا سفر طے کرتے ہوئے شاید ایک گھنٹا ہی لگ گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں لوگوں کے درمیان سے نہیں جذبات کے ایک بپھرے ہوئے دریا کے درمیان سے گزرا ہوں۔ پھر مجھے انیق اور سجاول کی شکلیں بھی نظر آئیں۔ سجاول، سکھ پربت سنگھ کے روپ میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکیلے کوکوں والی ایک لٹھ تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے لباس میں کوئی نہ کوئی آتشیں ہتھیار بھی ہوگا۔ وہ میرے قریب آیا اور دھیمی مگر بارعب آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب! تم نے یہاں آکر کمال کر دیا ہے۔ میں نے کبھی کسی کو شاباش نہیں دی، پر دل کر رہا ہے کہ آج تمہیں شاباش دوں۔''

''شکریہ...... پر تم کہاں غائب تھے۔ کل بھی تم سارا دن نظر نہیں آئے؟''

''بس تمہارے آس پاس ہی تھا۔''

انیق نے مجھے آنکھ ماری اور سنجیدہ لہجے میں آہستہ سے بولا۔ ''دراصل سجاول بھائی ان لوگوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہے ہیں جو کل والے ہنگامے میں زخمی ہوئے۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ سجاول کے عقب میں ایک خاتون نظر آرہی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے کل اپنے بچے کو گرے فورس سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں سجاول نے بھی دیوانہ وار اس کا ساتھ دیا تھا اور وہ کامیاب رہی تھی۔ اس کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا گرفتاری سے بچ گیا تھا۔

وہ عمر میں چونتیس پینتیس کے لگ بھگ ہوگی مگر جسمانی طور پر متناسب تھی۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی کہنی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جامانجی کے دو پرچم تھے اور جوش سے اس کا رنگ گلابی دکھائی دے رہا تھا۔

انیق نے مجھے پھر آنکھ ماری اور بولا۔ ''یہ ہیں محترمہ خورسنہ۔ آزادی کی لڑائی لڑنے والوں میں ان کا بڑا کردار ہے۔ یہ سیاسی تنظیم 'ہوپ فل' کی سیکٹر انچارج بھی ہیں۔''

خاتون آگے آئی۔ اس کی پُراشتیاق نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ اردو میں بولی۔ ''ہم آپ کے فین پہلے ہی تھے لیکن مسٹر پربت سنگھ کی زبانی آپ کی باتیں سن کر اور بھی فین ہو گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر پربت سنگھ میں بھی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی کو بھی ان کا فین بنا سکتی ہیں۔ یہ

خطروں کے کھلاڑی ہیں...... جب ڈٹ جائیں تو لوہے کی دیوار بن جاتے ہیں۔"

"اس کا تجربہ تو کل مجھے ہو گیا ہے جناب! میرے بیٹے کو گرفتاری سے بچانے کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ میں کبھی بھول نہیں سکوں گی اور میرے خیال میں...... آج...... آپ نے بھی جو کچھ کیا ہے وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں۔" اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھیں میرے سراپا۔ پر دوڑائیں اور ذرا توقف سے بولی۔ "آپ اس حالت میں ہمارے درمیان آ گئے ہیں لوگوں کو یقین نہیں آ رہا۔ ان کا حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا ہے۔"

کسی نے ملائی میں فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ اس کا مطلب تھا...... ماریں گے مر جائیں گے۔ جواب میں یہی فقرہ سیکڑوں لوگوں نے بیک زبان ادا کیا تو قرب و جوار گونج گئے۔ ہجوم میں لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں ہم سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے سیکڑوں پرچم لہراتے دیکھے۔ یہاں بھی لٹھ بردار محافظوں نے ہمیں چاروں طرف سے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔

تب مجھے قائم مقام ناظم جاسم کی صورت نظر آئی۔ وہ گول چہرے والا ایک صحت مند شخص تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ بے ساختہ میرے گلے لگ گیا۔ پھر اس نے میرے ہاتھوں کو بوسے دیے اور ایک میگافون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لوگ آپ کو سننے کے لیے بے تاب ہیں۔ آپ ان سے کوئی بات کریں۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں...... اور نہ ہی ابھی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں وقت آنے پر ضرور بولوں گا مگر اس طرح میگافون پر نہیں۔ تمہیں انتظام کرنا ہو گا کہ میری آواز دور تک جائے۔"

شاید آپ ساؤنڈ سسٹم کی بات کر رہے ہیں...... یہاں پر یہ آسان تو نہیں ہو گا...... لیکن...... میں پوری کوشش کرتا ہوں۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ خورسنہ کے سیل فون پر کوئی کال آئی۔ اس نے اپنے اسکارف کو تھوڑا سا پیچھے ہٹایا اور ایک کان میں انگلی ٹھونس کر کال سننے میں مصروف ہو گئی۔ تب میں نے اسے جوش کے عالم میں سجاول سے لپٹتے دیکھا۔ اس کی بے باکی بڑی بے ساختہ تھی۔

"کیا ہوا خورسنہ؟" قائم مقام جاسم نے اس سے پوچھا۔

وہ بولی۔ "مسٹر شاہ زیب کے یہاں پہنچنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ بہت سے لوگ چھوٹی بڑی ٹولیوں کی شکل میں جلوس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ایک اس سے بھی اہم خبر ہے...... چھاؤنی میں ہلچل ہوئی ہے...... اور گرین فورس کے کچھ یونٹ رکاوٹیں توڑ کر باہر آ گئے ہیں۔"

یہ دوسری خبر واقعی بہت اہم تھی۔ ڈی پیلس کے دفاع کے وقت ریان فردوس سے جو غلطیاں ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے امن پسندی اور خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرین فورس کے زیادہ تر دستوں کو چھاؤنیوں میں بند کر دیا تھا۔ بعد ازاں رائے زل اور ایجنسی نے انہیں جنگی قیدیوں کی حیثیت دے دی تھی۔ اب یہ لوگ بھی باہر نکل رہے تھے۔

اسی اثنا میں مجھے ایک بڑا ریلا اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ قائم مقام ناظم محمد جاسم نے کہا۔ "یہ عارفہ خاتون ہیں۔ آپ سے ملنے آ رہی ہیں۔"

چند ہی سیکنڈ بعد عارفہ خاتون میرے سامنے تھی۔ وہ ایک شہید کی بیوی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا چغا نما لباس پہن رکھا تھا۔ عمر چالیس سے اوپر رہی ہو گی۔ وہ قدرے فربہ جسم کی ایک صحت مند خاتون تھی۔ اس کا نصف چہرہ نقاب میں تھا۔ بیسیوں پُرجوش نوجوان اس کے اردگرد تھے۔ ان نوجوانوں نے اپنی پیشانیوں پر نعرۂ تکبیر کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور دیکھا جاتا تو اب یہ واقعی ایک مذہبی جنگ بن گئی تھی۔ ایک طرف رائے زل تھا جو سرے سے خدا کو مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جنت دوزخ یہیں پر ہے بلکہ دوزخ بھی کیا صرف جنت ہی جنت ہے اور اس "جنت" سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ دن رات عیش و عشرت میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔ رائے زل کے ساتھ اس کے امریکی دوست تھے۔ یہ پرلے درجے کے لالچی اور مکار لوگوں کا گروہ تھا۔ یہ لوگ نیوسٹی پر تو پہلے سے قابض تھے۔ اب انہوں نے مسلمان اکثریت والے علاقے جاماجی شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس شیطانی اتحاد کے مقابلے کے لیے اب جو لوگ نکلے تھے ان میں نوّے پچانوے فیصد مسلمان ہی تھے۔

ایک شہید کی بیوی کی حیثیت سے میں نے عارفہ خاتون کو تکریم دی اور اسے سلام کیا۔ اس نے بہت خلوص اور محبت سے جواب دیا، وہ بولی۔ "ام نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ آج آپ کو دیکھ بھی لیا۔ اور ام کو لگ رہا ہے کہ ام نے جو کچھ سنا وہ درست ہی تھا۔"

"میں کسی قابل نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کا حسنِ نظر ہے۔"

"ایسی بات نہیں۔" وہ بڑے یقین سے بولی۔

"آپ نے امارے لیے بہت کچھ کیا ہے اور سب سے بڑا بات یہ کہ آپ نے ہاناوانی جیسی عورت کی نظروں کے جادو کو ناکام کیا ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اب تو یہاں تک کہا جارہا ہے کہ وہ عورت آپ کی وجہ سے اسپتال میں پڑا ہے۔ یہ ایک بڑا اچھا شگون ہے۔ لوگوں کے دلوں سے اس کا خوپ (خوف) دور ہوا ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ لوگ ایسا سمجھ رہے ہیں۔"

"یہ آپ کا نہیں امارا خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں موجود ہے۔ ام اس جلوس کا قیادت کررہا تھا اور اپنے آپ سے شرمندہ بھی ہورہا تھا کہ...... اصل لیڈر تو قسطینا بی بی ہے یا پھر آپ ہے۔ اب آپ یہاں آگیا ہے تو اب اس جلوس کا قیادت آپ کے سپرد ہے۔"

اسی دوران میں جنوب کی طرف سے بہت شور و غل سنائی دیا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ چھاؤنی سے نکل کر آنے والے فوجی دستے یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہیں دیکھ کر جلوس کے شرکا خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔

میں کوئی سیاسی تجربہ نہیں رکھتا تھا اور احتجاجی سیاست کی تو الف ب بھی مجھے معلوم نہیں تھی، مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ صورتِ حال میں یہ تبدیلی ہمارے لیے مثبت نہیں ہے۔ ہم پرامن جدوجہد اور مسلح کوشش کو آپس میں مکس اپ کرنے والے تھے۔ اس طرح سے یہ نہ تو پرامن عوامی جدوجہد رہتی اور نہ عسکری کوشش ہوتی۔ میں نے قائم مقام جاسم سے کہا۔ "یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

وہ ذرا جوش سے بولا۔ "جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔"

"جو کچھ میرے سامنے ہے، وہ تمہارے سامنے شاید نہیں ہے۔ اگر تم لوگ مجھے لیڈر مان رہے ہو تو پھر یہ میرا حکم ہے کہ گرین فورس کے یہ دستے ہمارے جلوس میں شریک نہیں ہوں گے۔ ہم پرامن...... اور مسلح جدوجہد کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں کریں گے۔ ان دستوں کو فوراً واپس جانا ہوگا۔"

جاسم پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے مقامی طرز کے چولے کے دامن سے اپنے گول چہرے کا پسینا پونچھا اور کہنے لگا۔ "لیکن شاہ زیب صاحب! اب یہ کیسے ہوسکتا

ہے؟''

''اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں کو ابھی اور اسی وقت جلوس سے علیحدہ کرو، آدھے گھنٹے کے اندر اندر۔''

''مگر یہ کہاں جائیں گے؟''

''جہاں بھی جائیں مگر یہ جلوس میں نہیں ہوں گے۔ اگر ان کی ضرورت پڑی تو پھر ہم انہیں خود بلائیں گے۔ ابھی ان کا یہاں ہونا ہمارے ''کاز'' کے لیے بے حد خطرناک ہے۔''

چند منٹ کی بحث کے بعد عارفہ خاتون اور جاسم نے دیگر نائبین سے بھی صلاح مشورہ کیا۔ کمانڈر افغانی کی طرح عارفہ خاتون بھی ملائی زبان بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ آخر فیصلہ وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ میری بات نائبین کی سمجھ میں بھی آرہی تھی۔

جاسم میرے پاس آکر بولا۔ ''یہاں قریب ہی ایک فٹ بال اسٹیڈیم ہے۔ چھاؤنی سے باہر آنے والے دستوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ اسٹیڈیم کا کنٹرول سنبھال لیں اور تاحکم ثانی وہیں پر موجود رہیں۔''

''وہیں پر موجود رہیں...... اور ہر طرح کی لڑائی سے بھی ہاتھ روک کر رکھیں۔'' میں نے جاسم کا فقرہ مکمل کیا۔

''جی ہاں...... ایسا ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر چھاؤنی سے گرین فورس کے مزید دستے نکلیں تو وہ بھی اسٹیڈیم میں ہی پہنچیں۔ اسٹیڈیم کے اندر یا اسٹیڈیم کے باہر۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے تائید کی۔

افق پر صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہی روشنی جسے ''صبح صادق'' کہا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ روشنی دن کے اجالے میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے جیپ کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی انسانی سر نظر آرہے تھے۔ ایک سمندر تھا جو صرف محاورتاً نہیں حقیقتاً ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ وہی انسانی ردعمل تھا جس کے ذکر سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ آج میں وہ ردعمل اپنے سامنے اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

انیق نے کہا۔ ''ڈی پیلس میں کھلبلی ہے شاہی بھائی! شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ آج لوگ اتنی بڑی تعداد میں نکلیں گے۔ گرے فورس اور ایجنسی کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کے باوجود لوگ مسلسل پہنچ رہے ہیں، کئی کلومیٹر تک اردگرد کی سڑکیں بلاک ہو چکی ہیں۔ لوگ بے چین ہیں کہ آپ انہیں مارچ کا حکم کب دیں گے۔''

''ابھی تھوڑا مزید انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کی پنڈلیوں سے خون رس رہا ہے جی۔ آپ کو زیادہ دیر کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔''

''آج تو کھڑا ہونا ہی پڑے گا انیق! تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''وہ تو پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں موجود ہے۔ آپ کی اجازت کا انتظار کر رہا ہے۔''

انیق نے جاسم سے کہا اور ملائیشین ڈاکٹر آن موجود ہوا۔ وہ دیکھتے ہی جان گیا کہ میری ٹانگوں کے زخم خون اگل رہے ہیں اور میرے جوتوں میں خون جمع ہو چکا ہے۔

اس نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! آپ اپنے جوتے اتاریں۔''

''نہیں ڈاکٹر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ تشخیص کا وقت نہیں ہے۔ تم مجھے بس پین کلر انجکشن دو اور NUMBING اسپرے کر دو۔''

ملائیشین ڈاکٹر انکار میں سر ہلانے لگا۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں بحث شروع ہو جاتی، مجھے کرنل ڈاکٹر احرار آصفی کی شکل نظر آگئی۔ اس نے میری مشکل آسان کی اور ملائیشین ڈاکٹر سے کہا کہ وہ وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔

مجھے انجکشن لگ گیا اور اسپرے ہو گیا تو ایک بار پھر جیسے جسم میں نئی جان پڑ گئی۔ نائب جاسم بُرے بھلے ساؤنڈ سسٹم کا انتظام کر چکا تھا۔ میں ساتھیوں کا سہارا لے کر جیپ کی چھت پر چلا گیا۔ میں کوئی مقرر نہیں تھا، نہ ہی میں نے اپنی تقریر کے لیے کوئی تیاری کی تھی، میں نے مائیک پکڑا اور جو کچھ میرے دل میں تھا بولنا شروع کر دیا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی، ایک انوکھا سا جذبہ تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا تھا۔ میں نے جاناں کی آخری ہچکیاں سنی تھیں، میں نے ان گنت پھانسیوں کے مناظر ملاحظہ کیے تھے اور وہ سارا رنج و الم ایک آتش کی صورت میرے لہجے میں وارد ہو گیا تھا۔ جو کچھ میرے دل میں تھا، میں بولتا چلا گیا۔

اپنی تقریر کے آخر میں، میں نے کہا۔ ''یہ صرف جاماجی کی کہانی نہیں، یہ ہر اس خطے کی کہانی ہے جہاں ظلم روا رکھا گیا ہے...... یہ کشمیر، فلسطین اور افغانستان جیسے ہر علاقے کی روداد ہے۔ اگر آج تمہارے قدم رک گئے تو پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔ اگر آج تم ڈر گئے تو تمہاری نسلوں کو

ذلت کا عذاب جھیلنا پڑے گا۔ ایک رائے زل کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا آئے گا...... اور تم پر مسلط ہو جائے گا۔ غلامی کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

آج اپنے گریبان چاک کر دو، اپنے سینے کھول دو...... اپنی نظر سامنے رکھو، اپنے ہاتھوں کی زنجیر بناؤ اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ میں تم سب سے آگے ہوں۔ ہماری طرف سے کوئی ایک شیشہ نہ ٹوٹے...... ہماری وجہ سے خون کا ایک قطرہ نہ بہے۔ آج ہم نے ایک اور طرح کی جنگ لڑنی ہے، آج ہم نے ایک اور طرح کا معرکہ سر کرنا ہے۔ یہ وہ لڑائی ہے جس میں ایک بھی گولی چلائے بغیر آتشیں ہتھیاروں کا مقابلہ کیا جاتا ہے، جس میں بارود کے سامنے سینوں کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ یہ وہ مزاحمت ہے جس میں ہزار ہا نہتے لوگ ایک قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں...... دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی ہجوم میں زبردست ہلچل نظر آنے لگی۔ اب مزید انتظار نقصان دہ تھا۔ میری ہدایت پر جیپ آگے بڑھی اور اس کے ساتھ ہی لوگ حرکت میں آگئے۔ جیپ پر موجود بلند پرچم لوگوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ جلوس کے راستے میں پہلی رکاوٹ قریباً چار سو میٹر کی دوری پر تھی۔ پولیس اور مسلح رضا کار دستے ایک آہنی دیوار بنائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈھالیں تھیں اور وہ سرتاپا آہن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا بیسیوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

انیق میرے ساتھ ہی جیپ پر موجود تھا۔ اس نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھا اور بولا۔ ''رضا کار دستے غدار اعظم کی قیادت میں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''کمانڈر اوان...... جس نے عین موقع پر دھوکا دیا تھا۔''

''ایجنسی کے لوگ بھی نظر آرہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

انیق نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے لگائے نفی میں سر ہلایا۔ ''کم از کم اس جگہ تو ایجنسی کا کوئی سفید یا کالا بندر نہیں ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر زیادہ مشتعل ہوں گے۔''

مارچ شروع ہونے کے ایک منٹ بعد ہی آنسو گیس کی اندھا دھند شیلنگ شروع ہوگئی۔ میری والی جیپ کے دائیں بائیں دو اور جیپیں تھیں۔ ایک پر عارفہ خاتون اور دوسری پر قائم مقام ناظم جاسم موجود تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود پاسبان بریگیڈ کے سادہ پوش نوجوان مجھے چاروں طرف سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ جیسے میرے اوپر گرے پڑ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔

ابھی یہ عظیم الشان جلوس دفاعی لائن سے قریباً 100 میٹر دور ہی تھا کہ ''وارننگ شاٹس'' فائر کیے گئے...... اور اس کے فوراً بعد سیدھی فائرنگ شروع ہوگئی۔ چند لمحوں کے لیے بدنظمی اور بھگدڑ نظر آئی۔ جس لینڈ روور جیپ پر میں سوار تھا اسے بھی گولیاں لگیں۔ میں نے دو نوجوانوں کو زخمی ہو کر جیپ سے گرتے دیکھا۔ میری نظر شہید کی بیوی عارفہ خاتون پر پڑی۔ وہ جیپ میں کھڑی ہوگئی تھی اور اس کا بالائی جسم سن روف کے خلا سے باہر نظر آرہا تھا۔ وہ للکار رہی تھی اور شرکا کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

بھگدڑ والی لمحاتی کیفیت ختم ہوگئی۔ ہجوم رکا، سنبھلا اور پلٹ پڑا۔ نعروں کی ہیبت ناک گونج میں یہ ایک زبردست یلغار تھی۔ پولیس کے سیکڑوں اہلکار اور رضا کار دستے پہلے الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور پھر منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ ایک انسانی سیلاب تھا جو ایک بلند لہر کی طرح ان کی طرف بڑھا تھا۔

وہاں موجود زیادہ تر سرکاری گاڑیاں تو پسپا ہوگئیں مگر چند ایک مظاہرین کے قبضے میں بھی آگئیں۔ یہ زیادہ تر قیدیوں کو لے جانے والی بسیں تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم ہر رکاوٹ توڑنے پر آمادہ تھا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی دو رنگے پرچم اور کتبے لہرا رہے تھے۔ اگلی صفوں کے لوگ دیوانہ وار آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، ہزاروں لوگ ان کے پیچھے تھے۔ قریباً 150 میٹر آگے بھی ایک دفاعی لائن قائم کی گئی تھی۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ چار پانچ منٹ پہلے تک یہاں بھی پولیس اور نیم فوجی دستوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں، مگر لوگوں کی غیر معمولی تعداد اور ان کا بے پناہ جوش و جذبہ دیکھ کر یہاں موجود سیکڑوں اہلکار دُم دبا کر بھاگ نکلے تھے۔

ایک گاڑی پر پوری آواز کے ساتھ ترانہ گونج رہا تھا۔

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
ہم سچے سویرے تک لڑیں گے

اور اگر ہم واپس نہ آسکے
تو ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے

سجاول بھی اگلی صف میں تھا۔ اس صف میں کئی جوشیلی خواتین بھی موجود تھیں۔ انیق نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھیں جی، آپ کا امریش پوری ہیرو کے کردار میں نظر آرہا ہے۔''

میں نے دیکھا سجاول کے ساتھ اب خورسنہ بھی نظر آرہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں پرچم اٹھائے... فلک شگاف نعرے لگارہے تھے۔

انیق بولا۔ ''بڑی بہادر عورت ہے۔ ایسی عورتیں اپنے مردوں میں اتنا جذبہ پیدا کردیتی ہیں کہ وہ شہادت سے ہمکنار ہوجاتے ہیں۔''

''اپنے مردوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا تم سجاول کو خورسنہ کا مرد کہہ رہے ہو؟''

''یہی بات ہے جی...... پچھلے دو دنوں میں بہت کچھ بدلا ہے۔ کئی کام جو برسوں میں نہیں ہوتے بعض اوقات گھنٹوں اور پہروں میں ہوجاتے ہیں۔ سجاول اور خورسنہ میں گہری دوستی ہوگئی ہے اور محترمہ خورسنہ کی کالی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر مجھے تو یہی لگتا ہے کہ یہ صرف دوستی نہیں ہے۔''

''اچھا تم زیادہ ماہرِ چشم نہ بنو۔ یہ وقت اس طرح کی باتوں کا نہیں ہے۔''

''آپ نے خود ہی بات چھیڑ دی ہے شاہی بھائی، ورنہ میں تو صرف سجاول بھائی کا دیدار کررہا تھا۔ وہ جتنے جوش میں نظر آرہے ہیں، پتا نہیں پھر کبھی ان کا رخِ روشن دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔''

جاسم نے اپنی جیپ میں سے پکار کر مجھے مخاطب کیا اور بولا۔ ''دیکھیں جناب! بھگوڑے یہاں سے بھی بھاگ گئے ہیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ ڈی پیلس کو جانے والی شاہراہ کا ایک معروف چوراہا تھا (جب آقا جان نے مجھ سے یادگار تھپڑ کھانے کے بعد مجھے دوسری دفعہ اپنے ٹارچر سیل میں لے جانے کی کوشش کی تھی تو اسی چوراہے کے قریب میرے ساتھیوں نے مجھے چھڑایا تھا۔ انیق، کرخت سنگھ اور سیف وغیرہ عقابوں کی طرح جھپٹے تھے اور مسلح افراد کو مار بھگایا تھا) اب اس چوراہے پر ریت کی بے شمار بوریاں اور دیگر رکاوٹیں نظر آرہی تھیں۔ خاردار تاروں کے طویل چھلے اور ''روڈ بلاکرز'' بتارہے تھے کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں بہت سے مسلح اہلکار و آفیسرز موجود تھے جو نازک صورتِ حال دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

آوازیں گونج رہی تھیں...... ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے...... ہم سچے سویرے تک لڑیں گے۔

عارفہ خاتون پکار کر بولی۔ ''اب ام کو رکنا نہیں چاہیے۔ لوہا گرم ہے۔ ام کو آخری چوٹ لگادینا چاہیے۔''

جاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم اس کے پاس کھڑا کرنل احرار آصفی بولا۔ ''یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ڈی پیلس کی حفاظت باقاعدہ فوج اور ایجنسی کررہی ہے۔ جلد ہی وہ ہمیں روکیں گے۔''

عارفہ خاتون گرجی۔ ''ام سب مرنے کے لیے ہی تو آئے ہیں۔ وہ ماردیں ام کو...... ام تیار ہیں۔''

جاسم کا ایک نائب میرے پاس آیا۔ اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جناب! ڈی پیلس سے دو کلومیٹر پہلے ہمیں روکنے کا پکا انتظام کیا گیا ہے۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں ایجنسی کے گارڈز اور فوجی دستے موجود ہیں۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار بھی ہیں۔ رائے زل کی طرف سے انہیں ہر طرح کے اختیار دیے گئے ہیں۔''

''یہاں سے یہ دستے کتنی دور ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ وہ جہاں سڑک تھوڑا سا موڑ کاٹ رہی ہے، قریباً وہی جگہ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ڈی پیلس یہاں سے ٹوٹل تین کلومیٹر دور ہے؟''

''جی جناب! مگر ان لوگوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ جلوس کو ڈی پیلس کے آس پاس بھی نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ ٹی وی پر بار بار اعلان کیے جارہے ہیں۔ شہریوں سے کہا جارہا ہے کہ وہ گھروں میں بند رہیں، جو شرپسند ڈی پیلس کی طرف مارچ کرنا چاہ رہے ہیں ان کے ساتھ نہایت آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔''

''جلوس کی صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے نائب سے پوچھا۔

''نعرہ زن جتھے مسلسل شامل ہورہے ہیں جناب۔ جاباجی کی تاریخ نے ایسا عظیم الشان اجتماع کبھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کہ سرکاری ٹی وی کن لوگوں کو گھروں میں بند رہنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ گھروں میں کوئی رہا ہی نہیں ہے۔''

چند منٹ بعد نائبین سے مشورے کے بعد میں نے

جلوس کو پھر مارچ کی ہدایت کی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہزاروں لوگ ایک فردِ واحد کی طرح حرکت میں آ گئے۔ خاردار تاروں کو کاٹ دیا گیا یا ان پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے رکھ کر انہیں روند دیا گیا۔ چند منٹ بعد جلوس اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ظلم کے پہرے دار سرتاپا آہن میں ڈوبے...... صف باندھے کھڑے تھے۔ یہاں بکتر بند گاڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان پر M-16 ٹائپ کی مشین گنیں نصب تھیں۔ گرے فوجیوں نے سڑک پر ایک جگہ سرخ جھنڈیاں گاڑ رکھی تھیں۔ جھنڈیوں کی یہ قطار افقی رخ پر اس شاہراہ کے آر پار چلی گئی تھی۔

کرنل احرار نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ریڈ لائن کی نشاندہی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس کو پار کرے گا تو اس پر فائر کھول دیا جائے گا۔ ان میں گرے فورس کے لوگ کم ہی ہیں۔ زیادہ تر ایجنسی کے امریکی ہیں۔ ٹاپ کلاس پروفیشنل...... حکم کے بندے...... ایک اشارے پر لاشیں بچھا دینے والے۔“

میں نے بکتر بند گاڑیوں کو گنا۔ تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ ان کے عقب میں ریت کی بوریوں سے بہت سے مورچے بنائے گئے تھے۔ اردگرد کی عمارتوں کے پاس بھی مسلح فوجیوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ انتظام اس طرح کا تھا کہ چڑیا بھی پر نہ مار سکے۔

اب یہ تخت یا تختے والا معاملہ تھا۔ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جاماجی کی بازیابی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی آج اسی جگہ پر ختم ہو جانا تھی یا پھر کامیابی کی طرف بڑھنا تھی۔

کرنل احرار کے چہرے پر مجھے پہلی بار کچھ ہراس نظر آیا۔ وہ بولا۔ ”انسانوں کا یہ سمندر دیکھ کر ان لوگوں کی ٹانگیں ضرور کانپ رہی ہوں گی مگر یہ گولی چلانے سے باز نہیں آئیں گے۔ یہ قتلِ عام کی شکل ہو جائے گی۔“

عارفہ خاتون گرجی۔ ”کتنوں کو ماریں گے...... کتنوں کو چھلنی کریں گے۔ یہاں ہر گھر سے کمانڈر افغانی اور عبدالکریم نکلے ہیں۔ وہ لاکھوں میں ہیں اور مرنے کو تیار ہیں۔“

کرنل احرار آصفی نے کہا۔ ”لوگوں کی ناقابلِ یقین تعداد اور جوش میں تو کوئی کلام نہیں، مگر بات خونریزی کی ہے۔ اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ بھگدڑ مچ گئی یا ایسا ہی کچھ اور ہو گیا تو سیکڑوں لوگ اپنے ہی پاؤں تلے کچلے جائیں گے۔“

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اب یہ بالکل پگھلے ہوئے سیسے اور انسانی گوشت کا ٹکراؤ تھا...... سینوں اور گولیوں کا تصادم تھا۔ کچھ علاقوں کے ناظم بھی متذبذب نظر آتے تھے۔

جلوس...... عظیم الشان جلوس اور ایجنسی کی آہنی دیوار کے درمیان قریباً ساٹھ ستر قدموں کا فاصلہ رہا ہوگا۔ درجنوں سرخ جھنڈیاں موت اور زندگی کے درمیان ایک واضح لکیر بنا رہی تھیں۔ ان جھنڈیوں سے پندرہ بیس قدم آگے، ہیلمٹ اور سیاہ عینک پوش امریکی گارڈز اپنی انگلیاں جدید رائفلوں کے ٹریگرز پر رکھے پتھروں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ دو تین گاڑیوں میں گرے فورس کے لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ کے اندر دو طرح کی رائے سامنے آئیں۔ جلوس کے کچھ سرکردہ افراد کا خیال تھا کہ اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھا جائے۔ کچھ لیڈر ایسے تھے جو فوری طور پر آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ یہیں پر احتجاج جاری رکھا جائے۔ مین شاہراہ اور اردگرد کی سڑکیں بلاک کر دی جائیں۔ شام تک مظاہرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ آخری فیصلے کا حق یہ لوگ مجھے دے رہے تھے اور یہی وہ گراں بوجھ تھا جس سے میں مسلسل بچنا چاہ رہا تھا۔ ابھی یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ اچانک دو افراد میرے قریب آئے۔ وہ لمبے تڑنگے تھے اور ان کے جسموں پر مقامی لباس تھا۔ بہت سے رضاکاروں اور مظاہرین کی طرح انہوں نے بھی اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے۔ بس ان کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص کی نیلی آنکھیں دیکھ کر میں کچھ چونکا۔ اگلے ہی لمحے میرا شک درست ثابت ہو گیا۔ امریکی آفیسر پال کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ہیلو مسٹر شاہ زیب! کیسے ہو تم؟“

”او گاڈ، تم یہاں؟“ میں واقعی حیرت زدہ تھا۔

”جب دوست مصیبت میں ہوتا ہے تو دوست کو وہاں پہنچنا ہی پڑتا ہے، اور میں آ گیا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا اور مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا، پال بولا۔ ”یہ بھی ایجنسی کے آفیسر ہیں مسٹر راجر نیومن...... الاسکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ جلسے جلوسوں اور مشتعل ہجوم کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ایسی صورتِ حال کو سنبھالنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ صورتِ حال کو

سنبھالنے کے لیے نہیں آئے بلکہ ہماری مدد کرنے آئے ہیں۔"

اس دوسرے امریکی آفیسر نے بھی میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ پال کی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک نظر آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دور کھڑی ان پندرہ عدد بکتر بند گاڑیوں کی طرف دیکھا جن پر مشین گنیں نصب تھیں اور جن میں حکم کے سفاک تابعدار موجود تھے۔

پال بولا۔ "تمہاری ہمت کی داد دینا پڑتی ہے شاہ زیب! تم اس بُری حالت میں یہاں موجود ہو، مجھے لگتا ہے کہ یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔"

"بے شک۔" میں نے کہا۔ "یہ انسانی گوشت اور لوہے کا ٹکراؤ ہے۔ آئندہ چند منٹوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

پال نے مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے دونوں کندھے تھام کر عجیب لہجے میں بولا۔ "آئندہ چند منٹوں میں کچھ نہیں ہوگا شاہ زیب! کم از کم وہ تو نہیں ہوگا جو تم سوچ رہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں پال؟"

"تمہیں دوست کہا تھا اور یہ دوستی مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی۔ تم لونگ کے تشدد کی چکی میں پستے رہے اور میں بھی آگ میں جلتا رہا۔ میں نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا...... اور آج میں تمہارے پاس موجود ہوں۔ آج جب تم ڈی پیلس کے دروازوں پر دستک دو گے تو میں تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوں گا۔"

"لیکن پال، ڈی پیلس کے دروازوں پر تو ہم تب دستک دے پائیں گے جب یہاں سے آگے بڑھ سکیں گے۔ یہ مشین گنیں ہمیں آگے بڑھنے دیں گی؟"

"ہاں یہ بڑھنے دیں گی۔" پال نے پھر عجیب لہجے میں کہا۔ "ان میں سے کوئی گن فائر نہیں کرے گی۔ سب خاموش رہیں گی۔ شاید کچھ سنگل فائر کیے جائیں۔ وہ بھی وارننگ شاٹس ہوں گے۔"

میں حیران تھا۔ میرے پاس کھڑے انیق کے چہرے پر بھی بے حد حیرت دکھائی دے رہی تھی۔ سجاول کچھ فاصلے پر تھا اس لیے اس تک ہماری آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ پہنچ بھی رہی ہوتی تو وہ انگلش نہ سمجھتا۔ جیپ میں میرے اور انیق کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ پال نے ڈرامائی لہجے میں بتایا۔ "اس وقت بکتر بند گاڑیوں پر جو پلاٹون موجود ہے وہ ان ہی دو کمپنیوں میں سے ایک ہے جو میری ٹریننگ میں رہی ہیں۔ آج جس طرح جاماجی کے لوگ تم پر جان چھڑک رہے ہیں۔ 50 بندوں کی یہ پلاٹون بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ لونگ جیسے آفیسرز کو اس بات کا پتا ہوتا تو آج یہ پلاٹون کبھی اس اہم ترین مقام پر موجود نہ ہوتی۔"

پال کی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور اس کا معنی خیز لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ پال کا ساتھی راجر بولا۔ "سامنے نظر آنے والی ایک دو بکتر بند گاڑیوں میں گرے فورس کے اہلکار بھی موجود ہیں مگر ان گاڑیوں میں بھی گن مین ہماری پلاٹون کے لوگ ہی ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے پہلے انیق اور پھر پال کی طرف دیکھا۔ پال کی آنکھوں میں جوش آمیز نمی تھی۔ اس نے آہستگی سے میرے کندھے تھامے اور بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ بہت اچھے لوگوں میں بھی کمانڈر اوان جیسے برے موجود ہوتے ہیں...... اور بروں میں بھی ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جاسکتا ہے جنہیں اچھا کہا جاسکے۔"

راجر نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے مسٹر شاہ زیب! میں بہت مختصر لفظوں میں آپ کو پوزیشن سمجھا دیتا ہوں، بلکہ میرا خیال ہے کہ آفیسر پال ہی آپ کو بتا دیتے ہیں۔"

پال نے کہا کہ یہ بات طے ہوچکی ہے کہ پندرہ گن مینوں میں سے کوئی ایک بھی فائر نہیں کھولے گا۔ تاہم پلاٹون کو اپنے حق میں ایک دو دلیلیں چاہئیں۔ ان میں اہم دلیل یہی ہوگی کہ اچانک سیکڑوں مظاہرین نے اندھا دھند چارج کیا اور بکتر بند گاڑیوں پر چڑھ دوڑے۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ میری بات تم سمجھ رہے ہو نا؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب مظاہرین چارج کریں گے تو بکتر بند گاڑیوں میں موجود گن مین ہوائی فائرنگ کریں گے اور سامنے کی طرف کچھ سنگل شاٹس بھی چلائیں گے لیکن کوئی زخمی نہیں ہوگا۔"

راجر بولا۔ "پچھلے دس سال میں میں نے RIOT کنٹرولنگ کے سلسلے میں جو تجربہ حاصل کیا ہے، اس کا نچوڑ یہی ہے کہ ہجوم کی پہلی ایک یا دو صفیں ہجوم کو لیڈ کرتی ہیں۔ یہ ہراول لوگ جو ایکشن دیتے ہیں باقی مجمع اس کو فالو کرتا ہے۔ ان ہی اگلی ایک دو صفوں میں لیڈر بھی ہوتے ہیں اور فعال ترین ورکر بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو یہاں جمع کیا جائے اور انہیں لائحہ عمل سے آگاہ کیا جائے۔"

انیق نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ انہیں اصل

صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ یعنی بتا دیا جائے کہ فائرنگ نہیں ہو گی؟"

"نہیں۔" پال نے کہا۔ "اگر یہ اطلاع ہم اس طرح عام کریں گے تو پھر یہ راز...... راز نہیں رہے گا۔ ہاں ان ہراول لوگوں کو MOTIVATE کیا جائے۔ انہیں کہا جائے کہ وہ اشارہ ملتے ہی بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹ پڑیں۔ ڈیئر شاہ زیب جب تمہاری طرف سے یہ اعلان ہو گا کہ تم اور تمہارے قریبی ساتھی سب سے آگے چلیں گے تو ان لوگوں کے حوصلے پہاڑ بن جائیں گے۔"

"لیکن مجھے قائم مقام جاسم اور نائبوں کی جماعت کو تو ہر صورت اعتماد میں لینا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ تین چار اسٹوڈنٹ لیڈر ہیں اور تنظیموں کے ہیڈ ہیں۔"

"خاص الخاص لوگوں کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر انہیں پابند کیا جائے کہ وہ رازداری برتیں گے۔" پال کورنی بولا۔

اسی دوران میں تین مزید ڈھاٹا پوش افراد بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ پال کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے بھی بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں کہ...... اچھا تم ہو وہ ایم ایم اے فائٹر جس کی "زخمی تصویر" یہاں چپے چپے پر نظر آ رہی ہے۔ ان تین امریکیوں میں سے ایک نے اپنا ڈھاٹا منہ سے ہٹایا اور پال سے بات کی۔ وہ شکل و صورت سے کوئی اسکیمو نظر آتا تھا۔ جو زبان وہ بول رہا تھا، انگلش سے کافی مختلف تھی، پال نے بھی اسی زبان میں اس شخص کے ساتھ چند فقروں کا تبادلہ کیا۔ میں پال سے اس گفتگو کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا کہ ایک شخص محافظوں کا گھیرا توڑتا ہوا مجھ تک آن پہنچا۔ آنسو گیس وغیرہ کے اثرات سے بچنے کے لیے اس نے بھی اپنا منہ سر ایک ڈھاٹا نما کپڑے میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ قریب آیا اور اس نے کپڑا ہٹایا تو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی پچاس پچپن سالہ مقامی شخص تھا جس نے کل مجھ سے کہا تھا کہ اس کا ایک معصوم پوتا جنگ کا نوالہ بن چکا ہے اور دوسرا موت کے خطرے سے دوچار ہے۔ آج یہ دکھی دادا تمتمائے چہرے اور چاک گریبان کے ساتھ اس عظیم الشان جلوس میں موجود تھا اور اپنی آنے والی نسل کے لیے ہر قربانی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ صرف میرے ہاتھ ہی چوم سکا۔ میرے حفاظتی حصار کے لوگ اسے مجھ سے کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ کے اندر قائم مقام جاسم اور اس کے نائبین نے نئی صورتِ حال کے مطابق عملی قدم اٹھا لیے۔ سرکردہ افراد کو اکٹھا کر کے ان کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا اور ان کی رائے میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ گولی نہ چلنے والے انکشاف نے ہر شخص کو ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ سرکردہ افراد نے چار پانچ سو مظاہرین کے ہراول دستے کو ایک جگہ جمع کیا اور انہیں بتایا کہ کس طرح بکتر بند گاڑیوں کی طرف سرپرائز چارج کرنا ہے۔ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ اگر دوسری طرف سے ان پر سیدھی گولی نہیں چلتی تو وہ بھی ایجنسی کے گن مینوں کو جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ انہیں یہ بتا کر ان کی مزید حوصلہ افزائی بھی کر دی گئی کہ ایجنسی کے کچھ اہم افسران مظاہرین کے ساتھ آن ملے ہیں اور یہ لوگ اگلی صف میں موجود ہوں گے۔

پلاننگ مکمل ہو چکی تو آگے بڑھنے کا وقت آ گیا۔ سینوں میں دلوں کی دھڑکن تیز تر ہو چکی تھی۔ ہزاروں لوگ ایک ایسے پُرآشوب پانی کی طرح تھے جو کسی بھی وقت کنارے توڑ کر بہہ نکلنا چاہتا تھا۔ میری نگاہ سردار سجاول پر پڑی۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو تھا۔ اسے وراثت میں فنِ حرب کی کچھ خاص صلاحیتیں ملی تھیں اور ان لمحوں میں وہ سرتاپا غیظ و غضب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے خوش اندام و بلند ہمت خورسنہ کو دیکھا۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر سجاول کی پگڑی کو ایک ڈھاٹے کی طرح اس کے چہرے اور سر پر لپیٹ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دونوں مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

☆☆☆

وہ ایک خوفناک یلغار تھی۔ سیکڑوں افراد یک بیک بکتر بند گاڑیوں کی طرف لپکے تھے۔ ان کے عقب میں ہزاروں افراد کا جلوس تھا۔ میں انیق اور سجاول ان لوگوں میں تھے جو سب سے آگے تھے۔ جاسم، عارفہ خاتون، پال کرونی، اس کے چاروں امریکی دوست بھی صفِ اول میں تھے۔ للکاروں کی گونج اور سیکڑوں پرچموں کی پھڑپھڑاہٹ میں جلوس کی اگلی صف چند سیکنڈ میں سرخ جھنڈیوں تک پہنچ گئی۔ جونہی ہم نے سرخ جھنڈیاں کراس کیں، زبردست ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی۔ پھر سیدھے فائر آنے لگے لیکن یہ فائر شاید ایک دو گاڑیوں سے ہی ہو رہے تھے۔ مظاہرین کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے کئی افراد کو زخمی ہو کر جیپ کے اردگرد گرتے دیکھا، میری جیپ کے بونٹ پر کھڑے ایک

بلوچی نوجوان کی چھاتی پر گولی لگی اور وہ پلٹ کر جیپ کے اندر آگرا۔ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ ایک اور شخص گردن میں گولی کھا کر زمین بوس ہوا۔

پال کرونی نے کہا تھا...... سیدھی گولی نہیں چلے گی، مگر وہ چل رہی تھی۔ یہ فائرنگ شدید نہیں تھی مگر ہو تو رہی تھی۔ سرخ جھنڈیوں کو کراس کرنے کے بعد پانچ چھ سیکنڈ کے اندر مظاہرین بکتر بند گاڑیوں تک پہنچ گئے۔ جن دو تین گاڑیوں سے فائر ہوئے تھے، ان میں موجود اہلکاروں کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا گیا اور بری طرح زدوکوب کیا جانے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایجنسی کے دو امریکن اہلکاروں کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ تب ایک بار پھر فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ کئی سفید فام گارڈز کو بپھرے ہوئے مظاہرین سڑک پر گھسیٹ رہے تھے۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی تھے جو لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ آناً فاناً چاروں طرف بپھرے ہوئے مظاہرین دکھائی دیے۔ بکتر بند گاڑیاں، ریت کی بوریوں کے مورچے، روڈ بلاکرز، سب کچھ مظاہرین کے غیر معمولی ازدحام میں ڈوب گیا۔ اس سے چند لمحے پہلے جاسم پکار کر لٹھ بردار محافظوں کو حکم دے چکا تھا کہ جن بکتر بند گاڑیوں سے فائرنگ نہیں ہوئی ان کے سواروں کو تحفظ دیا جائے۔ اس کی ہدایت پر خاطر خواہ عمل ہوا اور میں نے بیشتر بکتر بند گاڑیوں کے گرد محافظوں کو ہاتھوں کی زنجیر بنائے دیکھا۔ میری اور عارفہ خاتون کی جیپ کے گرد سماعت شکن نعرہ زنی ہو رہی تھی۔ لوگ آگے بڑھنے کے لیے بے تاب تھے۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ سب کچھ ہو گیا تھا جو نہایت مشکل نظر آرہا تھا۔ ڈی پیلس سے تقریباً دو کلومیٹر دور بولے جانے والے اس ہلے میں صرف چار پانچ مظاہرین کی جان جانے کی اطلاع تھی۔ مرنے والے امریکن گارڈز کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ بتائی جا رہی تھی۔ کچھ زخمی ہوئے تھے۔ دیکھا جاتا تو یہ نقصان اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا جس کا اندیشہ تھا۔ اب آخری مرحلہ باقی تھا اور یہ تھا ڈی پیلس پر چڑھائی کا۔

صفِ اول میں ہونے کی وجہ سے پال کورنی کے کندھے کے پاس زخم آیا تھا۔ گولی کندھے کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ فرسٹ ایڈ لینے کے بعد وہ میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کا وہ آفیسر دوست بھی تھا جو صورت سے اسکیمو دکھائی تھا۔ اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک گولی سیدھی اس کے سینے پر لگی ہے۔ پال کھلی چھت والی جیپ کے اندر آگیا۔ میرے اردگرد موجود نوجوان سمجھ گئے کہ میں اور پال اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جیپ سے اتر گئے۔ پال کے زخم کی حالت دریافت کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا ہے پال؟ کن لوگوں نے فائرنگ کی ہے۔ تم تو گارنٹی دے رہے تھے کہ......“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شاہ زیب! اگر اجازت ہو تو، تمہیں تھوڑا سا حیران کر سکتا ہوں؟“

”کس سلسلے میں؟“

”اسی فائرنگ کے سلسلے میں۔“ میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ میری طرف جھکا اور مدھم آواز میں بولا۔ ”شاہ زیب! بکتر بند گاڑیوں میں موجود انفنٹری کی اس پلاٹون سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا...... ویری سوری...... میں نے غلط کہا تھا کہ ان لوگوں سے ہماری ”انڈراسٹینڈنگ“ ہو چکی ہے۔“

میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ درد کی لہریں پھر ٹانگوں کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ پال نے بات جاری رکھی۔ ”میں چاہتا تھا شاہ زیب کہ لوگوں کی رائے تقسیم نہ ہو۔ اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ جب اتنا بڑا ہجوم بپھر کر ان بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹے گا تو ٹریگر دبانے والوں کی انگلیاں شل ہو جائیں گی۔ ان کی ”بے رحمی“ جواب دے جائے گی...... اور تم نے دیکھا شاہ زیب! ایسا ہی ہوا...... صرف دو تین گاڑیوں سے تھوڑی بہت گولیاں چلی ہیں......“

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر مجھے بھی اجازت ہو تو میں تمہیں تھوڑا سا حیران کروں؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

میں اس کی طرف جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ ”پال کورنی...... میرے دوست...... مجھے بھی پتا تھا کہ تمہارے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے۔“

وہ ہکا بکا میری طرف دیکھنے لگا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

فیصلہ

مہتاب خان

فیصلے زندگی کی راہ متعین کرتے ہیں... اور کبھی ان راہوں کو عبور کرنے کے لیے فیصلوں کا سہارا لینا پڑتا ہے... کچھ ایسی ہی الجھن کا شکار ہو جانے والے خاندان کا پُرملال قصہ... پوتا اغوا ہو چکا تھا... اور دادا پر دہری ذمے داری کا بوجھ آن پڑا تھا...

دیانت داری سے بارِ امانت اٹھانے والے منصف کی انصاف پسندی

عدالت کا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پریس رپورٹر، ٹی وی چینلز کے نمائندے اور فوٹوگرافرز کی بھی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ کیونکہ یہ ایک نہایت خطرناک دہشت گرد کا مقدمہ تھا اور آج اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا۔

عام افراد کو بھی اس مقدمے سے بڑی دلچسپی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص سراپا انتظار تھا۔ سب ہی یہ چاہتے تھے کہ ایسے سفاک مجرم کو قرار

واقعی سزا ملے۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا تھا کہ مجرم اپنا اثرورسوخ استعمال کر کے انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے تھے یا تو چھوٹ جاتے تھے یا ملک سے فرار ہو جاتے تھے۔ اس سے دیگر قانون شکنوں کو اور شہ ملتی تھی۔

جب سے اس دہشت گرد فرید دادا کا مقدمہ سینئر جج سیف اللہ صاحب کی انسداد دہشت گردی کی اس عدالت میں آیا تھا، لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سیف صاحب کسی دباؤ میں آئے بغیر درست فیصلہ کریں گے اور انصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔

فرید دادا کا پیدائشی نام فرید احمد تھا۔ شروع میں وہ چھوٹی موٹی وارداتیں کیا کرتا تھا پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنا گروہ بنا لیا۔ وہ دہشت گردوں کے اس گروہ کا سرغنہ تھا، جس کی پشت پناہی کئی بااثر شخصیات کر رہی تھیں۔

خصوصاً جب سے مانی ڈینجر اس کا دستِ راست بنا تھا، یہ گروہ بڑا طاقتور ہو گیا تھا۔ وہ قتل، اغوا برائے تاوان، دہشت گردی اور تخریب کاری کی سیکڑوں وارداتوں میں ملوث تھا۔

منفی سرگرمیوں سے منسلک لوگ اُن سے کام نکلوانے کے لیے اور اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے کے لیے انہیں بڑی رقمیں دیا کرتے تھے۔ پورے ملک میں فرید دادا اور مانی ڈینجر دہشت کی علامت سمجھے جانے لگے تھے۔

فرید دادا اس سے پہلے کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ ہر مرتبہ وہ بڑی چالاکی سے پولیس کو جل دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا مگر ہر ظالم ایک نہ ایک دن اپنے انجام کو ضرور پہنچتا ہے۔ فرید دادا بھی اس بار بچ نہیں سکا تھا اور پولیس کے شکنجے میں آ چکا تھا۔

جب مقدمہ اس عدالت میں پہنچا تو خفیہ طور سے اس کی رہائی کی کوششیں کی جانے لگیں۔ جب سے مقدمے کی آخری تاریخ دی گئی تھی اور فیصلہ سنائے جانے کا بتایا گیا تھا تب سے مانی ڈینجر فون کے ذریعے جج صاحب کو سمجھوتے کی پیشکش کرتا رہا۔ جب وہ انہیں خریدنے میں ناکام رہا تو دھمکیوں پر اتر آیا۔

سیف صاحب عدالت کے کمرے میں آ چکے تھے۔ فرید دادا ملزموں کے کٹہرے میں ہتھکڑیاں پہنے کھڑا تھا۔ عدالتی کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ سرکاری وکیل کہہ رہا تھا۔

''جناب یہ مقدمہ آئینے کی طرح صاف ہے اور اس آئینے میں قاتل اور دہشت گرد فرید دادا کا مکروہ اور سفاک چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔''

اس دہشت گرد کی طرف سے وکیل صفائی کے کمزور دلائل اور جھوٹے گواہ اپنا کام نہیں دکھا سکے۔

جج صاحب نے کہا۔ ''ملزم فرید دادا پر قتل، اقدامِ قتل، بھتہ خوری اور دہشت گردی کے تمام الزامات درست ثابت ہوئے ہیں۔ ملزم کے خلاف ملنے والے ٹھوس ثبوتوں اور گواہوں کے پیشِ نظر عدالت......''

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت پیش کار نے ان کے پاس آ کر انہیں ایک چٹ دی۔ انہوں نے اس پرچی کو کھول کر پڑھا۔ ان کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ چند ساعتوں کے لیے گم صم سے ہو گئے۔ عدالت میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے ایک نظر حاضرین کو دیکھا پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی مجھے یہ پرچی ملی ہے۔'' انہوں نے پرچی حاضرین کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پرچی نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ مقدمے کی تاریخ بڑھا دی جائے یا آج ہی فیصلہ سنا دیا جائے۔ میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے عدالتی کارروائی عارضی طور پر ملتوی کر رہا ہوں۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔

''مقدمے کی حساس نوعیت کے پیشِ نظر نماز کے وقفے کے بعد ٹھیک تین بجے دوبارہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہو گا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حاضرینِ عدالت بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حاضرین میں شامل دہشت گرد کے ساتھیوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ اس شہر کا ایک بڑا اور مشہور اسکول تھا۔ یہاں اکثریت ان طالب علموں کی تھی جو دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسکول شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں واقع تھا۔ یہاں سیکیورٹی کے لیے گارڈ موجود تھے اور گیٹ پر کیمرے بھی نصب تھے۔

اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی، بچے اور ٹیچرز جا چکے تھے۔ اسی لیے اسکول کے اندر اور احاطے میں خاموشی تھی۔

میڈم اپنے دفتر میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھی تھیں اور ایک رجسٹر پر جھکی کچھ حساب کتاب میں مصروف تھیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ چھٹی کے بعد بھی وہ ایک گھنٹے مختلف کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ اسی وقت پیون اندر آیا۔

''میڈم سب بچے جا چکے ہیں بس ایک بچہ نیو ایڈمیشن

نرسری کلاس کا ابھی تک بیٹھا ہے۔ اسے لینے کوئی نہیں آیا۔“
”بچے کو یہاں لے آؤ۔“ میڈم نے کہا۔ پیون چلا گیا۔
کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔
”ہیلو۔“ میڈم نے کہا۔
”ہیلو میڈم! میں بیگم سیف اللہ بات کر رہی ہوں۔ ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ ہم دوسری گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں کچھ دیر ہو جائے گی۔ پلیز آپ ہمارے بچے کا خیال رکھیے گا۔ وہ نرسری کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے۔ آج اس کا اسکول میں پہلا دن ہے۔“
”اچھا وہ آپ کا بچہ ہے۔ فکر نہ کریں۔ اسے میں نے آفس میں بلوا لیا ہے۔“ میڈم نے ریسیور رکھ دیا۔
اسی وقت اچانک انہیں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی آہنی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میڈم نے کرسی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔
ایک سفید کار آہنی گیٹ سے گزرتی احاطے میں آرکی۔ اپنے چہروں پر نقاب چڑھائے کچھ افراد کلاشنکوفیں لیے دوڑتے ہوئے ان کے آفس اور کلاس رومز کی طرف آرہے تھے۔ دور گیٹ کے پاس سیکیورٹی گارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔
میڈم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ وہ تیزی سے میز کے پاس آئیں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ وہ پولیس کا نمبر ڈائل کرنا چاہتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ نمبر ڈائل کرتیں، دو مسلح افراد ان کے دفتر کا دروازہ لات مار کر کھولتے ہوئے اندر گھس آئے۔ میڈم نے حلق کے بل چیخنا چاہا مگر آواز نہیں نکل سکی۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ریسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
ایک نے آتے ہی ٹیلی فون کو اٹھا کر پٹخ دیا اور دوسرے نے میڈم کو گن پوائنٹ پر رکھ کر پوچھا۔
”جج سیف اللہ کا پوتا کہاں ہے؟“
وہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولیں۔ ”کون جج؟“
”بڑھیا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔ جج کی گاڑی ہم خراب کر چکے ہیں۔ بچہ اسکول میں ہی ہے ہمیں پتا ہے۔“
”میں یہاں آفس میں ہوں، مجھے باہر کی کوئی خبر نہیں ہے۔ تمام بچے جا چکے ہیں۔“
اسی وقت پیون بچے کا ہاتھ تھامے میڈم کے دفتر میں

اس گانے کے بعد ہم لڑ مریں گے

داخل ہوا۔ میڈم نے اشارے سے اسے باہر جانے کا کہا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک کی نظر بچے پر پڑی تو وہ شکرے کی طرح پیون کی طرف لپکا اور بچے کو جھپٹ کر قابو کر لیا۔
”چلو بچہ مل گیا۔ ہمیں واردات کے لیے صرف پانچ منٹ دیے گئے ہیں۔“ مسلح نوجوان بولا۔
دوسرے نے بچے کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔ بچہ رونے اور مچلنے لگا۔ میڈم دوڑتی ہوئی اس کا راستہ روکنے کے لیے سامنے آگئیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولیں۔
”اس معصوم کو چھوڑ دو۔ اس سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“
اس نے میڈم کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئیں۔ وہ دونوں بچے کو اٹھا کر باہر نکل گئے۔
باقی دو مسلح افراد جو مختلف کلاسوں میں بچے کو تلاش کر رہے تھے ان سے آملے۔ وہ سب دوڑتے ہوئے جا کر کار میں سوار ہوگئے۔
میڈم نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہ بچے کو لے کر کار میں بیٹھ گئے تھے پھر وہ کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔
یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ حواس کھو بیٹھیں۔
”میرا فون کہاں ہے؟“ کچھ دیر بعد جب ان کے حواس ٹھکانے آئے تو وہ میز پر پڑے اپنے فون کی طرف لپکیں۔
”پولیس اور بچے کے والدین کو اطلاع دینی ہے او گاڈ میں کیا کروں؟“

میڈم نے تیزی سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور انہیں اسکول میں ہونے والی اس واردات کے بارے میں بتانے لگیں۔ دوسری طرف سے کہا گیا کہ وہ ابھی آرہے ہیں پھر میڈم نے جج صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جارہی تھی کچھ ہی دیر میں بیگم سیف اللہ کی آواز آئی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو میں......'' بیگم سیف اللہ نے اُن کی بات کاٹی۔

''سوری میڈم آپ کو زحمت ہوئی۔ گاڑی آگئی ہے۔ ہم کچھ ہی دیر میں اسکول پہنچ جائیں گے۔ میں معذرت خواہ ہوں......''

''پلیز آپ پہلے میری بات سنیں۔ آپ کے پوتے کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ ہوش میں تو ہیں؟ وہ آپ کے اسکول کے اندر آپ کی نگرانی میں تھا پھر اسے کون لے جاسکتا ہے؟ آپ کہہ دیں کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں؟''

''نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں...... مجھے سخت افسوس ہے۔ وہ چار نقاب پوش تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ ہمارے سیکیورٹی گارڈ کو قتل کر کے اسکول میں گھس آئے تھے۔ اسلحے کے سامنے کون انہیں روک سکتا تھا۔''

''نہیں...... میرے پوتے کو کوئی اغوا نہیں کرسکتا۔ کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا......'' وہ ہذیانی کیفیت میں بولے جارہی تھیں۔

''میں نے پولیس اسٹیشن فون کردیا ہے پولیس آنے ہی والی ہے۔'' میڈم نے کہا۔

بیگم سیف اللہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں پھر انہوں نے فون بند کردیا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ بیگم سیف نے فون اٹھایا۔

''ہیلو۔''

''میں بیگم سیف اللہ سے بات کرسکتا ہوں؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی میں بول رہی ہوں۔''

''آپ کا پوتا ہمارے قبضے میں ہے۔ اس سے پہلے ہم متعدد بار سیف اللہ صاحب کو سمجھا چکے تھے کہ لوگوں کو دوست بنائیں دشمن نہ بنائیں مگر وہ نہیں مانے۔'' انتہائی ترش لہجے میں ان سے کہا گیا۔

''لیکن اس میں میرے پوتے کا کیا قصور ہے؟'' بیگم سیف کی آنکھوں میں یکدم آنسوؤں کا ریلا آگیا۔

''کان کھول کر میری بات سنیں اور اپنے شوہر کو بھی سمجھا دیں کیونکہ کچھ باتیں بیویاں اپنے شوہر کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا سکتی ہیں۔ اگر آج انہوں نے ہمارے ساتھی کو موت کی سزا سنائی تو آپ کے گھر سے بھی جنازہ اٹھے گا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ یہ سفاک جملہ ان کی روح فنا کرگیا تھا۔

''یہ دھمکی تم کسے دے رہے ہو؟ کیا تمہاری شامت آئی ہے؟'' بیگم سیف نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ہمت سے کام لیا۔

''ہم خوش رہیں گے تو آپ کے گھر میں بھی خوشیاں رہیں گی ورنہ قیامت آجائے گی قیامت...... اگر آپ انہیں قائل نہ کرسکیں تو آپ کا پوتا تو جان سے جائے گا ہی آپ کے گھر کو بھی میں جہنم بنادوں گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کردیا۔ بیگم سیف اللہ کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔

اب سے پہلے بھی سیف صاحب نے قتل اور دہشت گردی کے کئی مقدمات کے فیصلے سنائے تھے مگر ان کے گھر والوں کو کبھی اس صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ البتہ جج صاحب کی زندگی کو خطرات لاحق رہتے تھے اور ان کی سیکیورٹی کے لیے بہت سے انتظامات کیے جاتے تھے۔ وہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بڑی پُرخطر زندگی گزار رہے تھے۔

☆☆☆

جج صاحب کمرائے عدالت سے ملحقہ چیمبر میں آگئے تھے جہاں پولیس کے ایک اعلیٰ افسر جو اُن کے دیرینہ دوست بھی تھے موجود تھے۔

انہوں نے جج صاحب کو سلام کیا پھر کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے عدالتی کارروائی میں مداخلت کی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ آپ فیصلہ سنائیں، آپ کو آپ کے پوتے کے اغوا سے آگاہ کردیا جائے۔''

''آپ نے اچھا کیا۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولے ''آپ لوگ تشریف رکھیں۔'' وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔

سیف صاحب کے حواس پر ان کا معصوم پوتا چھایا ہوا تھا۔ وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بظاہر وہ چپ تھے مگر اندر ہی اندر وہ رو رہے تھے۔

''ہم جلد ہی مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔'' پھر کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولے۔ ''آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''فرمائیے۔''

''آج عدالتی کارروائی ملتوی کر دیں۔ فیصلے کی تاریخ بڑھا دیں۔ میں نے وہ پرچی اسی لیے آپ کو بھیجی تھی۔ آج فیصلہ نہ سنائیں۔ جب تک آپ فیصلہ نہیں سنائیں گے۔ آپ کا پوتا سلامت رہے گا۔ بس ہمیں آج کی مہلت چاہیے۔ آپ کا پوتا مل جائے گا تو پھر آپ پر کوئی دباؤ نہیں رہے گا۔''

''اور وہ نہ ملا تو...... اس کی بازیابی میں تاخیر ہوئی تو...... اُسے ملنے میں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے اور ایک مہینا بھی یا شاید اس سے زیادہ۔ مجرم تو مہلت ہی چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کر سکیں۔ کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟'' جج صاحب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہمیں بس تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔''

''آج تک یہی تو ہوتا آیا ہے۔ مہلت ہی تو دی جاتی رہی ہے جس کا فائدہ اٹھا کر مجرموں نے قانون اور انصاف کو مذاق بنا دیا ہے۔''

سیف صاحب نے گھڑی دیکھی۔ ''ڈیڑھ بجا ہے آپ کے پاس تین بجے تک کا وقت ہے۔ آپ میرے پوتے کو بازیاب کروالائیں۔ اگر نہ بھی کر سکے تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''مجھے اجازت دیں۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

اسی وقت اُن کے موبائل پر بیل ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے بیگم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''سیف ہمارا پوتا......''

''ہاں مجھے پتا چلا ہے......''

''کون لوگ ہیں یہ جنہوں نے اسے اغوا کیا ہے اور آپ اس کی بازیابی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟''

''ہم سب اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں پوچھتی ہوں آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''پولیس اور انتظامیہ پر بھروسا کرو۔''

''پولیس کچھ نہیں کرے گی صرف آپ اُسے زندہ سلامت لا سکتے ہیں۔ ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر لیں تو ہمارا پوتا خیریت سے گھر پہنچ جائے گا۔''

''بیگم میرے فرائض کی راہ میں دخل اندازی نہ کرو۔'' انہوں نے سختی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ آفس میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اے ایس پی نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔''

''سر کال ٹریس ہو گئی ہے۔ فون موبائل مارکیٹ کی ایک دکان سے کیا گیا تھا۔''

''گڈ...... پولیس پارٹی کو روانہ کرو۔ چھاپے کے

دوران میں خیال رہے کہ کوئی مجرم بھاگنے نہ پائے۔ معاملہ جج صاحب کے پوتے کا ہے اور انہیں زندہ گرفتار کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"اس سفید کار کی کوئی اطلاع؟"

"نہیں سر ابھی تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی گئی ہے۔ پچھلے دو گھنٹوں سے ان راستوں سے یہ کار نہیں گزری اور شہر کے اندر بھی چیکنگ شروع کردی گئی ہے۔"

"جیسے ہی اس کی کوئی اطلاع ملے، مجھے فوراً خبر دینا۔"

"بہتر سر۔" اے ایس پی نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

ہاکس بے کی ہٹ نمبر 171 دوسری ہٹوں سے ذرا فاصلے پر بنی ہوئی ویرانی کا منظر پیش کررہی تھی۔ اس کے گیراج میں وہ سفید کار کھڑی تھی جو بچے کو اغوا کرکے لائی تھی۔

ہٹ کے ایک کمرے میں مکروہ اور سفاک چہروں والے چار تنگڑے نوجوان ایک میز کے اطراف میں بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ ہٹ کا بوڑھا ملازم ان کے پاس کھڑا تھا اور میز پر پانی رکھ رہا تھا۔

"جج پر اثر ہوتو بات ہے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"اثر کیسے نہیں ہوگا۔ ہمیں تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا کہ جج نے کیا فیصلہ کیا۔"

بلو سانڈ نامی شخص نے بوڑھے ملازم کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ "نذیر بابا اس چھوکرے کو روٹی کھلا دی؟"

"ہاں کھا رہا ہے۔ بہت مشکل سے چپ ہوا ہے۔ ماں کے پاس جانے کے لیے رو رہا تھا۔ میں اسے پانی دینے جارہا ہوں۔" نذیر ایک گلاس میں پانی لے کر وہاں سے چلا گیا۔

باہر ہال کے کونے میں بنے ایک کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا جسے کھول کر وہ اندر چلا گیا۔ وہ بچہ فرش پر بیٹھا کھانا کھارہا تھا۔ نذیر نے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا پیٹ بھر کے کھانا کھالو۔" پھر سوچا شاید یہ تمہاری زندگی کا آخری کھانا ہو۔ باہر ساحل پر سمندر کی لہریں سر پٹخ رہی تھیں۔

بوڑھے نذیر نے اپنی زندگی میں یہاں کئی بار غیرانسانی اور روح تڑپا دینے والے تماشے دیکھے تھے۔ یہ دہشت گرد کئی بار لوگوں کو اغوا کرکے یہاں لاچکے تھے اور متعدد بار نوجوان لڑکیوں کو بھی اٹھالاتے تھے پھر داد عیش دے کر انہیں مار ڈالتے تھے اور سمندر میں بہادیتے تھے۔

نذیر کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یہاں اسے تین وقت کی روٹی، سر چھپانے کا ٹھکانا اور خرچ کے لیے مناسب رقم مل جاتی تھی۔ اس کے عوض وہ یہاں ان کی خدمت کیا کرتا تھا۔

بچے نے کھانا کھالیا تھا۔ نذیر خالی پلیٹ اور گلاس لے کر جانے لگا تو بچے نے اس کا دامن پکڑلیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔

"امی کے پاس جانا ہے۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے نذیر کا دل پسیجا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا دامن چھڑا لیا اور اسے خود سے جدا کرتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں بیٹھو ابھی تمہیں امی کے پاس لے جائیں گے۔" وہ تیزی سے کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ بند کردیا۔

☆☆☆

شہر کی اس مشہور موبائل مارکیٹ میں سب سے بڑی اور خوب چلتی ہوئی دکان مانی الیکٹرانکس تھی۔ دکان پر اس وقت بھی بڑا رش تھا۔ اسی دکان کے بارے میں پولیس کو اطلاع ملی تھی۔

پولیس کے ان اعلیٰ افسر کے حکم کے مطابق دکان کا محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ پوری مارکیٹ میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔

پولیس کی بھاری نفری کو دکان میں اور آس پاس دیکھ کر لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور دکان میں موجود لوگ تیزی سے باہر جانے لگے تھے۔

مانی نے جیسے ہی پولیس کو دیکھا، پھرتی سے کاؤنٹر سے باہر آکر لوگوں میں گھل مل گیا اور دکان سے باہر جانے والے ریلے میں شامل ہوگیا۔ دکان کی تلاشی لی جارہی تھی اور تمام سیلز مینوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔

انسپکٹر نے ایک سیلز مین کی گردن دبوچی ہوئی تھی۔

"مانی ڈینجر کہاں ہے؟"

"میں کسی مانی ڈینجر کو نہیں جانتا۔"

"سیدھی طرح بتاورنہ ہمیں اگلوانا آتا ہے۔" انسپکٹر نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

''بول اس دکان کا مالک کہاں ہے؟''
''وہ ابھی آپ کے سامنے ہی لوگوں کی بھیڑ میں باہر گئے ہیں۔''
پولیس کا ایک افسر یہ سنتے ہی تیزی سے باہر لپکا لیکن وہ باہر کہیں نہیں تھا۔
مانی ڈینجر پولیس کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سنہری فریم کا چشمہ لگائے گرے کلر کی پینٹ پر وائٹ اور گرے چیک کی شرٹ پہنے وہ اسمارٹ سا نوجوان کہیں سے خطرناک دہشت گرد مانی ڈینجر نہیں لگ رہا تھا۔
وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا پچھلی گلی میں پارک کی ہوئی اپنی کار میں آبیٹھا۔ ''آج تو بال بال بچ گئے۔ حیرت ہے پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی؟'' کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

☆☆☆

سیف اللہ صاحب کے گھر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ رشتے دار خواتین بھی آگئی تھیں۔ بیگم سیف اور بہو کا رو رو کر برا حال تھا۔ بیٹا خرم انہیں تسلیاں دے رہا تھا مگر اندر سے وہ بھی بہت پریشان اور دکھی تھا۔
''مجھے تسلیاں نہ دو اپنے ڈیڈی کو سمجھاؤ وہ اصولوں اور انصاف کے تقاضوں کو بھول جائیں اور ان کی بات مان لیں مگر میں انہیں جانتی ہوں وہ نہیں مانیں گے۔''
عدیلہ تیزی سے اپنے شوہر کے پاس آکر بولی۔ ''پتا نہیں وہ ظالم میرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ آپ ڈیڈی کے پاس جائیں اور انہیں سمجھائیں۔''
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خود کو سنبھالے یا انہیں دلاسا دے۔ ''رونے اور فریاد کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔'' وہ بولا۔
بیگم سیف نے کہا۔ ''بیٹے وہ دہشت گرد مجھے دو بار فون کر چکا ہے کہ تمہارے ڈیڈی اپنے فیصلے میں لچک پیدا کریں۔ وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ تم ہی انہیں سمجھا سکتے ہو۔''
''آپ فکر نہ کریں خود کو سنبھالیں۔ میں ڈیڈی کے پاس جا رہا ہوں۔'' وہ ماں کو تسلی دے کر باہر آگیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ کورٹ کی طرف تھا۔
وہ اپنے والد کی اصول پسندی کو بخوبی سمجھتا تھا اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ آج بھی ڈیڈی اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہے تو اس کے بیٹے کا کیا بنے گا؟

وہ کورٹ میں آیا تو پتا چلا کہ سیف صاحب مسجد میں ہیں۔ وہ مسجد میں چلا آیا اور اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈیڈی اسے ایک صف کے آخر میں بیٹھے نظر آئے۔ خرم ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
''گھر میں سب نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔'' خرم نے کہا۔
''ہوں۔''
''ڈیڈی ہم مسجد میں بیٹھے ہیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میرے بیٹے کو بچا لیں۔''
''تم اللہ کے گھر میں بیٹھ کر یہ کہہ رہے ہو۔ کیا نہیں جانتے کہ مارنے اور بچانے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔''
''لیکن بندہ بھی تو کوشش کرتا ہے۔ میں آپ کے فرائض کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آج فیصلہ نہ سنائیں۔''
''قاتل بھی یہی چاہتا ہے۔ مجرم کی عمر جتنی لمبی ہوگی اتنا ہی لوگوں پر عذاب بڑھے گا۔ ایمان سے کہو کیا میں اسے رِہا کر دوں؟''
وہ خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

وین ڈرائیور رفیق کا یہ دن بڑا عجیب گزر رہا تھا۔ ویسے تو وہ بڑا ذمے دار شخص تھا اور بروقت اسکول کے بچوں کو لاتا لے جاتا تھا مگر اس دن نہ جانے کیوں وہ دیر تک سوتا رہ گیا تھا۔ اسے اسکول کے لیے دیر ہو رہی تھی اس لیے وہ بغیر ناشتا کیے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ اسی گھبراہٹ میں اس کا چشمہ بھی گر کر ٹوٹ گیا تھا۔
وہ گاڑی اپنے جانے پہچانے راستوں پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ ونڈ اسکرین کے باہر سے کچھ اسے دھندلا نظر آرہا تھا۔ آج اسے ایک نئے بچے کو لینے گلشن اقبال بھی جانا تھا۔ نرسری کلاس کے اس بچے کی ماں نے دو دن پہلے ہی اس سے بات کی تھی۔ بہرحال بچوں کو کسی نہ کسی طرح خیریت سے اسکول پہنچا کر اس نے اپنا چشمہ بنوانے دے دیا تھا۔
چھٹی کے وقت رفیق کی وین کے سب بچے آکر وین میں بیٹھ گئے تھے۔ ابھی وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ اسے نئے بچے کا خیال آگیا، اس نے شکر ادا کیا کہ اسے بروقت وہ بچہ یاد آگیا تھا۔ وہ تیزی سے وین سے اترا اور نرسری کلاس روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر بچے کو آواز دی۔
''علی آؤ بیٹا۔'' اس نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے

کہا۔

بچہ دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ ''واہ بھئی واہ یہ بھی خوب رہی اگر میں آواز نہ دیتا تو تم وہیں بیٹھے رہتے؟'' اس نے بچے کو اگلی سیٹ پر بٹھا دیا پھر بچوں کا یہ قافلہ لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اسکول کے قریب رہنے والے بچوں کو اس نے ان کے گھروں پر چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنا چشمہ جو بنوانے کے لیے دیا تھا لینے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بہت زور پڑ رہا تھا اور سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ابھی اسے نئے بچے کو چھوڑنے گلشن بھی جانا تھا۔

چشمہ لگاتے ہی اس کی دنیا جیسے ایک دم سے روشن ہو گئی تھی۔ انہیں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ بچے کے لیے اس نے بسکٹ اور جوس لے لیا تھا جسے وہ مزے سے بیٹھا کھا رہا تھا۔ رفیق نے اس کی سمت دیکھا بڑا ہی پیارا اور معصوم سا بچہ تھا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف بچے کی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''ہیلو رفیق اتنی دیر ہو گئی، تم ابھی تک نہیں پہنچے۔''

''باجی فکر نہ کریں۔ بس آ رہا ہوں۔ ذرا چشمہ لینے رک گیا تھا۔ میں نے علی کو بسکٹ وغیرہ کھلا دیا ہے۔ ہم دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔''

ارم نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ارم کے گھر میں بڑے دن بعد خوشیاں آئی تھیں۔ پہلے وہ لیاقت آباد میں دو کمروں کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ بیٹا پیدا ہوا تو اس کے مستقبل کے حوالے سے کئی خواب ان کی آنکھوں میں جاگ اٹھے تھے۔

انہی دنوں اس کے شوہر نے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ وہ اپنا بزنس شروع کر رہا ہے جس میں سرمایہ کاری اس کا دوست کرے گا اور باقی کام وہ دیکھے گا۔ جو بھی منافع ہو گا وہ دونوں دوستوں میں برابر برابر تقسیم ہو گا۔

''یہ کیسی پارٹنر شپ ہے جو بغیر سرمایہ کاری کے منافع میں آپ کو آدھا حصہ دے گی؟''

''وہ صرف سرمایہ لگائے گا محنت ساری میری ہو گی۔ اس کام میں بہت منافع ہے۔''

''سچ ...... پھر تو ہم اپنے بیٹے کو اس شہر کے سب سے بڑے اسکول میں پڑھائیں گے۔'' وہ خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

بہرحال رفتہ رفتہ ان کے حالات بدلنے لگے اور وہ لیاقت آباد سے گلشن شفٹ ہو گئے۔ ارم کا شوہر ہفتوں، ملک سے باہر رہتا تھا۔ وہ اپنے بزنس میں بہت مصروف ہو گیا تھا۔ ان دنوں بھی وہ ملک سے باہر تھا جب اُن کے بیٹے کا ایڈمیشن شہر کے اس سب سے بڑے اسکول میں ہوا تھا جہاں صرف دولت مند افراد کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔

وہ بے حد خوش تھی، اس دن اس کا بیٹا پہلے دن اسکول گیا تھا۔ اس کا شوہر واپس آ تو گیا تھا مگر اپنے کاموں میں بے حد مصروف تھا۔

☆☆☆

سیف صاحب نماز ادا کر کے چیمبر میں آ گئے تھے۔ وہاں پولیس کے ان اعلیٰ افسر کے ساتھ ڈپٹی کمشنر بھی بیٹھے تھے۔ خرم ان کے ساتھ تھا۔ سیف صاحب سر جھکائے سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

پولیس افسر نے کہا۔ ''سیف صاحب ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کار ہاکس بے کی سمت جاتی دیکھی گئی ہے۔ لگتا ہے اسے کسی ہٹ میں چھپایا گیا ہے۔ سرچ آپریشن جاری ہے۔ وہ کافی بڑا ایریا ہے۔ بہرحال ہمیں یقین ہے، ہم جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

کمشنر نے کہا۔ ''آپ ہم سے تعاون کریں آج فیصلہ نہ سنائیں۔''

سیف صاحب نے کہا۔ ''میری عدالت میں یہ مقدمہ گزشتہ چھ ماہ سے چل رہا ہے۔ اس عرصے میں ملزم کے ساتھی مقدمے کو پیچیدہ بناتے رہے اور تاریخ بڑھاتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھی فون پر دھمکیاں دیتے رہے اور پولیس انہیں تلاش کرتی رہی ہے اور آج تک تلاش کر رہی ہے۔''

''لیکن سیف صاحب اب معاملہ دوسرا ہے۔ آپ کا پوتا ان کی تحویل میں ہے۔ ہمیں اسے بچانا ہے۔ اگر مہلت مل جائے تو کچھ ہو سکتا ہے۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن بہت سی توقعات کے پیشِ نظر مقدمے کو طول دینا مناسب نہیں ہے جبکہ ملزم کسی شک و شبہے کے بغیر سیکڑوں بے گناہ افراد کا قاتل اور دہشت گرد ثابت ہو چکا ہے۔ اس وقت فیصلہ ملتوی کرنا انصاف کے منافی اور قانون سے کھیلنے والی بات ہو گی اور قانون سے کھیلنا میں نے نہیں سیکھا۔''

''ڈیڈی! خدا کے لیے میرے بیٹے پر رحم کریں۔''

چھوڑو اسے......سائیکل نہ ملی تو میں ریس ہار جاؤں گا!

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو آگے کہنے سے روک دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے گئے۔

عدالتی کارروائی کا وقت ہو گیا تھا۔ عدالت کا کمرا پہلے کی طرح لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پریس کے نمائندے بھی موجود تھے اور دہشت گرد کے ساتھی بھی عام حلیے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سیف اللہ صاحب نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر حکم دیا۔ ''فرید دادا کو حاضر کیا جائے۔''

ان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور فرید دادا کو مجرموں کے کٹہرے میں پہنچا دیا گیا۔ سیف صاحب نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔

''عدالت کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''اس سے پہلے کارروائی کے دوران مجھے ایک پرچی موصول ہوئی تھی جس میں مجھے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ میرے پوتے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

کمرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں، لوگ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ پریس رپورٹرز چوکنّے ہو گئے۔ سیف صاحب پھر بولے۔

''میں اس سے پہلے یہ بات منظرِ عام پر نہیں لایا تھا کہ پچھلے چھ ماہ سے میری جان و مال کو ایذا پہنچانے کی دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں اور آج ان دھمکیوں پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ وہ میرے معصوم پوتے کو اغوا کر چکے ہیں۔ آج جو سزا میں فرید دادا کو دوں گا وہی سزا وہ میرے بے گناہ پوتے کو دیں گے۔

''مجرموں نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں فیصلہ کرنا انتہائی کٹھن ہے۔ اگر میں اپنے پوتے کی رہائی کے لیے فرید دادا کو رہا کر دوں تو پتا نہیں وہ کتنے بے گناہ انسانوں کو مزید قتل کرے گا اور کتنا شر پھیلائے گا۔ میں ایک بچے کی نہیں اپنی قوم کے ہر بچے کی خیر چاہتا ہوں۔'' وہ چند لمحے رک کر پھر بولے۔

''عدالت تمام ثبوتوں اور گواہوں کے بیانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تعزیرات پاکستان دفعہ 302 کے تحت فرید احمد عرف فرید دادا کو مجرم قرار دیتی ہے اور سزائے موت کا حکم سناتی ہے۔''

یہ ایک فیصلہ جج سیف اللہ کی عدالت میں ہوا تھا مگر اسی وقت ایک اور فیصلہ سب سے بڑے منصف کی عدالت میں بھی ہوا تھا جہاں نہ دلائل کی ضرورت ہوتی ہے نہ وکلا کی۔

☆☆☆

ان چاروں نے کھانا کھا لیا تھا۔ نذیر اُن کے سامنے سے خالی پلیٹیں اٹھانے لگا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''بابا! برتن بعد میں اٹھا لینا پہلے میرے لیے سگریٹ لے آؤ۔''

دوسرے نے کہا۔ ''تھرماس لے جاؤ، چائے بھی لے آنا۔'' وہ تھرماس لینے اور برتن رکھنے کچن میں چلا گیا۔

اسی وقت بلو ساونڈا نامی شخص کے فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف مانی ڈینجر تھا۔

''تم نے بیگم سیف اللہ کو فون کیا تھا؟''

''ہاں باس کیا تھا۔ آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔''

''وہ فون تم نے کہاں سے کیا تھا؟''

''آپ کی دکان سے کیا تھا باس۔''

''گدھے سانڈ جیسے جسم میں عقل نام کو نہیں۔ تیری اس بے وقوفی سے دکان کا فون ٹریس ہو گیا ہے۔ اب تک پولیس میرے گھر بھی پہنچ گئی ہو گی اور جلد ہی اس ہٹ تک بھی پہنچ جائے گی۔ تم سب اپنے فونز سمندر میں پھینک دو اور اس ہٹ کو بم سے اُڑا دو۔''

''کیا واقعی؟ میرا مطلب ہے وہ بچہ......'' بلو سانڈا بولا۔

''اس کے دادا نے اس کے لیے موت لکھ دی ہے۔ اس نے فرید دادا کو سزائے موت سنا دی ہے۔''

''اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔''

''ہم بھی برا کریں گے۔ بچے کو کمرے میں بند کر کے ٹائم بم لگا دو اور فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔ پولیس پہنچنے والی ہو گی اور دو دن بعد مجھے کورنگی والے اڈے پر ملنا۔''

نذیر تھرماس لے کر جا رہا تھا۔ بلو سانڈا نے فون بند کیا اور اس سے کہا۔

''چائے نہیں لاؤ بلکہ فوراً یہاں سے نکل کر کہیں روپوش ہو جاؤ۔ دو دن بعد کورنگی والے اڈے پر آ جانا۔''

پھر اس نے ساتھیوں سے کہا۔ ''ضروری سامان سمیٹ کر ٹائم بم میں دس منٹ بعد کا ٹائم سیٹ کر دو۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔''

سب ہی تیزی دکھانے لگے۔ نذیر بھی چلا گیا۔ وہ تینوں اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگے پھر وہاں سے نکلنے سے پہلے بلو سانڈا نے کمرے کا دروازہ کھول کر ایک نظر بچے کو دیکھا جو نہ جانے کب روتے روتے سو گیا تھا۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور دس منٹ کا ٹائم سیٹ کر کے ٹائم بم دروازے کے باہر رکھ دیا پھر وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ اب وہاں خاموشی تھی اور خاموشی کو توڑتی ہوئی ٹک ٹک کی آواز تھی۔ سب کچھ یکدم ہی طے پا گیا تھا۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ آفس میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اے ایس پی نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔''

''سر! ہاکس بے کی اس ہٹ کا پتا چل گیا ہے جہاں وہ سفید کار جاتی دیکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مانی ڈینجر کے مکان کا بھی پتا چل گیا ہے۔ ہم نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔''

اے ایس پی نے گھنٹی بجائی پھر ان کے پتے نوٹ کرنے لگا۔ اسی وقت ایک انسپکٹر نے آ کر اسے سیلوٹ کیا۔ اے ایس پی نے کہا۔ ''دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا پتا چل گیا ہے۔ تم مانی ڈینجر کے مکان کا محاصرہ کرو گے۔ پولیس پارٹی کو سمجھا دینا، کاؤنٹر فائرنگ کے وقت خیال رکھیں کہ بچے کو نقصان نہ پہنچے۔''

پولیس کی موبائلیں دو مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ اے ایس پی کی گاڑی اور پولیس کی بھاری نفری تین موبائلوں میں تیز رفتاری کے ساتھ ہاکس بے کی سمت جا رہی تھیں۔ اتنی ہی تیز رفتاری سے وقت گزر رہا تھا۔

دس منٹ گزرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اے ایس پی کی پولیس پارٹی ہاکس بے کی اس ہٹ کے قریب پہنچنے والی تھی کہ ٹائم بم کی سانسیں پوری ہو گئیں۔ آخری ٹک کے ساتھ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہٹ کی در و دیوار کے پرخچے اُڑ گئے۔ آس پاس واقع عمارتوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے۔ عمارتوں میں مقیم اور ساحل پر سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہوئے لوگ چلّاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ پولیس موبائلیں کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ بدحواسی میں بھاگنے والے ان ہی کی طرف آ رہے تھے۔

☆☆☆

بلو سانڈا اور اس کے ساتھی پیدل چلتے ہوئے کچھ فاصلے پر موجود چائے کے ایک چھپر ہوٹل میں آ بیٹھے تھے اور چائے اور سگریٹ سے شغل کر رہے تھے۔ وہ ٹائم بم کی کارکردگی دیکھ کر اور بچے کی ہلاکت سے مطمئن ہو کر ہی وہاں سے جانا چاہتے تھے۔

منصوبے کے مطابق ان چاروں کو اب الگ ہو جانا تھا اور دو دن بعد کورنگی میں واقع اڈے پر ملنا تھا۔ سادہ لباس میں پولیس افسر اس ہٹ کے چاروں طرف ہوٹلوں اور چائے خانوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں بھی قریبی میز پر دو پولیس افسر سادہ لباس میں بیٹھے ان مشتبہ نظر آنے والے نوجوانوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ میز سے اٹھے، پولیس افسروں نے انہیں دھر لیا۔

پٹائی کے دوران بلو سانڈا سے پولیس کو بہت اہم معلومات ملی تھیں۔ اے ایس پی کو اب ایک تکلیف دہ فرض ادا کرنا تھا۔ سیف اللہ صاحب کو یہ جانکاہ خبر سنانی تھی۔ انہوں نے فون آن کیا اور سیف صاحب کو یہ افسوس ناک اطلاع دے کر رابطہ ختم کر دیا۔

☆☆☆

جس ہٹ میں دھماکا ہوا تھا وہاں کہیں کہیں سے شعلے اور دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کا عملہ اور سائرن بجاتی ایمبولینسیں بھی پہنچ گئی تھیں۔ اے ایس پی نے اپنے ماتحت افسر سے کہا۔

''آگ بجھنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔ اس کے بعد ہماری ڈیوٹی شروع ہو گی۔ کدالیں اور بیلچے منگوا لیں سپاہی ملبا اٹھائیں گے۔ بچے کی لاش برآمد کرنا ضروری ہے۔'' ماتحت افسر حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

عدیلہ نے فلک شگاف چیخ ماری پھر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ ''ہائے میرا بچہ۔ کہیں سے بھی میرا بچہ لا کر دو۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ کہاں ہے میرا بچہ؟''

بیگم سیف اللہ کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ خرم دونوں کو سنبھال رہا تھا۔ اس کا اپنا دل رو رہا تھا۔ وہ آنسوؤں کو روک رہا تھا مگر وہ بہہ رہے تھے۔ سیف اللہ صاحب بھی ایک صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اسی وقت ان کی بیگم نے ان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

''آپ کیوں رو رہے ہیں۔ آپ کا تو کلیجا ٹھنڈا ہو گیا نا۔''

''ممی پلیز، ڈیڈی کو کچھ نہ کہیں۔''

''کیوں نہ کہوں؟ اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے انہوں نے۔ ان کے اصول جیت گئے انصاف کا بول بالا ہو گیا لیکن کس قیمت پر۔ یہ قاتل ہیں اپنے پوتے کے۔''

''ممی چپ ہو جائیں پلیز۔''

سیف صاحب نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکے۔ وہ صوفے سے اٹھے اور تیزی سے چلتے ہوئے باہر لان میں چلے گئے۔ ان کی آہیں اور سسکیاں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ انہیں کیسے بتاتے کہ وہ اندر سے کیسے ٹوٹ رہے تھے۔ خرم نے ان کے پاس آ کر کہا۔

''ڈیڈی آپ نے اچھا کیا یا برا میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ بیٹا رونے لگا۔ دونوں کی دھڑکنیں ہم آواز تھیں اور درد لازوال۔

سیف صاحب نے کہا۔ ''خرم گاڑی نکالو ہمیں اپنے پوتے کو لینے جانا ہے۔''

خرم نے گاڑی نکالی۔ سیف صاحب اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی ہاکس بے کی سمت روانہ ہو گئی۔

ایک منصف کی حیثیت سے انہوں نے کئی یادگار فیصلے کیے تھے اور ہمیشہ عدالت کے وقار کو بلند رکھا تھا۔ جب کبھی انہوں نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا تھا تو اپنے اندر نئی توانائی محسوس کی تھی مگر آج وہ مرجھا گئے تھے۔ اپنے پوتے کی موت کی خبر سننے کے بعد انہیں چپ لگ گئی تھی۔ بیگم کی نظروں میں وہ ایک قاتل تھے۔ بہو اور بیٹے کو بھی ان سے شکایت ہو گی لیکن وہ باپ کے احترام میں خاموش تھے۔ وہ اس بات کو سمجھ رہے تھے۔

وہ اس ہٹ کے سامنے پہنچ گئے جو بم دھماکے کے بعد کھنڈر بن گیا تھا۔ فائر بریگیڈ نے آگ بجھا دی تھی۔ در و دیوار کے جو حصے گر گئے تھے۔ انہیں توڑ توڑ کر ہٹایا جا رہا تھا۔ ملبا بہت زیادہ تھا اسے ہٹانے میں وقت لگنا تھا۔ سیف اللہ اور خرم صدمے سے چور اس ملبے کو تک رہے تھے جہاں سے ان کے پیارے کی لاش برآمد ہونی تھی۔

وہ دونوں باپ بیٹا انتظار کی سولی پر چڑھے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک سپاہی نے بلند آواز سے کہا۔

''مل گئی۔''

سب نے چونک کر ملبے کی طرف دیکھا۔ افسران اُدھر جانے لگے۔ خرم نے باپ کو سہارا دیا اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''حوصلہ رکھیں ڈیڈی۔''

سپاہی بیلچہ ایک طرف رکھ کر ملبا ہٹانے لگا۔ اس کے ہاتھ میں بچے کی ٹائی تھی۔ ٹائی پر اسکول کا مونوگرام تھا۔ اسے دیکھ کر سیف صاحب کے دل کو دھچکا سا لگا۔

☆☆☆

ارم گھر کے باہر دروازے پر کھڑی بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ رفیق کی ہائی روف آتے دیکھ کے وہ بے تابانہ آگے بڑھی۔ رفیق نے اس کے قریب گاڑی روکی اور بچے کو اتارتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے باجی میں آپ کے بیٹے کو وقت پر نہیں لاسکا۔''

''یہ تم کس کا بچہ اٹھا لائے ہو۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟''

رفیق نے کہا۔ ''یہ آپ کا بیٹا علی ہے۔''

''تم صبح میرے بیٹے کو لے کر گئے تھے۔ اب کوئی دوسرا بچہ مجھے لا کر دے رہے ہو۔ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔''

''باجی میں برسوں سے یہ کام کررہا ہوں کبھی غلطی نہیں ہوئی۔ آج دراصل میرا چشمہ ٹوٹ گیا تھا۔ اسی لیے شاید...... پھر آپ کے بیٹے کو آج پہلے دن اسکول لے کر گیا تھا۔ اسی لیے اس کی صورت اچھی طرح یاد نہیں رہی۔ چھٹی پر میں نے اس کا نام لے کر پکارا تو یہ دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔''

''میرا بچہ کہاں ہے؟ اس کے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''وہ اسکول میں ہوگا اور اس کے گھر والے بھی اسکول آئے ہوں گے۔ جلدی چلیں باجی۔''

وہ بچے اور رفیق کے ساتھ اسکول کی سمت روانہ ہو گئی۔ اسے رہ رہ کر بیٹے کا خیال آرہا تھا کہ وہ کس قدر پریشان ہو رہا ہوگا۔

بچہ اب رونے لگا تھا۔ رفیق اور ارم اُسے چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اسکول پہنچ گئے۔ وہاں افراتفری پھیلی ہوئی تھی...۔ لاش کو ایمبولینس میں رکھا جارہا تھا۔ احاطے میں پولیس کی موبائل کھڑی تھی۔

رفیق اور ارم بچے کو لیے تیزی سے میڈم کے دفتر میں آ گئے جہاں میڈم اور پولیس کے افسران بیٹھے تھے۔ رفیق میڈم کو تفصیل بتانے لگا کہ کیسے وہ غلطی سے اس بچے کو ارم کا بچہ سمجھ کر لے گیا تھا۔

ارم نے میڈم سے پوچھا۔ ''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

وہ گڑبڑا گئیں۔ اسی وقت پولیس افسر نے پوچھا۔

''آپ اس بچے کو پہچانتی ہیں؟''

میڈم اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر کہا۔ ''دراصل نرسری کلاس میں سب نیو ایڈمیشن ہیں اور آج ان کی پہلی کلاس تھی۔ ایک نئے بچے کی صورت پہلے ہی دن یاد نہیں رہتی۔ بیٹا! آپ کے ابو کا نام کیا ہے؟'' میڈم نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی۔'' بچہ معصومیت سے بولا۔

''ایک یہ خاتون ہیں ان کا بیٹا گم ہے اور اس کا پتا نہیں چل رہا۔ دوسرا جج صاحب کا پوتا تھا جسے دہشت گرد اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ سیف اللہ صاحب کے پوتے کو ہی لے کر گئے ہیں؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''ایک منٹ میں ریکارڈ چیک کرتی ہوں۔'' ان کے حواس ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ تیزی سے الماری سے چند فائلیں اٹھا لائیں اور ورق گردانی کرنے لگیں۔ ایک فارم پر رک کر انہوں نے بچے کو غور سے دیکھا۔

''یہ سیف اللہ صاحب کا پوتا ہے۔'' ان کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی جسے سن کر ارم کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔

''دہشت گرد سیف صاحب کے پوتے کے دھوکے میں ان خاتون کے بیٹے کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔''

ارم سکتے کے عالم میں یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس کے دماغ میں شدت سے آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنے شوہر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پولیس افسر نے سیف صاحب کے گھر کا فون ملایا۔

''سیف صاحب سے بات کرائیں۔'' دوسری طرف سے آواز آتے ہی وہ بولا۔

''وہ نہیں ہیں۔''

''بیگم صاحبہ کو فون دیں۔''

''وہ صدمے سے نڈھال ہیں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔''

''کسی طرح بھی اُن سے بات کرائیں بہت ضروری ہے۔''

تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ ''فرمایئے میں بیگم سیف اللہ بول رہی ہوں۔''

''بی بی! آپ کے لیے بہت بڑی خبر ہے آپ کا پوتا زندہ ہے۔''

''کیا؟...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ ملبے سے زندہ نکل آیا ہے؟''

''آپ کا پوتا ملبے میں نہیں تھا۔''

بیگم سیف نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''میں پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کا پوتا زندہ ہے اور اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ آپ خود اس سے بات کر لیں۔ بیٹا! اِدھر آؤ۔'' وہ قریب آیا تو اس کے کان سے ریسیور لگا کر بولا۔ ''اپنی دادی سے بات کرو۔''

بچے نے کہا۔ ''ہیلو دادی۔''

''میرے لال، میری زندگی، کہاں ہو تم؟''

''اسکول میں۔''

''بیگم صاحبہ آپ کو پوتے کی نئی زندگی مبارک ہو۔

موسلا دھار بارش کے بعد!

ہم آپ کے پوتے کو لا رہے ہیں۔ آپ یہ خوش خبری سیف اللہ صاحب کو بھی سنا دیں۔'' اس نے بچے کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔

☆☆☆

بیگم سیف نے سیف صاحب کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔''

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''خوش خبری سنیں۔ ہمارا علی زندہ ہے اور اسکول میں ہے۔ پولیس اسے لا رہی ہے۔''

''بیگم یہ تم کیسی ناممکن باتیں کر رہی ہو۔'' انہیں بیگم کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ وہ سامنے برآمد ہونے والی لاش کو دیکھ رہے تھے جو پولیس کے ایک سپاہی نے بازوؤں میں اٹھائی ہوئی تھی۔

''ڈیڈی کیا بات ہے ممی ٹھیک تو ہیں؟''

''بیٹا وہ کہہ رہی ہیں۔ علی زندہ ہے اور اسکول میں ہے۔''

''کیا؟'' خرم اور آس پاس کھڑے ہوئے پولیس افسران بھی چونک گئے۔

اسی وقت اے ایس پی کے فون پر کال آئی۔ کچھ دیر وہ دوسری طرف کی بات سنتے رہے پھر تیزی سے سیف صاحب کے پاس آئے اور کہا۔

''آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کا پوتا زندہ ہے اور پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ اسے آپ کے گھر لے کر جا رہے ہیں۔''

سیف اللہ نے خوشی سے کانپتے لہجے میں بیٹے سے کہا۔ ''ہمارا علی زندہ ہے جلدی چلو۔''

☆☆☆

مانی ڈینجر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ گھر جانا اس وقت خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پولیس یقیناً اب تک وہاں پہنچ گئی ہوگی۔ اس نے سوچا۔ وہ اِدھر اُدھر بے مقصد روڈ پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

دو برس پہلے وہ کیا تھا۔ ایک محدود تنخواہ پانے والا عام انسان جو اپنے بچے کے لیے مہنگے کھلونے نہیں خرید سکتا تھا۔ آج اس کے بیٹے کا کمرا کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ آسائش کی ہر چیز اسے میسر تھی۔ وہ اور اس کی فیملی پُرآسائش زندگی گزار رہے تھے۔ فرید دادا نے جب سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے ٹریننگ دی تھی، اس کے تو دن بدل گئے تھے۔

☆☆☆

گھبراہٹ میں ارم سے نمبر ڈائل نہیں ہو رہا تھا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر کال آئی۔ دوسری طرف اس کی پڑوسن تھی۔

''ارم! تمہارے مکان کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور مکان کا تالا توڑ کر اندر گھس گئی ہے۔ محلے والوں سے بھی انہوں نے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ یہاں کسی مانی ڈینجر کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم لوگ جلدی واپس آ جاؤ۔''

پے در پے پڑنے والی افتادوں نے اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے فون بند کر کے تیزی سے اپنے شوہر کا نمبر ڈائل کیا۔ ''سنیں ہمارے بیٹے کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔'' رابطہ ہوتے ہی وہ تیزی سے بولی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''کیا؟ کہاں ہو تم؟ کیسے اغوا کرلیا؟''

''وین ڈرائیور رفیق غلطی سے کسی اور بچے کو ہمارا بیٹا سمجھ کر لے آیا تھا، میں اسے چھوڑنے اور اپنے بیٹے کو لینے اسکول آئی تھی تو......''

''کون سے اسکول؟ کہاں ایڈمیشن کروایا تھا تم نے علی کا؟''

''براڈوے گرامر اسکول......''

مانی کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ ''کیا؟''

''نہ جانے یہ اسکول کی میڈم اور پولیس والے کیا کہہ رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مسلح افراد یہاں کسی جج کے پوتے کو اغوا کرنے آئے تھے۔ وہ غلطی سے ہمارے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ خدارا جلدی کچھ کریں۔ وہ زاروقطار رونے لگی۔

''کیا بکواس کررہی ہو؟'' وہ دہاڑتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور ابھی پڑوسن کا بھی فون آیا تھا وہ بتا رہی تھی کہ ہمارے گھر پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ وہ کسی مانی ڈینجر کو تلاش کررہے ہیں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو کوئی تمہارے پاس تو نہیں؟''

''نہیں، میں میڈم کے دفتر کے باہر ہوں۔''

''وہاں پولیس ہے۔ میرا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔ تم چپ چاپ باہر نکل آؤ۔ میں اسکول کے سامنے پارک کے گیٹ سے تمہیں پک کرلوں گا۔ جلدی آؤ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، میں پہنچنے والا ہوں۔''

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی پارک کے پاس گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد وہ آگیا وہ اس کی گاڑی میں جا بیٹھی' گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ چند ہی لمحوں میں گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔

ارم کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سلمان اسکول کے اندر کیوں نہیں آیا تھا؟ وہ پولیس کا سامنا کرنے سے کیوں ڈر رہا تھا؟ اور اس کے گھر پر پولیس کسی مانی ڈینجر کو تلاش کررہی تھی؟

وہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑے دوسرے ہاتھ سے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کررہا تھا۔ اس نے باری باری ان چاروں کے موبائل نمبر ڈائل کیے۔ سب کے موبائل خاموش تھے۔ یہ مشورہ ان چاروں کو اس نے ہی دیا تھا کہ واردات کے بعد وہ اپنے موبائل سمندر میں پھینک دیں۔ اس نے جھنجلا کر زور سے مکّا اسٹیئرنگ پر مارا۔

''ہمیں پولیس کی مدد لینی چاہیے۔ کون ظالم ہے جس نے میرے بیٹے کو اغوا کیا ہے؟'' آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''خدا کے لیے خاموش رہو۔ اللہ سے دعا کرو کہ ہمارا بیٹا محفوظ ہو۔''

اس کے متوحش چہرے کو دیکھ کر وہ اور تیزی سے رونے لگی۔ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ان کا رخ ہاکس بے کی جانب تھا۔

چند ہی منٹوں میں وہ کھنڈر بنے ہوئے ہٹ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ پولیس کی بھاری نفری ملبے کے آس پاس موجود تھی اور آنے جانے والے لوگوں کو اُدھر جانے سے روک رہی تھی۔ کار روکتے ہی وہ تیزی سے ملبے کی طرف بھاگا۔ ارم حیرانی سے اسے دیدے پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جج سیف اللہ بھی اپنی کار میں سوار ہوتے ہوتے رک کر اس نوجوان کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے جو اس سپاہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس نے بچے کی لاش کو بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا۔ ارم بھی سلمان کے قریب چلی آئی تھی۔

سپاہی کے بازوؤں میں موجود بچّے کے دو ننھے ننھے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ ماں کی آغوش میں آنے کے لیے بے قرار ہو.... سلمان نے جھپٹ کر سپاہی سے بچے کو چھینا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سلمان عرف مانی ڈینجر گود میں اپنے لختِ جگر کی لاش لیے بیٹھا تھا۔ اس کے دماغ کے اندر تڑاتڑ گولیاں برس رہی تھیں۔ بموں کے دھماکے ہورہے تھے۔ وہ اسے دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ سسک رہا تھا۔ ارم پر سکتہ طاری ہوگیا تھا پھر وہ حلق پھاڑ کر چیخی اور بچے کے ننھے بازوؤں کو چومنے لگی۔ پھر وہ چکرا کر وہیں گر گئی۔

اس نے آج تک جو کچھ بھی کیا تھا ایک فلم کی طرح اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی واردات کرتا تھا۔ خوشی سے نہال ہوجاتا تھا۔ کیونکہ ہر قتل پر اسے لاکھوں روپے ملتے تھے۔ اس وقت اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ قتل ہونے والے پر اور ان کے لواحقین پر کیا گزرتی ہوگی۔

اللہ کا انصاف ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ فوری اور شفاف جس میں ایک لمحے کی دیر نہیں ہوتی اور گناہ گار کو اتنی مہلت بھی نہیں ملتی کہ وہ توبہ کرسکے۔

واردات کرنے کے لیے بہترین منصوبہ بنیادی چیز ہوتی ہے... ہر مجرم جرم کرنے سے پہلے تمام پہلوئوں کو مدِنظر رکھتا ہے... مگر کبھی کبھی صورتِ حال وہ رخ اختیار کر لیتی ہے کہ بنا سوچے... جرم سرزد ہو جاتا ہے... ایک ایسی ہی واردات کا فسانہ جس کا پیشِ منظر ایک الگ کہانی رکھتا تھا...

ایک دوسرے سے نا آشنا قاتل و مقتول کا انوکھا ملاپ......

قاتلانہ کھیل

سلیم انور

ایڈی کبھی بھی اپنے کام پر بروقت نہیں پہنچتا تھا لیکن ایک مرتبہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس کی تباہی کا باعث بن گیا۔ تب سے وہ اپنے کام کے معاملے میں مستعد ہو گیا تھا۔

اس نے اپنا پہلا کام تیزی سے پندرہ منٹ میں مکمل کر لیا۔ اس نے گٹر لائن میں پھنسا ہوا وہ مردہ ریکون اس مقام سے لگ بھگ پانچ فٹ کے فاصلے پر تلاش کر لیا جہاں سے وہ سرنگ میں اترا تھا۔ اور یہ بات اس لحاظ

سے بھی اچھی ثابت ہوئی تھی کہ مردہ ریکون کی سڑاند سے اس کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہوگیا تھا اور گلا بھی بند ہونے لگا تھا۔ اس نے مردہ جانور کا جسم ایک موٹی سی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور رینگتا ہوا اس سرنگ سے باہر آگیا۔

مسز ہاربنائی اس کے کام سے بے حد خوش ہوئی اور اس نے ایڈی کو نقد ادائیگی کردی۔ ایڈی کو وہ کلائنٹ بہت اچھے لگتے تھے جو اسے نقد ادائیگی کرتے تھے کیونکہ یہ کمائی اسے اپنی ٹیکس ریٹرن میں ظاہر نہیں کرنی پڑتی تھی۔

اس کی دوسری جاب صرف ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ اس نے اپنی وین گورمین کے ڈرائیووے میں داخل کردی۔ اسے علم تھا کہ اس کے اپائنٹمنٹ کے مقررہ وقت میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ تیزی سے اپنا کام نمٹا دے گا تو وہ گھر پہنچ کر اطمینان کے ساتھ اپنا پسندیدہ کوکنگ شو دیکھ لے گا۔

مسز گورمین کی سیڈان ان کے ڈرائیووے میں موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر پر موجود ہے اور شاید یہ جان کر خوش ہو جائے گی کہ وہ وقت سے پہلے کام کرنے آگیا ہے۔

ایڈی پتھریلی روش پر ڈھلکی چال چلتا ہوا مکان کے ڈبل شیشے کے بنے ہوئے داخلی دروازے پر پہنچ گیا اور دو مرتبہ دستک دی۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

مسز گورمین خود کو کارلا کہلوانا پسند کرتی تھی۔ وہ شاید مکان کے عقب میں سوئمنگ پول کے کنارے گرمی کے آخری دنوں سے لطف اندوز ہو رہی ہے، ایڈی نے سوچا۔

اس نے اپنا ٹول بیگ اور سیڑھی اٹھائی اور مکان کے عقبی حصے کی جانب چل پڑا۔ مکان کے جنوبی گوشے میں شاہ بلوط کے درخت کے نیچے بنے ہوئے گٹر ہمیشہ بری طرح بند ہو جایا کرتے تھے۔ اگر وہ اپنے کام کا آغاز وہاں سے کرے گا تو لیڈی آف دی ہاؤس یقیناً خوش ہو جائے گی۔

وہ جونہی کارنر سے ہرے بھرے عقبی لان کی جانب گھوما تو اس کی نگاہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک شخص پر پڑی۔ اس کے بالوں کی رنگت سرخی مائل تھی اور وہ ایک کھڑکی کی اسکرین تھامے ہوئے تھا۔ اس سیاہ لباس والے نے دوسرے ہی لمحے اسکرین کو نیچے گرا دیا اور اس کھڑکی کے راستے ماسٹر بیڈ روم میں داخل ہوگیا۔

کیا چکر ہے، ایڈی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ایڈی نے سیڑھی نیچے رکھ دی اور دبے پاؤں کھلے آنگن کی جانب بڑھنے لگا۔ کیا وہ شخص کوئی برگلر ہے؟

ایڈی نے جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ وہ اپنا سیل فون تلاش کر رہا تھا۔ لعنت ہو، وہ بڑبڑایا۔ وہ تو اپنا سیل فون وین ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

پھر وہ تیزی سے اس چوڑی کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

کارلا خطرے میں تھی۔

ایڈی نے اپنے اوزاروں کے تھیلے کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ وہ کسی ایسی شے کی تلاش میں تھا جسے وہ بطور ہتھیار استعمال کر سکے۔ اس کی انگلیاں ایک دستے سے ٹکرائیں تو اس نے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ اس نے اس اوزار کو باہر نکال لیا اور ٹول بیگ گھاس کے فرش پر گرا دیا۔

وہ اوزار ایک کھرپی تھی۔

پھر اس دلیری کے ساتھ جس کا علم خود ایڈی کو بھی نہیں تھا، وہ کھرپی کو ہاتھ میں تھامے اسی کھڑکی سے اندر کود گیا جس سے کالے کپڑے والے کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا پیر ایک گملے سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔ اس دوران اس کا ٹخنا مڑ گیا۔ اس کے پیر میں درد کی ایک تیز لہر سی اٹھی۔ ایڈی نے اپنی چیخ روکنے کے لیے زبان دانتوں میں دبا لی۔

اس سیاہ لباس والے منحنی کارلا کو خانے دار الماری اور کنگ سائز بیڈ کے درمیان کی دیوار کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔ اس کا بڑا سا ہاتھ کارلا کے منہ کو دبائے ہوئے تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ کارلا کا سفید کاٹن کا بلاؤز نہ پھاڑ رہا تھا۔

”نہیں۔“ سیاہ لباس والے کی ہتھیلی کے دباؤ کی بنا پر کارلا کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ ابھری۔

وہ سیاہ لباس والا پیچھے ہٹا اور اس نے کارلا کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ کارلا کراہنے لگی۔

اس سیاہ لباس والے نے کارلا کے منہ پر دوبارہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے جیکٹ کی جیب میں سے جھٹکے کے ساتھ ریوالور نکال لیا۔ پھر وہ آگے کی جانب جھکا اور اس نے ریوالور کی نال کارلا کے رخسار پر گاڑ دی۔ ”خاموش رہو ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

اس دھمکی آمیز لہجے نے ایڈی کے بدن میں خوف کی ایک لہر سی دوڑا دی۔

ایڈی ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔

اسے ہتھیاروں سے نفرت تھی۔ اپنی سابقہ زندگی میں جب وہ ایک معمولی چور ہوا کرتا تھا تو ان ٹھگوں سے گریز کرتا تھا جن کے پاس ہتھیار ہوتے تھے لیکن اب اس سیاہ لباس والے کی نظروں میں آئے بغیر کھڑکی کے راستے واپس باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ یونہی ساکت کھڑا رہتا تو اس کے مارے جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ اس پر گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

تبھی اس سیاہ لباس والے نے اپنا پہلو بدلتے ہوئے پلٹنا چاہا۔ ایڈی بھی فوراً حرکت میں آگیا۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور اس سیاہ لباس پر ہلّا بول دیا جیسے کہ وہ ہائی اسکول میں سیکنڈ اسٹرنگ فٹ بال پلیئر کے طور پر کیا کرتا تھا۔ اس نے سیاہ پوش کے پہلو میں شانے پر پوری قوت سے اپنا سر ٹکرا دیا۔ یہ ضرب پڑتے ہی وہ سیاہ پوش خانے دار الماری سے ٹکراتے ہوئے نیچے فرش پر دبیز سفید قالین پر گر پڑا۔

ایڈی اسے مسلسل ضربیں لگاتا رہا۔

اس دوران کارلا اس کے عقب میں بلند آواز سے چیخے جا رہی تھی۔

ایڈی اس سیاہ پوش کے سینے پر سوار ہو گیا اور اسے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان فرش پر جکڑ لیا۔ پھر اسے کاری ضرب لگانے کے ارادے سے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔ خوف کے مارے اس شخص کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور چہرہ بگڑ گیا۔

ایڈی نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کرتے ہوئے دونوں ہاتھ میں دبی ہوئی کھرپی سے اس سیاہ پوش کے چہرے پر ایک بھرپور وار کیا۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ کھرپی کی نوک اس سیاہ لباس والے کی آنکھ میں گڑ گئی تھی۔

پھر اس شخص کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور اس کی آنکھ کے زخم سے خون بہنا شروع ہو گیا اور منہ سے عجیب قلقل کی سی آوازیں نکلنے لگیں جیسے پانی انڈیلا جا رہا ہو۔ اس سیاہ پوش کا چہرہ بھی ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔

’’نہیں۔‘‘ ایڈی کو اپنے عقب میں کارلا کی چیخ سنائی دی۔

ایڈی نے سیاہ پوش کے سینے پر سے اٹھنا چاہا۔

’’اوہ مائی گاڈ!‘‘ کارلا نے بلکتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تم نے کیا، کیا؟‘‘

’’یہ تمہیں مار ڈالتا؟‘‘ ایڈی نے جواب دیا۔

کارلا نے ایڈی کے شانوں پر گھونسے برسانا شروع کر دیے۔ وہ بدستور سسکیاں لے رہی تھی۔ ’’اوہ مائی گاڈ! یہ مر تو نہیں گیا؟‘‘

ایڈی کنفیوز ہو گیا۔ وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

کارلا نے بیڈ کے ساتھ رکھی ہوئی ایک کرسی پر سے جھپٹ کر ایک ٹی شرٹ اٹھائی اور اس سیاہ لباس والے کے پاس گھٹنوں کے بل جھک کر ٹی شرٹ کو اس کی آنکھ پر رکھتے ہوئے اس کے زخم کو دبانے لگی تاکہ خون بہنا رک جائے۔ پھر ایڈی سے بولی۔ ’’تمہیں اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔‘‘

ایڈی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ عجیب مخمصے کا شکار تھا۔ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے کارلا کی طرف دیکھا۔

کارلا اس کی سوالیہ نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ’’یہ میرا محبوب ہے، ایڈیٹ۔‘‘

تب ایڈی کی نگاہ پہلی بار کارلا کے پھٹے ہوئے بلاؤز پر پڑی۔ اس نے بلاؤز کے ساتھ جو اسکرٹ پہنا ہوا تھا وہ نہایت باریک کپڑے کا بنا ہوا تھا جس سے اس کا بدن صاف جھلک رہا تھا۔

’’اوہ سویٹ جیسس!‘‘ ایڈی بڑبڑایا۔ اس کا ذہن ابھی بھی الجھن میں مبتلا تھا اور اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ ’’اس نے اپنے ریوالور کی نال تمہارے چہرے پر گاڑی ہوئی تھی۔‘‘ اس نے کارلا سے کہا۔

’’یہ ہمارے اس کھیل کا حصہ تھا۔‘‘ کارلا نے بتایا۔ ’’مجھے ہتھیار اچھے لگتے ہیں۔‘‘ کارلا کی آنکھوں کے اطراف کا میک اپ بگڑ چکا تھا لیکن اب اس نے اپنی آواز پر قابو پا لیا تھا۔ ’’اب باتیں کرنا بند کرو اور اس کو تمہاری وین تک پہنچانے میں میری مدد کرو۔ اسے ایمرجنسی روم میں لے جانے کی ضرورت ہے۔‘‘

ایڈی کو خدشہ تھا کہ اس شخص کو اسپتال تک پہنچتے پہنچتے موت نہ آ جائے۔ ’’ایمبولینس طلب کر لو۔‘‘ ایڈی نے اس کھڑکی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا جس کے راستے سیاہ لباس والے کے پیچھے اندر آیا تھا۔ ’’آئی ایم سوری، میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔‘‘ اس نے کارلا کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرا دیا۔

یہ سنتے ہی کارلا کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ ’’میں نائن ون ون یا پولیس کو فون نہیں کر سکتی۔ اگر میرے شوہر کو پتا چل گیا کہ میں اس کے ساتھ بے

وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔ تمہیں لازمی میری مدد کرنی ہوگی۔'' کارلا نے اس شخص کے زخم پر اپنا دباؤ برقرار رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایڈی سے مدد کی التجا بھی کر رہی تھی۔

ایڈی تذبذب میں پڑ گیا۔

''میں تمہیں معاوضہ دوں گی۔'' کارلا نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''بس اِسے اسپتال پہنچا دو۔''

ایڈی دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ کارلا کے خیال کے مطابق اس اعانت کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جو وہ طلب کر رہی ہے۔ پانچ سو ڈالر؟ ایک ہزار ڈالر؟

ایڈی کو احساس تھا کہ اس کی جگہ اگر کوئی اس سے مختلف قسم کی زندگی گزارنے والا کوئی اور شخص ہوتا تو کارلا کی التجاؤں اور رشوت کی پیشکش کے باوجود وہ سیدھا پولیس کو فون کر دیتا۔ لیکن ایڈی نے بچپن ہی سے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ تمام پہلوؤں کا بہ خوبی جائزہ لینے کے بعد وہی قدم اٹھایا جائے جو اپنے فائدے کے لیے ہو۔

''مجھے ایک ہزار ڈالر چاہئیں، نقد۔'' ایڈی نے کہا۔

کارلا تذبذب میں پڑ گئی۔ ''میں اتنی رقم ادا نہیں کر سکتی۔''

ایڈی نے اسے تیز نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم راہ نکال لوگی۔''

پھر ایڈی نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس بڑے ڈھیلے سے آدمی کو یہاں سے اپنی وین تک کس طرح لے جائے گا۔

''تمہارے پاس میڈیکل ٹیپ ہے؟ یا کوئی ایسی چیز جس سے اس ٹی شرٹ کو زخم پر رکھ کر باندھا جا سکے؟ تم یہ تو نہیں چاہو گی کہ تمہارے سفید قالین پر ہر طرف خون پھیل جائے؟'' ایڈی نے پوچھا۔

کارلا تیز تیز چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایڈی نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس شخص کی پتلون کی پچھلی جیب میں ڈالا اور آسانی کے ساتھ اس کا بٹوا نکال لیا۔ بٹوے میں نوٹوں کی ایک چھوٹی سی گڈی موجود تھی۔ اس نے تمام نوٹ نکال کر اپنی جینز میں ٹھونس لیے۔ پھر اس شخص کے شناختی کارڈ پر نگاہ ڈالے بغیر اس کا بٹوا واپس اس کی پتلون کی جیب میں واپس رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص کی شناخت کا نہ جاننا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔

پھر اس کی نگاہ اس شخص کے ریوالور پر پڑی جو فرش پر گرا ہوا تھا۔ ایڈی کے منہ سے بے ساختہ مغلظات اُبل پڑیں۔ وہ اس ریوالور کا کیا کرے؟ کارلا یہ نہیں چاہے گی کہ یہ ریوالور اس کے گھر میں پڑا رہ جائے۔ اور ایڈی بھی اسے اپنی تحویل میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے ایک طویل عرصے تک پاس رکھنے کے بعد فروخت کر دے۔

اس ریوالور کو دیکھ کر ایڈی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس نے احتیاط کے ساتھ ریوالور کے دستے کو اپنی گرفت میں لیا اور ریوالور اٹھا کر دوبارہ اس زخمی شخص کے جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ ریوالور اسی شخص کا تھا، اس لیے اس کی موجودگی کی وضاحت بھی اسے خود ہی کرنا ہوگی۔

ایڈی اب اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ اس شخص کو گھسیٹتے ہوئے اتنی دور وین تک لے جا سکتا ہے؟ اسے توقع نہیں تھی کہ دبلی پتلی بگڑی ہوئی کارلا اس معاملے میں اس کے لیے زیادہ مددگار ثابت ہو سکے گی۔

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آگ بجھانے والوں کی طرح اس شخص کو کاندھے پر اٹھا کر وین تک لے جائے گا۔

اتنے میں کارلا دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جسے اس نے پھاڑ دیا اور ایڈی کو ایک چوڑی لاسٹک بینڈیج تھما دی جو عام طور پر لوگ اپنے گھٹنوں پر لپیٹتے ہیں۔ پھر جونہی کارلا نے اس شخص کے سر پر وہ بینڈیج لپیٹنا شروع کی تو اس شخص کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔

اس شخص کی کراہ سنتے ہی ایڈی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے آج تک کبھی کسی کو قتل نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لینا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہی اسے بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

''اسے گیراج کے راستے باہر لے جاؤ۔'' کارلا نے ہدایات دیں۔ ''میں نہیں چاہتی کہ میرے پڑوسی یہ سب کچھ دیکھیں۔''

''تو پھر جا کر میرے لیے گیراج کا گیٹ کھول دو اور میری وین کا پچھلا دروازہ بھی۔'' ایڈی نے غرانے کے انداز میں کہا۔ اسے کارلا پر غصہ آ گیا تھا۔ ایک تو وہ اس کی مدد کر رہا تھا اور وہ اس پر حکم چلا رہی تھی۔ کارلا کو اس کے ساتھ شائستگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

اس کے باوجود بھی کارلا کا پلان قابلِ فہم تھا۔ اگر وہ اس شخص کو اٹھا کر گیراج کے راستے سیدھا اپنی وین تک جاتا

یوم آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لیے اگست 2017ء کا جشن آزادی نمبر
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں...... قسط وار ناول کی صورت
سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا دلنشیں اختتام
سیما رضا ردا اپنے منی ناول...... ہم کو عبث بدنام کیا...... کو ایک دلکش انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے
14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانہ اختر، دردانہ نوشین خان،
منشا محسن علی اور نرمین سرھیو کی خصوصی تحریریں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روح پرور مضامین
نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب...... فکاہیہ کالم کی صورت
وہ آئے بزم میں......
نزہت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب
کی پُر لطف باتیں
اس کے علاوہ
طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، غزالہ عزیز، ہاجرہ ریحان،
افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں
دیارِ غیر میں بسنے والے اپنا یومِ آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شائستہ زریں کے خصوصی سروے میں......
اس کے ساتھ ساتھ مسحور کن شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابلِ غور تراشے اور دلچسپ و پُراثر مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

ہے تو ایسا ممکن نہیں کہ کوئی اسے اس شخص کو کاندھے پر اٹھائے دیکھ پائے گا۔ کارلا کا مکان سڑک سے ایک سیدھی ستواں بلندی پر تھا اور گھنی جھاڑیوں نے اس کے مکان کو ان کے پڑوسیوں سے الگ تھلگ رکھا ہوا تھا۔

ایڈی نے اس زخمی شخص کو اپنے کاندھے پر اٹھایا اور کارلا کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہال سے گزر کر بڑے سے کچن کے راستے تین کار والے گیراج میں پہنچ گیا۔ گیراج کا درمیانی اوورہیڈ دروازہ اٹھا ہوا تھا۔ اُدھر کارلا ڈرائیووے میں اس کی وین کا عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اسے کامیابی نہیں ہورہی تھی۔

''ہینڈل کو گھماؤ۔'' ایڈی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کی کوشش تھی کہ آواز بلند نہ ہونے پائے۔

اس شخص کا وزن ایڈی کی کمر کے نچلے حصے میں بری طرح تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔ یہ تکلیف اسے آرمی میں اپنے آخری سال کے دوران شروع ہوئی تھی اور پھر کھڑکی سے کودتے وقت اس کا جو پیر مڑ گیا تھا اس میں تکلیف علیحدہ ہورہی تھی۔

''جلدی کرو۔'' وہ غرایا۔

وہ آج تک کارلا کو ایک وضع دار اور شفیق خاتون تصور کرتا تھا۔ لیکن وہ ایک بے وفا اور متلون مزاج ثابت ہوئی تھی اور ایڈی کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔

کارلا بالآخر وین کا پچھلا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔ ایڈی تیزی سے وین کی جانب بڑھا۔ اس نے وین کے پاس پہنچ کر اس شخص کو کاندھے پر سے وین کی اس وینائل فلورنگ پر منتقل کردیا جو اس نے گزشتہ ہفتے ہی اتاری تھی لیکن اسے ابھی تک پھینکا نہیں تھا۔

''جیسس!'' ایڈی بڑبڑایا۔ اس کی کمر کا درد اب کم ہوگیا لیکن وہ اب بھی ناخوش تھا۔

''اسے ڈاؤن ٹاؤن اسپتال لے جاؤ۔ وہی قریب ترین ہے۔'' کارلا نے کہا اور واپس گیراج میں چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ اپنے انگوٹھے کا ناخن چبارہی تھی۔

ایڈی نے وین کا عقبی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے وین اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیووے سے باہر نکل آیا۔ اب وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسپتال پہنچ کر وہ کیا کہے گا؟ اس نے اسے اسی طرح پایا تھا؟ اگر وہ کارلا سے اس کام کا معاوضہ لینا چاہتا ہے تو اسے کارلا یا اس کے چھوٹے سے کھیل کا تذکرہ نہیں کرنا ہوگا۔ ایڈی نے فیصلہ کیا بہتر یہی رہے گا کہ وہ اس شخص کو اسپتال پہنچا کر وہاں سے نکل لے۔ لیکن کیا وہ اس طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا؟

کیا بکواس ہے۔ وہ اس معاملے میں کیوں ملوث ہو گیا؟ اس کی کارکردگی تو بہت اچھی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے پیرول افسر کا بھی یہی کہنا تھا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے وین بائیں طرف گھمادی اور رفتار بھی معمول پر کردی۔ اسے احساس تھا کہ اگر راستے میں کسی پولیس والے نے اسے روک لیا تو یہ بات اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔

اور اس کے باوجود ایک لمحے بعد وہی ہوا جس سے وہ بچنا چاہ رہا تھا۔ پولیس کی ایک نیلی کار پہاڑی پر تیزی سے اس کی جانب آرہی تھی۔ اس کی لائٹیں فلیش کررہی تھیں اور وہ ایڈی کو کنارے ہوکر رکنے کا اشارہ کررہی تھی۔

ایڈی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اس نے سڑک کے کنارے درختوں کے درمیان ایک خالی جگہ پر جہاں سے گاڑی بہ آسانی موڑی جاسکتی تھی، اپنی وین روک دی۔ پولیس پٹرول کار بھی اس کے پیچھے آکر رک گئی۔

پُرسکون رہو، ایڈی نے اپنے آپ سے کہا۔ اس دوران میں ایک باوردی پولیس افسر پٹرول کار سے اتر کر ایڈی کی وین کے پیچھے آن کر کھڑا ہوگیا اور اس کی لائسنس پلیٹ کا نمبر نوٹ کرنے لگا۔

گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، ایڈی نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ٹیل لائٹ کا کوئی بلب فیوز ہوگیا ہو یا کوئی اور معمولی سی بات ہوسکتی ہے جس کی بنا پر وہ اس کی وین کی جانب متوجہ ہوا ہو۔

پھر وہ باوردی پولیس افسر ٹہلتا ہوا اس کی کار کی کھڑکی کے پاس آگیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے بیلٹ سے بندھے ہولسٹر پر تھا۔ اس نے ایڈی کو کھڑکی کا شیشہ گرانے کا اشارہ کیا۔

''لائسنس اور رجسٹریشن۔'' پولیس افسر نے ایڈی سے کہا۔

اس افسر کا چہرہ دلکش تھا ماسوائے اس کے کہ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ایڈی نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ اس پولیس افسر کے پیٹ پر خاصی چربی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر دوڑنے کی نوبت آئی تو وہ اسے بہ آسانی پیچھے چھوڑ دے گا۔

ایڈی گلوکمپارٹمنٹ میں کاغذات ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے وہ کاغذات نکال کر کھڑکی سے آگے بڑھا دیے۔ ساتھ

ہی پولیس افسر سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے کیوں روکا ہے؟'' اس کا لہجہ بلند تھا۔

پولیس افسر اس کے ڈرائیونگ لائسنس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر بولا۔ ''ایڈی لوکس! تم اس مکان میں کیا کر رہے تھے؟ تمہاری رہائش تو یہاں کی نہیں ہے؟''

''میں مرمت کا کام کرتا ہوں۔ زیادہ تر گٹر کی صفائی۔'' ایڈی نے بتایا۔

''بکواس، دوبارہ بتاؤ۔''

''یہ سچ ہے۔ میں اپنا کاروبار خود چلاتا ہوں۔ میرے اس کام کا نام ڈرٹی جابس ہے۔''

''اپنے ہاتھ دکھاؤ۔''

ایڈی نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال دیے۔ ساتھ ہی سوچنے لگا کہ ماجرا کیا ہے؟ کیا پولیس افسر کا خیال ہے کہ وہ کارلا کے گھر میں لوٹ مار کر کے فرار ہو رہا ہے؟

''ہوں ..... !'' پولیس افسر نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب وین کے پچھلے حصے کو چیک کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا وہاں تم نے اپنے اوزار وغیرہ رکھے ہوئے ہیں؟''

ایڈی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سانپ اچانک اس کے پیٹ پر رینگنے لگا ہو۔ اس نے پسنجر سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا جہاں وہ اپنے اوزاروں کا بیگ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔ ''مجھے ایک اور جاب پر جانا ہے۔'' ایڈی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں مرمت کا کام کرتا ہوں۔''

اس دوران پولیس افسر وین کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ وہ شیشہ لگی گول کھڑکی سے وین کے اندر جھانکنے لگا۔

''یہ وین کے اندر کیا ہے؟''

پلک جھپکتے میں اگلے پانچ منٹ کا منظر ایڈی کے ذہن میں گھومنے لگا۔ پولیس افسر اپنی گن نکال لے گا، مزید کمک کے لیے فون کرے گا، ایڈی کو وین سے اترنے پر مجبور کرے گا۔ اسے زمین پر الٹا لٹا دے گا، اس کی کمر کو اپنے گھٹنے سے دباتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر لے جا کر ان میں ہتھکڑیاں پہنا دے گا، اسے دھکیل کر اپنی پولیس کار کی عقبی نشست پر ڈال دے گا اور کاؤنٹی جیل میں اس کا چالان درج کرا دے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ایڈی نے گردن گھما کر دیکھا تو اس وقت پولیس افسر وین کا عقبی دروازہ کھول چکا تھا۔ اس نے خون آلود ٹی شرٹ کا کنارہ اٹھا کر زخمی شخص کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹ سمٹ گئے اور چہرہ تن گیا۔ وہ چند لمحے تک اس زخمی کے چہرے پر نظریں جمائے رہا، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایڈی اپنی نشست پر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

پولیس افسر نے زخمی شخص کی نبض چیک کی اور دوبارہ مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

پھر جب وہ گھوم کر ایڈی کی کھڑکی کے پاس آیا تو بولا۔ ''تم اس مکان میں گٹر صاف کرنے کے لیے گئے تھے، تو پھر کیا ہوا؟''

ایڈی نے اسے پورا قصہ سنا دیا۔ البتہ وہ حصہ حذف کر دیا جہاں اس نے زخمی شخص کی جیب سے رقم نکال کر اپنی جینز میں منتقل کی تھی۔

ایڈی کو کارلا پر ترس آ رہا تھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس پولیس افسر نے اسے کارلا کے ڈرائیووے سے وین نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ کسی طور کارلا کو اس قصے سے لاتعلق نہیں رکھ سکتا تھا اور نہ ہی اس شخص پر اپنے حملے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس بناوٹی مجرمانہ حملے کا منظر حذف کر سکتا تھا۔

جب وہ اپنا قصہ بیان کر چکا تو اس نے پولیس افسر کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

''تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ یہی گیم کھیلا کرتے ہیں، ایں؟'' ایڈی نے محسوس کیا کہ یہ جملہ ادا کرتے وقت پولیس افسر کے چہرے پر کرب کی ایک جھلک سی دکھائی دی تھی جو فوراً ہی غائب ہو گئی۔

''وہ منظر بالکل حقیقی دکھائی دے رہا تھا۔'' ایڈی نے کہا۔ ''اس کے پاس ریوالور تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ ہم دونوں کو مار ڈالے گا۔''

''اس کا ریوالور کہاں ہے؟''

''اس کے جیکٹ کی جیب میں۔'' ایڈی نے کہا پھر تلملاتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اس شخص کو اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس کا خاصا خون بہہ رہا ہے۔''

''کیا تم جانتے ہو یہ کون ہے؟'' پولیس افسر نے خون بہنے کی بات پر خاص توجہ دیے بغیر پوچھا۔

''نہیں۔''

''میں اسے لے جاتا ہوں۔ اسے میری کار میں ڈالنے میں میری مدد کرو پھر تم جا سکتے ہو۔''

اس سے قبل کہ ایڈی کوئی جواب دیتا، وہ پولیس افسر وین کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گیا اور اس زخمی شخص کو باہر کھینچنے لگا۔ ایڈی اپنی وین سے تیزی سے اتر کر اس کی مدد کے لیے لپکا۔ اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس زخمی شخص سے اسے چھٹکارا مل جائے گا۔

جب ان دونوں نے اپنی حکمتِ عملی سے اس نیم بے ہوش زخمی شخص کو پولیس پٹرول کار میں منتقل کر دیا تو پولیس افسر نے ایڈی کو اشارہ کیا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

ایڈی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی وین میں سوار ہو گیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور وین کو اطمینان سے واپس سڑک پر لے آیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

کیا وہ حقیقت میں یہاں سے ڈرائیو کرتا ہوا نکل جائے گا؟ پولیس تو کبھی اس پر یقین نہیں کرتی تھی چاہے وہ سچ ہی کیوں نہ بول رہا ہو۔ لیکن یہ تو عجیب پولیس افسر نکلا، واہ کیا خوش قسمتی ہے۔

پھر ایک لمحے کے لیے اسے اس زخمی شخص کی رقم چوری کرنے پر ندامت سی محسوس ہوئی لیکن پھر اسے یاد آیا کہ کارلا نے اس کے کام کا معاوضہ تو ادا نہیں کیا اور اب اسے توقع بھی نہیں تھی کہ کارلا وعدے کے مطابق اسے ہزار ڈالر دے گی۔ خاص طور پر یہ جاننے کے بعد کہ وہ ایک پولیس افسر کو اس کی تفریح اور بناوٹی کھیل کے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔

اب وہ گھر پہنچ کر اطمینان کے ساتھ اپنا پسندیدہ کوکنگ شو ٹی وی پر دیکھ سکتا ہے۔

جب اس کی وین پہاڑی سے نیچے پہنچی تو اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ایڈی، میں کارلا بول رہی ہوں۔ ہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن تم اسپتال میں میرا نام کہیں مت لینا۔ وہ پولیس رپورٹ درج کرتے ہیں۔ یہ بات فوری توجہ طلب ہے کہ پولیس کو اس معاملے کی بھنک نہ پڑے۔''

ایڈی اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ کیا وہ اسے سب کچھ بتا دے؟

''تم اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو؟'' وہ بالآخر گویا ہوا۔ ''اگر پولیس کو پتا چل گیا تب بھی تمہارے شوہر کو یہ سب کچھ کیسے پتا چل سکتا ہے؟''

''میرا شوہر پولیس افسر ہے اور انتہائی حاسد اور بدگمان ہے۔ اگر اسے کبھی پتا چل گیا کہ میں اس سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی تو وہ مجھے اور میرے عاشق کو مار ڈالے گا۔''

ایڈی نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر رک گیا اور فون بند کر دیا۔

'وہ اس جنجال سے بچ نکلا ہے۔ اس نے خطرے میں پڑی ہوئی ایک عورت کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اس زخمی شخص کو اسپتال لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے پولیس کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ آج وہ ایک اچھا شہری ثابت ہوا ہے جس پر اس کی ماں فخر کر سکتی ہے۔'

پھر اس نے اپنا سیل فون آف کر دیا تاکہ کارلا اسے دوبارہ فون کرے تو اسے فون کی گھنٹی سننے کو نہ ملے۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہ اپنا بقیہ دن گزارنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑا سا ٹی وی دیکھنا، پھر ستانا اور پھر ڈنر کے لیے کوئی اچھا سا کھانا پکانا۔

لیکن چند سوالات بار بار اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

کیا آفیسر گورمین خود اپنے مکان کی نگرانی کر رہا تھا کیونکہ اسے اپنی بیوی پر اعتماد نہیں تھا؟

کیا وہ اپنے قیدی کو مار ڈالے گا جو اب اس کی پٹرول کار کی عقبی نشست پر موجود تھا؟

کیا وہ گھر جا کر کارلا کو بھی مار ڈالے گا؟

اپنے ان خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے ایڈی نے وین کا ریڈیو آن کر دیا لیکن یہ خیالات عمدہ تیراک کے مانند ثابت ہوئے اور بار بار سطح پر ابھر رہے تھے۔

آخر اس نے لپک کر اپنا سیل فون اٹھا لیا اور اسے آن کر کے کارلا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری جانب فون کی گھنٹی سات مرتبہ بجنے کے بعد وائس میل پر منتقل ہو گئی۔ ایڈی نے ریکارڈنگ مشین پر کوئی پیغام نہیں چھوڑا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اُدھر آفیسر گورمین ایڈی کی وین کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ ایڈی اتنا ذہین ثابت نہیں ہوا جیسا کہ وہ اس کے بارے میں اندازہ لگا کے پریشان ہو رہا تھا۔

اگر کبھی کارلا اور اس کے عاشق کی لاشیں دریافت ہو جاتی ہیں تو ایڈی کو پھانسنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

بڑا کھلاڑی

عمران قریشی

کوئٹہ سے فراڈ کی یہ کہانی ہمارے ایک قاری نے ارسال کی ہے۔ پڑھیے اور سر دھنیے کہ اس جہانِ خیر و شر میں ہر سیر کو سوا سیر بھی ملتا ہے... اور جب یہ سوا سیر... سر پر سوار ہوتا ہے تو اس کی زد میں آنے والا بس تلملا کر رہ جاتا ہے۔

ماحول کی نرم...... گرم کیفیات سے فائدہ اٹھانے والوں کے داؤ پیچ

وقار صاحب کا تقاضا سننے کے بعد یاسر کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بدحواس لہجے میں بولا۔ ''تین کروڑ...... وقار صاحب یہ بہت بڑی رقم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمدانی کارپوریشن دیوالیا ہونے کے قریب ہے۔ ایسے موقع پر آپ کا تقاضا بے محل ہے۔''

''چند دنوں کے دوران تمہارے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ کی رقم منتقل ہونے والی ہے۔ میری رقم دینے کے بعد بھی تمہارے پاس دو کروڑ باقی بچ جائیں گے۔ اتنی رقم تمہارے

لیے کافی ہے۔'' وقار صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔
''اور اگر میں رقم دینے سے انکار کردوں۔ تب آپ کیا کریں گے؟'' یاسر نے پوچھا۔
''میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوششیں کروں گا کہ ہمدانی کی موت حادثاتی نہیں تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور اس قتل میں تمہارے ساتھ تمہاری ماں بھی ملوث ہے۔''
یاسر بے اختیار اچھل کر کرسی سے کھڑا ہوگیا اور بھرے ہوئے لہجے میں بولا۔
''وقار صاحب! آپ ہم پر الزام تراشی کررہے ہیں۔ ایک معمولی پالیسی کے لیے میں اپنے باپ کو قتل نہیں کرسکتا۔''
''یہ کوئی معمولی پالیسی نہیں ہے۔ رقم پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اتنی رقم کے لیے اگر اولاد حد سے تجاوز بھی کر جائے تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ میری اور ہمدانی کی چند ملاقاتوں کے دوران اس نے متعدد بار اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اسے اپنی فیملی سے جان کا خطرہ لاحق ہے۔ موت سے کچھ عرصہ قبل اس کی گاڑی کے بریک فیل ہوگئے۔ اس حادثے کے دوران وہ معمولی زخمی بھی ہوا تھا۔ دوسری دفعہ اسے سیڑھیوں سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ وہ مرنے سے بال بال بچا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کرنے پر اسے یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان دونوں حادثوں کے پیچھے تمہاری ماں کا ہاتھ تھا۔ اگر میں ان حادثوں کی تفصیل مع ثبوت بیمہ پالیسی والوں کو مہیا کردوں تو نہ صرف تمہیں رقم حاصل کرنے میں ناکامی ہوگی بلکہ ہمدانی کی موت کا ذمے دار گردانتے ہوئے پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔''
یاسر کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ لیکن وہ انہیں چھپاتے ہوئے بولا۔
''میں وہ ثبوت دیکھنا چاہوں گا جس کے بل بوتے پر آپ اتنے بڑے دعوے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔''
وقار صاحب نے مسکراتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سیاہ رنگ کی سی ڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''ہمدانی کارپوریشن کے آفس میں کیمرے نصب ہیں۔ ہمدانی کی موت سے چند روز قبل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تفصیلات اس سی ڈی میں محفوظ ہیں۔ فرصت کے لمحات میں سُن لینا۔ تمہارے بنگلے میں کام کرنے والا نوکر جس نے گاڑی کی بریکس کھولی تھیں میرے گھر میں مقیم ہے۔ میں جب چاہوں اسے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرسکتا ہوں اور اس بات کو دماغ میں رکھنا کہ مجھے نقصان پہنچانے کی صورت میں فوراً گرفتار کر لیے جاؤ گے کیونکہ میری بیوی تمام معاملے سے باخبر ہے۔ وہ تمہارے متعلق پولیس کو مطلع کرسکتی ہے۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

رات کو سٹنگ روم میں سی ڈی پلیئر پر ریکارڈ شدہ ویڈیو دیوار پر نصب ایل ای ڈی پر دکھائی دے رہی تھی۔ سٹنگ روم میں یاسر کے علاوہ مسز ہمدانی بھی صوفے پر براجمان تھیں۔ مسز ہمدانی تیکھے نقوش والی پُرکشش عورت تھیں۔ میک اَپ کی دبیز تہ نے ان کے چہرے پر اُبھرنے والی جھریوں کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھپا رکھا تھا۔ سی ڈی میں ہمدانی صاحب نہایت تفصیل کے ساتھ وقار صاحب کو تفصیل سے آگاہ کررہے تھے۔ ان کے چہرے پر دل شکنی کے تاثرات تھے اور وہ نہایت دل گرفتہ دکھائی دیتے تھے۔ تاہم وقار صاحب کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وقار نہ صرف ان کے گہرے دوستوں میں سے ایک تھے... بلکہ کاروباری شریک بھی تھے۔ پانچ کروڑ کی دو پالیسیاں ان دونوں نے تین سال قبل خریدی تھیں۔ یاسر، ہمدانی صاحب کا اکلوتا لڑکا تھا جبکہ وقار کے دونوں لڑکے بیرونِ ملک زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا اور دوسری سے ان بن جاری تھی۔ ہمدانی صاحب کی بات کے اختتام پر وقار بولے۔
''آپ جیسے حالات سے میں بھی دوچار ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ پالیسی کے منظرِ عام پر آنے کے بعد میری بیوی میری جان کی دشمن بن کر رہ جائے گی تو میں پالیسی کو پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ پالیسی کی رقم کے متعلق معلوم ہونے کے بعد اس کا رویہ مشکوک سے مشکوک تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ کچھ دن پہلے میرے دودھ کے گلاس میں نیند کی گولیوں کی مقدار بڑھا دی گئی تھی۔ میں بمشکل تمام اسپتال پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا ورنہ جان سے چلا جاتا۔'' مسز ہمدانی نے ایل ای ڈی کو آف کردیا پھر پریشان لہجے میں بولیں۔
''وہ مردود مرتے مرتے بھی ہمیں پھنسا کر چلا گیا۔ اگر تم ہمت سے کام لیتے ہوئے اسے شراب کے نشے میں وحشت ہوجانے کے بعد تیسری منزل سے نیچے نہ دھکیل دیتے تو شاید ہم پالیسی حاصل نہ کرپاتے۔''
''یہ ویڈیو نہ صرف ہمیں پالیسی کی رقم سے دور کرسکتی ہے... بلکہ اگر منظرِ عام پر آگئی تو پھر پھانسی پر چڑھانے کا ذریعہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔'' یاسر گہری سوچ میں گم بولا۔
اب تک بیمہ پالیسی والوں کو ہمدانی کی پوسٹ مارٹم

رپورٹ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمدانی مرنے سے قبل شراب کے نشے میں دھت تھا۔ باقی کی کسر یہ ویڈیو اور نوکر کی گواہی پوری کر دے گی اور ہم چوہے دان میں بے بس چوہے کی طرح پھنس کر رہ جائیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں وقار کے مطالبے کو مان لینا چاہیے۔ اس صورت میں بھی ہمارے پاس دو کروڑ کی رقم بچ جائے گی۔ اتنی بھی ہمارے لیے کافی ہے۔'' مسز ہمدانی تفکر سے بولیں۔

''دو نہیں صرف ایک کروڑ۔ کارپوریشن کے اثاثوں اور قرض خواہوں کی رقم کو آپ نظر انداز کر رہی ہیں۔ ان سب کی ادائیگی کے بعد ہمارے پاس اس سے زیادہ رقم نہیں بچ پائے گی۔'' یاسر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہمدانی کا قرضہ واپس کرنے کے ہم پابند نہیں ہیں۔ قرضہ اس نے لیا تھا۔ وہ جانے اور اس کے قرض خواہ جانیں۔'' مسز ہمدانی بولیں۔

''ایک قتل میں کر چکا ہوں اگر دوسرا بھی میرے ہاتھوں سرزد ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ یقین جانیے تین کروڑ کی رقم اسے دینے والی بات میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی۔'' یاسر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''کیا تم وقار کو قتل کرنے کے متعلق سوچ رہے ہو۔ یہ آسان نہیں ہوگا۔ تمہارا باپ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس لیے اسے نیچے دھکیلنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ لیکن وقار کو قتل کرتے ہوئے ناکوں چنے چبانے پڑیں گے۔'' مسز ہمدانی بوکھلائے لہجے میں بولیں۔

''میں چنے چبانے کے لیے تیار ہوں لیکن تین کروڑ کی رقم وقار صاحب کو آنکھیں بند کر کے دے دینا میرے اختیار سے باہر ہے۔'' یاسر ہنستے ہوئے بولا۔

''اسے قتل کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ وہ تمام معاملے سے اپنی بیوی کو آگاہ کر چکا ہے۔ وہ تمہارے خلاف بیان دے سکتی ہے۔''

''مسز وقار میرے خلاف بیان دینے کی کوشش نہیں کریں گی۔ ڈیڈی کی طرح وقار صاحب بھی پانچ کروڑ کی پالیسی کے مالک ہیں۔ اگر میں انہیں قتل کر دوں تو پالیسی کی رقم ان کے بیوی بچوں کے نام ہو جائے گی۔ اس کے بعد مسز وقار کو بلیک میل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ سی ڈی میں ڈیڈی کے ساتھ وقار صاحب نے بھی اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ ان پر بھی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ یعنی مسز وقار ہماری طرح وقار صاحب کی بیمہ پالیسی کی متمنی ہیں۔ اگر وقار صاحب کے قتل کے بعد میں اس سی ڈی میں ریکارڈ شدہ گفتگو کو بیمہ پالیسی والوں کے حوالے کر دوں تو مسز وقار کو پالیسی کی رقم بھی ملنے نہ پائے گی۔''

مسز ہمدانی کے چہرے پر تحسین آمیز تاثرات اُبھرے اور یاسر ہمدانی کی بیمہ پالیسی پر مشتمل کاغذات کی ورق گردانی کرنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن غیر متوقع طور پر مسز وقار کی ان کے گھر آمد ہوئی۔ وہ نہایت خوب صورت درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔ ان کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان تھی۔ چہرے مہرے سے سخت مزاج اور ضدی دکھائی دیتی تھیں۔

سٹنگ روم میں بیٹھنے کے بعد جب انہوں نے اپنی غیر متوقع آمد کی وجہ بیان کی۔ تب مسز ہمدانی اور یاسر حیرت کی شدت سے اچھل پڑے۔ بات ان کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ وقار صاحب کی موت کی خواہاں تھیں اور ایک کروڑ کی رقم بطور معاوضہ دینے کے لیے آمادہ تھیں۔ یاسر اس بات سے آگاہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا فقدان تھا اور ان کے ازدواجی اختلافات میں عمروں کا تضاد نمایاں حیثیت رکھتا تھا لیکن نوبت قتل تک بھی آسکتی تھی اس کے متعلق اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ قتل کی وجہ دریافت کرنے پر مسز وقار نے جواب دیا۔

''میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وقار مجھے طلاق دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اسے راستے سے ہٹانا میرے لیے نہایت ضروری ہے۔''

''کام نہایت مشکل ہے اور معاوضہ بھی معقول نہیں ہے۔ اگر آپ کرائے کے قاتلوں کا سہارا لیں گی تو میرے خیال میں وہ تجھی قتل کا معاوضہ ایک کروڑ سے اوپر لیں گے۔ آپ کو معاوضہ بڑھانا ہوگا۔'' مسز وقار کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے تاہم انہوں نے تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میری پیشکش کو ٹھکرانے کی صورت میں تمہیں تین کروڑ کی رقم سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور وقار جیسے خودغرض انسان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ تین کروڑ کی رقم ہتھیانے کے بعد مزید کا مطالبہ کردے۔ تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ ایک کروڑ پر معاملہ طے کرلو۔ بصورتِ دیگر میں چاہوں تو زبردستی بھی تم سے قتل کرواسکتی ہوں۔'' اس کی باتوں میں چھپی ہوئی دھمکی کو محسوس کرکے یاسر پریشان ہوگیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی حقیقت میں ویسا ہی تھا۔ وقار اسے تمام معاملے سے باخبر کرچکے تھے اور اب معاملے کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ جو چاہے یاسر سے کرواسکتی تھی۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ قتل کا معاوضہ دینے کے لیے تیار تھی۔ ورنہ وہ بغیر معاوضے کے بھی اسے بہ آسانی وقار کے قتل کے لیے مجبور کرسکتی تھی یاسر نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

''کام کا معاوضہ قتل سے پہلے ملے گا یا پھر بعد میں؟''

''میرے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی موجود نہیں ہے لیکن وقار پانچ کروڑ کی پالیسی کا مالک ہے۔ اس کی موت کے بعد یہ پالیسی مجھے مل جائے گی اور پالیسی ملنے کے فوراً بعد میں تمہیں ایک کروڑ کی ادائیگی کردوں گی۔'' مسز وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی سوچ مناسب ہے لیکن دو ایسے پالیسی ہولڈروں کی یک دم موت بیمہ پالیسی والوں کو شک میں مبتلا کردینے کے لیے کافی ہوگی جو آپس میں نہ صرف گہرے دوست ہوں بلکہ کاروباری شریک بھی رہ چکے ہوں۔ علاوہ ازیں ان کی اموات حادثاتی طور پر واقع ہوئی ہوں۔'' یاسر بولا۔

ہمدانی صاحب اور وقار نے بیمہ پالیسی خریدنے سے قبل شراب نوشی کی عادت سے کمپنی والوں کو مطلع کیا تھا اور شراب نوشی کے دوران حادثے کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ صرف ہمیں حادثے کے وقت اپنی موجودگی کسی خاص جگہ ظاہر کرنا ہوگی۔ میں گزشتہ کئی سالوں سے دمے کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سینٹرل اسپتال میں زیرِعلاج ہوں۔ حادثے والی رات میں اسپتال میں ایڈمٹ ہوں گی۔ قتل کے بعد ڈاکٹروں اور نرسوں کی گواہیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے وقار کے قتل میں ملوث نہیں کیا جاسکے گا۔ تم دونوں کو بھی اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے گواہوں کا انتظام کرنا ہوگا۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مسز وقار انہیں اپنے اگلے لائحہ عمل سے مطلع کرنے لگیں۔

''اتوار کی رات بنگلے کا چوکیدار اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ اس رات وقار کی مہ نوشی بھی حد سے تجاوز کرجاتی ہے۔ تم اس مدہوشی کے دوران بنگلے میں داخل ہوکر وقار کے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنے کے بعد گیس ہیٹر کو کھول دو گے۔ شراب کے نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے وہ احتجاج کرنے کی ہمت نہیں کرسکے گا اور دم گھٹنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ اس کے بعد بیمہ پالیسی والوں سے رقم حاصل کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔'' یاسر نے ستائش بھری نگاہوں سے مسز وقار کی طرف دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلا کر اس کی تائید کردی۔

☆☆☆

وقار صاحب کا بنگلا شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ یاسر نے اپنی گاڑی بنگلے سے کچھ ہٹ کر پارک کی اور بنگلے کی طرف چلا آیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ بنگلے کی دیواریں مختصر تھیں۔ انہیں پھلانگنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ لان میں جرمن شیفرڈ دندناتا پھر رہا تھا۔ اس نے احتجاجاً یاسر پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یاسر سے مانوس ہونے کی وجہ سے جلد ہی اپنی دُم ہلانے لگا۔ عمارت کا داخلی دروازہ اندر سے لاک تھا۔ لیکن آخری حصے میں واقع اسٹور روم کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوا اور دوسری منزل پر واقع وقار کے

کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے۔ وقار شراب کے نشے میں دھت آرام کرسی پر براجمان تھے اور ان کے سامنے میز پر شراب کی دو خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ یاسر نے تنقیدی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑکی تھی۔ اسے دبیز پردے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ الٹے ہاتھ کی طرف باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے درمیان میں گیس ہیٹر جل رہا تھا۔ یاسر نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے دروازے کو کنڈی لگا دی پھر کھڑکی کے آگے پردے برابر کرنے کے بعد گیس ہیٹر کی طرف آ گیا۔ اس نے گیس ہیٹر کو بند کر کے دوبارہ آن کر دیا۔ گیس کا اخراج شروع ہو گیا۔ اس تمام کارروائی کے دوران وقار نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ ان کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ معمولی حرکت بھی کر سکتے۔ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک دفعہ پھر ماحول کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا اور باہر نکلنے کے بعد اسٹور روم کی کھڑکی سے ہوتا ہوا لان میں آ گیا۔ جرمن شیفرڈ نے دُم ہلا کر اس کا استقبال کیا۔ یاسر نے مسکراتے ہوئے چار دیواری کو پھلانگا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اپنی گاڑی تک آ گیا۔ تمام کام حسبِ منشا بہ احسن و خوبی ہو گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا۔ پھر گاڑی کو اسٹارٹ کر کے اپنے بنگلے کی طرف چلا آیا۔ آدھی رات کے وقت بھی بنگلے میں دن کا سماں تھا۔ مسز ہمدانی نے ہمسائیوں کے علاوہ اپنی بہترین سہیلیوں کو بھی رات کی پارٹی پر مدعو کیا ہوا تھا۔ تاکہ وہ عینی گواہ کے طور پر یاسر اور مسز ہمدانی کی موجودگی کی گواہی دے سکیں۔

☆☆☆

دوسرے دن وقار کی موت کی خبر مسز وقار کی فون کال کے ذریعے موصول ہوئی۔ پولیس اہلکاروں نے مسز وقار کے ساتھ یاسر اور مسز ہمدانی کو شاملِ تفتیش کیا لیکن چند دنوں کی پوچھ گچھ کے بعد ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث انہیں تفتیش سے بری کرنے کے بعد موت کو حادثاتی قرار دے دیا۔ اسی شام چھ بجے کے قریب مسز وقار کی آمد ہوئی۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ سٹنگ روم میں بیٹھنے کے بعد مسز ہمدانی نے ان سے پوچھا۔

مسز وقار بیمہ پالیسی والوں کی کارروائی میں کچھ پیش رفت ہوئی۔''

جیت کی سزا

''ہمدانی صاحب کی موت کے فوراً بعد وقار نے اپنی بیمہ پالیسی کو منسوخ کر دیا تھا۔ میں نے وقار سے شادی بیمہ پالیسی کی رقم کو مدِنظر رکھتے ہوئے کی تھی۔ پالیسی کے یک دم ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی امیدوں پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہوا۔ وقار نے جب مجھے تم دونوں کو بلیک میل کرنے کے ارادے سے آگاہ کیا تب میرے دماغ میں مختصر لیکن جامع منصوبہ بندی نے جنم لیا۔ میں نے یاسر کو اس بات پر اکسایا کہ وہ وقار کو قتل کر دے۔ یاسر نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایسا بخوبی کیا۔ اس طرح مجھے وقار سے نجات مل گئی۔ بیمہ پالیسی کی رقم کے حصول کے لیے میں نے وقار کی موت سے قبل اس کے کمرے میں کیمرے لگا دیے تھے۔ ان کیمروں نے یاسر کے ہر اس عمل کو بخوبی فلمبند کیا جو اس کے خلاف قتل کا بہترین ثبوت ہو سکتے ہیں۔ تم دونوں گردن تک دلدل میں دھنس چکے ہو۔ اس دلدل سے باہر نکلنا اب تم دونوں کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک میرے مطالبے پر بلاچوں وچرا کیے عمل نہیں کرو گے۔'' مسز وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یاسر نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا مطالبہ کیا ہے؟''

مسز وقار نے پرس میں سے پین اور ڈائری نکالی۔ پھر کاغذ پر اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھنے کے بعد کاغذ یاسر کے ہاتھوں میں تھما دیا اور سرد لہجے میں بولیں۔

''ہمدانی صاحب کی بیمہ پالیسی پر مشتمل رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دو۔ میں کل تک انتظار کروں گی۔ اگر میری ہدایت پر عمل نہ کیا گیا تو میں سی ڈی پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' انہوں نے پرس میں سے سیاہ رنگ کی سی ڈی باہر نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنا پرس سنبھالتے ہوئے دونوں کو ہکا بکا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

آوارہ گرد

قسط:40

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لیئق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جاپہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِاثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور

سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل داد اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیمبلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کورنیلا اور سے جی کو ہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کورنیلا اور سے جی کو ہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کو ہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل داد اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل داد کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیمپ بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے... ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام چھالگری کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل داد کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ شاہ نواز کے حواری شکیلہ اور ارم کو بھی پکڑ لاتے ہیں۔ شہزی کو رسن بستہ چھوڑ کر شاہ نواز، شکیلہ کو ساتھ لے کر ہیرے کی تلاش میں نکلتا ہے جو شکیلہ نے قبرستان میں کہیں چھپا دیا تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، عارب کو ساتھ لے کر پریل کو بچانے نکل پڑتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ آواز غراہٹ سے مشابہ تھی......

میں ابھی اس کی سمت کا اندازہ ہی کرتا رہ گیا تھا جبکہ عارب فوراً ہی خطرے کی بُو سونگھ کر بولا۔

"ہوشیار! حیوانی شکاریوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

اس کا لہجہ لرزیدہ سا تھا۔

"کک...... کس طرف......؟" میرے منہ سے قدرے ہکلاہٹ آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔ میں ہنوز غراہٹ سے مشابہ اس آواز کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا

تھا اور عارب کے بتانے سے پہلے ہی میری متلاشی نظروں نے مذکورہ سمت میں ایک .... بھورے رنگ کے کتے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ہم سے صرف چند فرلانگ کی دوری پر ایک ریتیلی مٹی پر بیٹھا ہماری طرف گھور رہا تھا۔ اس کے خونخوار سا تاثر پیش کرنے والے جبڑوں سے دو نکیلے شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ میں نے فوراً گن سیدھی کر لی۔

"خبردار! ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔" عارب نے سرسراتی آواز میں مجھے متنبہ کیا۔

"گن نیچے جھکا لو......" میں نے ایسا ہی کیا۔ عارب نے مجھے دائیں جانب سے آگے بڑھنے کو کہا۔

"یہ رات کے راہی ہیں مگر چوکیداری کے لیے ان میں سے دو تین کتے جاگتے رہتے ہیں۔" اس نے میرے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بھونک بھونک کر اپنے ساتھیوں کو جگا دے گا۔"

"مگر اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا کہاں چھوڑے گا؟" میں نے کسی خیال کے تحت عارب سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے چلتا ہوا نسبتاً ایک اونچی ٹیکری کی اوٹ میں آکر رک گیا۔

ہمارے سروں پر سورج مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ گرمی اور تپش کی شدت سے میرا دماغ گھومنے لگا تھا۔ پسینہ...... ٹپ ...... بہہ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ آواز بھی اٹک اٹک کر برآمد ہو رہی تھی۔ سچی بات تھی کہ اس خوفناک جہنم زار بنجر ویرانے میں مجھے پریل چانڈیو کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ میں خود کو اب کوسنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میں یہاں آیا ہی کیوں تھا؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ کسی شخص کو رات میں ایک ایسی کھائی میں پھینک دیا جائے جو خونخوار کتوں اور لگڑ بھگوں کا مسکن تھی، ایک بے ہوش شخص ان کے خونی پنجوں سے بچ سکتا ہو......؟ بس! ایک خوش امیدی تھی یا پھر اسے ایک سرپھری سی دھن سمجھ لیں کہ میں نے پریل چانڈیو کو تلاش کرنے کی ٹھان لی تھی۔ شاید اس میں سونہڑیں سے کیے گئے وعدے کا دخل تھا اور خود پریل کا میرے ساتھ وہ دوستانہ سلوک بھی جو اس نے میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ میری یہ سرشت نہ تھی کہ ایک بار کوئی میرے ساتھ دوستی کا دم بھرے اور میں کسی آڑے وقت میں اس کی طرف سے منہ موڑ لوں......بس! شاید یہی وہ عزم تھا جو مجھے اس پُرخطر جگہ پر لے آیا تھا۔

ٹیکری میں آنے کے باعث وہ بھیڑیئے سے مشابہ کتا ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ عارب بھی میری آنکھوں کے سامنے اوجھل ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا شاید وہ اِدھر اُدھر کہیں ہو گیا ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تب ہی ایک لرزتا ہوا خیال میرے دل میں ابھرا۔ کہیں وہ مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر خود راہِ فرار تو نہیں اختیار کر گیا تھا؟ یہ سوچتے ہی عارب کی اس دھوکے بازی پر میرا دماغ جو پہلے ہی گرمی کی شدت سے گھوما ہوا تھا، آتش فشاں بن گیا۔ میں ٹیکری سے ہٹا اور اسے آوازیں دینے لگا۔ میں ٹیکری پر چڑھ گیا کہ اسے دیکھ سکوں۔ اچانک ہی میری نظر ایک جانب پڑی اور بے اختیار میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ عارب خان دم دبا کر ایک طرف کو دوڑے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تو ادھر سے ہی اس پر گولیاں برسا سکتا تھا مگر میں نے کسی خطرے کے باعث ایسا نہیں کیا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے رگ و پے میں جیسے لرزہ طاری ہو گیا۔ عارب مجھ سے تو بچ کر بھاگ نکلا تھا لیکن اس کتے کی نظروں میں آ گیا تھا جو ہمیں ایک دوسرے قریبی ٹیلے پر بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ بھونکتا اور غراتا ہوا اس کی طرف گولی کی طرح بڑھا تھا۔ ابھی یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا کہ میں نے دیکھا ایک دو اور ٹیلوں کے عقب سے تین چار کتے بھی بھونکتے ہوئے اس کی جانب کو لپکے تھے اور آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

عارب خان عبرت ناک موت کے خوف سے بری طرح بوکھلا گیا تھا اور کبھی اِدھر بھاگتا تو کبھی اُدھر......تب ہی اس کے سامنے سے بھی خونخوار کتوں کا ایک اور غول اس کی طرف لپکا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ مدد کے لیے چیخنے لگا۔ خونخوار کتے اسے بری طرح بھنبھوڑنے لگے۔ میں ٹیکری کی آڑ سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا اور میرے پورے جسم میں بھی سرد پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس ویرانے میں مجھے دھوکا دے کر بھاگ جانے کی فاش غلطی کی تھی اور اب اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا...... کتے عارب خان کو چیر پھاڑنے میں مصروف تھے۔ ایک نے اس کا نرخرہ چبا کر اس زور سے پھاڑ ڈالا کہ سرخ سرخ سی موٹی نالی ادھڑے ہوئے نرخرے سے نکال کر کھینچ لے گیا تھا۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر میرا پورا وجود جھرجھرا سا گیا تھا۔ عارب خان کی چیخیں معدوم ہو چکی تھیں۔ دیگر کتے بھی

اسی طرف آن وارد ہوئے تھے، ان میں لگڑ بھگوں کا غول بھی شامل ہونے لگا تو کتے ان سے جا بھڑے۔ اچھی خاصی لڑائی شروع ہوگئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ عارب خان نے مجھے اس کھائی کی نشاندہی کر دی تھی جہاں اس نے اپنے ساتھی کی مدد سے اسے دھوکے سے بے ہوش کر کے پھینکا تھا، لہٰذا میں اگلا ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسی طرف کو تیزی سے لپکا۔

میرے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی اور میں ٹیکریوں کی آڑ لیے ہوئے بالآخر اس کھائی کی طرف آ گیا مگر اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ مذکورہ کھائی کے قریب ہی مجھے کسی چھوٹی گاڑی کا ملبا سا نظر آیا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ہائی روف تھی۔ اس کے ناکارہ ٹائر ریت نما مٹی والی زمین میں دھنسے ہوئے تھے، جس کے باعث وہ ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ شیشے سلامت تھے۔ مگر اگلے ایک اور پچھلے دونوں ٹائروں کی حالت نہایت خستہ تھی۔ باڈی بھی ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی۔ اس ''کیری'' نما چھوٹی سی گاڑی کی مجموعی خستہ حالی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کئی روز سے یہاں اس بنجر ویرانے میں پڑی ہوئی تھی یا تو اس کے سوار گاڑی کی خرابی دور نہیں کر پائے تھے اور پیدل ہی کہیں نکل گئے تھے یا پھر ان شکاری کتوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ کیونکہ اس کی باڈی پر ہی نہیں بلکہ اس کے بند شیشوں پر بھی گرد و غبار کی موٹی تہ جمی نظر آ رہی تھی۔

میں ابھی اس طرف قدم بڑھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے..... مجھے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر پلٹا تو جیسے میری روح ہی فنا ہونے لگی۔ میرے پیچھے ایک قریبی ٹیکری پر دو خوفناک جبڑوں والے کتے کھڑے میری طرف دیکھ کر غرغرا رہے تھے۔ ان کی باچھوں سے لمبے نکیلے دانت صاف نظر آ رہے تھے اور ان کے تھوتھنے خون آلودہ تھے۔

بدقسمت عارب خان کی ضیافت اُڑانے کے بعد اب یہ میری ضیافت اُڑانے آئے تھے۔ میرے پاس گن تھی۔ میں گولیاں برسا کر دونوں کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد دیگر کتوں کا غول میرے پیچھے لگ جاتا۔ نجانے کس طرح یہ میری بُو سونگھتے ہوئے یہاں آن دھمکے تھے۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے ان کی جانب تکتا رہا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ کتے میری جانب بڑی خونخوار نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔

یہ مجھے چھوڑنے کے موڈ میں بالکل بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک شکار کے بخیے ادھیڑنے کے بعد انہیں فوراً ہی میری صورت میں دوسرا شکار میسّر آ گیا تھا، یہ بھلا اسے کہاں چھوڑتے؟ میں نے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ کتوں نے زور سے غراہٹ بلند کی۔ ان کی زبانیں، نکیلے دانتوں سے باہر کو نکلی لپلپا رہی تھیں اور وہ مجھے بھنبھوڑ ڈالنے کے فل موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دم ایک ساتھ میری طرف دوڑ لگائی۔ میں بھی ان کے خوفناک عزائم کا اندازہ کر کے دوڑ پڑا۔ میرا رخ اسی خستہ حال گاڑی کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کوئی وہاں ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تھی جہاں گھس کر میں اپنی جان بچا سکتا، اگرچہ یہ بھی کچھ ایسی خاص جگہ تو نہ تھی، بس! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی۔ تاہم سوچ رکھا تھا میں نے کہ ضرورت پڑی تو میں.... دونوں کتوں کو گولی مار دینے سے بھی بالکل دریغ نہیں کروں گا۔ پھر جا ہے جو ہو دیکھا جاتا۔ غنیمت تھا کچھ کہ دونوں کتے بھونک نہیں رہے تھے، غراتے ہوئے میرے تعاقب میں اندھا دھند دوڑے چلے آ رہے تھے، جیسے مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے بے چین ہوں...... میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ لحظہ بہ لحظہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی بھی قریب تھی۔ دونوں کتے بھی میرے قریب پہنچنے لگے تھے۔

بالآخر جیسے ہی میں گاڑی کے قریب پہنچا اور جلدی سے ہانپتے ہوئے ایک دروازہ کھولنے کی سعی چاہی تو دھک سے رہ گیا۔ وہ پھنس کر بند ہو چکا تھا۔ میں زور آزمائی کرتا رہ گیا۔

یہاں مجھے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دو انسانی پنجر بھی پڑے دکھائی دیے، جنہیں دیکھ کر میرے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں ان کا تعلق اس تباہ حال گاڑی سے تو نہیں تھا؟

ایک خیال آیا کہ گن کا بٹ مار کر شیشہ توڑ ڈالوں اور اندر گھس جاؤں، مگر جلد ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور یہ ارادہ ترک کر کے پہلے سر پہ آنے والے خطرے سے نمٹنے کا ارادہ کیا۔ دونوں کتے خوفناک انداز میں غراتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں ان کی طرف پلٹا۔

اپنی گن کو میں سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر چکا تھا فوراً ہی سب سے آگے والے ایک کتے پر گولی داغ دی۔ دھماکا ہوا اور کتا اپنے حلق سے عجیب سی آواز نکال کر دھپ سے بھربھری مٹی والی زمین پر گرا اور ختم ہو گیا، اس کے

دوسرے ساتھی نے میدان چھوڑنا بالکل گوارا نہ کیا تو میں نے ایک عدد گولی اسے بھی ٹھونک دی۔ وہ بھی اپنے مردہ ساتھی کے قریب ہی گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اب گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اپنی گن کا میگزین نکال کر چیک کیا تو پسینے سے تر پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ راؤنڈ کم تھے۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا اگلا ایک اور پچھلے دونوں دروازے تھوڑا پچک کر بالکل سیل ہو چکے تھے۔ اگلے دونوں دروازوں کا بھی یہی حال تھا، زور آزمائی کے باوجود وہ نہیں کھلے۔ میں نے پچھلے دروازے کا رخ کیا۔ اس کی حالت مجھے نسبتاً کچھ بہتر محسوس ہوئی تو میں نے اس پر زور آزمائی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک لاتعداد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھریں...... میں ہولا کر رہ گیا۔ میرے دائیں جانب سے شکاری کتوں کا ایک غول دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میرے پاس بچنے کا کوئی اور ٹھکانا تھا نہ ہی راستہ، فقط یہی راہ تھی کہ کسی طرح گاڑی کا یہ دروازہ کھل جاتا اور میں اندر جا بیٹھتا۔ میں نے اپنی کوشش تیز کر دی۔ گن میں اتنی گولیاں نہیں تھیں کہ میں ان خونیں شکاری کتوں کو ختم کر سکتا۔

دروازہ ہلنے لگا۔ میرے دل میں امید پیدا ہوئی۔ میں جنونیوں کے انداز میں دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا، اس کے ساتھ ہی میرے تصور میں عارب خان کا ادھڑا ہوا جسم اور تپتی دھوپ میں گاڑی کے قریب پڑے انسانی پنجرے گردش کرنے لگے اور کیا بعید تھا کہ میرا بھی انہی جیسا حشر ہونے والا تھا؟ ادھر لحہ بہ لحہ کتوں کے بھونکنے اور خونخوار غراہٹوں کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ میرے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ کوئی لحہ جاتا تھا کہ میں ان کے نرغے میں تھا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ بہت ہی قلیل ترین لمحے میں مجھے ایک بات کا ادراک ضرور ہوا تھا کہ دروازہ محض میری اپنی کوشش سے ہی نہیں کھلا تھا، کسی نے اندر سے بھی کچھ زور آزمائی کی تھی، اس پر زیادہ غور کرنے کا وقت کہاں تھا؟ میں غڑاپ سے عین اس وقت گاڑی کے پچھلے حصے سے اندر کودا تھا جب دو تین کتے خوفناک انداز میں مجھ پر بیک وقت جھپٹے تھے، مگر میں تب تک بجلی کی سی پھرتی سے دروازہ بند کر چکا تھا اور وہ بند دروازے سے ٹکرا کر پلٹ کر گرے تھے، مگر اٹھ کر پھر زور زور سے بھونکنے لگے۔ میں نے گرد سے اٹے پڑے شیشوں سے باہر جھانکنے کی کوشش چاہی تو مجھے گاڑی کے گرد خوں خوار کتوں کا پورا غول چکراتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اب بالکل محفوظ تھا۔ لہٰذا ان پر لعنت بھیج کر میں نے گاڑی کے اندر کا جائزہ لیا تو اچانک مجھے ایک زبردست شاک لگا......

☆☆☆

شاید اسی نے اپنے ناتواں اور نحیف و نزار وجود کا زور لگا کر اندر سے دروازہ کھولنے میں میری مدد کی تھی۔ اس نے کسی طرح اندر سے دھند لکے شیشے کے باوجود مجھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی کے اندر فقط یہی ایک شخص تھا جس کی ہیئت کذائی نہایت خستہ اور ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی، وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اوپری جسم برہنہ تھا اور وہاں خراشیں ابھری ہوئی تھیں، چہرے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ایک جوان اور تگڑا آدمی تھا مگر خستہ حالی اور بھوک پیاس نے اسے جیسے زندہ لاش بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب اس کا چہرہ سامنے آیا تو ایک اور شاک میرا منتظر تھا۔ تب میں نے اسے پہچاننے میں مطلق دیر نہیں لگائی تھی، میں حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات سے اسے تکنے لگا۔

''پپ...... پریل! ی ی...... یہ تم ہو......؟'' میں بے اختیار چلا اٹھا اور جلدی سے اسے سنبھالا۔ اس کیری کے پچھلے حصے میں کوئی سیٹ نہیں ہوتی، صرف سامان رکھنے کی تھوڑی سی جگہ ہوتی ہے اور وہ ادھر ہی مڑا تڑا لیٹا ہانپ رہا تھا، خود میں بھی مشکلوں سے یہاں جما ہوا تھا باقی سیٹوں کی حالت درست تھی۔ تاہم کیری کے جھکے ہونے کے سبب ہمیں جم کر سیدھے بیٹھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

وہ پریل ہی تھا۔ اس کے ہونٹ پیاس کی شدت سے سوکھ کر چھلکا سا نظر آنے لگے تھے۔ وہاں سپید سپید رنگ کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ نجانے یہ کتنے گھنٹوں سے اسی جگہ محبوس ہو کر بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا۔

''تت...... تم......'' اس نے بھی شاید مجھے اور میری آواز پہچان لی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر کیری کی باڈی سے ٹکا کر بٹھا دیا تھا۔

''ہاں، پرو! یہ میں ہوں...... تمہارا قیدی دوست! شہزی۔'' میں نے کہا۔ اس کے سوکھے ہونٹ میری اس بات پر مسکرانے کی کوشش میں تھوڑا کھنچے تھے۔

''پپ...... پپ...... پانی ہے تمہارے پاس......؟'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''نہیں دوست! لیکن تم فکر مت کرو...... میں تمہاری تلاش میں ہی نکلا تھا...... ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''تت...... تمہارا شکریہ...... لل...... لیکن یہ مشکل ہے، تم نے کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال دی میری خاطر......؟ اور...... اور...... سس...... سونہڑیں کیسی ہے؟''

میں نے اسے دھیرے دھیرے ساری بات بتادی۔ وہ مجھے خاصا زخمی بھی نظر آرہا تھا۔ اس کا پورا جسم خراش زدہ نظر آرہا تھا، کہیں کہیں سے گوشت نچا ہوا بھی نظر آتا تھا، وہ شاید ان شکاری جنگلی کتوں کے خوفناک نرغے سے بال بال بچ کر یہاں آن چھپا تھا۔

باہر کتے بھونک بھونک کر دھیرے دھیرے واپس پلٹنے لگے تھے۔

میری بات سن کر اس کا خستہ حال چہرہ مزید شکست خوردہ سا نظر آنے لگا مگر اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں شعلوں کی گرمی بھی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ اسے لائق ماچھی کی غداری اور دھوکے پر یقیناً غصہ آیا تھا مگر وہ خود کو از حد بے بس بھی محسوس کررہا تھا تاہم مجھے دیکھنے کے بعد اسے کچھ حوصلہ ہوا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ مجھ سے بولا۔

''میں اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا۔ اگر تم نہ آتے تو آج میں نے خود کو ان خونی کتوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہاں بند قبر میں گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر یہی تھا کہ ایک بار ہی موت کو گلے سے لگالوں......''

میں اس کی بات سن کر کانپ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں دوست! ایسا مت کہو...... اللہ مسبب الاسباب ہے...... مایوسی کفر ہے...... دعا کرو اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''لل...... لیکن ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟ یہ پورا علاقہ ان جنگلی کتوں کا مسکن ہے۔''

''تم مجھے یہ بتاؤ...... کہ جب عارب خان نے دھوکے سے تمہیں یہاں بے ہوش کر کے پھینکا تھا تو...... اللہ ہی نے تمہاری مدد کی تھی نا...... کہ تم اپنی جان، بال بال بچا کر یہاں اس گاڑی کے اندر پناہ لینے میں کامیاب ہوئے اس لیے حوصلہ رکھو...... آگے بھی وہی ہماری مدد کرے گا۔''

''آفرین ہے تم پر دوست! تمہارے ساتھ تو میں نے بس ایک ذرا سی بھلائی کی تھی کہ تمہاری جی داری اچھی لگی تھی مجھے...... اور تم اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری تلاش میں یہاں چلے آئے۔ سچ پوچھو دوست! میں تو مایوس ہوچکا تھا اپنی زندگی سے۔ ان خونخوار جنگلی کتوں کے چنگل سے نکلنا میرے بس میں نہیں نظر آرہا تھا۔'' پریل نے ممنون بھرے لہجے میں کہا۔ میں مسکرا کر بولا۔

''بھلائی سے بھلائی ہی جنم لیتی ہے میرے دوست! جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مجھے تو اسی رات سے ہی شک ہوچلا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردست دھوکا ہوا ہے، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تمہیں غائب کردیا گیا ہے۔ لیکن سونہڑیں کی طرح میرا دل بھی کہتا تھا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو زندہ ہو...... اسی لیے میں نے تمہیں تلاش کرنے کا اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا۔ خیر......! تمہیں دھوکے سے یہاں لانے والا ایک سازشی تو اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس سازش کا اصل ماسٹر مائنڈ یعنی لائق ماچھی زندہ ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ابھی واپس جنگل ڈیرے چلنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے ساتھی دوبارہ سے جی اٹھیں گے اور لائق ماچھی جیسے غدار کی تکابوٹی کرڈالیں گے۔ ان کے حوصلے بلند ہوجائیں گے۔ وہ سب تمہارا ہی ساتھ دیں گے۔''

غدار لائق ماچھی کے ذکر پر پریل چانڈیو کے چہرے پر نفرت و غیظ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''اس ذلیل انسان کو تو میں اپنے ہاتھوں سے عبرتناک انجام تک پہنچاؤں گا لیکن شہزی یار! مجھے اب خود سے زیادہ سونہڑیں کی فکر ہونے لگی ہے۔ تم نے مجھے بتایا کہ وہ بدبخت لائقو...... سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض واپس اس کے باپ کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو بہت ہی برا ہوجائے گا۔'' وہ ایک دم بے چین ہوگیا اور ذرا سانس لینے کو رکا اور پھر تھوڑا سا میری جانب جھکا، میں نے فوراً ایک ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ کمزوری اور بھوک پیاس کے باعث اس کی سانس بات کرتے ہوئے بار بار پھول رہی تھی۔

''شہزی یار! ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل بھی نہیں...... کیونکہ...... کیونکہ...... مم...... میں...... اس انا کے مارے ہوئے وحشی انسان شاہنواز خان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں...... وہ...... وہ...... اُسے مار ڈالے گا...... جان سے مار ڈالے گا وہ ظالم اُسے......'' یہ کہتے ہی پریل چانڈیو پر ایک عجیب دورہ پڑ گیا۔ وہ ایک دم بہ مشکل تمام اٹھا اور کیری کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کی حرکت پر حیران ہوکے اچھل پڑا اور اسے پشت سے پکڑ کر تھام لیا۔

''یہ کیا کررہے ہو...... تم؟ کہاں جارہے ہو؟ باہر موت بکھری ہوئی ہے۔''

''نہیں، شہزی یارا......! چھوڑ دو مجھے...... میں...... میں سونہڑیں کو اس کے باپ کے حوالے نہیں ہونے دوں گا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے مقدور بھر زور آزمائی کرنی چاہی مگر میں نے اسے آرام سے تھام کر دوبارہ سیٹ پر بٹھا دیا۔ کیری کے سائڈ سے ٹائرز برسٹ ہونے کے باعث چونکہ وہ ایک طرف کو جھک گئی تھی اسی لیے سیٹ پر سیدھے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''حوصلہ کرو دوست! ہم یہاں سے جلد ہی نکل جائیں گے۔ کیوں فکر کرتے ہو......؟ مجھے کچھ سوچنے دو ذرا......''

میری بات پر ذرا تھم تو گیا مگر اس کے چہرے پر بے چینی و تشویش کے سائے، لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا لیکن ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ خود مجھے بھی اس کی بے قراری اور بے چینی دیکھ کر اس بات پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں واقعی اس کا خدشہ درست تو نہیں تھا؟ یہ شاید ایکشن کا ری ایکشن تھا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنے اس خیال نما خدشے کو رد بھی کرتا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی باپ اپنی اولاد اور وہ بھی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر سکتا ہے......؟

پریل ہانپنے لگا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کیری کا اندر سے تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ باہر سے اس کی حالت جتنی خستہ تھی اتنی اندر سے محسوس نہیں ہوئی۔ ماسوائے کھڑکیوں کے شیشوں کے...... اندر سے تو میں نے ایک ڈسٹر نما کپڑا ڈھونڈ کر اس کے شیشے صاف کر لیے تھے مگر باہر سے ان پر گرد و غبار چپکا ہوا تھا۔ اسے صاف کرنے کے لیے مجھے کیری سے باہر اترنے کا رسک لینا پڑتا۔ جس کا فی الوقت میں نے ارادہ ملتوی کر رکھا تھا۔ لیکن یہ کرنا ضروری بھی تھا۔ تاہم میں اس کا انجن چیک کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں اٹھ کر اگلی سیٹ پر آیا۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے گیئر چیک کیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بہ مشکل ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''بہ مشکل'' اس لیے کہ کیری ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی۔ اگر کیری اسٹارٹ ہو جاتی تو میں اسے برسٹ زدہ ٹائروں سے ہی کھینچتا ہوا اس علاقے سے دور لے جاتا یا کوئی اور نسبتاً بہتر صورت اپناتا۔

''میں یہ کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں......'' عقب سے اچانک پریل کی آواز ابھری۔

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی...... ''چزززز...... زززز......'' کی آواز ابھرتی رہی مگر انجن بیدار نہ ہوا...... میں دوبارہ کوشش کرنے لگا۔

''اس کی بیٹری بھی ڈاؤن ہے اور انجن میں بھی گڑبڑ ہے۔'' اس نے دوبارہ پیچھے سے ہانک لگائی۔

''یار! مجھے دیکھ تو لینے دو......'' اس کے مسلسل اس طرح بولنے پر میں نے چڑ کر کہا۔ موجودہ صورتِ حال نے مجھے بھی چڑچڑا سا کر ڈالا تھا۔ پریل چانڈیو محسوس کر گیا اور ہولے سے بولا۔

''معاف کرنا یار!''

مجھے اس پر ترس سا آ گیا۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ بھی ہنس دیا اور اپنا ایک ہاتھ دوستانہ انداز میں میری طرف بڑھایا تو میں نے بھی اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر تالی بجا دی۔

''میں کسی بھی حال میں ناامید نہیں ہوتا...... اللہ پر بھروسا کر کے کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

''اچھی عادت ہے...... پسند آئی مجھے......'' وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

کیری اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ میں نے پہلے اس کے اگنیشن سوئچ کے تاروں کا گچھا باہر نکال لیا۔ جو اسٹیئرنگ کے نیچے ہی کہیں جڑا ہوا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا۔ اس کے بعد میں اٹھ کر پچھلی سیٹ پر آیا اور انجن چیک کرنے لگا۔ اس میں واقعی خرابی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور گرد آلود شیشے سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر گھٹن اور حبس بڑھنے لگا تھا۔ گرمی کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے تھوڑے تھوڑے شیشے کھول لیے تھے تاکہ کم از کم آکسیجن ملتی رہے۔ ورنہ تو باہر بھی بادِ سموم ہی چل رہی تھی.... میں ایک ہاتھ باہر نکال کر کسی میلے کپڑے سے شیشے صاف کرنے لگا۔ جنگلی کتے اِدھر اُدھر زمین اور ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ہماری کیری سے زیادہ دور نہیں تھے اور اطراف میں ایک گھیرا سا ڈالے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں ان کی مکاری دیکھ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ مجھے عارب خان کی بات یاد آ گئی۔ اسی نے ہی کہا تھا کہ جنگلی کتوں کا یہ غول بڑا مکار اور بے رحم ہوتا ہے۔ شکار کو پا کر یہ اسے ہرگز نہیں چھوڑتے۔ میں نے دیکھا تھا کہ کتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس طرف اپنی تھوتھنی اٹھا کر دیکھ لیتے تھے، جدھر ہماری کیری موجود تھی۔

دھوپ خاصی تیز نکلی ہوئی تھی مگر انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وقت گزر رہا تھا، لگتا تھا کہ دن اب دھیرے دھیرے ڈھل رہا ہے۔

معاً ایک کتے کو میں نے بدستور اپنی منحوس تھوتھنی اٹھائے اسی طرف تکتے پایا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کیری کی طرف بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ ان بدبختوں کا ایک عجیب سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ کتے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے لپک کر شیشے بند کر دیے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی محض جھری بنانے کی حد تک ہی کھلے ہوئے تھے۔ شیشے صاف ہونے کے بعد اب میں باہر دیکھ سکتا تھا۔ اس ایک کتے کے لپکنے سے باقی خبیث کتے بھی بھونکتے غراتے ہوئے کیری کی طرف لپکے اور پھر وہی منحوس کھیل شروع ہو گیا۔ یعنی وہ کیری کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ کئی ایک تو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پہ کھڑے ہو کے اگلی دونوں ٹانگیں کیری کی باڈی سے ٹکا کر اپنے خوفناک تھوتھنے شیشے کے ساتھ رگڑنے لگے اور خونخوار انداز میں غراتے بھی جاتے۔

میں غصیلے انداز میں انہیں شیشے کے پار سے گھور کے پریل کے سامنے والی سیٹ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ مردود کتوں کے دھکوں سے کیری بھی ہل رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک بھونکتے اور غراتے رہنے کے بعد یہ غول ''پنخ...... پنخ'' کرتا ہوا پلٹ گیا۔

میں نے سامنے سیٹ پر بیٹھے پریل کی طرف دیکھا، وہ نڈھال سا ہو رہا تھا۔ بڑی اکتا دینے والی اور اس سے زیادہ مشکل صورتِ حال تھی۔ رفتہ رفتہ دن ڈھلنے لگا۔ پریل پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ میں نے اسے اسی طرح ہی رہنے دیا۔ جاگتا تو پھر سونہڑیں کی طرف سے اسے بے چینی ستانے لگتی۔

میں نے شیشے کے پار سے اطراف میں نظریں دوڑائیں...... بنجر ویرانی اور سناٹے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کتے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ شاید کوئی مدد آ جائے۔ شاید کوئی گاڑی یہاں سے گزرے اور ہم پر اُن کی نگاہ پڑ جائے۔ پتا نہیں یہ قبولیت کی کون سی گھڑی تھی کہ تھوڑی دیر بعد جب شام کا دھندلکا چہار اطراف میں پھیلنے لگا تو اچانک میں ٹھٹکا۔ ایک جانب مجھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس متحرک نظر آئی۔ میرا دل خوش امیدی کے باعث تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستگی سے اس طرف کا شیشہ ہٹایا اور ایک ہاتھ باہر نکال کر لہرانے لگا۔ اسی وقت کتے بھونکتے ہوئے اس گاڑی کی طرف لپکے۔

گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ کتوں کے غول کو دیکھ کر ڈرائیور نے اس کی رفتار بڑھا دی تھی۔ کتوں کا پورا غول اس کے تعاقب میں دوڑا گیا حتیٰ کہ مجھے گاڑی کی ٹیل لائٹ نظر آنے لگیں۔ بے بسی اور مایوسی کے عالم میں، میں نے کیری کی باڈی پر مُکا جڑ دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا اور پھر میں نے پریل کو جھنجوڑ ڈالا......

''پپ...... پریل! اٹھو...... جلدی کرو...... یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع ہاتھ لگا ہے۔'' وہ پہلے تو اپنے حلق سے نحیف و نزار سی آوازیں خارج کرتا رہا، اس کے بعد...... اس نے نیم وا کر کے آنکھیں کھولیں اور میں نے دوبارہ اسے جھنجوڑا۔ وہ بیدار ہوا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

''کتے کسی گاڑی کے تعاقب میں بھاگے ہیں...... موقع اچھا ہے...... نکل چلو......'' کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ یہ رسک لینے کی ہمت نہ کرتا مگر وہ سونہڑیں کے تازہ ترین اور سنگین معاملے کی وجہ سے میرا ساتھ دینے پر فوراً ہی راضی ہو گیا۔

میں نے کیری کا پچھلا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ کوئی کتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کھائی کی طرف بھی سناٹا طاری تھا۔ میں پریل کو سہارا دیتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ کیری سے نیچے اترا۔ ان وحشی اور خوں خوار جنگلی کتوں کا خوف مجھے بھی تھا لیکن جستجوئے بقا کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے گن اپنے کاندھے پر اٹکا دی تھی اور اپنے جیسے گرانڈیل پریل کو سہارا دیتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا۔ میرا دل بھی اسی تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا۔ ہم اپنی ''پناہ گاہ'' سے دور ہو چکے تھے۔ اگر کتے واپس لوٹ آتے تو ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں بچتا کہ ہم واپس کیری میں داخل ہوتے۔ اب تخت تھا یا تختہ...... والی بات تھی۔

میرے دل سے اس بات کا خدشہ ایک لمحے کے لیے بھی محو نہیں ہوا تھا کہ اگر کتے لوٹ آتے تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوتا...... اطراف کا منظر بڑا خشک، بے رحم اور گرم ہو رہا تھا۔ آسمان پر گرم سی شام کی سرخی پھیل رہی تھی۔

ایک جنون سا تھا کہ میرے رگ و پے میں پارے کی مثل دوڑنے لگا تھا اور میں رکے بغیر پریل کو کھینچے ایک طرف لیے جا رہا تھا کہ اچانک میری تھکی ہوئی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ وہ ایک خوفناک سی غراہٹ تھی۔ میں نے شام کی ملگجی سی تاریکی میں اس منحوس آواز کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ دو کتے خوفناک جبڑے پھاڑے

عجیب مکارانہ سے انداز میں میرے عقب میں پہلے تیز تیز اور پھر جب مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو یک دم دوڑ پڑے۔ نجانے یہ اس غول میں شامل ہونے سے کیسے بچ گئے تھے۔ یا پھر ادھر اندھے گڑھے میں پڑے سو رہے تھے کہ ہماری بُو پا کر اس طرف نکل آئے۔

میں نے پریل کو چھوڑا۔ وہ چکرانے کے سے انداز میں خشک بنجر زمین پر ڈھے گیا۔ دونوں کتّے خوفناک جبڑے پھاڑے گولی کی رفتار سے میری طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ میں نے گن پشت سے لے کر دونوں ہاتھوں میں پکڑلی اور نال کا رخ ان کی طرف کر کے تلے اوپر دو تین فائر جھونک دیے۔ دھماکے ہوئے اور دونوں کتے خاک چاٹنے لگے۔ میں نے گن پھر پشت پر ٹکائی اور جھک کر پریل کو سنبھالا۔ اس کے بعد اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔ خدشہ اس بات کا قوی ہوچکا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر خوں خوار کتوں کا غول اس طرف کا رخ کر سکتا ہے جبکہ مجھے ابھی تک کوئی ایسی جگہ یا پناہ گاہ دکھائی نہیں دی تھی جسے میں محفوظ خیال کرتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ مجھے سامنے ایک بڑا سا ٹیلا نظر آیا تھا۔ مجھے امید سی تھی کہ اس کے پار ہمارے لیے کچھ بہتری کا سامان ہوسکتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے تھکے ہارے وجود میں جیسے ایک نئی طاقت سی دوڑ گئی۔ پریل کچھ خوف زدہ سا نظر آنے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی زندگی ایسے دل اندوز واقعات سے بھری پڑی تھی لیکن اس طرح کی بے بسی کی موت کا تصور اچھے اچھوں کا پتا آب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے جبکہ خود میرا اپنا بھی یہی حال تھا۔

ایک مقام پر ٹیلے کی ڈھلان چڑھتے ہوئے...... پریل کو سنبھالے سنبھالے میرا ایک پاؤں رپٹ گیا اور میں گر پڑا۔ پریل بھی میرے ہی سہارے تھا، وہ بھی گرا۔ ٹیلا خاصا بلند تھا اور ہم دونوں ہی لڑھکتے ہوئے نشیب میں جانے لگے۔

ٹیلے کی ڈھلان پر جا بجا چھدری چھدری جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں...... میں نے ایک کو تھام لیا، وہ پُرخار تھی، تکلیف سے میری کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔ ہتھیلی پہ چبھنے والے کانٹوں سے خون رسنے لگا۔ میں نے وہ خارزدہ جھاڑی چھوڑ دی۔ پریل بھی ایک طرف کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں اٹک کر رک گیا تھا۔

میں لیٹے لیٹے اس کی جانب کھسکا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور میرے رگ و پے میں خوف کی پھریری سی دوڑ گئی۔ یہ اَن گنت بھاگتے ہوئے جنگلی کتوں کی آوازیں تھیں۔ وہ شاید مذکورہ گاڑی کا ناکام تعاقب کرنے کے بعد نجانے اب کدھر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ تاہم ان کے بھونکنے کی آواز مدھم سی تھی اور اس سے زیادہ خوف طاری کیے دے رہی تھی۔ کتوں کے نرغے میں پھنس کر موت کے منہ میں جانے کا تصور ہی روح فرسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے وجود کی ساری طاقت مجتمع کرتے ہوئے ایک بار پھر پریل کو سنبھالا اور اس سے ہانپتی ہوئی آواز بولا۔

''پریل...... اٹھ، وقت بالکل نہیں ہے ہمارے پاس...... کتے واپس لوٹ رہے ہیں، انہوں نے شاید ہماری بُو سونگھ لی ہے۔''

''تت...... تم بھاگ جاؤ دوست! مجھے چھوڑ دو...... اِدھر ہی...... میں اب نہیں چل سکتا...... بس...... لل...... لیکن سونہڑیں کو کبھی اس کے باپ کے حوالے نہ......''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم پریل! تمہاری خاطر میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی ہے اور تم کہتے ہو میں تمہیں یہاں ان جنگلی شکاری کتوں کا نوالہ بننے کے لیے چھوڑ دوں...... ہرگز نہیں، اٹھو......'' میں نے یہ کہتے ہوئے اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی کچھ ہمت سے کام لیا اور اپنے ڈھتے ہوئے وجود کی طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے میرے ساتھ ڈھلان پہ چڑھنے لگا۔

''مجھے...... پورا یقین ہے......'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک نظر عقب میں ڈالی جہاں سے میرا خیال تھا کہ کتوں کا غول ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آرہا تھا۔ ''اس ڈھلان کی دوسری طرف...... کوئی نہ کوئی محفوظ پناہ گاہ ہمیں مل جائے گی۔''

پریل بھی اپنی سی کوشش کررہا تھا میرا ساتھ دینے کی اور میں نے تو اپنا تن من دھن لگا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم ٹیلے کی چوٹی پر پہنچے...... اور میں نے عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ ٹیلے سے نیچے تھوڑی دور پھیلے بھربھری مٹی والے میدان میں خونی کتوں کا غول گولی کی رفتار سے ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عبرت ناک موت کے جاں گسل تصور سے میرا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر میرے اعصاب شل سے ہونے لگے اور ہمت جواب دینے لگی۔ جانے یہ ان منحوس کتوں کا کیسا خوف تھا جو بری طرح میرے اعصاب پر سوار ہوچکا تھا۔

''مم...... مجھے ان کے سامنے پھینک کر بھاگ جاؤ...... یہ میرے ساتھ مصروف ہو جائیں گے اور تمہیں

بھاگنے کا موقع......'' پریل کی آواز حلق میں دب گئی۔ میں اس کی بات کاٹ کر چیخا۔

''پریل! ہمت کرو...... مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ نظر آ گئی ہے۔'' یہ کہتے ہی میں اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ کتوں کا غول بدستور دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ ایک ہیبت ناک اور کریہہ انگیز موت کی صورت میں ٹیلے کی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے دوڑتے نظر آرہے تھے۔ چوٹی پر پہنچتے ہی میں نے پریل کو زور سے دوسری طرف نیچے نشیب میں دھکا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی رگیدتا ہوا نیچے لڑھکتا چلا گیا اور پھر جیسے ہی کتوں کی خونخوار تھوتھنیاں ٹیلے کی چوٹی سے نمودار ہوئیں...... میں اور پریل...... قریب بہتی ایک قدرے چوڑے پاٹ والی نہر کے ریتیلے کراڑے پر آن گرے تھے۔ وہاں سے لڑھکتے ہوئے ہم سیدھے بہتی نہر میں جا گرے۔

گرمی اور تپش کے مارے ہوئے وجود، نہر کے ٹھنڈے پانی کی برودت میں جیسے اچانک ہی جی اٹھے تھے۔

میں نے پریل کو سنبھال لیا تھا اور ہم اب دونوں گویا ایک دوسرے کو تھامے ہوئے نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہے چلے جارہے تھے۔ ادھر جنگلی کتے...... نہر کے کنارے کنارے ریتیلے کراڑے پر، ہمارے ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہے تھے۔ میری کوشش یہی تھی کہ ہم کنارے سے دور ہی رہیں۔ کیا خبر کوئی بھوکا کتا جوشِ شکم سیری میں ہم پر وہیں سے ہی چھلانگ لگا لیتا۔ میں نے اپنا ہی نہیں بلکہ پریل کا منہ بھی پانی کی سطح سے اوپر کر رکھا تھا، تاکہ غوطہ نہ لگ سکے۔ ورنہ بہتی نہر میں ایک بار غوطہ کھانے کے بعد برا حال ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہی بوقتِ ضرورت اپنے ہاتھوں پیروں کو بھی متحرک کیے ہوئے تھے۔ تاکہ ڈوبنے سے بھی بچے رہیں۔

''شش...... شہزی!''

اسی وقت مجھے کانوں میں پانی کے شور میں پریل کی ڈوبی ڈوبی سی آواز سنائی دی۔

''ہم بچ گئے شہزی...... ! ہم بچ گئے......'' وہ کہہ رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی خوشی تھی تاہم میں ابھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم خطرے سے بالکل باہر نکل آئے ہیں کیونکہ ایک تو ہم نہر میں تھے اور دوسرے یہ کہ کتے ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ یہ نہر میں ہی کود پڑتے۔

''ہاں پریل! شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہمیں اب بھی ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا ہے......'' میں نے کہا۔

''تم سمجھے نہیں میری بات......'' وہ بولا اور میں حیران سا ہوا۔

''یہ نہر...... جنگل ڈیرے کے قریب سے گزرتی ہے۔'' اس نے اپنی خوشی کی اصل وجہ بتا کر مجھے بھی ایک خوشگوار سی حیرت سے دوچار کر ڈالا۔

''اچھا...... ! یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگئی......'' میں نے بھی خوش ہو کے جواب میں کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب پریل کے وجود میں بھی کوئی انجانی سی طاقت دوڑ گئی تھی۔ اسی سبب ہم نے دوسرے کنارے پر اترنے کے بجائے اسی طرح تیرتے رہنے پر ترجیح دی تھی۔

نہر آگے جا کر قوس کی صورت میں گھنی جھاڑیوں اور آک...... کے موٹے کڑوے پتوں والے گھنے پودوں میں گم ہو رہی تھی۔ جو کنارے پر بہت آگے تک نہر پر جھکے ہوئے تھے۔ تب ہی میں نے محسوس کیا کہ کتوں کے دوڑنے کی رفتار بتدریج آہستہ ہوتی جارہی تھی...... یہاں تک کہ ان کی تعداد میں بھی کمی آنے لگی۔ بیشتر کتے زبان باہر نکالے ہانپ رہے تھے اور رکتے جارہے تھے۔ قوس کی شکل میں خطرہ تھا کہ ہم دونوں کنارے سے جا لگتے اور یہی ہوا...... جیسے ہی ہم نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ موڑ کاٹنے لگے...... ہمارا رخ کنارے کی طرف ہونے لگا۔ گن ہنوز میرے کاندھے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے پریل کو خبردار کر کے اسے چھوڑ دیا اور کنارے کے قریب آتے ہی میری گن میں جتنی بھی گولیاں تھیں وہ میں نے کنارے پر دوڑتے ہوئے باقی ماندہ کتوں پر برسا دیں، وہ سب ڈھیر ہو کر گرنے لگے اور شاید تعداد کی کمی کے باعث وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ موڑ کاٹتے ہی میں اور پریل دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن ملے۔ خالی گن میں نے پھینک دی اور خود کو پانی کے بہاؤ کے سپرد کر دیا۔

بہاؤ زیادہ تیز نہ تھا مگر اتنا کم بھی نہ تھا...... موڑ کاٹتے ہی نہر کے دونوں کناروں پر لانبے گھنے پیڑوں کے جھنڈ نمودار ہونے لگے۔ جن کی شاخیں سطحِ آب پر جھکی ہوئی عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا، کتے غائب ہو چکے تھے۔

''کیا خیال ہے دوست! اب کنارے کا رخ کیا جائے؟'' میں نے پریل سے پوچھا۔

''ابھی نہیں، میں بتاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

ہم اسی طرح خود کو بہاؤ کے سپرد کیے تیرتے رہے۔ پریل غور سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ایک پُلیا کے نیچے سے ہم گزرے تو پریل نے مجھے دوسرے کنارے پر نکل جانے کا کہہ دیا۔ ہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دوسرے کنارے کے قریب ہونے لگے اور پھر کنارے پر پھیلی ہوئی آبی جھاڑیوں اور پودوں کو دبوچ کے ہم نے اپنی رفتار جام کی اور کنارے پر نکل آئے۔

خشکی پر آتے ہی ہمارے وجود کی تھکن جیسے ایک دم بیدار ہوگئی اور ہم خاصی دیر تک اسی طرح کنارے پر پڑے ہانپتے رہے...... گھنا جنگل دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ ستانے کے بعد ہم ذرا باتیں کرنے کے قابل ہوئے تو پریل نے مجھے بتایا کہ یہ نہر ”گاج ندی“ کہلاتی ہے، جسے مقامی زبان میں ”گاج نعین“ کہا جاتا ہے اور یہ آگے کئی میل جا کر دریائے سندھ میں جا گرتی ہے۔ یہاں سے جنگل ڈیرا زیادہ دور نہیں تھا۔

”اس صورت میں جبکہ......“ میں نے کسی محتاط خیال کے پیشِ نظر اس سے کہا۔ ”تمہارا غدار نائب لائق ماچھی گروہ کا سرغنہ بن چکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ ہمارا خوشی سے استقبال کریں گے؟“

پریل چانڈیو میرا اشارہ سمجھ کر تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ”مجھے اس کا اندازہ ہے...... چلو آگے بڑھو۔“

ایک مصیبت سے نجات ملتے ہی اس کے درماندہ وجود میں بھی نئی طاقت دوڑ گئی تھی۔ ہم دونوں اٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ اب راستوں کی راہنمائی پریل کر رہا تھا۔ وہ یہاں کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ ہم دونوں چھپتے چھپاتے جنگل میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ پریل کے مطابق اس کے ساتھی اسے دیکھ کر خوش تو ضرور ہوں گے لیکن جو کسی وجہ سے لائق ماچھی کے ساتھ مل چکے تھے، وہ بھی اپنے پرانے سرغنہ کو دیکھ کر اس سے آن ملیں گے...... ایک بڑی جنگ کا خطرہ پھر بھی موجود تھا مگر پریل کو یقین تھا کہ عبرتناک شکست پھر بھی غدار لائق ماچھی کے حصے میں آئے گی۔ کیونکہ پریل کے وفاداروں کو ابھی تک یہ کھٹک ہوگی کہ آخر ان کا سردار سائیں (پریل) اچانک کہاں غائب ہوگیا لیکن وہ شاید اب اپنی جان کے خوف سے مصلحتاً خاموش تھے۔

تھوڑی دیر بعد پریل کے مطابق جنگل ڈیرے کی حدود شروع ہو چکی تھی۔ اب ہم دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شام کے ملگجے سائے رات کی گہری تاریکی میں مدغم ہو چکے تھے۔ ہم اسی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ایک خطرے سے بچ کر تو نکل آئے تھے مگر اب دوسرا خطرہ لٹکتی تلوار بن چکا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا، پریل مطمئن تھا یا پھر شاید اسے اپنے گروہ کی تازہ صورتِ حالات کا اندازہ نہ تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ ہم خالی ہاتھ تھے جبکہ پریل اپنے وفادار ساتھیوں پہ تکیہ کیے ہوئے تھا۔

بہرحال ہم محتاط روی کے ساتھ بدستور آگے بڑھتے رہے۔ فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ آسمان صاف تھا اور دور کہیں اماوس کا چاند ہونے کے باعث جنگل میں کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔ میں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا اور سانپوں کا بھی ڈر تھا مجھے...... لیکن پریل یوں بڑھا چلا جا رہا تھا جیسے اسے سب نظر آرہا ہو...... اب میرے بجائے وہ راہنمائی کر رہا تھا۔ اچانک ایک مقام پر وہ قدرے ٹھٹک کر رکا۔ میں بھی رک گیا۔ وہ جیسے کوئی سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے سرگوشی میں بولا۔

”ہم منزل کے بہت قریب ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہرے پر صرف دو افراد تعینات کیے جاتے ہیں، کیونکہ اس طرف کسی خطرے کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔“

”کیا تم ان دونوں پہرے داروں سے بھڑ جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ ابھی ہمیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ایک قہقہے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ میں چونک کر رکا مگر پریل مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید پریل کے کانوں نے قہقہے کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ میں ابھی اسے یہ بتانے ہی والا تھا کہ دفعتاً پریل کو میں نے دبک کر رکتے پایا۔ میں بھی رک گیا۔ تب ہی مجھے گہری خاموشی کے دامن میں باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے اسی طرف دیکھا، پریل کی نظریں بھی وہیں جمی ہوئی تھیں۔

”ان دونوں میں سے ایک میرا ساتھی ہے۔“ معاً پریل نے سرسراتی سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

”کیا تم ان پر جھپٹنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”نہیں...... آؤ میرے ساتھ...... لیکن میرے پیچھے ہی رہنا۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے عقب میں قدم بڑھاتا رہا۔

”دل مراد...... ہوشیار......“ اچانک پریل نے ٹھہر کر قدرے بلند آواز میں کہا۔ اس طرف مجھے روشنی سی نظر آئی تھی۔ کمزوری کے باعث اس کی آواز میں ویسا رعب

اور دبدبہ نہ تھا...... لیکن میں نے دیکھا اس کی آواز پر یکلخت دو مسلح آدمی اسی روشنی والی جگہ سے نمودار ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ جس کا چکارا خاصے پھیلاؤ والا تھا۔

''بس...... سردار سائیں...... ! تت...... تم۔'' ٹارچ والے کے منہ سے مسرت بھرے الفاظ ابھرے۔ شاید یہی دل مراد تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی خاموش تھا، حیرت اس کے چہرے پر بھی طلوع ہوئی تھی مگر اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔

''کیسے ہو تم دل مراد؟ پہچان لیا مجھے......؟'' پریل اس سے بولا۔ ''لیکن لگتا ہے، شنواری نے مجھے نہیں پہچانا ابھی تک......'' اس نے آخر میں اس کے برابر میں کھڑے دوسرے مسلح آدمی پر نظر ڈال کر کہا تو وہ اچانک جیسے گڑبڑا کر بولا۔

''نن...... نہیں سردار سائیں! بھلا آپ کو میں کیسے نہیں پہچانوں گا......'' تب ہی اچانک دل مراد نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ اس نے پلک جھپکتے ہی اپنی گن کی نال شنواری نامی اس آدمی کی کنپٹی سے لگا دی۔

''اپنی گن پھینک دو شنواری! اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔''

شنواری گم صم ہو گیا۔ چونکا میں بھی تھا مگر پریل نے دل مراد سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''دل مراد! یہ کیا حرکت ہے؟''

''سردار سائیں! یہ اسی غدار لائق ماچھی کا آدمی ہے۔'' دل مراد نے جواب دیا۔

''نہیں دل مراد۔'' پریل بولا۔ ''غدار صرف لانقو ہے، یہ لوگ نہیں...... انہیں ورغلایا گیا ہے اور میں ایسے لوگوں کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔ گن نیچے کر لو۔''

دل مراد چند ثانئے مخمصے کا شکار رہا اس کے بعد اس نے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ میری نظریں شنواری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پریل نے شنواری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اب بھی لائق ماچھی کو اپنا سردار سائیں تسلیم کرتے ہو؟'' اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ شنواری اچانک پریل کے قدموں میں گر پڑا۔

''سائیں! مجھے معاف کر دو...... ہم لالچ میں آ کر اس بدبخت لانقو کے کہنے میں آ گئے تھے۔ آپ ہی ہمارے سردار سائیں ہو اور کوئی نہیں۔''

پریل نے شنواری کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کر دیا اور بولا۔

''شنواری! میں کسی قسم کا خون خرابا کرنے نہیں آیا ہوں...... ورنہ جانتا ہوں میں کہ اگر اس وقت میں خود کو ظاہر کر دوں تو گروہ میں زبردست جنگ پڑنے اور کشت و خون پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اگر لوگ لائق ماچھی کو اپنا سردار سمجھتے ہیں تو بے شک وہ اس کے ساتھ اپنا الگ گروہ بنالیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں اس کا قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں لیکن اس نے میرے دوست شہزی اور سونہڑیں کے ساتھ جو کمینہ پن کیا ہے، اس کا اس مردود کو حساب دینا ہو گا۔''

''بالکل سائیں! آپ برابر بولتے ہو۔'' شنواری بولا۔ ''آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں...... آپ کو دیکھ کر وفاداروں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ وہ سخت مایوسی کا شکار ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ آپ زندہ ہیں لیکن سائیں! کیا تم جانتے ہو کہ سونہڑیں بھاجائی کے ساتھ اس مردود نے کیا حرکت کی ہے؟''

سونہڑیں کے متعلق اس کے کہنے کا انداز اس طرح کا تھا کہ پریل کا چہرہ یک دم فق ہو گیا۔

''اس نے سونہڑیں کے ساتھ کیا کیا ہے؟ جلدی بتاؤ مجھے......؟'' پریل بپھر کر بولا۔

''بس...... سائیں! اس خبیث نے بھاجائی سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض دوبارہ اس کے باپ زمیندار شاہنواز خان کے حوالے کر دیا ہے......'' اس بار دل مراد نے بتایا اور میں نے دیکھا اس انکشاف پر پریل کا چہرہ ایک دم دھواں دھواں ہو گیا۔ اگرچہ خود میرے لیے یہ خبر غیر متوقع نہ تھی، کیونکہ مجھے پیشگی ہی اس بات کا علم تھا کہ لالچی لانقو...... معصوم سونہڑیں کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے یہ پریل کو بتایا بھی تھا۔

''مم...... میں اب لانقو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......'' اچانک پریل غیظ و غضب سے بولا۔ ''میں اسے معاف کرنے والا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا، لیکن اس مردود نے میری معصوم سونہڑیں کو چند ٹکوں کے لالچ میں دوبارہ اس کے سنگ دل اور بے رحم باپ کے حوالے کر کے اچھا نہیں کیا۔ سونہڑیں کو شدید خطرہ ہے۔ اس کا ظالم اور انا کا مارا ہوا باپ اپنی شان بچانے کے لیے غریب اور معصوم سونہڑیں کو ہلاک کر ڈالے گا۔'' پریل کو وہی دورہ پڑ گیا۔

''میں اسی وقت جاؤں گا...... میں اب نہیں رک سکتا۔ یہ گن

مجھے دو......'' پریل نے دل مراد سے گن جھپٹ لی۔
میں نے بھی ہتھیار کا تقاضا کیا تو شنوازی نے اپنی شلوار کے نیفے سے پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔
''میرا خیال ہے کہ سردار سائیں کا ابھی ڈیرے میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ پہلے رازداری کے ساتھ......'' دل مراد کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت پریل نے اس کی بات رد کردی اور آگے بڑھ گیا۔ ہم اس کے ساتھ تھے۔
صورتِ حال...... معاملہ فہمی سے ہٹ کر اب دوبارہ جنگ کی نہج پر آگئی تھی۔
ڈیرے پر پہنچتے ہی پریل نے اپنی گن کا رخ آسمان کی طرف کر کے ایک عدد ہوائی برسٹ فائر کر دیا۔ مقصد اپنی آمد کا اعلان کرنا اور دشمن کو للکارنا تھا۔ اگرچہ ڈیرے میں داخل ہوتے ہی کئی اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں اور چہروں سے حیرت و مسرت عیاں تھی، بعض لوگ عجیب سی پریشانی اور الجھن کا بھی شکار تھے۔ کئی ڈاکوؤں نے تو پریل کو زندہ دیکھ کر اس کے حق میں نعرے بازی بھی کر ڈالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مجمع لگ گیا اور پریل کے وفاداروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ اسی وقت لائق ماچھی بھی وہاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اس خبیث کو دیکھتے ہی پریل کا مارے طیش کے جو حال ہوا سو ہوا تھا خود میرے اپنے وجود میں بھی نفرت و غیظ کی لہریں امڈ پڑی تھیں۔
پل کے پل وہاں گروہ بندی کی لائن سی آپوں آپ کھنچ گئی۔ وہ سب ہتھیار سنبھالے چوکنا کھڑے تھے۔
''ساتھیو! میں کوئی خون خرابا نہیں کرنا چاہتا......''
پریل نے اپنے غدار نائب کو دیکھنے کے باوجود اپنے اندرونی ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کے ٹوٹے اور ریختہ وجود میں جانے کہاں سے اچانک قوت آگئی تھی، شاید جوشِ جذبہ اسی کو کہتے ہیں۔ پریل کا خطاب جاری تھا۔
''مجھے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مروانے کی کوشش کی گئی اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس سازش کا سرخیل اور کوئی نہیں میرا اپنا ہی نائب لائق ماچھی تھا۔ لیکن اللہ سائیں کو میری زندگی ابھی منظور تھی۔ اس نے میرے دوست شہزاد احمد شہزی کو میرا نجات دہندہ بنا کر میرے پاس بھیج دیا اور اسی میرے جاں نثار دوست نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا۔ جس کی وجہ سے آج میں تم لوگوں کے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔ میں نے اس آستین کے سانپ...... لائق ماچھی کو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس بات پر بھی راضی تھا کہ بے شک جو اس کے ساتھ ملنا چاہے مل جائے اور الگ گروہ کی بنیاد ڈال دے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس بدبخت نے میری ایک مقدس امانت، ایک معصوم لڑکی، جس سے میں محبت کرتا تھا اور جو اپنے ظالم باپ وڈیرے شاہنواز خان کی شان و شوکت کو ٹھوکر مار کر میرے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر چکی تھی، اس غریب کو رقم کے لالچ میں اندھا ہو کر اس بدبخت غدار نے دوبارہ اس ظالم انسان کے حوالے کر دیا۔ اب میں فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں...... جو مجھے اب بھی اپنا سردار تسلیم کرتا ہے، وہ میرے دائرے میں آجائے...... اور جو لائق ماچھی کے ساتھ ملنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف اپنے قدم بڑھا لے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس کے بعد لائق ماچھی کو اپنے جرم کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔''
پریل اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ مجمع میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ میرے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ بالکل ہی عجیب...... میں خود یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی آتش فشاں پر کھڑا ہوں اور جس کے اندر سے کسی وقت بھی ایک خوفناک جوالا مکھی پھوٹ پڑے گا۔ تاہم مجھے پریل کی دانش مندی کا بھی اعتراف تھا کہ اس نے یہاں بھی اپنی معاملہ فہمی سے کام لینے کی کوشش چاہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ پریل کو اپنے گروہ میں اب بھی اپنی اہمیت اور حیثیت کا بغیر کسی خوش فہمی کے پورا احساس تھا۔ وہ بڑی چالاکی اور فہم و فراست سے لائق ماچھی جیسے خطرناک دشمن غدار کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند ہی لمحے بعد اس کے ثمرات میری آنکھوں کے سامنے تھے۔
ہمارے ساتھ جو اسلحہ بدست ڈاکو شامل ہوئے تھے، ان کی تعداد لائق ماچھی سے کہیں زیادہ تھی۔ جبکہ لائق ماچھی کے ساتھی، تعداد میں آٹے میں نمک کے برابر تھے اور جو تھے وہ بھی الجھن کا شکار ہی معلوم ہوتے تھے۔ پریل نے اپنی جان دار حکمتِ عملی سے اپنے دشمن کو تنہا کر کے رکھ دیا تھا اور اب اس کے ساتھی جیسے حکم کے منتظر تھے کہ وہ لائق ماچھی جیسے غدار کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے ایک بار پھر پریل کی زود فہمی اور دانش مندی کا قائل ہونا پڑا۔
''ہم تمہارے ساتھ نہیں چل سکتے...... ہم جانا چاہتے ہیں۔'' معاً خبیث لائقو نے کہا اور میں اس کی شاطرانہ مکاری پر اندر ہی اندر کھول اٹھا مگر بولا کچھ نہیں۔ ابھی یہ معاملہ مکمل طور پر پریل کے سپرد تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے پریل کو پُرطیش عالم میں اس کی طرف قدم بڑھاتے

ہوئے دیکھا اور پریل نے لائق ماچھی کے قریب پہنچ کر اس کا گریبان دبوچ لیا۔

''تجھے پہلے اپنے جرم کا حساب دینا ہوگا...... لائقو! لیکن میں اپنی زبان پر بھی قائم ہوں کہ میں نے اپنا جرم تجھے معاف کر دیا ہے لیکن...... تو نے میری سونہڑیں کے ساتھ جو قبیح اور انتہائی گری ہوئی حرکت کی ہے، اس کا تجھے ابھی حساب چکتا کرنا ہوگا۔''

''نہیں سردار سائیں......!'' اچانک ایک ساتھی ڈاکو نے بہ آواز بلند پریل چانڈیو سے کہا۔ ''اس غدار کمینے کو تمہارا حساب بھی دینا ہوگا...... اس نے تمہاری پیٹھ میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں بھی بزور دھمکی اور زبردستی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، اس کا جرم معمولی نہیں ہے۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔'' اس کی بات پر مجمع میں شور بلند ہوا۔

''غدار کی سزا موت...... غدار کی سزا موت......''

ایسے ہی فیصلہ کن لمحات نے مجھے بھی اس کی جانب قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا اور میں چند قدم اٹھاتا ہوا پریل کے قریب پہنچا اور اس سے کہا۔

''پریل! اس وقت سونہڑیں کا معاملہ سب سے اہم ہے۔ ہمیں اس کے لیے جلد سے جلد کچھ کرنا ہوگا...... ابھی اس معاملے کو اِدھر ہی رہنے دو اور لائق کو قید میں ڈال دیا جائے...... اسے پھر دیکھتے ہیں......''

پریل کو میری یہ تجویز معقول لگی اور اس نے یہی حکم دے ڈالا...... چنانچہ لائق ماچھی اور اس کے چند ساتھیوں کو ایک جھونپڑے میں رسن بستہ کر کے مقید کر دیا گیا۔ پریل کے ساتھیوں کا ارادہ، اپنے سردار سائیں کی واپسی کی خوشی میں جشن منانے کا تھا لیکن پریل نے منع کر دیا اور اسی وقت وڈیرے شاہنواز خان کی حویلی پر ہلا بولنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

سونہڑیں کی دستیابی کے علاوہ میں نے پریل سے ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی اس کے قبضے سے آزاد کرانے کا ذکر خاص طور پر کیا تھا جبکہ شکیلہ بھی اسی کے قبضے میں تھی۔ مجھے یہ معلوم تو نہ تھا کہ شکیلہ کو جب زمیندار شاہنواز نے اپنے حواریوں کے ساتھ وہ طلسم نوز ہیرا ڈھونڈنے کے لیے پرانے قبرستان کی طرف روانہ کیا تھا تو اس کا ''کھڑتیل'' کیا برآمد ہوا تھا؟ ظاہر تھا کہ وہ بھی شاہنواز کی قید میں ہی ہوگی اب...... ساتھ ہی مجھے فکر وتشویش بھی تھی کہ وہ ہیرا اس خبیث آدمی کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ کبیل دادا اور اول خیر بھی پولیس لاک اپ میں تھے۔ ان سے متعلق بھی میں نے خاص طور پر پریل سے ذکر کیا تھا۔ پریل نے مسکرا کر مجھے اس بات کی تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اب کیوں فکر کرتا ہے میرے یار شہزی! وڈیرے اور اس کے راتب خور انسپکٹر رجب دین نے تیرے اور تیرے ساتھیوں کے خلاف جو غیر قانونی ہتھکنڈا استعمال کیا ہے میرے لیے وہی ہتھیار استعمال کرنا آسان ہے۔ بس، دیکھتا جا تو......''

پریل نے اپنے چند ڈاکو ساتھیوں کا انتخاب کیا...... مجھے بھی ایک عدد کلاشنکوف تھما دی گئی۔ اس کے بعد ہم سب تیز رفتار گھوڑوں پر شاہنواز خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کی حدود سے نکل کر جب ہم شاہنواز خان کے گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے تو پریل نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے دو ساتھی جاسوسوں کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے حویلی روانہ کر دیا۔ ہم سب وہیں موجود رہے۔ گوٹھ کی اس سمت پر کیکر کا گھنا جنگل تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ شاہنواز اتنا نچلا بیٹھے رہنے والا آدمی نہیں ہوسکتا تھا۔ حویلی پر حملے اور بیٹی کے ''اغوا'' اور لائق ماچھی کی غداری کے سبب دوبارہ اپنی بیٹی سونہڑیں کو حاصل کرنے کے بعد وہ بھی محتاط ہو گیا ہوگا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک خیال بھی، اس کے مطمئن اور غیر محتاط ہونے کا ضرور ابھرتا تھا کہ لائق ماچھی سے ساز باز (تاوانِ زر کی صورت) کے دوران، ممکن تھا کہ اس نے شاہنواز کو بتایا ہو کہ پریل اب زندہ نہیں رہا تھا۔ میں نے جب اس کا اظہار پریل سے کیا تو وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''لائق ماچھی میرے متعلق یہ بات شاہنواز خان کو کبھی نہیں بتا سکتا۔ بلکہ اگر وہ یہ بتانے کی بیوقوفی کرتا تو اس کا دبدبہ کمزور پڑنے لگتا۔ اس نے تو میرا ہی نام استعمال کیا ہوگا...... کیونکہ شاہنواز کے دل و دماغ پر آج بھی میری ہی دہشت طاری ہے۔ لہٰذا لائقو نے یہی بتایا ہوگا کہ میں نے اس کی بیٹی کو تاوان کے لیے ہی اغوا کیا تھا۔'' پریل کی بات پر میں نے پُرغور انداز میں اپنی بھویں اچکالیں۔

خاصی دیر بعد پریل کے دونوں مذکورہ جاسوس لوٹے تو انہوں نے اطلاع دی کہ شاہنواز خان کی حویلی کے گرد مسلح حواریوں کے علاوہ پولیس کے کچھ اہلکار بھی تعینات کر دیے گئے تھے۔

''پولیس متعلقہ تھانے سے تعلق رکھتی ہے یا شہر سے

بلوائی گئی ہے؟'' پریل نے ایک جاسوس ساتھی سے پوچھا۔
''وہاں کھڑی دو پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گوٹھ کے تھانے کی ہیں۔'' جاسوس نے جواب دیا۔
''ہوں......'' پریل نے پُرسوچ ہنکارا ابھرا۔ پولیس کے ذکر پر میری پیشانی پر بھی سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ پریل اب بھی حویلی پر چڑھائی کا ہی حکم صادر کرے گا مگر اس نے ساتھیوں کو متعلقہ تھانے پر ہلّا بولنے کا حکم دیا۔ مجھے اس کی حکمتِ عملی کے یکدم بدلنے پر حیرت تو ہوئی لیکن یہاں کے معاملات اور حالات کا مجھ سے کہیں زیادہ پریل ہی ادراک رکھتا تھا اسی لیے میں خاموش رہا۔

چنانچہ رات کی تاریکی میں ہم گھوڑوں کو درمیانی رفتار سے دوڑاتے رہے اور پھر ایک مقام پر پریل نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

پریل نے جلد ہی میری الجھن رفع کر دی اور بتا دیا کہ تھانے پر دھاوا بولنے کے دو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں...... ایک تو یہ کہ وڈیرے کی حویلی پر تعینات پولیس اسی طرف دوڑی چلی آئے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ہم گبیل دادا اور اول خیر کو چھڑا سکتے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی تو لاجواب تھی لیکن...... میں تب بھی مطمئن نہ ہوا تھا، بولا۔
''لیکن کیا اس طرح ایک قانونی عمارت پر حملہ کرنا صورتِ حال کی خطرناکی کو بڑھانے کا سبب نہیں؟ میرا مطلب ہے......'' میں رکا پھر بولا۔
''یار! برا مت منانا...... تمہارا معاملہ اور ہے۔ لیکن اس طرح میں اور میرے ساتھی بھی سنگین جرم کی لسٹ میں آ سکتے ہیں۔'' میری بات پر پریل مسکرا کے بولا۔
''تم میرے محسن ہو شہزی! میں بھلا تمہاری بات کا کیوں برا مناؤں گا لیکن میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں...... بے فکر رہو...... ایسا کچھ نہیں ہوگا...... تم اور تمہارے ساتھی اس وقت کسی حقیقی قانون کی زد میں نہیں بلکہ جنگل کے قانون میں پھنسائے گئے ہو...... پھر اس قومی امانت (طلسم نور ہیرا) سے متعلق معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے جو صرف...... شاہنواز کے لیے ہی نہیں بلکہ خود اس راتب خور انسپکٹر رجب دین کے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے۔ ان پر غداری کا کیس بن جائے گا، اس حقیقت کا انہیں بھی علم ہوگا اسی لیے مجھے یقین ہے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں سے متعلق ایسا کوئی ریکارڈ وہاں نہیں رکھا گیا ہوگا اور یہ جو کچھ تم لوگوں

سیدھی سی بات

شادی کے چند ماہ بعد شوہر نے رومان پرور موڈ میں بیوی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر حسین ہونے کے باوجود بے وقوف کیوں ہو؟''
''کمال ہے کہ یہ سیدھی سی بات گزرے ہوئے مہینوں میں بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی!'' بیوی نے برجستہ جواب دیا۔
''ذرا میں بھی سنوں کہ وہ سیدھی بات کیا ہے؟''
''حسن میں میرا کوئی کمال نہیں...... اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ہی پیدا کیا تاکہ تم میری طرف متوجہ ہو جاؤ اور مجھ میں ذرا سی سادگی یا بے وقوفی اس لیے رکھ دی تاکہ میں تم جیسے نکمے آدمی سے شادی پر رضامند ہو جاؤں۔''

اسلام آباد سے ہما احمد کا جواب

کے ساتھ ہوا، وہ بدمعاشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔''
پریل نے اپنی بات ختم کی تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ پریل ایک ڈاکو ہی نہیں بلکہ سمجھدار انسان بھی ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ساتھیوں کے متعلق حالات کا جو تجزیہ کیا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ دشمنوں کو بھلا ایک درست بات کو غلط موڑ دینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھے سوچتا پا کر وہ میرے کاندھے کو تھپکتے ہوئے بولا۔

''فکر مت کرو دوست! یہ شاہنواز اور قانون کی وردی پہنے ہوئے رجب دین بھی جرم کی راہ پر گامزن ہیں اور خود سب سے بڑے چور ہیں۔ تم میرے ایک ساتھی کے ساتھ تھانے سے دور ہی رہنا، میں اور میرے باقی ساتھی ہلّا بول کر صرف تمہارے ہی نہیں بلکہ وہاں موجود سارے حوالاتیوں کو آزاد کر دیں گے۔''
''نہیں میرا بھی تمہارے ساتھ چلنا ضروری ہے...... پریل! اپنے ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے میں، پیچھے میں بھی نہیں ہٹوں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔
تھانہ زیادہ دور نہ تھا۔ پریل کے کہنے پر اس کے ایک ساتھی نے میرے چہرے پر بھی اجرک کا ڈھاٹا باندھ دیا۔

مجھے یہ سوچ کر دل میں ہنسی آگئی کہ کیا وقت آگیا مجھ پر کہ سندھ کا ڈاکو بھی آج بننا پڑ گیا تھا مجھے۔

گوٹھ کی آبادی سے ہٹ کر ہم کیکر کے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے کھیتوں کھلیانوں کی طرف نکل آئے اور اس کے بعد چند فرلانگ مزید آگے بڑھے تھے کہ ہمیں مدھم سی روشنی میں ذرا ہی دور ایک پیلی سی سالخوردہ عمارت دکھائی دینے لگی...... پتا نہیں یہاں اول خیر اور کبیل دادا بے چارے کن حالوں میں ہوں گے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ انہیں اپنے سے زیادہ میری اور شکیلہ کی فکر کھائے جا رہی ہو گی۔

انسپکٹر رجب دین کے شاید تصور میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے اپنے جس راتب نواز (زمیندار شاہنواز) کی حفاظت کے لیے پورے تھانے کی اچھی خاصی نفری متعین کر رکھی تھی، اس کی ضرورت اسے بھی پڑ سکتی تھی۔

تھانے کے مین گیٹ کے سامنے مختصر سا میدان تھا، دائیں جانب کیلے کے لمبے چوڑے پتوں والے جھاڑ دار کھیتوں کے سلسلے کا آخری سرا ملتا تھا۔ بائیں جانب کیکر کا جنگل اور عقب میں قبرستان کی حدود تھی۔ پریل نے اپنے دستے کے نصف ساتھیوں کو آخر الذکر راستے سے عمارت پر نقب لگا کر پیچھے حملہ کرنے کا حکم دے کر روانہ کر دیا اور خود اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بائیں جانب روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ تاہم پریل نے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ خون خرابا اور قتل کسی کا نہ ہونے پائے، بلکہ زیادہ سے زیادہ دہشت ناکی پھیلائی جائے اور اشد ضرورت یا خطرے کے پیشِ نظر صرف زخمی کیا جا سکتا تھا۔ تھانے کی عمارت کو بھی صرف اسی حد تک نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے کہ قیدی باہر نکل کر راہِ فرار اختیار کر سکیں......

ان ہدایات کے تھوڑی دیر بعد ہی تھانے پر چڑھائی کر دی گئی۔ پہلا گروپ تھانے کی عقبی دیوار پھاند کر اندر جا کودا اور اس نے اچانک حملہ کر کے ہلّا بول دیا۔ جبکہ ہمارے گروپ نے کیلے کے کھیت کی جانب سے رخ کیا۔

گھوڑے ہم نے تھوڑی دور ہی باندھ دیے تھے اور ہتھیار سنبھالے پتوں کی آڑ لیے عمارت کے دائیں جانب کی دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں اپنے دوسرے گروپ کی کارروائی کا انتظار تھا تا کہ مین گیٹ اور تھانے کے مرکزی راستے پر موجود پولیس اہلکار شور یا ہنگامے کی آواز پر اندر کا رخ کرتے اور وہی ہوا۔ جیسے ہی اندر شور اور ایک دو برسٹ کھڑکنے کی آواز ابھری، ہم نے مین گیٹ سے دھاوا بول دیا۔

ایک چھوٹے سے گوٹھ کا تھانہ کتنا بڑا ہوگا، اس کا اندازہ اس کی عمارت اور نفری کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

پریل کو رجب دین کی تلاش تھی اور مجھے اپنے ساتھیوں کی...... ہمارے سامنے چند پولیس اہلکاروں نے ڈٹ جانے کی کوشش چاہی تھی اور ہم پر انہوں نے گولیاں بھی برسا دیں۔ نتیجے میں ہمارے دو ساتھی زخمی ہو کر گر پڑے، باقی ساتھی اِدھر اُدھر آڑ میں ہونے لگے مگر پریل اور میں نے اپنی کلاشنکوفیں سیدھی کر ڈالیں اور ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ نشانہ ان کی ٹانگیں تھیں مگر شاید کوئی بھولی بھٹکی گولی ایک سپاہی کی گردن میں پیوست ہو گئی۔

یہ پریل کے فائر کیے ہوئے برسٹ کی گولی تھی۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو پولیس والوں کے ہاتھوں گولی کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یوں شاید بپھر کر اس نے ان پر اندھا دھند فائرنگ کر ڈالی تھی۔ وہ چاروں چیخیں مارتے ہوئے گرے اور تڑپنے لگے۔

پریل شاید انسپکٹر رجب دین کی تلاش میں مختلف کمروں میں جھانکتا رہا، مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تو اس نے ایک زخمی پولیس والے سے پوچھ لیا، اس نے بتایا...... وہ اپنے کوارٹر میں تھا۔ پریل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر اسی طرف کو بڑھ گیا جہاں لائن سے پانچ چھ کوارٹرز بنے ہوئے نظر آ رہے تھے جبکہ میں نے حوالات کی طرف کا رخ کیا۔

پریل نے ساتھیوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ میرا حکم مانیں گے مگر مجھے کسی کو حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ یہ سبھی ایک "پلانٹڈ" منصوبہ بندی کے تحت "مصروفِ کار" تھے۔ ایک نے حوالات کی طرف دستی بم اچھال دیا جو ساعت شکن دھماکے سے پھٹا...... ہر طرف دھواں اور بارود کی بُو پھیل گئی۔ ہمارا مقصد قتل و غارت نہیں تھا صرف ہراس پھیلانا تھا تا کہ حویلی پر تعینات کی ہوئی دوسری پولیس پارٹی اس طرف متوجہ ہو سکے نیز ہم اپنے ساتھی اول خیر اور کبیل دادا کو بھی پولیس کے چنگل سے چھڑا سکیں اور یہ کام پریل کے ڈاکو ساتھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے جبکہ مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش تھی۔

حوالات کا دروازہ ٹوٹتے ہی قیدیوں کی خاصی تعداد شور مچاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ گھبرا وہ بھی گئے تھے اس ناگہانی افتاد پر...... تاہم اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کی انہوں نے بھی ٹھان رکھی تھی، میں نہایت بے چینی اور

دھڑکتے دل کے ساتھ اول خیر اور گبیل دادا کو تلاش کررہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہے تھے، ایک خیال آیا کہ کہیں وہ بھی اس افراتفری اور ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر نکل نہ بھاگے ہوں اور میری ان پر نظر نہ پڑسکی ہو۔ لیکن حوالات یا مختصر سی جیل میں قیدی ہوتے ہی کتنے ہیں؟ میں نے ایک ایک قیدی اور بھاگتے ہوئے حوالاتی کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اول خیر یا گبیل دادا مجھے اس ڈھاٹے میں شاید نہیں پہچان پاتے۔

میں پریشان اور بے چین ہوگیا۔ اسی وقت گولی چلی...... اور مجھے اپنی کنپٹی کے بالکل قریب ''جھپک'' سی محسوس ہوئی۔ بس، ایک آدھ انچ کا ہی فاصلہ رہا ہوگا ورنہ میں اگلے جہاں سدھار چکا ہوتا۔ قریب سے گزرتی موت کی اس ہولناک سرگوشی نے میرا دماغ جھنجھنا ڈالا اور میں نے تیزی کے ساتھ جھکائی دے کر پلٹا کھایا تو ایک پولیس مین اپنی رائفل سے مجھے دوسری گولی ٹھونکنے کی تیاری میں تھا۔ وہ ایک کمرے کی دیوار کی آڑ میں تھا، میرے پاس فوری طور پر اس کی دوسری متوقع فائر ہونے والی گولی سے بچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بھی اس پر جوابی فائر کرتا لیکن ابھی میں بچنے کے لیے متحرک ہوا ہی تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا بوکھلایا قیدی، بڑے زور سے مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ کم بخت خاصا بھاری بھرکم اور موٹا تازہ تھا۔ میرا توازن بگڑا اور میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ تب ہی مجھے قریب سے دوسری گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا جس میں اسی بھاگتے ہوئے مجھ سے ٹکراتے قیدی کی لرزہ خیز چیخ بھی شامل تھی۔ وہ میرے بجائے اسی پولیس والے کی گولی کا شکار ہوگیا تھا جبکہ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں جہاں لڑکھڑا کر گرا تھا وہاں وہی قصائی پولیس اہلکار رائفل سنبھالے کھڑا تھا جس نے دوبار مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اس کے نشانے پر تھا۔ ایک اور بدقسمتی تو یہ ہوئی کہ میری کلاشنکوف بھی ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا پرے جاگری تھی۔

اس نے اپنے شکار کو اتنے قریب اور آسان ''ہدف'' میں دیکھا تو دوبارہ مجھ پر اپنی رائفل سونت لی۔ موت کو اچانک اور غیر یقینی انداز میں اس قدر اپنے قریب پا کر میں خود ایک لمحہ کو دم بہ خود سا رہ گیا اور یہ سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ میرے ساتھ تقدیر نے یہ کیسا مذاق کیا تھا کہ مجھے ایک طرف موت سے بچایا بھی اور دوسری طرف پل کے پل اجلِ بے رحم کے دہانے پر گرا بھی دیا۔ تیسری گولی چلی تھی اور مجھے اسی پولیس اہلکار کی کریہہ انگیز چیخ سنائی دی۔ میں زندہ تھا اور تقدیر کو میں نے غیر مرئی نگاہوں سے مسکراتے دیکھا، تب ہی میں پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ پریل تھا، جو نجانے وہاں اچانک کب اور کیسے نمودار ہوا تھا کہ اس نے مجھے اس پولیس اہلکار کے نشانے پر دیکھ کر اسے اپنی گن سے نشانہ بنا ڈالا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہوناں......؟'' اس نے میرے قریب آکر پوچھا۔ ''میں نے اصل کام نمٹا دیا ہے۔ اس رذیل انسپکٹر رجب دین کو دھمکا کر میں نے حویلی سے باقی نفری بلوالی ہے۔ اب اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچیں، ہمیں حویلی کی طرف چلنا ہوگا۔ اور یہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟''

میں نے فکر و تشویش سے کہا۔ ''پرو! میں ابھی تک انہیں ڈھونڈ رہا ہوں...... وہ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں......''

پرو میری بات پر چونکا۔ کچھ سوچا۔ اس کے بعد مجھے چند جملوں میں تسلی دی اور پھر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' کہہ کر وہ پھرتی سے پلٹا، میں حیران و پریشان اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ مجھے لیے تھانے کے احاطے میں اس جگہ پر آگیا جہاں لائن سے چند کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک میں جا گھسا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر ایک کمرے میں انسپکٹر رجب دین رسن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ وہ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ پریل نے خوف ناک انداز میں اسے گھورتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنی کلاشنکوف کی نال رکھ دی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پہ خوف اتر آیا.... وہ گھگیا کر بولا۔

''م...... مجھے مت مارو...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں...... میں نے تمہاری ہر بات مان لی ہے۔''

''بکواس بند کر اپنی......'' پرو چانڈیو حلق کے بل دہاڑا اور پھر اس نے اول خیر اور گبیل دادا کے بارے میں پوچھا تو رجب دین نے میری جانب دیکھا۔ میرا چہرہ اگرچہ اجرک کے ڈھاٹے میں ملفوف تھا لیکن رجب دین کو مجھ پر اس سوال کے بعد شبہ ہونا عین فطری امر تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''م......''

''خبردار......! جھوٹ مت بولنا......'' پرو دہاڑا۔ ''میں تصدیق کیے بغیر نچلا نہیں بیٹھوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا جھوٹ بولنے سے پہلے۔''

پرو کے اس طرح پیشگی ''وارن'' کرنے پر بالآخر انسپکٹر رجب بولا۔ ''وہ...... وہ دونوں اس کے ساتھ والے

کوارٹر میں موجود ہیں......'' یہ بتاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پرو کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ میں بے چین تھا۔ پرو پلٹا اور مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

ابھی اس کوارٹر سے باہر نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک باہر فائرنگ کی آواز سنائی دی ساتھ ہی ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں بھی ابھریں...... میں اور پریل یہی سمجھے تھے کہ حویلی والی نفری یہاں آن پہنچی تھی۔ لیکن...... جب ہم نے دروازے سے باہر ذرا جھانکا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... تھانے کے احاطے میں......اور باہر رینجرز کی وردی میں ملفوف مسلح نوجوان پرو کے واپس لوٹتے ہوئے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے پاس مخصوص اونچے اور چوڑے ٹائروں والی جیپیں تھیں۔ وہ سب جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔

''اینٹی ڈکیت فورس......''

معاً ہی ساتھ کھڑے پرو چانڈیو کو میں نے زیرلب بڑبڑاتے پایا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ میں خود بھی اس نئی صورتِ حال سے پریشان ہو گیا تھا۔ یہ کوئی عام فورس نہ تھی۔ رینجرز کے انتہائی تربیت یافتہ اہلکار تھے۔ پتا نہیں کیسے انہیں اطلاع دی گئی تھی یا پھر یہ لوگ پہلے سے ہی کسی ''آپریشن کلین اَپ'' میں مصروف تھے۔ ان کے اندر مختلف ونگس کام کرتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر ''لاء انفورسمنٹ''، ''پاور'' (جواب ڈراپ کی جاچکی تھی اور اس ونگ میں، میں خود بھی شامل تھا، بعد میں اول خیر اور شکیلہ بھی)، اینٹی ٹیررسٹ ونگ'' اور اینٹی ڈکیت ٹاسک فورس'' تھیں۔

''شہزی! ہوشیار...... ہمارا اب باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ کوئی عام پولیس فورس نہیں ہے۔''

اب اسے کیا پتا تھا کہ اس سے زیادہ میں یہ حقیقت جانتا تھا۔ میں خود کئی سال پہلے رینجرز کے ایک خصوصی اور خفیہ ونگ ''پاور'' کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ تاہم بولا۔

''او...... اس کا مطلب ہے ہم خطرے میں گھر گئے ہیں...... میرے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ وہ ساتھ والے کوارٹر میں قید ہیں۔'' (بقول انسپکٹر رجب دین کے)

''میرے اپنے ساتھی بھی اس وقت اینٹی ڈکیت فورس کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں، مجھے ان کی مدد کو جانا ہوگا......'' پرولرزتے لہجے میں بولا۔ ''تم اس کوارٹر کی چھت پر جا کر ساتھ والے کوارٹر میں ٹاپ جاؤ...... مجھے ان سے مقابلہ کرنا ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکلنے لگا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''پرو! میرے یار! تو ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ انتہائی تربیت یافتہ......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرو میرا ہاتھ چھڑا کر یہ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''میں اپنے ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑ سکتا......''

میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ باہر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ جاری تھی۔ میں تیزی سے کوارٹر کی چھت پر جا پہنچا۔ مجھے بار بار...... یہ خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر میں یا میرا کوئی ساتھی اینٹی ڈکیت فورس کے ہتھے چڑھ گیا تو ان پر سنگین مقدمہ بھی قائم ہوسکتا تھا اور وہ ہمیں بھی ان ڈاکوؤں کا ساتھی ہی سمجھیں گے جبکہ باقی کی کسر انسپکٹر رجب دین اور وڈیرا شاہنواز پوری کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

ان اندیشوں نے مجھے...... سرتاپا لرزہ سا دیا اور میں تیزی کے ساتھ چھت کی دیوار ٹاپ کر دوسرے کوارٹر کی چھت پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ مجھ پر باہر کہیں سے ایک برسٹ فائر ہوا...... زندگی باقی تھی کہ بچ گیا۔ وگرنہ تو اس برسٹ نے میرا سر اُڑا دینا تھا۔ گولیوں کی پوری باڑھ کو میں نے اپنے سر کے اوپر سے گزرتے دیکھا تھا جس کی ہولناک آتشیں جھپک بھی مجھے صاف محسوس ہوئی تھی۔ یہ بات خطرے سے کم نہ تھی کہ میں بھی رینجرز فورس کی نظروں میں آ گیا تھا۔

دوسرے کوارٹر کی چھت ٹاپ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا...... نیچے آیا اور کھلے صحن میں آ کر دیکھا یہاں دو ہی کمرے تھے۔ ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ کمرا خالی تھا جبکہ دوسرے کا بند تھا۔ میں ابھی اسی کمرے کا دروازہ توڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک داخلی دروازہ ایک زبردست دھڑاکے سے ٹوٹ کر گرا اور کئی مسلح رینجرز اہلکار اندر گھس آئے۔

''خبردار...... ! حرکت مت کرنا...... ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔'' ان میں سے ایک نے درشت اور رعب دار آواز میں کہا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے حکم دینے والا ایک دراز قامت اہلکار تھا۔ وہ کیپٹن کی وردی میں ملفوف تھا۔

''گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لو......''

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی اور ساتھ ہی اپنے چہرے سے اجرک کا ڈھاٹا بھی اتار دیا۔ کیپٹن کا لب و لہجہ پنجابی اردو تھا۔

''کیپٹن آصف صاحب! میں ان ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہوں اور اندر اس کمرے میں میرے ساتھی......''

''شٹ اپ......'' کیپٹن آصف نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ اس کے سرخ رنگ کے چیسٹ ٹیگ پر اس کا نام کیپٹن آصف بٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک میری ہی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرہ گورا چٹا اور کلین شیو تھا۔ جسم کی ساخت مناسب تھی۔ قد و قامت بھی ٹھیک ہی تھا۔

مجھے گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ میری جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ مجھے بولنے نہیں دیا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ میں ان کے سامنے ابھی اپنی مرضی سے کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکوؤں کے گروہ کا شاید سرغنہ ہی سمجھے ہوئے تھے۔

کیپٹن آصف نے دو اہلکاروں کو مذکورہ کمرے کا دروازہ بھی کھولنے کا حکم دیا۔ میری دھڑکتی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں...... دروازہ توڑ دیا گیا اور اندر سے کبیل دادا اور اول خیر کو بھی باہر نکالا گیا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے۔ ساتھ ہی اس نئی صورتِ حال پر ان کے بشروں سے تشویش آمیز حیرانی بھی مترشح ہونے لگی تھی۔ انہیں بھی بولنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری آنکھوں پہ پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ہمیں بازوؤں سے پکڑے باہر لے آئے۔ فائرنگ کی گھن گرج معدوم ہو چکی تھی۔ کسی اہلکار کو میں نے مؤدبانہ انداز میں کیپٹن آصف سے یہ کہتے سنا۔

''سر! آپریشن کلیئرڈ...... بہت سے ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ کئی پکڑے گئے ہیں۔ ان کا سرغنہ بھی مارا گیا ہے......''

اس آخری بات پر میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، کرب اور تاسف کی ایک لہر سی میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

''سرغنہ سے تمہاری مراد پریل چانڈیو ہی ہے...... مختیار احمد؟'' مجھے کیپٹن آصف کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔

''یس سر!'' اس کے ماتحت نے مؤدبانہ کہا۔ ''ہم نے ان کے گرفتار شدہ ساتھی سے تصدیق کروا لی ہے اور تصویر سے میچ بھی کر لیا ہے۔''

میرے اندر کرب و درد...... کی لہر کسی تیز دھار خنجر کی طرح مجھے چرکے لگائے جا رہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے بدنصیب سونہڑیں کی معصوم صورت گردش کرنے لگی۔

''یہ بھی مجھے اس کا نائب لگتا ہے۔ اس سے بھی تصدیق کروا لینا چاہیے، آگے بڑھو......'' کیپٹن آصف کی آواز ابھری۔

ہم آگے بڑھے۔ چند قدم ان کے سہارے چلنے کے بعد رک گئے۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ جبکہ کبیل دادا اور اول خیر کی آنکھوں میں ہنوز پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پٹی ہٹتے ہی...... میں نے خود کو رینجرز فورس کی خاصی تعداد کے درمیان پایا۔ ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھمی تھیں۔ کچھ ڈاکو بھی ان کی گرفت میں تھے۔ یہ تھانے کا وسیع احاطہ تھا۔ وہاں لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لاش کو دیکھ کر میری روح تک رنجور ہو گئی، اس کے پیٹ پر گولیوں کا پورا مہیب برسٹ فائر کیا گیا تھا، جس کے باعث انتڑیاں باہر کو ابل پڑی تھیں۔ وہ پریل چانڈیو کی لاش تھی...... اس پریل چانڈیو کی جوان رینجرز والوں کی نظروں میں بے شک ایک خطرناک اشتہاری ڈاکو رہا ہوگا، مگر اس کی اصل اور دردناک کتھا سے کوئی نہیں واقف تھا۔ اسے گولیوں کا نشانہ بنانے والوں کے پاس بھلا کب اتنا فالتو وقت ہوگا کہ...... وہ اس سے پوچھتے کہ تمہیں ڈاکو بنانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ ان لوگوں کا، جو شرفا کے بھیس میں اس دوغلے معیار کے سماج میں اس سے زیادہ کریہہ اور خطرناک ڈاکو بنے بیٹھے ہیں...... یا وڈیرے شاہنواز خان کا...... جو ملک کا غدار تھا جس نے ایک قومی امانت چوری کی تھی اور پریل جیسے ایک غریب اور نیک سیرت ہاری کو اپنے روایتی جبر تلے کچل کر ڈاکو بننے پر مجبور کر ڈالا تھا یا پھر قانون کی وردی میں اس راتب خور پولیس انسپکٹر رجب دین کا...... جس کے پاس پریل انصاف مانگنے آیا تھا اور الٹا اسے ہی دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ پریل ایک غریب ہاری (کسان) کا بیٹا تھا؟

''پہچانو اسے...... کیا یہی تمہارا سرغنہ پریل چانڈیو ہے......؟'' معاً کیپٹن آصف نے مجھے تحکمانہ درشتی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا سرغنہ نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کا کبھی ساتھی رہا ہوں...... کیپٹن آصف صاحب!''

پل کے پل میرے لب و لہجے میں ایک عجیب طرح کا جوش اور دبدبہ امڈ آیا تھا۔

''اے مسٹر! اپنی آواز نیچی اور لہجہ مدھم رکھو...... سمجھے

تم......؟'' کیپٹن آصف نے درشت لہجے میں مجھ سے کہا تو میں... دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدستور اسی ٹھنڈی ہوئی متانت اور لب و لہجے میں بولا۔

''کیپٹن صاحب! آپ مجھے بولنے کا کوئی موقع دیں گے تو میں کچھ اپنے بارے میں تفصیل بتا پاؤں گا کہ میں......''

''بکواس بند کر اپنی...... اور جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دو صرف......'' اس خرانٹ رینجرز آفیسر نے پھر میری بات کاٹی تو میں نے بھی اسی روانی سے کہا۔

''میں آپ کے سوال جواب دے چکا ہوں۔''

''یہ پریل چانڈیو ہی کی لاش ہے؟''

''ہاں۔''

''کلیئر۔''

اسی وقت دو تین رینجرز اہلکاروں کچھ پولیس کے آدمیوں کے ساتھ انسپکٹر رجب دین وہاں آ گیا اور ہماری طرف دیکھتے ہی وہ کیپٹن آصف سے بولا۔

''یہ تینوں بہت خطرناک مجرم ہیں سر! میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ سخت طیش میں نظر آ رہا تھا اور بڑی کھا جانے والی نظروں سے ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی بروقت آمد سے...... یہ تینوں بھی گرفت میں آ گئے...... یہ بہت اچھا ہوا، اپنے مجرم ساتھیوں کو قانون کی حراست سے چھڑانے کے لیے اس خطرناک مجرم نے صوبائی شہرت یافتہ ڈاکو پرو چانڈیو کی مدد لی تھی اور تھانے میں دھاوا بولنے کا سنگین جرم بھی کیا ہے۔'' اس نے آخر میں میری جانب اشارہ کیا تھا۔ وہ ایک خفیہ ''ایجنڈے'' کے تحت، ہم تینوں کے لیے بار بار ''خطرناک'' کا لفظ بڑی روانی کے ساتھ استعمال کر رہا تھا۔

''اوکے...!'' کیپٹن آصف نے کہا۔ ''ہمیں زمیندار شاہنواز صاحب نے پہلے ہی سے بتا رکھا تھا کہ ان کی بیٹی کے اغوا میں بھی انہی کا ہاتھ تھا۔ بہرحال ہمیں کیس سے متعلق مزید بریفنگ درکار ہے۔''

''سر! آپ میرے کوارٹر میں تشریف لائیں...... میں آپ کو کیس سے متعلق ہی نہیں بلکہ مزید سنسنی خیز تفاصیل سے بھی آگاہ کر دوں گا...... تھانے کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں......''

مجھے معلوم تھا کہ رجب دین انہیں کیا اور کس قسم کی ''تفصیلی'' بریفنگ دینے والا تھا۔ تاہم میں خاموش رہا تھا۔ کمیل دادا اور اول خیر بہت زیادہ فکرمند اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ خود میں بھی کم پریشان نہ تھا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گاڑیوں میں سوار کرا دیا گیا اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

صورتِ حالات ایک دم گمبھیر اور اس سے زیادہ سنگین ہو چکی تھی۔ رینجرز فورس سے جان چھڑانا اتنا آسان نہ تھا اس پہ مستزاد...... پولیس انتظامیہ بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک اور صوبائی شہرت یافتہ بدنام ڈاکوؤں کے گروہ سے الحاق کا الزام اس پر سوا تھا......

اس ساری خوں ریز کشاکشی میں شاہنواز خان، جو اس کا اصل سبب بنا تھا، مجھے اس کی قسمت بڑی یاور محسوس ہوئی تھی۔ وہ کم بخت اس سارے بکھیڑوں میں بڑے آرام سے نہ صرف دودھ میں بال کی طرح نکل کر صاف بچ نکلا تھا بلکہ معزز اور مظلوم بھی کہلایا جانے والا تھا۔ وہ اب ہر طرح کا گل کھلانے کے لیے آزاد تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن پرو چانڈیو اینٹی ڈکیت فورس کے ہاتھوں مارا گیا تھا جس کا مجھے جتنا بھی افسوس ہوتا، وہ کم ہی تھا۔ شکیلہ اور ارم اس کے قبضے میں تھیں۔ طلسم نور ہیرے تک اس کی رسائی ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس کی بیٹی سونہڑیں اس کے پاس پہنچا دی گئی تھی۔ پرو چانڈیو کے گروہ کا تقریباً قلع قمع ہو چکا تھا اور ہم قانون کی گرفت میں آ چکے تھے۔ کیپٹن آصف کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ صوبائی شہرت یافتہ بدنام زمانہ ڈاکو پریل چانڈیو کی سرکوبی کے لیے اینٹی ڈکیت فورس پہلے ہی سے سرگرم تھی اور یہ معاملہ اس وقت خراب ہوا ہو گا جب اس لالچی لائق ماچھی نے سونہڑیں کے سلسلے میں تاوانِ زر کا مطالبہ وڈیرے شاہنواز خان کے سامنے رکھا تھا۔ شاہنواز کی زیرک دماغی کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنا شاطر انسان تھا جس نے ایک خاص مقصد کے تحت ہی لائق ماچھی کو خاموشی سے زرِ تاوان ادا کر کے اسے اندھا کر ڈالا ہو گا اور پھر کسی طرح اس کے خفیہ ٹھکانے کی مخبری بھی کر لی ہو گی۔ سو اس نے ہی رینجرز کو کسی طرح اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہو گا کہ جس خطرناک ڈاکو کی تلاش میں قانون نافذ کرنے والے ادارے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ ادھر ہی کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ وغیرہ......

پیش آمدہ حالات کے مطابق میرے تجزیئے کم ہی غلط ثابت ہوئے تھے۔

بہرحال...... کم و بیش آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑیاں رک گئیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ چند ایک

دروازے اور گھومتی راہداریاں پار کرنے کے بعد شاید ہم کسی کمرے میں آ گئے تھے۔

اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے تو میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے سے لہرانے لگے اس کے بعد میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ کمرا ماسوائے انسانوں کے ہر شے سے عاری ہی نظر آیا۔ یعنی فرنیچر نام کی کوئی شے وہاں نہیں تھی۔ کبیل دادا، اول خیر اور مجھے ایک ساتھ قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کیپٹن آصف دھیمی آواز میں ایک نائب سے کچھ کہنے کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا، اس کے ہمراہ چند دیگر اہلکار بھی چلتے بنے تھے۔

اب کمرے میں تین رینجرز اہلکار ہمارے ساتھ موجود تھے۔ ہمارے دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھ رکھے تھے۔ ہمیں آپس میں باتیں کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ تینوں اہلکار خاموش تنے کھڑے تھے، جیسے اپنی ڈیوٹی کا ایک اہم حصہ بنے ہوئے ہوں۔

کمرے میں روشنی تھی۔ ایک روشندان بھی تھا۔ چھت قدرے بلند تھی۔ ایک اندازے کے مطابق رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی اور ہمیں یہاں لائے ہوئے مشکل سے بیس پچیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے اس طرف دیکھا۔

پانچ افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو کیپٹن آصف ہی تھا۔ دوسرا اس کا بھی کوئی بڑے رینک کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ میجر کی مخصوص وردی میں تھا اور میں نے سب سے پہلے اس کے سینے پر لگے ٹیگ میں نام پڑھا۔ میجر وسیم بھٹی اس کا نام تھا۔ اس کی عمر کا مجھے چالیس پینتالیس سال کا اندازہ ہوا تھا۔ چہرہ بارعب تھا۔ جسم خاصا مضبوط اور کسرتی تھا، قد کا بھی میری طرح دراز تھا۔ شانے بھی چوڑے تھے۔ آنکھیں البتہ چھوٹی تھیں۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی مخصوص رینجرز کیپ پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم پر بھی کیپٹن آصف کی طرح رینجرز والی مخصوص وردی تھی۔

تیسرا اپنی مخصوص پولیس وردی اور اس کے شولڈرز پر لگے ستاروں سے ڈی ایس پی دکھائی دیتا تھا۔ گویا پولیس انتظامیہ بھی تفتیش کے لیے ان کے ساتھ بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ اس کا نام سہاگو خاں نظر آیا تھا مجھے۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی سی روایتی سخت گیری اور کرختگی مترشح تھی..... یہ قدرے بھاری اور موٹی جسامت کا آدمی تھا۔ عمر چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی لگتی تھی۔ ناک موٹی تھی اور رنگت چہرے کی سیاہ مائل تھی۔ چہرہ جسم کی طرح ہی چربیلا سا نظر آتا تھا جو اس کی موٹی گردن سے ہم آہنگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ قد درمیانہ تھا۔ میں نے فقط اسی آدمی کے ہی چہرے کے تاثرات سے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کچھ زیادہ ہی غصیلی اور برمانی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ باقی دو افراد جوان ”افسران“ کے پیچھے تھے، ان میں سے ایک پولیس مین تھا اور دوسرا رینجرز کا آدمی......

ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر دروازے سے چند افراد نمودار ہوئے۔ لباس سے یہ کوئی ملازم ٹائپ ہی نظر آتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو دو کرسیاں تھام رکھی تھیں۔ جو اندر لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بعد وہ تینوں افسران اس پر براجمان ہو گئے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ اس پر کوئی ڈیوائس رکھ دی گئی تھی۔ یہ ایک آڈیو ریکارڈنگ ایویڈنس تھا۔ جب میں رینجرز میں ایک ”پاور ایجنٹ“ تھا تو ایسے آلات میری نظروں سے گزرے تھے۔

میری فہم و فراست اور عقل سلیم بتاتی تھی کہ ہم تینوں کے سلسلے میں کیپٹن آصف نے انہیں ضرور کوئی ایسی بات بتائی ہے جس کی بنا پر ہمیں دیگر مجرموں (ڈاکوؤں) سے الگ کر کے یہاں بند کمرے میں تفتیش کا یوں خاص بندوبست کیا گیا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ انسپکٹر رجب دین نے ہی آخر میں کیپٹن آصف کو ہمارے سلسلے میں کچھ ”خاص“ بتایا ہو...... میں ذہنی طور پر اب ہر قسم کی تفتیش اور حالاتِ دگرگوں کو فیس کرنے کے لیے بالکل پُراعتماد اور تیار تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا......؟“ میجر وسیم بھٹی نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ بھاری اور رعب دار تھا۔

”شہزاد احمد خان شہزی......“ میں نے جواب دیا۔

”تم کہاں کے رہنے والے ہو......؟“

”پنجاب، ملتان......“

”ڈاکوؤں کے اس خطرناک گروہ، جو پریل عرف پیرو...... چانڈیو کے نام سے بدنام صوبائی شہرت رکھتا تھا۔ کیا تعلق تھا تمہارا اس کے ساتھ......؟“

”میں اس کا گروہی ساتھی نہیں تھا مگر میری اس کے ساتھ دوستی کی نہج بھی بہت قلیل عرصے پر محیط رہی تھی۔“

”شکل وصورت اور گفتار سے تم ایک پڑھے لکھے شخص دکھائی دیتے ہو مگر ایک خطرناک سرغنہ ڈاکو سے تمہاری راہ و رسم کس طرح پیدا ہو گئی۔ اپنے بارے میں تفصیل

بتاؤ......"

میں نے اس بھلے مانس میجر کے اس سوال پر دل ہی دل میں اللہ کا شکرادا کیا کہ اس نے مجھے کا موقع فراہم کیا۔ تاہم میں ڈی ایس پی سبھا گو خان کے سلسلے میں شکوک کا شکار تھا لہٰذا میجر وسیم بھٹی سے ریکویسٹ کرنے کے انداز میں بولا۔

"سر! میں کون ہوں کیا ہوں...... یہ میں آپ کو سب سچ سچ بتادوں گا اور مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کے ٹھوس شواہد بھی آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا...... فقط میری ایک گزارش ہوگی جو پوری کردی جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا......"

"کیسی گزارش......؟" میجر وسیم نے بہ دستور میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"سر یہ بہت ہی خفیہ اور اہم معاملہ ہے۔ آپ کا چونکہ پاک آرمی سے تعلق ہے...... اسی لیے...... مجھے ڈر ہے کہ مقامی سطح پر اس کے لیک آؤٹ ہونے کا خدشہ رہے گا...... اسے آپ ایک ملٹری سیکریٹ سروس کا راز سمجھ لیں...... یا قومی سلامتی کا معاملہ......"

لفظ "مقامی سطح" کا ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ بیٹھے ڈی ایس پی سبھا گو خان کی طرف دیکھ کر دانستہ ادا کیا تھا۔ میری بات پر میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے چہروں پہ ایک دم سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ دونوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنی بکواس بند کرو تم......" معاً ہی ڈی ایس پی سبھا گو خان پُرطیش انداز میں بولا۔ "تم ایک ڈاکو ہو...... اور ایک بدنام صوبائی شہرت یافتہ خونی ڈاکو پرو چانڈیو کے قریبی ساتھی بھی...... ہمیں چکر دینے کی کوشش مت کرو......" یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب بیٹھے میجر وسیم بھٹی سے کہا۔

"میجر صاحب! اسے آپ ہمارے حوالے کر دیں...... یہ بہت چالاکی سے کام لے رہا ہے۔ ایک سیدھے سادے معاملے کو خوامخواہ...... الجھا کر سیریس بنا رہا ہے، تاکہ آپ کی توجہ ایک خطرناک مسئلے سے ہٹا کر اپنا مقصد حاصل کر سکے۔"

"ڈپٹی صاحب! جس معاملے کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اہم نوعیت کا ہے۔" میں نے اس کی جھڑکی کی پروا کیے بغیر کہا۔ وہ دوبارہ غصیلے لہجے میں مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میجر وسیم نے اسے ٹوکا۔

"ڈی ایس پی صاحب! ہم اتنے پاگل یا بے وقوف نہیں ہیں کہ اس کی باتوں میں آجائیں گے...... یہ جن ٹھوس شواہد کی باتیں کررہا ہے، وہ اگر ہمیں دکھانے میں ناکام رہا تو اس پر قانون کو جھانسا دینے کا بھی سنگین ترین کیس داخل کردوں گا میں......"

میں جانتا تھا کہ یہ بات میجر صاحب نے صرف ڈی ایس پی سبھا گو خان کو ہی سنانے کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ مجھے بھی درپردہ خبردار کیا تھا۔

"آپ برائے مہربانی تھوڑی دیر کے لیے میرے کمرے میں جا کر تشریف رکھیں...... اگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی جو ملٹری سیکریٹ سروس کے اہم رازوں کا حصہ بنتی ہو تو میں آپ کے گوش گزار بھی ضرور کروں گا...... بہ صورتِ دیگر میں اسے مکمل طور پر اپنی تحویل میں رکھوں گا......"

میجر وسیم کی بات پر ڈی ایس پی سبھا گو خان نے ناک بھوں تو بہت چڑھائی مگر اسے جاتے ہی بنی تھی۔

"ہاں! مسٹر شہزی! اب بولو......" ڈی ایس پی کے کمرے سے جاتے ہی میجر وسیم میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "لیکن...... ایک بات یاد رکھنا...... اگر تم نے جھوٹ بولا یا کوئی اور چکر چلانے کی کوشش کی تو تمہارا کیس میں عام عدالت سے خصوصی کورٹ میں منتقل کر دوں گا جو ایسے مجرموں کو بہت خطرناک سزائیں دیتا ہے۔"

میں نے میجر وسیم کی بات پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے ذرا بھی بس نہ کی، شروع سے آخر تک ساری داستان اسے پوری تفصیل سے سنا ڈالی۔ یہاں تک کہ میجر ریاض باجوہ جو میری تازہ اطلاع کے مطابق کرنل کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کے "پاور" ونگ، وزیر جان سے لے کر چوہدری ممتاز، اسپیکٹرم اور طلسم نور ہیرے سے لے کر...... بشام چھلگری کی موت اور یہاں تک کے سارے واقعات بلاکم وکاست سنا ڈالے۔ باوصف ان ساری باتوں اور حقائق کے میرا جو اصل اور اہم تعارف تھا، وہ میرا اپنا باپ تھا۔ جس کا ملکی ہیرو اور گمنام سپاہی کا اعتراف سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بڑی دھوم دھام سے کیا گیا تھا۔ یہی نہیں آج جو بھارت کا خطرناک جاسوس جو وطنِ عزیز میں انارکی پھیلانے کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ سندر داس سکینہ...... اسے بھی میں نے ہی گرفت میں لیا تھا۔ اس پر کیس چل رہا ہے......

یہ وہ باتیں تھیں جو بذاتِ خود ایک ٹھوس شواہد کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس لیے...... اس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش ہو ہی

نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اتنی بڑی باتیں بغیر شواہد کے کبھی نہیں کی جاسکتی تھیں۔

میں نے دیکھا...... میجر وسیم بھٹی اور آصف بٹ کے چہروں پہ سناٹے سے گھل گئے۔ وہ جیسے اپنی کرسیوں پہ بیٹھے بیٹھے کہیں دور کھو گئے تھے۔ لیکن ان کی یک ٹک نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں مرحلہ وار آخر میں سونہڑیں اور پریل کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔

''جناب! میری آپ سے پُرزور گزارش ہے......''

میں نے ان دونوں ذمّے دار افسران کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے، لیکن اس قومی امانت کے کھو جانے کا مجھے بے حد قلق ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے انڈیا اور انڈیمان کے تاریخی اور ہولناک جزائر کا پُرخطر سفر طے کیا اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں پہنچا تو زمیندار شاہنواز خان کے چنگل میں پھنس گیا۔ وہ بہت بارسوخ آدمی ہے۔ اس نے متعلقہ تھانے کے انسپکٹر رجب دین کو بھی خرید کر رکھا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بدبخت نے بریفنگ کی آڑ میں کیپٹن آصف صاحب کو بھی میرے خلاف غلط گائیڈ کیا ہو گا۔ آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس قومی امانت یعنی طلسم نور ہیرے کے حصول کے سلسلے میں جلد از جلد کچھ کیجیے۔''

''نوجوان......''

اچانک میجر وسیم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا...... اس کی دیکھادیکھی کیپٹن آصف نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔

''تم اتنی بڑی باتیں جھوٹ نہیں کہہ سکتے...... لیکن اگر یہ سب واقعی سچ ہوا تو میں تمہیں سیلوٹ کروں گا...... میں پہلے اپنے ذرائع سے یہ سب معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں...... تمہاری تصاویر بھی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور تم نے اپنا ملتان کا جو پتا بتایا ہے جہاں تمہارے ماں باپ رہائش پذیر ہیں، یقیناً ملک کے اس بہادر سپاہی کا ایڈریس بھی وہی ہوگا جسے کچھ عرصہ پہلے قومی دن پر فوجی اعزاز سے نوازا گیا تھا۔''

''جناب! میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود بھی مجھ سے اپنے طور پر مطمئن ہو جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن...... سر! جو بھی کریں جلد کریں......''

''ڈونٹ وری...... ینگ مین!'' میجر وسیم بارعب لہجے میں بولے۔ ''ساری باتوں کا تو پتا لگانا ممکن نہ ہوگا، لیکن ان میں سے صرف چند بنیادی باتوں کی سچائی جان لینا بھی تمہاری صداقت کے لیے اتنا ہی ثبوت کافی ہوگا میرے لیے......''

پھر وہ کیپٹن آصف سے مخاطب ہو کر بولے۔

''کیپٹن!''

''سر۔''

''ان تینوں کو وار روم میں لے جاکر بٹھادو...... اور ان کے ہاتھوں کی بندشیں کھول دینا۔''

''اوکے سر...... !بٹ......''

''یس......؟''

''سر! وہ ڈی ایس پی بہت شور کرے گا......''

''ہم......'' کیپٹن آصف کی بات پر وسیم نے پُرسوچ انداز میں اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے، پھر چند لمحہ بعد اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں خود اسے کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں...... تم پہلے ان تینوں کو وار روم پہنچادو......''

''رائٹ سر......!'' کیپٹن آصف نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور پھر میجر وسیم کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا...... کیپٹن آصف ہماری طرف متوجہ ہوا اور پھر وہاں موجود دو رینجرز اہلکاروں سے تحکمانہ کہا۔

''ان تینوں کے ہاتھ کھول دو...... اور میرے ساتھ وار روم پہنچو......''

اس کے اگلے دس منٹ میں ہم ایک اور کمرے میں آگئے جو نسبتاً بہتر کنڈیشن میں تھا۔ کشادہ بھی تھا اور یہاں فرنیچر بھی رکھا ہوا تھا۔ ہمیں ایک صوفے پر بٹھادیا گیا۔ دو رینجرز کے اہلکار وہاں موجود رہے۔ ہمیں کچھ کھانے کو بھی دیا گیا۔ ایک طرف کونے میں خاصی بڑی میز اور اس کے دو طرف تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر کمپیوٹر اور ٹیلی فون سیٹس رکھے نظر آرہے تھے۔ اس دوران مجھے اول خیر اور گبیل دادا سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو بھی ہم نے ایک دوسرے سے خیر خیریت سے ہی متعلق گفتگو کی، اول خیر اور گبیل دادا نے سب سے پہلے شکیلہ کے بارے میں ہی استفسار کیا تھا۔ طلسم نور ہیرے سے متعلق بھی بات ہوئی اور باقی تفصیل وہ سن چکے تھے۔

ایک گھنٹے بعد کوئی نائک ٹائپ آدمی اندر داخل ہوا اور بڑے احترام سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تشریف لائیں سر......!''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ بھی میرے ساتھ ہوں گے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر

پوچھا۔ میرا اشارہ کیبل داداور اول خیر کی طرف تھا۔
''شیور سر......!'' اس نے ادب سے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی تھی۔
ہم تینوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں ہمیں میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے علاوہ دو اور افراد نظر آئے۔ یہ نسبتاً ایک آرام دہ کمرا تھا۔ یہاں صوفے بچھے ہوئے تھے اور فرش پر قالین تھا۔ درمیان میں گلاس ٹاپ بڑی سی ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ جس پر کچھ موبائل فون، ٹیلی فون سیٹ اور کارڈلیس نظر آرہے تھے۔ کونے میں ایک شخص بڑی سی دیوار گیر اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سر پہ ہیڈ فون چڑھا رکھا تھا۔ اسکرین ایل ای ڈی، جسے شاید کمپیوٹر سے کنکٹ کیا ہوا تھا، کیونکہ اس میں ایک گراف جس پر سرخ رنگ کی ایرو کی متحرک تھی۔ گراف کے بیچ میں کبھی کسی کی پنسل سے بنائی ہوئی تصویر ابھرتی اور پھر اس کی اسکیننگ ہونے لگتی تو اصل چہرہ سامنے آجاتا۔
''بیٹھو......'' میجر وسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق لگتا تھا اور پیشانی پر سلوٹیں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ہم تینوں اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئے۔
چاروں افراد کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میرے سلسلے میں انہوں نے خوب انکوائری کروائی ہوگی اور بات ملتان سے ''بیگم ولا'' تک جاپہنچی تھی۔ جبکہ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وہاں ایک نیا ''فتنہ'' نوشابہ کی صورت میں جنم لے چکا تھا۔ اسی فتنے نے پرانے سوئے ہوئے فتنوں کو بھی دوبارہ بیدار کردیا تھا۔ جس میں ایک تو اس کا اپنا باپ چوہدری ممتاز بھی شامل تھا جبکہ اسپیکٹرم کا مقامی چیف وزیر جان پہلے ہی در پردہ رہتے ہوئے اس کی پشت پناہی میں مصروف تھا، یہی نہیں نوشابہ اپنے باپ کی سیاسی پارٹی میں بھی پوری طرح سے ''اِن'' اور ''ایکٹو'' ہوچکی تھی، اس پر طرہ...... ان کی پارٹی کے اگلے چند ماہ میں ہونے والے عام انتخابات میں جیت کی بھرپور امید بھی کی جارہی تھی۔ عوامی حمایت اسے بھرپور حاصل تھی۔
''سنو، مسٹر شہزاد......!'' میجر وسیم نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے گویا ابتدا کی۔ ''میں نے تمہارے بارے میں بعض اہم اور فوری ذرائع سے کچھ باتوں کا پتا چلایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اپنے بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ درست ہے، لیکن اب بھی تمہاری ذات میں ابہام موجود ہے، یوں سمجھو بس، تھوڑی سی کسر... رہ گئی ہے۔'' وہ ذرا رکے اور پھر آگے کہنا شروع کیا۔
''تمہارے سلسلے میں جہاں کچھ مثبت باتوں کا علم ہوا ہے وہیں اس سے کہیں زیادہ منفی حقائق بھی سامنے آئے ہیں......''
''منفی حقائق......؟ اور وہ بھی میرے متعلق......؟'' میں نے الجھن آمیز پریشانی تلے میجر وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میجر صاحب! کیا میں نے اپنے بارے میں کچھ غلط بیانی سے کام لیا ہے؟ آپ یہ سمجھ رہے ہیں؟''
''بیگم ولا سے تمہارا کیا تعلق بنتا ہے......؟'' اچانک انہوں نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔
''میں تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ بیگم ولا...... میری بیوہ بھابی زہرہ بانو کی ملکیت ہے اور میرے ماں باپ وہیں رہتے ہیں......''
''بیگم ولا کوئی رہائش گاہ ٹائپ جگہ ہے یا کسی خفیہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت......؟'' میجر وسیم نے میری طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہیڈ کوارٹر......؟ کک...... کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں میجر صاحب؟ کس چیز کا ہیڈ کوارٹر......؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
''ملک دشمن عناصر کے مذموم مقاصد کے لیے یہ جگہ استعمال میں لائی جارہی ہے۔''
میجر وسیم نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے انکشاف کیا۔ اگرچہ مجھے بھی زہرہ بانو سے ٹیلی فونک گفتگو پر اس جھوٹے اور کریہہ الزام کا علم ہوچکا تھا۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ اس الزام کو کیا سچ سمجھا جانے لگا تھا۔ کیوں؟ اور کس بنیاد پر؟ یہی سوال جب میں نے میجر وسیم سے پوچھا تو وہ بولے۔
''ہم اپنے طور پر تصدیق کیے بغیر کسی الزام کو سچ نہیں مانتے۔''
''تو آپ نے بیگم ولا کے سلسلے میں کیا تصدیق کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی تو نہیں...... لیکن ملتان رینجرز کے مطابق کچھ شواہد ایسے علم میں لائے گئے ہیں جن کے مطابق اس الزام کی صداقت پر شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔''

''میجر صاحب! اب برائے کرم یہ بھی بتا دیں کہ وہ الزام ملتان رینجرز کے علم میں لانے والے کون ہیں؟ ہمارے مخالفین......؟''

''ہاں......'' میجر وسیم نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''تو آپ کے خیال میں ہمارے مخالفین کیا ہمارے بارے میں کوئی اچھی رائے بھی رکھتے ہوں گے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز کی کاٹ ابھر آئی تھی۔

''ایسا تو نہیں لیکن...... شواہد سے تو یہی لگتا ہے۔''

''جناب! ان شواہد کے بارے میں اور ان کے موجد کا نام بتا سکتے ہیں؟ تاکہ میں ردِالزام کے بارے میں کچھ کہہ سکوں؟''

''شواہد کے سلسلے میں ملتان رینجرز کے اینٹی ٹیریرسٹ ونگ کو ایک گمنام کال موصول ہوئی تھی کہ بیگم ولا میں اسی وقت ریڈ کیا جائے تو وہاں کافی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ اور کچھ مشتبہ افراد کا پورا مسلح گروہ مل سکتا ہے۔'' میجر وسیم نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے بیگم ولا پر ریڈ کیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تو پھر کیا ملا وہاں سے رینجرز کو......؟''

''اسلحہ ملا تھا اور لوگ بھی...... ایک رہائشی جگہ پر جہاں ایک خاندان اور بچے ہونے چاہیے تھے وہاں...... ان کے بجائے اسلحہ پوش افراد ملے تھے۔ ان میں کئی لوگوں کے پاس غیر قانونی اسلحہ تھا۔''

''کیا ملتان رینجرز کو بیگم ولا میں...... وطنِ عزیز کا وہ جانباز سپاہی نہیں ملا تھا جس نے ملک کی خاطر اپنی جوان حاملہ بیوی اور اپنے ایک چند سال کے بچے کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور خود گمنام سپاہی کی حیثیت سے ایک ایسے ملک دشمن جاسوس کے تعاقب میں جا نکلا تھا جو ملک کا ایک اہم راز لے اُڑا تھا...... اور جس نے دشمن ملک میں گھس کر اس جاسوس کو نہ صرف جہنم واصل کیا بلکہ اس کے قبضے سے وہ اہم راز بھی چھین کر ضائع کر دیا تھا۔ وہ راز اگر دشمن ملک کے ہاتھ لگ جاتا تو بنگلہ دیش کی طرح وطنِ عزیز کا ایک اور ٹکڑا بھی ''سہ لخت کی صورت الگ ہو جاتا۔ اس پاداش میں تاج دین شاہ جیسے دلیر محبِ وطن سپاہی کو دشمن ملک میں طویل اور پُرمصائب قید جھیلنی پڑی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میرے وجود کا رُواں رُواں فرطِ جوش تلے کانپنے لگا تھا۔ کمرے میں اے سی ہونے کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

''وہ سب ٹھیک ہے...... لیکن وہ لوگ اور غیر قانونی اسلحہ......؟'' میجر وسیم نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

''اسلحہ لائسنس یافتہ تھا، یہ الگ بات تھی کہ کچھ آؤٹ آف ڈیٹ تھا...... اس سلسلے میں کچھ سستی ہو گئی ہو گی۔'' میں نے زہرہ بانو سے کی ہوئی اس ضمن میں گفتگو کے تناظر میں کہا۔ ''رہی بات لوگوں کی تو وہ سب زہرہ بانو کے جاں نثار ساتھی ہیں...... ان سب کا بائیو ڈیٹا بیگم ولا میں موجود ہے۔ ان میں کوئی بھی ہسٹری شیٹر اور بری شہرت والا آدمی نہیں مل سکتا...... ایک بات بتائیں...... ملک کے سربرآوردہ لوگ اپنی سیکیورٹی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ وہ تو جہاں رہتے ہیں وہاں کے دوسرے عام لوگوں کے راستے تک راڈ لگا کر بلاک کر دیتے ہیں۔ کتے، شیر اور اسلحہ بدست آدمیوں کی پوری فوج ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر بیگم ولا میں چند اسلحہ پوش افراد نظر آ گئے تو کون سا ایسا نیا ہو گیا تھا جس کے باعث بیگم ولا میں ریڈ لگا کر ایک ملکی فوجی اعزاز یافتہ اور وطن کے گمنام سپاہی اور کنٹری ہیرو کے ساتھ یوں بے عزتی کی گئی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایسا آدمی ایسی جگہ پر رہنا پسند کرے گا جو ملک دشمن عناصر کی کمین گاہ کہلاتا ہو؟ اب میری ایک آخری بات کا بھی جواب دے ڈالیں میجر صاحب......! آپ نے میرے بارے میں ملتان رینجرز سے حقائق تو معلوم کر لیے کیا آپ نے ان سے پوچھا کہ...... چوہدری ممتاز خان، جسے میجر ریاض باجوہ اور کیپٹن عمران وغیرہ کے ساتھ ایک بڑے ریڈ، جس میں خود میں بھی ایک سابقہ پاور ایجنٹ کے طور پر شامل تھا، ملک دشمن عناصر کے ساتھ سازباز کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا، وہ اب آزاد کیوں ہے......؟''

میری اس آخری بات نے میجر وسیم کو لاجواب سا کر دیا۔ وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے تھے، میں اب نمایاں طور پر یہ بات محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں خاصے مخمصے کا شکار ہو گئے تھے۔

میں نے اس بار نہایت پُرزور اور ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''میجر صاحب! خدا کے لیے...... مجھ پر اگر اب بھی آپ کو شبہ ہے تو ٹھیک ہے، لیکن اس قومی امانت کے سلسلے میں جلدی کچھ کیجیے...... جو میں اور میرے جاں نثار ساتھیوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر حاصل کی تھی، آپ نہیں جانتے وہ صرف ایک ہیرا ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ایٹم بم بھی ہے جو اگر دوبارہ مخصوص گروہ کے ہاتھ لگ گیا تو دنیا کو

تیسری عالمی جنگ سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ اس کی تفصیل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''یہی ثبوت اگر ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی نشاندہی تم کر رہے ہو تو...... تم اور تمہارے ساتھی ہر الزام سے یکسر بری الذمہ ہو جائیں گے...... میں تم سے یہی بات آخر میں کہنے والا تھا۔'' میجر وسیم نے کہا اور پھر اسی وقت جیسے وہ متحرک ہو گیا۔ اس نے کیپٹن آصف سے تحکمانہ کہا۔

''اسی وقت ایک دستہ ٹاپ آف کرو...... ہمیں زمیندار شاہنواز خان کی حویلی میں ریڈ کرنا ہے۔''

''سر! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں......'' میں نے فوراً کہا۔

''تم کیا کرو گے؟'' میجر وسیم میری طرف متوجہ ہوا......

''جناب! وہاں میری ایک ساتھی شکیلہ ہی اس کی قید میں نہیں ہے بلکہ شاہنواز خان کی بیٹی سونہریں بھی ہے، جسے اپنے باپ کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ وہ بھی آپ کو میری باتوں کی گواہی کے لیے کافی ہو گی...... جس سے متعلق تازہ حالات کا ذکر میں آپ سے کر چکا ہوں...... کیونکہ میں ہی انہیں پہچان سکتا ہوں......''

میجر وسیم میری بات سن کر کچھ دیر ہونٹ بھینچے سوچتے بن گئے اس کے بعد انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

پانچ گاڑیاں تیار کر لی گئیں اور اس مشن میں کیپٹن آصف ہی نہیں بلکہ خود اس فورس کے سربراہ میجر وسیم... بھی شامل تھے۔ گاڑیاں آندھی طوفان کے ساتھ شاہنواز خان کے گوٹھ کی جانب روانہ ہو گئیں......

☆☆☆

رات اپنے آخری پہر کے سفر میں تھی۔ رینجرز کی چاروں بھاری بھرکم گاڑیاں لاڑکانہ کے مضافات کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے شاہنواز خان کا گوٹھ لاڑکانہ شہر سے تقریباً ملحقہ تھا۔ صرف چند کلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ میں میجر وسیم والی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھا اور میرے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہ تھا، جبکہ کیپٹن آصف دوسری گاڑی میں تھا۔ باقی دو گاڑیوں میں سے ایک ہمارے آگے تھی اور دوسری سب سے پیچھے۔

لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہم شاہ گوٹھ میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں اب پولیس کا کوئی پہرا نہ تھا۔ البتہ چند مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں دو افراد رینجرز کی گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً حویلی کے اندر جا گھسے تھے۔ تب تک گاڑیاں حویلی کے احاطے میں داخل ہو چکی تھیں۔ یہ ریڈ شاید اُن کے لیے غیر متوقع نہ ہو۔ تاہم مسلح حواریوں کے چہروں پہ تشویش اور فکر مندی پائی جاتی تھی۔

ہم سب گاڑیوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ احاطے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فولادی پائپوں پر گلوب نصب تھے، جن میں چند ایک ہی بجھے ہوئے تھے، باقی روشن تھے۔ اسی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ حویلی کے بڑے سے مرکزی دروازے پر تین افراد نمودار ہوئے۔ دو تو وہی مسلح آدمی لگتے تھے جنہوں نے ہماری گاڑیوں کو حویلی کے وسیع احاطے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اندر کی راہ لی تھی جبکہ تیسرا کوئی دبنگ سا شخص نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز ہی دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ بھاری اور گول تھا، رنگ گندمی، سر کے بال پیشانی سے نصف سے زائد اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ قد کاٹھ دراز قامت تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا، ازیں علاوہ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے میری طرف بہت غور سے ایک نظر دیکھا تھا۔

''جی میجر صاحب! خیریت تو ہے...... یہ سب کیا ہے......؟''

اس نے میجر وسیم کا جائزہ لینے کے بعد فوراً گمبھیر سے لہجے میں پوچھا۔ وہ مجھے خاصا زیرک دماغ اور چلتا پرزہ ٹائپ چالاک آدمی لگا تھا۔ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔ اس نے میجر کی وردی اور نام پہلی فرصت میں دیکھ لیا تھا۔

''حویلی کی تلاشی لینا ہے ہم نے اور شاہنواز خان سے بات کرنی ہے۔'' میجر وسیم نے ٹھنڈی ہوئی متانت کے ساتھ اس سے کہا۔

''کیسی تلاشی؟ کیا جرم ہوا ہے یہاں......؟'' مذکورہ شخص نے فوراً پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ اور اپنی حیثیت واضح کرو......'' میجر وسیم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے رعب دار لہجے میں اس سے کہا۔

''میرا نام صالح جان ہے......'' مذکورہ شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور...... میں شاہنواز خان کا ایک قریبی رشتے دار ہوں، ان کی غیر موجودگی میں حویلی وغیرہ کی دیکھ بھال میرے ہی ذمے ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن...... میجر صاحب! آپ کے پاس کوئی تلاشی کا وارنٹ، کوئی اجازت نامہ تو ہوگا......؟''

''ہمیں جو خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے ہیں، ہم اسی کے تحت حویلی کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ اب آپ مہربانی کر کے راستہ چھوڑ دیں......'' کہتے ہوئے میجر وسیم نے اس کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ صالح جان نامی وہ شخص خاصا برہم نظر آ رہا تھا، میں نے اسے اپنا موبائل نکالتے ہوئے دیکھا۔

بہر کیف ہم سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ رینجرز کے اہلکاروں نے کیپٹن آصف کی سرکردگی میں اوطاق سمیت پوری حویلی کی تلاشی شروع کر دی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر حویلی میں سوائے ملازمین کے اور کوئی نہ ملا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ زمیندار شاہنواز خان اپنی فیملی کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شرکت کے لیے فیملی سمیت جامشورو گیا ہوا تھا۔

بہر طور شکیلہ، ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی تلاش کیا گیا اور جب ان کے بارے میں پوچھا گیا تو سب نے اس سلسلے میں قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی نہیں جب شاہنواز خان کے دو مقرب خاص کارپردازوں کوڑا خاں اور بخشل کے بارے میں پوچھا گیا تو ان دونوں کو حواریوں نے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر یہ دونوں بھی مل جاتے، میجر وسیم انہیں گرفتار کر کے تفتیش وغیرہ کے سلسلے میں ساتھ لے جانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ جبکہ وہاں کوئی بھی بخشل اور کوڑا خان کو جیسے جانتا ہی نہ تھا......! میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ''کالی بھیڑیں'' پہلے ہی حرکت میں آ چکی تھیں اور جنہوں نے شاہنواز خان کو ایسے کسی خطرے سے پیشگی آگاہ کر ڈالا تھا۔ شاہنواز ایک شاطر اور عیار دماغ آدمی تھا۔ اثر و رسوخ اپنی جگہ لیکن جہاں دیکھتا ''بھاگنے اور چھپنے'' میں عافیت ہے تو وہ یہ کام بھی چالاکی سے کر ڈالتا تھا اور یہی اس نے کیا تھا۔

اس مردود انسان نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے غیاب کے ساتھ ساتھ شکیلہ اور ارم وغیرہ کو بھی غائب کر کے کسی اور خفیہ جگہ منتقل کر دیا ہوگا...... ازیں علاوہ طلسم نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ...... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں...... جبکہ شکیلہ کو...... اس نے ہیرے کی تلاش میں اپنے مسلح حواریوں (کوڑا خان وغیرہ) کے ساتھ روانہ کیا تھا اور خود بھی ان کے ساتھ تھا، پھر کیا ہوا تھا؟ ہیرا اُن کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں، شکیلہ کا انہوں نے خدانخواستہ کیا انجام کیا تھا......؟ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہوا تھا......؟ کیونکہ پھر پروچانڈیو نے حویلی میں حملہ کر دیا تھا...... یہی وجہ تھی کہ مجھے شکیلہ کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی، کیونکہ شاہنواز جیسے سفاک اور درندہ صفت آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

بہر طور...... میری رینجرز کے ہاتھوں حوالگی اس کے علم میں لائی جا چکی ہوگی، وہ جانتا تھا کہ میں رینجرز کو کیا کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ان دونوں خاص حواریوں، بخشل اور کوڑا خان کو فوراً غائب ہو جانے کا حکم دیا ہوگا اور خود شادی کے بہانے اپنی بیٹی سونہڑیں کو لیے جامشورو نکل گیا، اگرچہ مجھے اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ جامشورو گیا بھی ہوگا یا محض ایسا ظاہر کیا گیا تھا۔

ملازمین میں بھی مجھے بیشتر نئے لوگ نظر آ رہے تھے، چند ایک پرانے غائب تھے۔ ان کے ''غیاب'' میں بھی یہی مقصد کارفرما ہوگا کہ ایسی کسی متوقع صورت میں یہاں حویلی میں اس کی خود ساختہ غیر موجودگی کے دوران کوئی زیرِ تفتیش نہ لایا جا سکے...... ازیں علاوہ وہاں کے ملازمین سے میرے بارے میں بھی میجر وسیم نے دریافت کیا تھا، مگر وہ سب کے سب مجھے پہچاننے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اس دوران صالح جان نے اپنا موبائل میجر وسیم کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ ایم این اے شاہ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں......''

''سوری! اس وقت میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔'' میجر وسیم نے سنجیدگی کے ساتھ فون سننے سے انکار کر دیا اور وہ اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا۔

لیکن اِدھر میں زمیندار شاہنواز خان کی زیرک دماغی اور مکاری پر...... بے بسی کے ساتھ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

رینجرز کے لیے اب وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد میجر وسیم...... نے جوانوں کو واپسی کا حکم دیا تو میں نے کہا۔

''میجر صاحب! شاہنواز نے زبردست چال چلی ہے، مجھے اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا...... وہ ایک اثر و رسوخ والا آدمی......''

''میرا خیال ہے اس مسئلے کو ہیڈ کوارٹر چل کر آرام سے ڈسکس کر لیں گے۔'' انہوں نے میری بات کاٹ دی اور جوانوں کو واپسی کا حکم دیا۔ میں نے غور کیا وہ میری طرف سے ایک بار پھر کسی شک و شبہے کا شکار ہونے لگے

تھے۔ مجھے یہ میجر لکیر کا فقیر معلوم ہوا۔ اس کے اندر اپنے تئیں کچھ بوجھنے اور صورتِ حال کی بھل بھلیوں کو سمجھ کر اس سے کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت کم ہی تھی یا پھر وہ اسے استعمال کرنے سے اعراض برت رہا تھا، تاہم انہیں بھی کچھ قانونی تقاضوں کا پاس رکھنا ہی پڑتا ہے۔ خاموش میں بھی نہیں ہوا۔ بولا۔

''جناب! صرف چند منٹ مجھے دیں...... میں ذرا اپنے طور پر بھی کوئی کلیو تلاشنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں......''

میری بات سن کر میجر وسیم نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور سپاٹ لہجے میں مجھ سے بولا۔

''صرف دس منٹ......''

''شکریہ جناب!'' میں نے غیر تاثر انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کمرے کی جانب دوبارہ رخ کیا جہاں میری، شاہنواز کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی۔ وہاں میرے ساتھ ارم بھی تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا اور غور سے ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ساتھ میجر وسیم نے جوانوں کو کر رکھا تھا۔

ادھر صالح جان مجھے تیز سی کڑوی اور برماتی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے دو ایک کمروں کا خود بھی دوبارہ اچھی طرح جائزہ لیا اس کے بعد مایوس سا ہو کر میجر وسیم کے پاس آیا تو صالح جان، میجر وسیم سے احتجاجاً بولا۔

''میجر صاحب! یہ آدمی تو کوئی سویلین لگتا ہے مجھے، اسے کیا اختیار ہے کہ وہ ایک معزز آدمی کے گھر کی یوں تلاشی لے...... میں اس پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کا حق رکھتا ہوں۔''

صالح جان نچلا بیٹھنے والا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ یوں بھی اس نے شروع سے آخر تک ...... ہمارے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر تو ہو چکا تھا کہ شاہنواز خان نے اپنی غیر موجودگی میں خصوصی طور پر حویلی بلایا تھا۔ اگرچہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یعنی شاہنواز خان سے ٹاکرا ہوتے وقت یہ تھا۔ وہ شاہنواز کے لیے بار بار ''وڈو بھا'' (بڑا بھائی) کے الفاظ استعمال کر رہا تھا جو یقینی طور پر کوئی قریبی شخص ہی کہہ سکتا تھا۔

میجر وسیم نے اس کی طرف گمبھیر نظروں سے دیکھا اور میری جانب خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے اس سے جواباً بولے۔

''یہ آدمی بہ طور چشم دید گواہ کے یہاں لایا گیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے یہاں قید میں رکھا گیا تھا اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں بھی یہاں ابھی تک قید ہیں، ان سب باتوں کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن ابھی اتنا کافی ہے۔''

''بہت خوب میجر صاحب!'' صالح جان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی ایرا غیرا آپ کے پاس یہ کہنے آجائے کہ اس حویلی میں مجرا ہوتا ہے تو کیا آپ اس کی بات کا یقین کرلیں گے؟''

''سنو مسٹر...... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟'' میجر وسیم نے اس کی طرف اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بارعب اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''صالح جان۔''

''ہاں، صالح جان! اپنا لہجہ دھیما اور تمیز کو ملحوظ رکھو...... ہم کسی مصدقہ اطلاع پر ہی ایسی کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔ ہم دوبارہ بھی آسکتے ہیں......''

یہ کہہ کر میجر پلٹا۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ طاری تھی۔ شاہنواز ہمیں چکما دے گیا تھا اور آئندہ بھی یہی روش قائم رکھنے والا تھا۔ میجر وسیم مجھ سے اب کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آرہے تھے جبکہ شاہنواز کے سلسلے میں اب کیا کرنا چاہیے تھا اس کا تعین اب خود مجھے ہی کرنا تھا۔ میں اس کے بارے میں اندر ہی اندر بہت غور و خوض کر رہا تھا اور اسی سبب کئی جارحانہ خیالات میرے اندر تیزی سے سر اٹھانے لگے تھے۔

پولیس ہو یا رینجرز یہ اپنی قانونی حدود و قیود کے محتاج تھے، جبکہ شاہنواز جیسے خطرناک اور چالاک مجرم ہوں تو بسا اوقات یہی قیود ان کے لیے راہِ مفر کہلاتی ہے۔ پل کے پل میں نے ایک حتمی فیصلہ کر ڈالا جو ایسے نازک مواقع پر مجھے بارہا کرنا پڑتا تھا۔

میرا یہ فیصلہ جارحانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھا مگر سچائی اور حقائق کو سامنے لانے کا اس کے سوائے مجھے کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تھا۔ حالانکہ اس میں رسک تھا، میری جان بھی جاسکتی تھی، جبکہ اول خیر اور گبیل دادا پہلے ہی ایک طرح سے رینجرز کی تحویل میں ہی تھے۔ میری نظر میں وہ محفوظ تو تھے کہ کم از کم کسی دشمن اور بالخصوص انسپکٹر رجب دین جیسے راتب خور کی گرفت سے آزاد تو تھے۔

دوبارہ گاڑیوں میں سوار ہوتے وقت میرے اندر ایک طوفان سا مچلنے لگا اور دانستہ میں نے دوسری گاڑی میں سوار ہونا پسند کیا تھا۔ اس میں ڈرائیور سمیت صرف چار رینجرز کے اہلکار سوار تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں، جبکہ دو درمیانی نشست پہ براجمان تھے، میں

نے اپنے لیے سب سے آخری والی سیٹ کا انتخاب کیا تھا اور گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کے عقبی دروازے کا جائزہ لیا تھا۔

مجھے جو کرنا تھا، اس کے لیے میں وقت اور جگہ کا تعین کرنے لگا۔ گاڑیاں کچے میں دوڑ رہی تھیں اور میرا سوچتا ذہن اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ فراٹے بھر رہا تھا۔

گاڑیاں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ میں اگلے چند لمحات میں جو خطرناک قدم اٹھانے والا تھا، مجھے احساس تھا کہ میں رینجرز کی تحویل میں ہوں اور یہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ اینٹی ڈکیت فورس کے یہ اہلکار خصوصی تربیت کے حامل تھے۔ اگرچہ میں نے بھی انہی کے انداز میں تربیت حاصل کر رکھی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ میری تربیت کی خصوصیت ان سے کچھ سوا ہی تھی۔ تاہم میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ مجھے کس وقت اور کون سا قدم اٹھانا ہے۔

آخر رات کی گھپ تاریکیوں میں گاڑیاں...... کچے پکے اور اپلے تھپی دیواروں والے گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے پاس سے گزرتی ہوئی کھیتوں کے درمیانی بل کھاتے کچے راستے پر ہولیں تو میں غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے عقبی دروازے کی طرف سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی کھسکنے لگا۔ قسمت بھی شاید میرا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ جس گاڑی کے اندر میں سوار تھا، وہ سب سے آخر میں ہوگئی تھی۔ آگے ان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں جبکہ ہماری گاڑی کے عقب میں اندھیرا تھا۔ ماسوائے سرخ ٹیل لائٹ کے۔

کھیتوں کے درمیان بل کھاتے دھول اُڑاتے کچے راستے پر قوس کی صورت میں گاڑیاں گھومتی ہوئیں جب ایک نہر کی پلیا پر چڑھنے لگیں تو مجھے اس کی دوسری طرف کیکر کا گھنا جنگل سا نظر آیا، اور ایک طرف قبرستان تھا۔ پُلیا قدرے اونچائی پر تھی اس لیے وہ سب لوگ سامنے ہی نظریں جمائے ہوئے تھے، میری طرف سے ان کی غافل نظروں کا مطلب یہی تھا کہ میں کوئی قیدی نہیں تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب ہماری گاڑی پُلیا پر چڑھی میں سیٹ سے فرش پر آچکا تھا اور دروازے کو اوپر اٹھاتے ہی میں نے گاڑی کے فرش پر لیٹے لیٹے ہی خود کو لڑھکنی دے کر باہر گرا دیا۔ گاڑی کے ہچکولوں میں ممکن تھا انہیں احساس نہ ہوا۔ اسی قلیل موقع سے فائدے اٹھاتے ہی میں نیچے گرا۔ بھربھری مٹی والی زمین پر گرتے ہی میں لڑھکتا ہوا نہر کے کراڑے پر آگیا۔ پُلیا پر چڑھتی گاڑی کی رفتار یوں بھی کم ہوگئی تھی۔ گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہ

تھی کہ انہیں زیادہ دیر تک میرے اس ''غیاب'' کا پتا نہیں چلے گا۔ لیکن میں اس تھوڑے سے ہی وقت میں جتنا مجھے ملتا، اپنا کام نمٹا لینا چاہتا تھا کہ ان کی گرفت میں نہ آسکوں......

کراڑے پر گرتے ہی میں اٹھا اور سر ابھار کر دیکھا۔ رینجرز کی گاڑیوں کی ٹیل لائٹیں دور ہوتی نظر آرہی تھیں اور جس وقت میں...... پُلیا پر چڑھتے ہوئے دوسری جانب بنے کیکر کے گھنے جنگل میں داخل ہونے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ رینجرز کی گاڑیاں رک چکی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے غیاب کا علم ہو چکا ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور یکلخت اعصاب تن گئے۔

میں نے جنگل میں دوڑ لگا دی۔ اسی وقت میں نے رینجرز کی گاڑیوں کو ریورس ہو کر پلٹتے دیکھا۔ کیونکہ اب ہیڈ لائٹس کی روشنیاں اسی طرف پڑنے لگی تھیں، میں تاریکی میں دوڑتا چلا گیا...... راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں قبروں پر چل رہا ہوں، مجھے اس کا افسوس تھا۔ ایک پرانی اور دھنسی ہوئی قبر پہ پاؤں پڑا تو میں اندر ہی جا گرا......

☆☆☆

بے اختیار میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ ناگوار بُو کا تیز بھبکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی وہ ہڈیاں بھی جو یقیناً اس مردے کی تھیں جسے دفن ہوئے نجانے کتنا عرصہ بیت چلا ہوگا۔ اس کی روح عالمِ برزخ یا عرشِ بالا کے نجانے کون سے درجے پہ ہوگی، تاہم ایک کالی بھٹ قبر کے اندر خود میں کسی لاش ہی کی طرح سما گیا تھا۔ زندہ حالات میں قبر کا تصور ہی لرزہ دینے کے لیے کافی ہوتا ہے چہ جائیکہ میں تو بہ قائمیِ ہوش و حواس اندر لیٹا تھا۔ چند ثانیے میں اسی طرح دہشت زدہ سا مبہوت حالت میں پڑا رہا، ہوش آیا تو میں نے فوراً سے پیشتر باہر نکلنے کا ارادہ کیا مگر ابھی میں نے اپنا سر قبر سے باہر نکالا ہی تھا کہ ہیڈ لائٹس کی طوفانی روشنیاں چمک اٹھیں ساتھ ہی گاڑیوں کے شور کی آواز بھی سنائی دی۔ تب ہی ایک خیال کلک ہوا۔ یہ قبر، منکر نکیر سے حساب کتاب کیے بغیر میری نجات کا سبب بن سکتی تھی۔ اخروی نہیں تو دنیوی سہی۔ اس خیال سے میں اندر ہی ہنس پڑا۔ میں نے فوراً ہی دوبارہ اپنا سر یوں قبر کے اندر کر لیا جیسے مجھے نیچے سے کسی نے کھینچ لیا ہو اور دو آنکھیں مجھے گھور کر کہہ رہی ہوں۔

''کیوں میاں! حساب کتاب دیے بغیر کدھر جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو......؟''

پھٹی ہوئی اس شکستہ حال قبر کی تہ اور لحد میں کوئی فرق نہ رہا تھا، مٹی جھڑ جھڑ کے سب برابر ہو چلا تھا لیکن میں نے پھنس پھنسا کر...... اپنی جگہ لحد کے اندر بنا ہی ڈالی۔

گاڑیوں کے انجن کی گھرررر...... گھرررر...... کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں دم بہ خود سا قبر کے اندر پڑا رہا۔ مٹی کی کیچڑ...... کیچڑ...... اور اس کی سوندھ سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ قبر کے اندر اس طرح لیٹنے کا میرا یہ پہلا ہی تجربہ تھا اور کم بھیانک نہ تھا۔ دفعتاً کچھ روشنیاں لہرائیں۔ باتوں کی بھی آوازیں ابھریں...... میں دم سادھے لیٹا رہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایک ایک قبر کو کھنگالنے کی سوچتے۔ نہ ہی ان کے سان وگمان میں یہ بات ہوسکتی تھی کہ میں یہاں کسی قبر میں بہ حالت زندہ یوں محوِ استراحت ہوسکتا ہوں......

تھوڑی دیر تک یہی سب کچھ چلتا رہا اس کے بعد دوبارہ گاڑیوں کی گھرر...... گھررر...... کی آواز ابھری اور پھر ایکا ایکی سسکیاں لیتا سناٹا طاری ہوگیا۔ ایسی ہی بھیانک اور خوفناک گھڑیوں میں جب میں لحد اور قبر سے باہر نکلنے کی تیاریوں میں تھا مجھے احساس ہوا جیسے میرے جسم پر لاتعداد حشرات الارض رینگنے لگے ہوں...... میری روح تک کانپ گئی۔ کیا کیڑے مکوڑے مجھے مردہ سمجھ کر اسی ڈھانچے جیسا بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جس کی قبر پر میں نے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا؟ اب تو چبھن بھی محسوس ہونے لگی۔ جب لیٹا تھا کیڑے مکوڑے ٹھہرے ہوئے سے تھے، اب جو ہلا جلا تو ان میں بھی لگتا تھا کہ ہلچل مچ گئی ہو، وہ مجھے کاٹنے لگے تھے۔ میں اچھلا اور قبر سے باہر آکر پاگلوں کی طرح اپنا جسم جھاڑنے لگا۔ تب بھی بات بنتی محسوس نہ ہوئی تو میں نے اپنی شرٹ اتار لی اور پھر پتلون بھی، حشرات الارض کی دہشت ایسی مجھ پہ سوار ہوئی کہ میں نے آخر میں زیرِ جامہ تک اتار دیا۔

اگر کوئی مجھے اس حالت میں ناچتے اچھلتے دیکھ لیتا تو کوئی پاگل دیوانہ یا چلّہ کاٹنے والا ہی سمجھتا۔ لیکن وہ کیا جانتا تھا کہ میں یہ رقص خوش فہم کسی بنائے نجات کے لیے ہی اچھل رہا تھا۔ اس اچھل کود میں خاصے کیڑے جھڑ گئے۔ باقیوں کو میں نے نوچ نوچ کر اتار دیا۔ کیکر کے قبرستان والے اندھیرے جنگل میں مجھے خود کو کپڑوں سے برہنہ دیکھ کر سخت شرم محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ یہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔

قبرستان والے اس جنگل میں بلا کا سناٹا طاری تھا۔ دور کبھی کسی آوارہ جانور کے بولنے کی آواز ابھرتی اور پھر وہی دھڑکا دینے والی خاموشی طاری ہو جاتی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے...... رینجرز والے شاید کہیں اور جگہ پر میری تلاش میں جا چکے تھے۔ ممکن تھا وہ پلٹ کر دوبارہ اسی جگہ آتے۔ میں نے ایک اندازے کے مطابق چلنا شروع کر دیا اور جنگل سے نکل کر نہر کے پاس آگیا۔ یہ شاید کسی قریبی گزرتے ہوئے دریا سے نکلتی تھی۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا کیا تھا مجھے ابھی تک اپنے جسم پر کیڑے مکوڑے چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اس ذرا تصور سے ہی لرز گیا تھا جب حقیقت میں موت گلے لگے گی اور مقدر میرا قبر ہوگی تو اس وقت میں کیڑے کیسے جھاڑوں گا......؟ میں نے دل ہی دل میں سورہ یٰسین شریف اور آیت الکرسی پڑھی، اللہ سبحان تعالیٰ سے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتے ہوئے...... نہر میں اتر گیا۔

میں نے ایک بار پھر کپڑے اتار لیے تھے اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہا کر باہر نکلا، اس کے بعد کپڑے پہنے۔ گردوپیش پر ایک نظر ڈالی اور ٹیلیا کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

ٹیلیا پار کر کے میں نے واپسی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ یہاں گاؤں گوٹھوں میں کھیتوں کی حفاظت وغیرہ کے لیے لوگوں نے کتے چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے ان کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دی تھیں مگر میں اللہ کا نام لیے واپسی کے سفر پر گامزن رہا۔ میں پہلے سے ہی شاہنواز خان کی حویلی کا راستہ اپنے ذہن میں پکا چکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی ہو رہی تھی کہ میجر وسیم اور کیپٹن آصف یوں آسانی سے میری ناکام تلاش کے بعد اتنی جلدی چلے کیوں گئے تھے۔

بہرطور یہ میرے لیے غنیمت تھا۔ وہ اب بھلا مجھے کہاں تلاش کر سکتے تھے؟ انہیں شاید تسلی ہوگی کہ میں کہاں جا سکتا تھا۔ کیونکہ میرے دو ساتھی (اول خیر اور کبیل دادا) ان کی تحویل میں تھے۔ انہیں شاید جلد یا بدیر میری رضا کارانہ واپسی کی امید ہوگی۔

میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مشرق کی سمت اب پو پھٹتی نظر آرہی تھی جو سحرِ صبح کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں تاریک اور کچے راستوں میں آگے بڑھتا رہا۔ کتوں کے ڈر سے میں نے کھیتوں کے بیچ گزرنے سے اجتناب ہی کیا تھا۔ نسبتاً کھلے راستے سے ہوتا ہوا میں آبادی میں داخل ہوگیا۔ دیہی ماحول خواہ پنجاب کا ہو یا سندھ کا، ایک ہی ہوتا ہے۔

یعنی الصباح بیداری......لوگ باگ جاگنے لگے تھے۔ پیچھے سے ایک سائیکل والا دودھ کے کین کھڑکھڑاتا ہوا، روایتی دستور کے مطابق مجھے سلام کرتا ہوا گزرا......

تقریباً نصف گھنٹا چلتے رہنے کے بعد میں...... شاہنواز خان کی حویلی والے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ صبح کاذب کی روشنی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ میں نئی مہم جوئی کے لیے خود کو ذہنی اور جسمانی طور تازہ دم کرنے کے لیے ذرا دیر کوستانے کے لیے پیپل کے ایک گھنے درخت تلے رک گیا۔

گاؤں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ٹھہری فضا میں مدھریاں ہونے لگی تھی۔ میں پھر چل دیا۔ جلد ہی مجھے شاہنواز خان کی حویلی کا خاکہ نظر آنے لگا۔ میں تھوڑا اور اس کے قریب جا کر رک گیا اور اس کے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ بلند و بالا حویلی کے دو طرفہ تو ہموار سطح تھی، مٹی اور گرد کا میدان سا تھا۔ دائیں جانب...... کماد کے کھیتوں کا سلسلہ دور تک جاتا دکھائی دیا۔ عقب میں...... بھی کھیت ہی نظر آتے تھے۔ صرف سامنے اور بائیں رخ پر مذکورہ میدان تھا۔ مجھے دور ہی سے...... چند ایک مسلح حواریوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تھوڑا اور آگے بڑھا اور پھر ذرا قریب پہنچ کر میں نے راستہ بدل ڈالا۔

اب میرا رخ بائیں جانب کماد کے کھیتوں کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے اصل راستے سے ہٹ کر...... ایک خاصا بڑا چکر کاٹنا پڑا تھا تاکہ میں کسی حواری کی نگاہ میں نہ آسکوں...... اگلے چند منٹوں بعد میں کھیت کے اندر کسی چیتے کی طرح گھات لگائے بیٹھ گیا اور چند لمحے بعد میں نے حویلی کی عقبی سمت سرکنا شروع کر دیا۔

جہاں کماد کا کھیت ختم ہوتا تھا...... وہاں سے حویلی کی پچھلی دیوار صرف دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں وہیں سرے پہ دبک گیا اور یونہی گرد و پیش کی سن گن لیتا رہا...... ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں کوئی پہرے دار کئی ثانیوں تک نہیں گزرتا دکھائی دیا تو میں...... نے دیوار کا دور سے ہی دبک کر جائزہ لیا۔

میں نے خفیہ طور پر حویلی کے اندر اس وقت تک ڈیرا ڈالنے کا ارادہ کر رکھا تھا جب تک کہ مجھے حقائق کا ادراک نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ در پردہ رہتے ہوئے بھی بہت سے ''پردے'' اٹھ جاتے ہیں۔

حویلی کی عقبی دیوار خاصی ''سی پیج'' زدہ نظر آ رہی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ عمارت کا سارا واٹر اینڈ ڈرینج سسٹم کے پائپوں کا جال اس دیوار پر پھیلے ہوئے ہونے کے باعث پانی رستا رہتا تھا۔ مجھے حویلی کے ایسے دریچوں کی تلاش تھی جس سے میں اندر داخل ہونے کی کوئی راہ ڈھونڈتا۔

اوپری منزل پر تین، چار دریچے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے دو دریچے تھے اور دونوں ہی بند تھے۔ باقی چند ایک دریچوں پر روشن دان کا گمان ہوتا تھا۔ اچانک ہی میری نگاہ دیوار کے آخری سرے پر پڑی، یہ میرے سیدھے ہاتھ کی دیوار تھی جو آگے سے گھوم کر حویلی سے ملحقہ اوطاق کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی دروازہ سا محسوس ہوا۔ اس کا یقین کرنے کے لیے میں کماد کی آڑ لیے تھوڑا اور اسی سمت کو سرکنے لگا مگر چند فٹ تک سرکنے کے بعد مجھے تھمنا پڑا تھا کیونکہ اس کے بعد کھیت کی حدود ختم ہو رہی تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف کچھ مزید قریب آنے پر مجھے وہ دروازہ ہی لگا تھا لیکن اس کی چوکھٹ جس پر مجھے سرخ پختہ اینٹیں نظر آ رہی تھیں...... اب مجھے دروازہ دیکھنے کے لیے کھیتوں کی آڑ سے باہر نکلنا پڑتا۔

بہرحال کچھ بھی تھا، مجھے یہ رسک تو لینا ہی پڑتا۔ لہٰذا میں نے اللہ کا نام لیا اور پہلے دائیں بائیں دیکھا، کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کی تسلی کرتے ہی میں نے اپنے تیزی سے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کماد کے کھیتوں سے نکلا اور مذکورہ سمت دوڑا......

قریب پہنچتے ہی میں دیوار سے چپک گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے دوبارہ حرکت میں مطلق دیر نہ لگائی تھی۔ وہ سنگل پٹ کا ایک سالخوردہ دروازہ تھا۔ میرا یہ شبہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ اصل چوکھٹ سے وہ تقریباً ڈیڑھ فٹ اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ دروازے پر باہر کی جانب سے کنڈی تو نہیں لگی ہوئی تھی تاہم جب میں نے اسے اندر کی طرف ہلکا سا دھکا دیا تو وہ تھوڑا ہلتا ہوا محسوس ہوا مگر کھلا نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے وجود کو چوکھٹ کے خلا میں سمو دیا تاکہ فوری طور پر کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہ سکوں...... اگر ممکنہ طور پر دائیں بائیں کی دیوار سے کوئی اچانک نمودار ہو جاتا تو جب تک وہ بالکل قریب نہ آ جاتا، مجھ پر اس کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

تھوڑا اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے دروازے پر ہلکی ہلکی زور آزمائی شروع کر دی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی کوئی جھری سی تلاش کر کے جھانک کر یہ

تسلی کر لی تھی کہ کوئی اندر موجود تو نہ تھا، نیز یہ دروازہ کسی اسٹور نما بند کمرے کا تھا یا پھر کوئی عام رہائشی کمرا تھا۔ اگرچہ دروازے کی باہر سے حالت دیکھ کر تو یہی لگا تھا کہ وہ کسی اسٹور کا ہی دروازہ ہوسکتا تھا اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

دروازے پر زور آزمائی کرنے کے دوران مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کی کنڈی ڈھیلی ڈھالی سی ہی تھی مگر باوجود اس کے کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ چوکھٹ اور دروازے کے بیچ اتنا ''گیپ'' ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ میں نے ایک ہاتھ بہ آسانی اندر داخل کر دیا تو دوسرے ہی لمحے میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا...... کیونکہ میرے ہاتھ کی انگلیوں سے اندرونی کنڈی ٹکرائی تھی۔ ابھی میں اسے اتارنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونکا۔

''میرو...... میرو......''

پتا نہیں کون کسے بہ آواز بلند پکار رہا تھا۔ میں اپنا پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا کام ادھورا چھوڑ کر یکلخت سیدھا کھڑا ہو گیا۔ آواز میرے دائیں جانب کی دیوار سے آئی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسی طرف کو آرہا ہو۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کنڈی اتار کر اندر گھس جاؤں مگر اب شاید اتنا وقت بھی تو نہیں رہا تھا، کیونکہ میں قریب آتے ہوئے اس شخص کے قدموں کی آواز صاف سن رہا تھا۔ وہ اب کسی بھی وقت چوکھٹ کے خلا کے سامنے سے گزرنے والا تھا...... اور وہی ہوا...... وہ ایک مسلح آدمی تھا اور حویلی کا کوئی پہرے دار ہی نظر آتا تھا۔ وہ ہنوز کسی میرو نامی آدمی کو آوازیں دیتا ہوا بڑھا جارہا تھا۔ اسی وقت وہ اندر کو دھنسی ہوئی چوکھٹ کے سامنے نمودار ہو گیا۔ میں نے جیسے اپنی بے ترتیب پڑتی سانسیں تک روک لیں...... وہ سیدھا دیکھ رہا تھا۔ ایک ذرا سی بھی گردن اگر وہ اس طرف کو موڑ لیتا تو میں دروازے کے ساتھ چپکا کھڑا اسے نظر آجاتا......

قسمت یاور رہی میری کہ وہ میرو کو آوازیں دیتا ہوا میرے بالکل دو فٹ کے فاصلے سے گزرتا چلا گیا مگر ٹھیک اسی وقت ایک غیر متوقع اور عجیب سی مصیبت گلے آپڑی۔ جس دروازے پر میں زور آزمائی کرنے میں مصروف تھا اس میں اچانک کھڑبڑاہٹ سی ابھری اور میرے اوسان خطا ہو گئے، یہ بات یقینی تھی کہ کوئی اندر سے دروازہ کھول رہا تھا اور کیا پتا اسے کسی بات کا شبہ ہو گیا ہو......

''اڑے او...... جانوری......! اِدھر ہوں میں......''

اسی دروازے سے اندر ایک دوسرے آدمی کی صدا ابھری اور مجھے اپنی لب بام کامیابی کے ناکام جانے پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ اس آدمی نے جو بلاشبہ میرو ہی ہوسکتا تھا، اچانک دروازہ کھول دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا اور میں اُسے...... پل کے پل ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں گھورنے لگے جیسے ایک دوسرے کے لیے کسی دوسری دنیا کے باسیوں کا درجہ اختیار کر گئے ہوں...... ایسی عجیب صورتِ حال میں ہم دونوں ہی جیسے ہپناٹائز ہو گئے تھے...... اس نازک کم سنگین ترین لمحہ کے اندر ہی اندر میں نے بہ سرعت حرکت کی اور اس کی ناک پر اپنے دائیں ہاتھ کے ہتھوڑے جیسا گھونسا رسید کر دیا...... وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کریہہ ناک آواز خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا اور پھر گر پڑا...... میں اتنے ہی موقع کو بہت جان کر غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔

یہ تو شکر تھا کہ اس متوقع میرو نامی آدمی نے اپنے ساتھی کو اس وقت پکار کا جواب دیا تھا جب وہ میرے محتاط اندازے کے مطابق کئی قدم آگے جا چکا تھا۔ ورنہ میں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ جاتا۔ یعنی یک نہ شد دو شد والی بات ہو جاتی...... اگرچہ اب بھی پہلے والے اس کے ساتھی کی طرف سے خدشہ بدستور موجود تھا۔

مُکا لگنے کے سبب میرو کا دماغ کئی ثانیوں کے لیے ماؤف ہو چکا تھا۔ اندر کسی روشندان سے آتی روشنی میں، میں نے اندر سیمنٹ بجری کا ریختہ سا پھیلا ہوا دیکھا تھا اور وہاں اناج وغیرہ کی بوریاں بھی بے ترتیب انداز میں رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں، میرو مُکا کھا کے انہیں بوریوں پر جا پڑا تھا۔ میں نے ایک فولادی اوزار اٹھا کر زور سے اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

''میرو...... اڑے او...... میرو...... کتھے مر گیاں اوئے......''

باہر سے پھر مجھے اس کے پہلے والے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ میں دھک سا رہ گیا۔ اس بار اس نے سندھی سرائیکی میں اپنے ساتھی میرو...... کو پکارا تھا، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور کنڈی بھی چڑھا دی...... کہیں وہ اِدھر کا ہی رخ نہ کر لے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے میرو کی جوابی آواز نہیں سنی ہو گی۔ میں دروازے سے لگا کھڑا رہا اور ایک کان دروازے سے چپکا لیا۔ دروازے کے باہر مجھے اس...... آدمی کے قدموں کی

کبھی ...... کچھ سنائی دی جو دروازے کے عین قریب آ کر ایک دم تھم گئی۔ میرا دل متوقع خطرے کے باعث تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے دوبارہ جاتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی، مگر جو کچھ ہوا تھا میری پلانڈ منصوبہ بندی کے خلاف ہی ہوا تھا۔ کیونکہ اب میرے پاس کوئی ایسا موقع نہیں بچا تھا کہ میں آرام اور تسلی کے ساتھ یہاں ڈیرا ڈال کر کچھ کرتا۔ میرو کی ڈھنڈیا... پڑ سکتی تھی۔ اس پر مستزاد اس کا ساتھی اسے پہلے سے ہی تلاش بھی کر رہا تھا۔ تاہم میں نے کچھ سوچ کر وہیں کوئی رسی کا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اسٹور میں ایسی اور بھی بہت سی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے بے ہوش میرو کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے اور...... اس کے منہ میں بھی ایک کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کا گولا بنا کے ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اسے کونے میں بنے ایک اور سپاٹ سے باتھ روم سائز کے گوشے میں لے جا کر پھینک دیا۔

اسٹور کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے دوران مجھے اس کے کونے میں ایک دروازہ بھڑا ہوا دکھائی دیا، وہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ میرو یقیناً اسی دروازے سے ہی اندر داخل ہوا تھا جو بلاشبہ حویلی کے اندر کسی گوشے میں کھلتا تھا۔

ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ میرو کو ہی تختۂ مشق بناتے ہوئے اس کے منہ سے حقیقت اگلوائی جائے مگر اس میں کئی ابہام مجھے محسوس ہوئے تھے۔ وہ بتانے سے انکار کرتا تو مجھے اس کا منہ کھلوانے کے لیے تشدد کرنا پڑتا، جان سے تو میں اسے نہیں مار سکتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ واقعی کچھ نہیں جانتا ہو...... کیونکہ اس کا جائزہ لینے کے دوران وہ مجھے کوئی عام سا ہی ملازم ٹائپ اور غیر مسلح آدمی لگا تھا۔ جبکہ میرا اصل ٹارگٹ صالح جان تھا جو زمیندار شاہنواز خان کا مجھے کوئی قریبی دستِ راست لگتا تھا۔ وہ یقیناً ساری حقیقت جانتا ہوگا اور یہ بھی کہ شاہنواز اس وقت کہاں چھپا بیٹھا تھا نیز شکیلہ اور ارم وغیرہ کو اس بدبخت نے کہاں قید کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ طلسم نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ...... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اللہ سے شکیلہ کے لیے خیر و عافیت کی دعا مانگی۔

صالح جان کو ہدف بنانے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رینجرز کی ناکام ریڈ کے بعد حویلی میں کیا حالات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شاہنواز کے سلسلے میں صالح جان نے میجر وسیم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ جامشورو کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا ہے۔

بہرطور...... میں دبے پاؤں بھڑے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور اس کی چوڑی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔ سامنے ایک راہداری نما راستہ تھا۔ یہ زیادہ طویل نہ تھا، بہ مشکل دس، پندرہ گام کے بعد وہ دائیں جانب گھوم رہا تھا۔ یہاں دائیں بائیں چند کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جو بند تھے۔ راہ داری میں مدھم سی تاریکی تھی اور وہ سنسان پڑی تھی۔ میں اسٹور نما اس کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری میں آ گیا۔ مجھے دیکھ لیے جانے کا خدشہ دامن گیر تو تھا ہی تاہم میں نے اس سلسلے میں حد درجہ احتیاط برتی ہوئی تھی۔

اچانک میں نے کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی...... میں ایک دم ٹھٹک کر ایک دیوار گیر چوڑے پلر کی آڑ میں ہو گیا۔

سامنے سے مجھے صالح جان آتا دکھائی دیا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا اور وہ کسی سے باتیں کرتا ہوا...... ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اپنے شکار کو دیکھتے ہی...... میرا رُواں رُواں جوش سے تھرکنے لگا۔ میں نے فوراً اسی کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لی۔ صالح جان کو بدستور کسی سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے پایا۔ میں ابھی پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کسی فیصلے پر اٹکا ہوا تھا کہ اچانک مجھے یوں لگا...... جیسے...... اندر کمرے میں صالح جان موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا ہو...... میں چونکہ دروازے سے کان لگائے ہوئے تھا اسی لیے اندر کی معمولی کھڑبڑاہٹ بھی مجھے صاف سنائی دی تھی جو صالح جان کے اچانک خاموش ہو جانے کے بعد ابھری تھی...... مجھے سخت تعجب ہوا کہ آخر اندر صالح جان کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا......؟ اور پھر اندر ابھرنے والی وہ عجیب سی آوازیں......؟ آخر کیا معمّا تھا یہ......

اس کے چند لمحے بعد ہی...... میرے لیے حیرت کا ایک اور جھٹکا تیار تھا جب میں نے...... دروازے کی جھری سے اندر جھانکا تھا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ
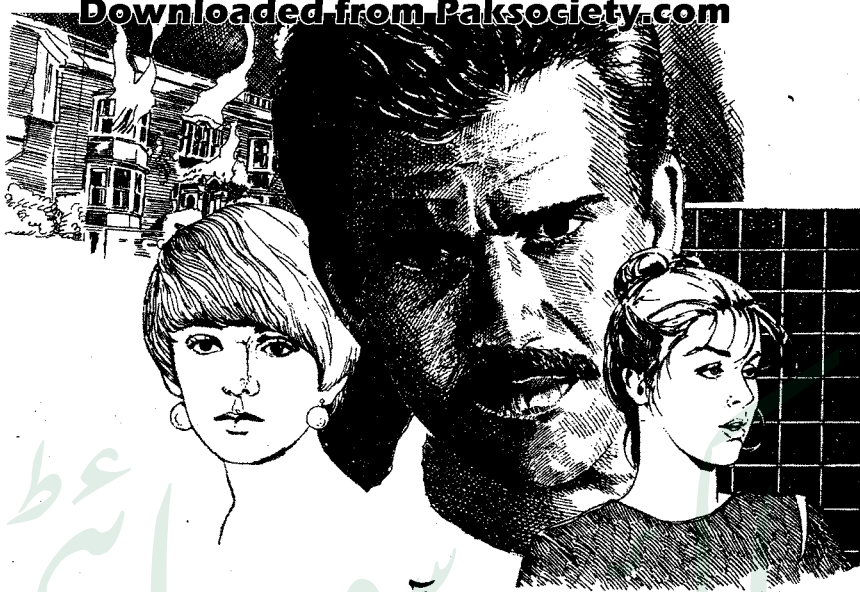
آتشِ زن

تنویر ریاض

جھوٹ بولنا نہ کوئی اضطراری غلطی ہے... نہ اتفاقی حادثہ بلکہ یہ کردار کی خاصیت ہوتی ہے۔ جس کی جڑیں گہری بھی ہو سکتی ہیں... جھوٹ کی عادت بدلنے کے لیے اور سچ بولنے کی عادت ڈالنے کے لیے بڑے جتن کرنا پڑتے ہیں... سچ کی عادت پڑجائے تو بہت چین و سکون ملتا ہے... سچ کا سامنا کرنے کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے اگر اسے رد کردیں تو شدید ترین اذیت جھیلنی پڑتی ہے... ایک ایسی ہی دلیر خاتون کی عادتیں... وہ عورتوں کے تحفظ اور ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف ڈٹ کے کھڑی تھی... اسے ہر حال میں سچ کا ساتھ نبھانا آتا تھا...

اس آتش پرست کا ماجرا جو عورتوں کا دشمن تھا

پہلی بار اس آتشِ زن کی موجودگی کا اشارہ اس وقت ملا جب وہ 23 جنوری 1969ء کو تھرڈ ورلڈ لبریشن فرنٹ کے احتجاج میں خفیہ طور پر شامل ہوا۔ میری کا اس مظاہرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دس سال پہلے کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے میں پڑھا کرتی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اسی شہر میں چھوٹی موٹی ملازمت کی اور بالآخر اپنا جم کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے فزیکل ایجوکیشن میں ڈگری حاصل کی تھی اور یہ کاروبار اس کی تعلیمی قابلیت

سے مطابقت رکھتا تھا۔ کم از کم اس نے لوگوں کو یہی بتایا اور کسی کو بھی اصل وجہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دراصل وہ ان عورتوں کی مدد کرنا چاہتی تھی جو مردوں کے ظلم سہہ رہی تھیں اور اپنا دفاع کرنے سے قاصر تھیں۔ اس کی ایک سہیلی ڈورس پر اس کے بوائے فرینڈ نے اتنا تشدد کیا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی یا پھر ایک ڈاکو نے اس کی سہیلی کیرول کا پرس چھیننے کی کوشش کی اور مزاحمت کے نتیجے میں اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ کئی مہینوں تک بولنے کے قابل نہ ہوسکی۔

میری کی تربیت کا مقصد ایسی ہی عورتوں کی مدد کرنا تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ حملہ آور پر غالب آسکیں۔ وہ انہیں صرف جوابی حملہ کرنے کی تربیت نہیں دیتی تھی بلکہ یہ بھی سکھاتی تھی کہ کس طرح اس پُرتشدد صورتِ حال سے بچا جائے۔ اسے یہ سبق اس کے باپ نے پڑھایا جو فلاڈیلفیا میں پولیس آفیسر تھا۔ وہاں اس نے کئی عورتوں کو زخمی ہوتے دیکھا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اپنا تحفظ کس طرح کیا جائے۔

اس رات وہ دیر تک کلاس لیتی رہی اور جب باہر آئی تو آسمان نارنجی ہورہا تھا اور چاروں طرف دھواں پھیل چکا تھا۔ اس نے پہلے آسمان کی طرف اور پھر سڑک کی جانب دیکھا اور اسے اطمینان ہوگیا کہ یہ آگ اس کے آس پاس نہیں لگی ہے۔ پھر اس نے جم کا دروازہ مقفل کیا اور چابیاں جیب میں ڈال لیں۔ پرس کندھے پر لٹکایا اور سڑک پر چل دی۔ اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر دیکھا اور اس کا سانس رکنے لگا۔ آگ بہت بڑی اور کافی فاصلے پر تھی۔ وہ ٹیلی گراف ایونیو کی طرف گئی۔ وہاں سب لوگ اپنے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر آگئے تھے اور ان کی نظریں کیمپس کی جانب تھیں۔ دھوئیں کے بادل گہرے ہوگئے تھے اور اس کے دائیں جانب شعلے واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

کیمپس نارنجی روشنی میں نہا گیا تھا لیکن اسے ابھی تک آگ بجھانے والی گاڑیوں کے سائرن کی آواز نہیں سنائی دی۔ جو بظاہر عجیب سی بات تھی لیکن اس نے مظاہرین کے نعرے بھی نہیں سنے اور نہ ہی ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی آواز سنائی دی۔ کئی ماہ سے اقلیتی طالب علموں کا گروپ تھرڈ ورلڈ لبریشن فرنٹ کے نام سے یونیورسٹی میں نسلی تعلیم کے کالج کے لیے احتجاج کررہا تھا۔ یہ ان طالب علموں سے مختلف تھے جو ساڑھے چار سال پہلے فری اسپیچ موومنٹ کے نام سے منظرِعام پر آئے تھے۔ یہ لڑاکا قسم کے لوگ تھے۔ اکثر فوجی وردی پہنتے اور چھوٹی چھوٹی پُرتشدد کارروائیوں سے کیمپس کی پولیس کو مشتعل کیا کرتے۔

وہ گیٹ پر پہنچی۔ اسے توقع تھی کہ وہ وہاں پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہوتا دیکھے گی لیکن اس نے دیکھا کہ وہاں موجود طالب علم بھی اس کی طرح پریشان تھے۔ بالآخر اس نے سائرن کی آواز سنی جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ وہ مرکزی کیمپس کی طرف بڑھی۔ فضا میں دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی اور اس کے لیے پلکیں جھپکانا مشکل ہوگیا۔

آگ کے شعلے وہیلر ہال کی چھت سے بلند ہورہے تھے جو کہ کیمپس کی پرانی عمارتوں میں سے ایک تھی۔ سیکیورٹی کا عملہ پانی کے پائپ کھینچ کر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر لے جانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ عمارت کے اندر فائر الارم کے قریب آگ بجھانے کے آلات اور پائپ موجود ہیں۔ کیا انہیں اس کا علم نہیں؟ جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچی۔ کسی نے اس کا بازو پکڑلیا۔ پروفیسر وائٹ جونز اسے پیچھے کھینچتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں میری۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میری کو آگ بجھانے کے آلات کا علم تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس قسم کی آگ پر کیسے قابو پایا جاتا ہے۔ اسی وقت ایک آگ بجھانے والا ٹرک اس کے پیچھے آکر رکا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ آگ بجھانے والا عملہ جائے وقوعہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے میگا فون پکڑا، اور چلا چلا کر لوگوں کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہنے لگا۔ وہ بھی مجمع کی طرف جانے لگی۔ تبھی پروفیسر نے کہا۔

''وہ کیا سوچ رہے تھے میری؟''

اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پروفیسر کے خیال میں یہ آگ لگائی گئی ہے۔

''تمہارا خیال ہے کہ یہ کسی کی حرکت ہے؟'' میری نے کہا۔

''کوئی بھی آڈیٹوریم کو استعمال نہیں کررہا تھا۔'' پروفیسر جونز نے کہا۔ ''اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہم سب نے وہ آواز سنی۔ وہ کوئی دھماکا نہیں تھا لیکن یوں لگا جیسے فضا میں سے ہوا کھینچ لی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی کی حرکت ہے اور یہ مظاہرین ہی ہوسکتے ہیں۔''

''کیا تم نے انہیں دیکھا؟'' اس نے اپنے باپ کے انداز میں جرح کی۔

''میں کلاس لے رہا تھا۔ اس لیے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کون تھے؟ آدھا کیمپس اس گند میں شامل ہو گیا ہے اور وہ سب کچھ تباہ کرنے پر تل گئے ہیں۔ دیکھو، انہوں نے کیا کر دیا۔''

اس کی آواز بھرّا گئی تھی اور میری کو لگا جیسے وہ رو دے گا۔ میری نے اسے غور سے دیکھا۔ اس نے پورا کیریئر یہیں گزار دیا تھا اور اب وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ وہ جس پُرسکون تعلیمی ماحول کا عادی تھا وہ پانچ برس پہلے ہی ختم ہو چکا تھا اور ان تبدیلیوں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

یکے بعد دیگرے مزید دو ٹرک اور آ گئے۔ ان کے آنے کے بعد سیکیورٹی کا عملہ وہاں سے چلا گیا۔ البتہ کچھ اب بھی باغ کا پائپ پکڑے کھڑے تھے۔ فائرمین میری کے پاس سے گزرتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ پھر ایک اور ٹرک آیا۔ اس میں سیڑھی نصب تھی۔ اس کی مدد سے آگ کے شعلوں پر پانی کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ میری نے واپس سڑک کا رخ کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس کا سامنا طالب علموں کے ایک گروپ سے ہوا۔ جنہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے گھبراہٹ میں پرس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ لڑکے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے پھر اس نے ایک آدمی کو درخت پر جھکے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ گرد آلود اور بال لمبے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں کتابیں بھی نہیں تھیں لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ میری نے سنا تھا کہ آگ کے شعلوں سے بچنے کے لیے کئی طالب علم اور پروفیسر اپنی چیزیں عمارت میں ہی چھوڑ آئے تھے۔

میری نے اس شخص کی طرف دیکھ کر سر ہلایا تو وہ بھی بے دلی سے مسکرا دیا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ کوئی اس کا خیر مقدم کر سکتا ہے اور پھر وہ اسٹرابیری کریک کی طرف چل دیا۔ میری کو اس کی یہ حرکت بہت عجیب لگی لیکن وہ فوری طور پر اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ اس نے سڑک پار کی اور احتیاطاً دونوں جانب نظریں دوڑائیں کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ وہ واپس ٹیلی گراف کی طرف چل دی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اب وہ گھر جانا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

جمعے تک اس نے اس آگ کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی۔ وہ معمول کے مطابق صبح جم آئی اور اپنے ذاتی کچن میں کافی بنانے لگی۔ کسی زمانے میں جم کے عقبی حصے میں دو اسٹوڈیو اپارٹمنٹ ہوا کرتے تھے جن کا زیادہ تر حصہ لاکر روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک کچن کو اپنے دفتر کا حصہ بنا لیا تھا جہاں وہ اپنے لیے کافی بنانے کے علاوہ ریفریجریٹر میں کھانا بھی رکھ سکے۔ دوسرا چھوٹا کچن لاکر روم سے ملحق تھا اور اسے دیگر خواتین استعمال کرتی تھیں۔

اس کی صبح کی کلاس دو گھنٹے کی ہوتی تھی جس میں کوئی طالب علم نہیں تھا اور اس میں آنے والی عورتیں بھی اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ میری کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اس جگہ کا پتا کیسے معلوم ہوا۔ ابتدا میں چھ عورتیں آئیں لیکن کرسمس تک ان کی تعداد تین رہ گئی۔ میری کو امید نہیں تھی کہ وہیلر ہال میں لگنے والی آگ کے بعد ان میں سے کوئی اس روز کلاس اٹینڈ کرنے آئے گی۔ سب سے پہلے اسٹیلا آئی۔ وہ اس طرح عجلت میں دروازہ کھول کر اندر آئی جیسے اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا ڈر ہو۔

اس کے بعد آنے والی جینی تھی جس نے اپنے ہاتھ میں بیگ پکڑا ہوا تھا۔ میری جانتی تھی کہ اس میں جم کے کپڑے ہوں گے۔ یہ عورتیں اپنے کپڑے میری کے جم میں ہی رکھتی تھیں تاکہ ان کے شوہر غیر ضروری پوچھ گچھ نہ کریں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ جینی کا شوہر اس کا بیگ کھول کر نہیں دیکھتا۔

سب سے آخر میں آنے والی این ایمرسن تھی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ آج تم لوگوں سے ملاقات ہوگی۔'' میری نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہمیں مجبوراً آنا پڑا۔'' اسٹیلا نے کہا۔

''ہم یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔'' جینی بولی۔ ''کیا ایسا نہیں ہے؟''

''مظاہرین ابھی تک کیمپس سے نہیں گئے۔'' میری نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے زیادہ وہ ان کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتی لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''لیکن وہ آگ بڑی خوفناک تھی۔'' جینی نے کہا۔

''اگر وہ مظاہرین وہیلر ہال کو نذرِ آتش کر سکتے ہیں تو وہ پورے شہر کو بھی آگ لگا دیں گے۔''

''وہ آگ ایک دفعہ کی بات تھی۔'' اسٹیلا نے کہا۔ ''ویسے بھی رائے کا کہنا ہے کہ اس کا احتجاج سے کوئی تعلق نہیں۔''

این نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''لیکن چانسلر نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مظاہرین کی کارروائی ہے۔''

''اخبارات کا موقف اس سے مختلف ہے۔'' اسٹیلا بولی۔ ''رائے کے کہنے کے مطابق اخبار والوں کو پورا یقین ہے کہ یہ آگ مظاہرین نے نہیں لگائی تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ لوگ ان کی بات کا یقین کرلیں۔''

''وہ چانسلر کی کہی ہوئی بات کو درست نہیں سمجھتے۔'' جینی نے کہا۔

''لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اصل مجرم ابھی تک آزاد ہے۔'' این نے کہا۔

''اصل مجرم ضرور پکڑا جائے گا۔'' اسٹیلا نے بڑے یقین سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ وہ اسے تلاش کررہے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا تعلق مظاہرین سے ہوسکتا ہے۔ اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے۔ اس کے مطابق اس آگ کا تعلق وہاں ہونے والی مووی فائٹس سے ہے۔''

''مووی فائٹس؟'' میری نے پوچھا۔

اسٹیلا نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ وہاں مختلف مقاصد کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے پرانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اب یونیورسٹی انتظامیہ نے پابندی لگادی ہے کہ اس آڈیٹوریم کو غیر طلبہ تنظیموں کے لیے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔''

''وہ ایسا کیوں سوچیں گے کہ اس آگ کا تعلق فلموں کی نمائش سے تھا۔'' میری نے پوچھا۔

''کیونکہ۔'' اسٹیلا بولی۔ ''رائے کا کہنا ہے کہ مختلف گروپ ان فلموں کی نمائش سے بے تحاشا پیسا کما رہے تھے۔''

میری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ ان فلموں کا ٹکٹ بہت کم تھا اور آڈیٹوریم میں نشستوں کی تعداد بھی ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

''گویا وہ اب بھی مظاہرین کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔'' این نے کہا۔

جینی نے تائید میں سر ہلا دیا لیکن اسٹیلا کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ بولی۔ ''نہیں۔ یہ کوئی مختلف گروپ ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس مووی کلب کا کوئی رکن ان مظاہرین کے لیے فنڈ جمع کررہا تھا۔''

''ان کے پاس کیا ثبوت ہے؟'' میری نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔'' اسٹیلا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس بارے میں رائے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

یہ کہہ کر وہ لباس تبدیل کرنے لاکر روم میں چلی گئی۔ جینی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ این نے میری سے کہا۔ ''کیا تم عورتوں کو یہاں رات میں قیام کرنے کی اجازت بھی دیتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ ایک دن میں صبح جلدی آگئی تھی تو میں نے ایک عورت کو یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔''

میری اس کا مطلب سمجھ گئی۔ غالباً وہ اسے متنبہ کررہی تھی کہ اس طرح عورتوں کو ٹھہرانے سے اس کے کاروبار پر اثر پڑ سکتا ہے وہ بولی۔ ''ہاں، کبھی کبھی میں عورتوں کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیتی ہوں لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔''

این کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ جینی نے لاکر روم کے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں لباس تبدیل کرنا ہے یا نہیں؟''

اگلے ہفتے حالات مزید خراب ہوگئے۔ کیمپس پر ہونے والا مظاہرہ اس وقت پُرتشدد ہوگیا جب ساٹھ پولیس والے مارچ کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھے اور ڈنڈے برسانے لگے۔ مظاہرین نے مشتعل ہوکر کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے اور کلاسوں میں خلل ڈالا۔ وہ اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ تعلیم ہر ایک کا حق ہے اور یہ صرف گورے طالب علموں کے لیے مخصوص نہیں ہونی چاہیے۔

جب اس نے سنا کہ کسی نے فون پر وہیلر ہال کو دوبارہ آگ لگانے کی دھمکی دی ہے تو وہ بُری طرح خوف زدہ ہوگئی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ گرٹن ہال کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی نقصان پہنچنے سے پہلے ہی اس پر قابو پالیا گیا۔ یہ ہال 1911ء میں ایک آرکیٹیکٹ جولیا مورگن نے عورتوں کے لیے ڈیزائن کیا تھا۔ اسی لیے میری کو اس سے قلبی لگاؤ تھا۔ یہ خبر سننے کے بعد وہ وقفے کے دوران اسے دیکھنے چل دی۔ وہ مظاہرین سے بچ کر نکلنا چاہ رہی تھی جو عام طور پر سیدر گیٹ اور سپرول پلازا پر جمع ہوئے تھے۔

اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اس نے دائیں

جانب گھوم کر دیکھا۔ ایک نوجوان سفید سویٹر اور گہرے رنگ کی پتلون پہنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں بھی تھیں۔ وہ اس کے قریب آیا پھر سمت بدل کر گریک تھیٹر کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گرٹن ہال میں داخل ہوگئی۔

اس دن سب کچھ معمول سے ہٹ کر تھا۔ سردی کے باوجود آتش دان میں آگ نہیں جل رہی تھی۔ کرسیاں دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں اور کچھ طالب علم فرش کی صفائی کررہے تھے۔ کسی نے اس کا استقبال نہیں کیا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ میری ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی چھوٹے سے کچن میں چلی گئی۔ وہاں اس نے اپنی پرانی دوست ایڈا کو دیکھا۔ وہ ایک کاؤنٹر پر جھکی ہوئی کافی پی رہی تھی۔

''کیا یہ سچ ہے۔'' میری نے ہیلو ہائے کیے بغیر پوچھا۔ ''کہ کسی نے اس عمارت کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی؟''

ایڈا اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''مٹی کے تیل سے بھری ہوئی سات بوتلیں کپڑے کے ٹکڑوں کے ساتھ ملی ہیں۔ کسی نے ان کپڑوں کو آگ دکھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور ان کپڑوں نے آگ نہیں پکڑی۔ فائر ڈپارٹمنٹ والوں کا کہنا ہے کہ اس جگہ کو کوئی خطرہ نہیں۔''

میری نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور بولی۔ ''جب یہ واقعہ پیش آیا تو تم یہیں تھیں؟''

ایڈا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، میں بعد میں آئی۔''

''انہوں نے کیا کیا؟ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر بوتلیں اندر پھینکیں؟'' میری نے پوچھا۔

''یہی تو عجیب بات ہے۔'' ایڈا کافی کا کپ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''بوتلیں یہاں رکھ دی گئی تھیں۔''

''کیا کہا۔ رکھ دی گئی تھیں۔ یہاں کچن میں؟''

ایڈا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، مرکزی ہال میں۔ آتش دان کے پاس۔ میں یہی اندازہ لگانے کی کوشش کررہی ہوں۔ یہ عمارت بہت پرانی اور لکڑیوں کی بنی ہوئی ہے۔ اگر کوئی اسے آگ لگانا چاہے تو وہ سب سے آخر میں اس جگہ کا انتخاب کرے گا جہاں یہ بوتلیں رکھی گئی تھیں۔ بقیہ جگہ کے لیے تو ماچس کی ایک تیلی ہی کافی ہے جبکہ گزشتہ روز تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ وہاں ایسی درجن بھر دوسری جگہیں تھیں جہاں ان بوتلوں کو آگ دکھائی جاتی تو گرٹن ہال مکمل طور پر تباہ ہوجاتا۔''

''کیا تمہارے خیال میں یہ کسی کی طرف سے کوئی پیغام تھا؟'' میری نے پوچھا۔

ایڈا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اگر ایسا ہے تو میں اسے نہیں سمجھ سکی۔ کیا وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں یا انہیں یہ عمارتیں اچھی نہیں لگتیں؟''

''کیا تم نہیں سمجھتیں کہ اس کا تعلق کسی طرح ان مظاہروں سے ہوسکتا ہے؟'' میری نے پوچھا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' ایڈا نے کہا۔ ''وہ اقلیتوں کے حقوق اور خواتین کے لیے پروگرام شروع کرنے کا مطالبہ کررہے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جلانے کے بجائے ان عمارتوں کی حمایت کریں گے۔''

میری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ایک بہت بڑا گروپ ان مظاہرین سے نفرت کرتا ہے؟'' میری نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ یہ ان کی کارستانی ہو؟''

''اگر یہ بات ہوتی تو انہیں تھرڈ ورلڈ لبریشن فرنٹ کے ہیڈ کوارٹر جانا چاہیے تھا یا ان مظاہرین پر بم پھینک دیتے۔'' ایڈا نے کہا۔ ''وہ یہاں کیوں آئے؟ ہم نے تو کچھ نہیں کیا اور نہ ہی ان کی کسی تقریب کی میزبانی کی۔ ہم اس پورے عمل کے دوران خاموش رہے۔''

اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے پھر اس نے آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ''میں اسے بالکل نہیں سمجھ سکی۔ ہم نے ایسا کیا کردیا کہ یہ لوگ ناراض ہوگئے۔ ہم کسی سیاست میں ملوث نہیں ہیں۔ ہمارا قصور کیا ہے؟''

میری نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے تسلی دینے لگی۔ ایڈا نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔

''میں محسوس کرتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں پر محافظوں کا بندوبست کیا جائے۔ رات میں کم از کم دو محافظوں کی ڈیوٹی ہونی چاہیے۔''

''یہ اطمینان کرلینا کہ وہ اپنے طور پر ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔'' میری نے کہا۔

''ضرور۔'' ایڈا بولی۔ ''تم چاہو تو ہماری مدد کرسکتی ہو۔''

''مجھے اپنا کاروبار دیکھنا ہے۔ بہرحال ضرورت پڑنے پر تمہاری مدد ضرور کروں گی۔''

میری یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ مٹی کے تیل کی تمام بوتلیں دریافت کر لی گئی ہیں اور اب کسی بوتل کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے واپسی میں اس نے عمارت کے اندر باہر گھوم پھر کر اچھی طرح جائزہ لیا لیکن اسے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اور نہ ہی اس نے کسی کے قدموں کے نشان دیکھے جن سے ظاہر ہوتا کہ کوئی شخص عمارت کے گرد چکر لگا تا رہا ہے۔ وہ درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی مرکزی راستے پر چل دی اور جیسے ہی وہ ایک کونے پر پہنچی تو ایک شخص اچانک ہی اس کے سامنے آگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔

''تمہیں جس کی تلاش ہے کیا وہ مل گئی؟''

''مجھے کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے تلاش کر رہی تھیں؟''

''اگر تم وہی ہو جس نے آج ان عورتوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم عورتیں اپنے آپ کو بہت اہم سمجھتی ہو۔ مجھے تمہاری پروا کیوں ہوگی؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟''

وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک منٹ میں تمہارا مزاج ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

میری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوشش کر کے دیکھ لو۔''

''تاکہ تم روتی ہوئی پولیس کے پاس چلی جاؤ۔''

''میں کبھی نہیں روتی۔''

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑا انتظار کرو۔ میں تم سے نمٹ لوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میری کو خیال آیا کہ اس نے کیموفلاج والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے اسے اس رات بھی دیکھا جب وہیلر ہال میں آگ لگی تھی اور اب وہ گرٹن ہال میں گھات لگا رہا تھا۔ میری کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ پولیس کو یہ بات بتا دے۔

گو کہ اس نے گرٹن ہال میں واپس جا کر ایڈا سے اس سراغ رساں کا نام معلوم کر لیا جو آگ لگنے کے واقعے کی تحقیقات کر رہا تھا لیکن اس نے اسے فون نہیں کیا بلکہ پولیس اسٹیشن جا کر باضابطہ شکایت درج کرا دی۔ اس نے ڈیسک سارجنٹ کو اس شخص کا حلیہ لکھوا دیا اور بتایا کہ اس نے اسے دونوں مواقع پر دیکھا تھا۔

''ان واقعات کو تو کئی گھنٹے گزر گئے۔'' سارجنٹ نے اسے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میری جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

''میں نے اسے وہیلر ہال میں اس وقت دیکھا جب وہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ البتہ گرٹن ہال میں وہ کافی دیر بعد نظر آیا لیکن اس نے مجھ سے اس طرح بات کیوں کی؟''

''آج کل کے لڑکوں کے پاس اس انداز میں گفتگو کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی لیکن وہ ایسا کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ تم سے بدتمیزی سے پیش آیا۔''

''عام حالات میں تمہیں نہ بتاتی۔'' میری نے کہا۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس معاملے میں یہ بتانا ضروری ہے۔ کسی شخص نے گرٹن ہال میں آگ لگانے کی دھمکی دی اور وہیلر ہال کے آڈیٹوریم کو جلا دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص آتشزنی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔''

''ہاں مسئلہ یہی ہے کہ وہ طالب علم امیر گھرانوں کے بچے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں ہمیشہ وہ نہیں مل سکتا جو وہ چاہتے ہیں۔''

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔'' میری نے کہا۔ ''لیکن میرے والد فلاڈیلفیا پولیس میں آفیسر تھے۔ انہوں نے مجھے یہی سکھایا کہ صحیح راستہ اختیار کروں خصوصاً جب جرائم ہو رہے ہوں۔ مجھے یقین ہے سارجنٹ کہ تم بھی ایسا ہی محسوس کرو گے۔''

سارجنٹ نے اسے غور سے دیکھا اور اسے ایک فارم پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی کسی پولیس والی سے کم نہیں ہو، اسے بھر دو۔''

''میں یہ فارم صرف اس صورت میں بھروں گی جب تم یہ وعدہ کرو کہ اسے متعلقہ سراغ رساں کے حوالے کر دو گے اور تمہیں یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ فارم کیس فائل میں لگ جائے گا۔''

سارجنٹ نے پوچھا۔ ''کون سی فائل میں؟''

''میں تو کہوں گی کہ دونوں میں۔'' میری نے کہا۔ ''لیکن اگر تمہیں ایک فائل کا انتخاب کرنا ہو تو پھر اسے وہیلر ہال والی فائل میں لگنا چاہیے کیونکہ یہ شخص اس وقت وہاں موجود تھا جب آگ لگی ہوئی تھی۔ تم صرف یہ وعدہ کرو کہ یہ

فارم ردی کی ٹوکری میں نہیں جائے گا۔''

''تم ہمارے بارے میں اتنا اونچا نہ سوچو۔'' سارجنٹ نے کہا۔

''مجھے تم سے بہت زیادہ توقعات ہیں ورنہ میں یہ شکایت لے کر تمہارے پاس نہ آتی۔ میں جانتی ہوں کہ تم ان دونوں واقعات پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے لیکن میں یہ یقین کرنا چاہتی ہوں کہ اگر یہ شخص مل گیا تو تم ضرور کوئی کارروائی کرو گے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ یہی شخص آگ لگا رہا تھا؟'' سارجنٹ نے کہا۔

''مجھے کسی بات کا یقین نہیں۔'' میری نے پوری سچائی سے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کا رویہ بہت عجیب لگا اور میں سمجھتی ہوں کہ اس صورتِ حال میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔''

''آج کل ہر شخص کا رویہ عجیب ہی ہے۔'' سارجنٹ نے ایک فائل پکڑی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس روز کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اکیلے ہی ایکسرسائز کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیونکہ جم کا وقت ختم ہونے کے بعد کوئی نہیں آتا تھا جب تک کہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تاکہ آنے والے کو بتا سکے کہ جم کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو سامنے این کھڑی ہوئی تھی۔ میری اسے اندر لے کر آئی اور پوچھا۔

''کیا تم اکیلی ہو؟''

این نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم ان کھڑکیوں سے دور ہٹ کر کہیں بات کر سکتے ہیں؟''

میری نے دفتر کی جانب اشارہ کیا اور خود دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ این تھوڑا سے لنگڑا کر چل رہی تھی۔ میری نے جلدی سے آگے بڑھ کر دفتر کا دروازہ کھولا اور بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

این نے کمرے کا جائزہ لیا پھر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔''

''کیا ہوا؟'' میری نے پوچھا۔

''میں نے اسے نہیں مارا۔'' وہ بولی۔ ''میں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ جب وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کی سانس چل رہی تھی لیکن میں نے کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں بلایا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اوپر اٹھایا تاکہ اس کا دم نہ گھٹ جائے لیکن وہ بے ہوش تھا اور اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور بولی۔ ''میں نے اسے نہیں مارا۔''

''اس سے پہلے کہ ہم کچھ کریں۔'' میری نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم لنگڑا کر کیوں چل رہی ہو؟''

''میں لنگڑا تو نہیں رہی۔'' این نے کہا۔

''میں نے خود دیکھا ہے۔'' میری بولی۔ ''اور تمہارا دایاں بازو بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا۔''

این نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ اس کی انگلیوں کے جوڑ زخمی ہو گئے تھے اور انگوٹھے پر لمبائی میں خراش آ گئی تھی۔

''اوہ، میرے خدا۔'' اس نے کہا اور گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ میری نے اسے گرنے سے پہلے ہی پکڑ لیا اور سہارا دے کر کرسی تک لائی۔ این ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے گاڑی چلانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔''

''چلو دیکھتے ہیں کہ تمہاری کیا حالت ہے۔'' میری نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی قمیص کا دامن اوپر اٹھانے لگی۔ قمیص اس کی کھال سے چپک گئی تھی۔ این نے بچوں کی طرح بازو اوپر اٹھائے لیکن درد ہونے کی وجہ سے رک گئی۔

''اگر ضرورت پڑی تو اسے کاٹنا پڑے گا۔'' میری نے کہا۔ ''تم ایسے ہی بیٹھی رہو۔''

اس نے بغور اس جگہ کا معائنہ کیا۔ وہاں اتنا خون نہیں تھا جتنا کہ میری کو توقع تھی۔ لیکن کھال پر زخم تھے اور ان میں کچھ پرانے ہونے کی وجہ سے زرد ہو گئے تھے۔ البتہ اس کے پیٹ اور پسلیوں پر تازہ زخم نظر آ رہے تھے۔

''میں اس جگہ کو آہستہ سے دباؤں گی تاکہ جان سکوں کہ تمہاری پسلیاں صحیح سلامت ہیں۔''

بظاہر اس کی پسلیاں ٹھیک تھیں لیکن میری ڈاکٹر نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اسے این کے زخموں کے بارے میں بھی تشویش ہو رہی تھی۔ ان میں سے کچھ سیاہ ہو چکے تھے اور میری کو خدشہ تھا کہ کہیں اندرونی طور پر خون کا رساؤ نہ ہو رہا ہو۔

''میں تمہیں اسپتال لے جا رہی ہوں۔'' میری نے کہا۔ ''ہم انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے لیکن

تمہارا معائنہ ہونا بہت ضروری ہے۔''
''نہیں۔'' این نے قدرے مضبوط لہجے میں کہا۔
''میں اسپتال نہیں جاؤں گی۔''
''این، مجھے ڈر ہے کیونکہ تمہارے کچھ زخم میں نہیں دیکھ سکی۔ یہ اسپتال جا کر ہی معلوم ہوگا۔''
''وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔'' این بولی۔ ''اور اس بار وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں اپنا سب کچھ لے آئی ہوں۔ پیسے، زیورات، چیک بک۔ اب واپس نہیں جاؤں گی۔''
''مجھے تمہارا پرس نظر نہیں آرہا۔'' میری نے کہا۔
این نے اپنی پتلون کی بیلٹ کھول کر دکھائی۔ وہاں ٹن فوائل کا ایک رول ٹیپ کی مدد سے اس کے کولھے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔
''میں نے اپنے آپ سے عہد کر رکھا تھا۔'' این نے کہا۔ ''اگر اس نے مجھے دوبارہ مارا تو اسے چھوڑ دوں گی۔ میں نے اس کی تیاری پہلے سے کر رکھی تھی۔ البتہ سوٹ کیس لینے اوپر نہیں جا سکی۔ یہ چیزیں میں نے کچن کی دراز میں رکھی ہوئی تھیں۔''
''ہم انہیں سیف میں رکھ دیں گے۔'' میری نے کہا۔ ''میں تمہیں اسپتال لے جاؤں گی تاکہ اطمینان ہو جائے کہ تم بالکل ٹھیک ہو، اس کے بعد......''
''نہیں۔'' این اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
''میں یہاں اس لیے نہیں آئی تھی کیونکہ تم جانتی ہو کہ کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے نہیں مارا...... میری۔''
''میں جانتی ہوں۔'' میری نے کہا۔
''لیکن میں نے اسے بہت بُری طرح مارا ہے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''
''اگر میں تمہیں سان فرانسسکو جنرل......''
''نہیں، وہ وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ تم اسے نہیں جانتیں میری۔''
میری واقعی اسے نہیں جانتی تھی۔ اسے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ ''میں نے اسے اسی طرح مارا۔ جیسے تم نے پڑھایا تھا۔'' این نے کہا۔ ''میں نے اس کی گردن پر ضرب لگائی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جھکا تو میں نے اس کے سر پر لیمپ مار دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔''
''تمہاری قمیص پر خون کیسے لگا؟'' میری نے پوچھا۔
''میں نے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے مجھے بیٹھنا پڑا۔ جب میں نے اسے اپنی جانب کھینچا تو اس کے سر سے بہنے والا خون میری قمیص پر لگ گیا۔''
اس کا بیان اصل واقعے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ کسی آدمی کو مارنے سے این کے ہاتھوں پر زخم نہیں آسکتے تھے اور نہ ہی اس کا انگوٹھا کٹ سکتا تھا لیکن فی الحال میری کے پاس ان تفصیلات پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا بلکہ وہ دوسری باتوں کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھی۔ اگر وہ شخص مر گیا تو این پر قتل کا الزام لگ جائے گا اور وہ اس میں شریک سمجھی جائے گی۔
''میں اپنی ایک دوست کو فون کر رہی ہوں۔'' میری نے کہا۔ ''اس نے میڈیکل ٹریننگ لے رکھی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ تمہیں دیکھ لے۔ اس پر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟''
''نہیں۔'' این نے جواب دیا۔
''کیا وہ تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آسکتا ہے؟'' میری نے پوچھا۔
''نہیں۔ اسے اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''
''یہ شخص جو تمہیں مارتا ہے۔ کیا وہ تمہارا شوہر ہے؟''
این نے اسے حیرانی سے دیکھا اور بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہوگی۔''
''میں صرف یقین کرنا چاہ رہی تھی۔'' میری نے جھینپتے ہوئے کہا۔
وہ این کو دفتر میں چھوڑ کر باہر چلی آئی۔ اس نے حاضری رجسٹر میں این کا نام تلاش کیا جہاں اس نے این ایمرسن کے نام سے دستخط کیے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ این برکلے ہلز میں رہتی تھی۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور اس میں ایمرسن کا پتا تلاش کرنے لگی۔ اس علاقے میں ایمرسن نام کے پانچ لوگ رہتے تھے لیکن اسٹیلا نے بتایا تھا کہ این اس کی پڑوسن ہے چنانچہ اس کی نظریں اسی اسٹریٹ پر رہنے والے ایمرسن کے پتے پر مرکوز ہو گئیں پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ برکلے پولیس ڈپارٹمنٹ کا نمبر ملایا جواب میں ایک مردانہ آواز سنائی دی۔
''میں نہیں جانتی کہ پڑوس میں کیا ہو رہا ہے لیکن مجھے وہاں سے چلانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ میں نے ایک شخص کو مکان کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔ لگتا ہے کہ وہاں ڈاکا پڑا ہے۔''
''تم مجھے وہاں کا پتا بتا سکتی ہو؟'' مردانہ آواز نے کہا۔

میری نے ایمرسن کا پتا بتا کر فون بند کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس عموماً کال ٹریس کرنے میں وقت اور پیسا ضائع نہیں کرتی۔ لہٰذا اسے بھی گمنام کال کے زمرے میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر اس نے ایک اور نمبر ملایا اور جواب ملنے پر بولی۔ ”مجھ سے فوراً ملو۔ تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔“

وہ جانتی تھی کہ جون ایگلٹن تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی۔ اس نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ اس نے ویت نام کی جنگ میں نرس کے طور پر کام کیا تھا اور جب بھی جم میں کسی کو کوئی چھوٹی موٹی چوٹ لگتی تو وہ ایگل کو ہی بلاتی تھی۔

میری نے دفتر میں آکر این کا معائنہ کیا۔ اس کے زخم سیاہ ہوتے جارہے تھے۔ اس نے این کو بتایا کہ اس کی دوست چند منٹوں میں پہنچنے والی ہے پھر وہ دفتر سے باہر آگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایگل بھی آگئی۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کا بیگ تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”کیا ہوا؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ یہاں کلاس ہو رہی ہوگی۔“

میری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے این کے بارے میں بتایا۔ ”وہ شوہر کے ڈر سے اسپتال نہیں جانا چاہتی کہ کہیں وہ اسے تلاش نہ کر لے۔“

”شاید وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ کیا ہوسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دفتر میں چلی گئی۔ میری وہیں رک گئی۔ وہ دروازہ بند کرنے گئی تو اسے شیشے کے باہر کوئی نقل وحرکت نظر آئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر کی طرف جھانکا۔ سڑک بالکل خالی تھی اور صرف ہوا چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بائیں جانب دیکھا جہاں اسے نقل و حرکت نظر آئی تھی۔ ایک سایہ اچانک ہی اس کے قریب آگیا۔ اس نے فٹ پاتھ پر چھلانگ لگائی اور گھٹنے اوپر اٹھا کر حملہ آور کو زوردار لات رسید کی۔ وہ کتے کی طرح چلایا جس سے تصدیق ہوگئی کہ وہ کوئی مرد ہے اور اس نے صحیح نشانے پر وار کیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو اس کے گرد ڈالے اور اس پر سوار ہوگئی پھر اس کے چہرے پر پے در پے مکے برسانے لگی۔ اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا اور وہ بے حس وحرکت ہوگیا۔

وہ کھڑے ہو کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگی۔ اندر جانے ہی والی تھی کہ اس کی نظر تین بوتلوں پر گئی جو جم کے دروازے سے آنے والی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ اس

نے ایک نظر اس آدمی کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ اسے پہچان نہیں پائی کیونکہ اس نے کیموفلاج والا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے کو جان بوجھ کر داغ دار بنایا ہوا تھا۔ وہ غصے میں بڑبڑائی۔ ''کتیا کی اولاد۔''

وہ تیزی سے اندر گئی اور دو مضبوط رسیاں لے کر آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور جیکٹ سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ پوری روشنی میں اس نے دیکھا کہ یہ وہی شخص تھا جس سے اس کا گرٹن ہال میں سامنا ہوا تھا گو کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے پاان بوتلوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ پہلے اسے یہ بوتلیں عمارت سے دور پھینکنا ہوں گی پھر پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ وہ باہر گلی میں گئی اور کچرے دان میں سے ایک خالی کین نکال کرفٹ پاتھ پر رکھ دیا پھر اس نے ایک ایک کر کے وہ تینوں بوتلیں اس کین میں رکھ دیں۔

وہ واپس اندر جا رہی تھی کہ ایک مرسیڈیز گلی میں داخل ہوئی اور اس میں سے اسٹیلا برآمد ہوئی۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ این اس وقت کہاں ہے؟''

''میں فی الحال دوسرے کاموں میں الجھی ہوئی ہوں۔'' میری نے کین پر ڈھکنا رکھتے ہوئے کہا۔

اسٹیلا نے اس کا بازو پکڑا اور بولی۔ ''این غائب ہے اور کسی نے اس کے شوہر کو بہت بُری طرح مارا ہے۔''

میری کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں این کا شوہر مر تو نہیں گیا۔ اگر ایسا ہوا تو این کے ساتھ وہ بھی مصیبت میں پڑ سکتی ہے۔

''پورے گھر میں خون پھیلا ہوا ہے اور پولیس اسے ڈاکا زنی کی واردات کہہ رہی ہے۔ این اپنی کار سمیت غائب ہے۔ پلیز میری، کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

میری اسے حقیقت نہیں بتانا چاہتی تھی۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے اسٹیلا۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسٹیلا اندر آئے لیکن وہ پہلے ہی دروازے میں قدم رکھ چکی تھی لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ زمین پر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہے؟''

وہ شخص ابھی تک زمین پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسٹیلا کا چہرہ سفید ہو گیا۔ ''یہ تم نے کیا کر دیا میری؟''

''میں نے اس جگہ کو بچایا ہے۔'' میری بولی۔ ''یہ شخص یہاں آگ لگانے آیا تھا۔ اس کے پاس مٹی کے تیل کی تین بوتلیں تھیں جو میں نے کوڑے دان میں پھینک دیں اور میں پولیس کو فون کرنے جا رہی تھی کہ تم آگئیں۔''

دفتر کا دروازہ کھلا اور ایگل باہر آتے ہوئے بولی۔ ''میری، میں......''

اسٹیلا کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی۔ اسٹیلا بھی اسے جانتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ میڈیکل کے معاملات میں وہ میری کی مدد کرتی ہے۔

''جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھ سے بات کر لینا۔'' ایگل نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔

اسٹیلا اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ آفس کی طرف بڑھی لیکن میری نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''تمہیں اندر نہیں جانا چاہیے۔''

''کیوں؟'' اسٹیلا طنزیہ انداز میں بولی۔

''تم پہلے ہی وہ کچھ دیکھ چکی ہو جو تمہیں نہیں دیکھنا چاہیے تھا اگر تم نے دروازہ کھولا تو تم بھی اس معاملے میں شامل ہو جاؤ گی اور میں ایسا نہیں چاہتی۔''

اسٹیلا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں اس میں شامل نہیں ہوں۔''

''تمہیں نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔'' میری بولی۔ ''تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''این اندر ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔'' اسٹیلا بولی۔ ''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

میری نے اپنے چہرے پر حدت محسوس کی۔ وہ اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

اسٹیلا اس کی جانب جھکتے ہوئے بولی۔ ''اس کے شوہر نے جولائی کے مہینے میں اُسے بری طرح مارا تھا۔ وہ میرے گھر آئی لیکن وہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں بھی پہنچ گیا اور اسے منت سماجت کر کے اپنے ساتھ لے گیا اور ساتھ ہی مجھ سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ این نے اس کی بات نہیں سنی۔ جینی اور میں اسے لے کر یہاں آئے تاکہ وہ اپنا دفاع کرنا سیکھ سکے۔ اب اس نے ایسا ہی کیا اور جواب میں اس پر ہاتھ اٹھایا۔''

میری نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا لیکن جیسے ہی اسٹیلا نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا، وہ بولی۔ ''اگر تم نے دروازہ کھولا تو تم بھی اس جرم میں شریک بن جاؤ گی۔''

''تمہارا مطلب بروس کو مارنے سے ہے۔'' اسٹیلا نے پوچھا۔ ''اسے تو یہ کام کئی برس پہلے کر دینا چاہیے تھا اور جو کچھ آج اس نے کیا وہ ذاتی دفاع کے زمرے میں آئے گا۔''

''ہاں، تمہاری نظر میں یہ ایسا ہوگا۔'' میری بولی۔

''لیکن تحقیقاتی افسر اسے کسی اور انداز سے دیکھے گا۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اسٹیلا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''لیکن تم نے تو بڑی ہوشیاری سے اسے ڈاکے کا رنگ دے دیا۔ اب وہ نقاب پوش شخص کو تلاش کر رہے ہیں اور خون کی لکیر سے انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کہاں گیا اور ڈھونڈنے پر وہ تمہارے فرش پر بندھا ہوا ملے گا۔''

میری کا سانس رکنے لگا۔ گویا اسٹیلا اس آتش زن پر بروس کی موت کا الزام لگا رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''اسی لیے تم نے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں۔''

''میں نے اسے اس لیے باندھا ہے کہ وہ جم کو آگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس نے گرٹن ہال میں کوشش کی اور وہیلر ہال میں آگ لگائی لیکن تم اس پر قتل کا الزام عائد نہیں کر سکتیں۔''

اسٹیلا نے ہلکا سا دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ میری بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔ اینگل نے دونوں کو دیکھا اور بولی۔ ''میں نے اس کی پسلیوں پر پٹی باندھ دی ہے، میرا خیال ہے کہ ان پر زخم آئے ہیں۔ اس کا سانس ٹھیک ہے۔ البتہ اس کی دائیں کہنی اور کندھے کا درمیانی حصہ کریک ہو گیا ہے لیکن کلائی کی سامنے والی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس طرح کی چوٹیں اس وقت آتی ہیں جب کوئی آپ کے بازو کو غلط طریقے سے موڑے۔ میرا خیال ہے کہ اسے سرجری کی ضرورت ہے۔ میں اس کے ایکسرے بھی کروانا چاہتی ہوں لیکن وہ اسپتال جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

این کا چہرہ چاک کی طرح سفید ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں۔

''میں اسے اپنی ایک دوست کے گھر لے جا سکتی ہوں۔'' اینگل نے کہا۔

''کہاں؟'' اسٹیلا نے پوچھا۔

اینگل اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں نہیں جانتی۔ اس لیے اس کے سوا کچھ نہیں بتاؤں گی کہ اس عورت کو بہت بُری طرح زدوکوب کیا گیا ہے اور اسے علاج کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میری نے کہا۔ ''مجھے مطلع کرتی رہنا۔''

''جب بھی ممکن ہوا۔'' اینگل نے جواب دیا۔

اینگل نے اپنا ایک بازو این کی کمر میں ڈال کر اسے کھڑا کیا اور گھسیٹتی ہوئی دفتر سے باہر لے گئی، میری اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اینگل سے کہا۔ ''تمہیں میری کار چاہیے۔''

اینگل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ جب مجھے کچھ معلوم ہوگا تو تمہیں فون کروں گی۔''

اس کے جانے کے بعد اسٹیلا نے کہا۔ ''وہ ٹھیک تو ہو جائے گی؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' میری بولی۔ ''لیکن وہ واپس نہیں آئے گی۔''

اس نے اسٹیلا کو یہ نہیں بتایا کہ این اپنی رقم اور زیورات بھی ساتھ لے آئی تھی۔ اس لیے وہ کسی بھی جگہ آرام سے رہ سکتی ہے۔

''اب تم اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟'' اسٹیلا نے پوچھا۔

''پولیس کو فون کرتی ہوں۔ دعا کرو کہ وہ یہاں آ جائیں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے وہیلر آڈیٹوریم میں آگ لگائی تھی؟''

میری نے اثبات میں سر ہلایا تو اسٹیلا بولی۔ ''تمہارا خیال درست ہے۔ شاید وہ تمہاری بات نہ سنیں لیکن انہیں مسز رائے آربوس کی بات ضرور سننا پڑے گی۔ میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔ تم جب تک دفتر کی صفائی کر لو۔''

''پہلے میں اسے دیکھ لوں۔'' میری نے کہا۔

وہ شخص لڑھکتا ہوا کرسی کے قریب پہنچ چکا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح باہر جھانک کر لوگوں کی توجہ حاصل کی جائے۔ میری نے اس کا کندھا پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچا۔ وہ دوبارہ زمین پر گر گیا۔

''کتیا۔'' وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے جانے دو۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا......''

میری نے اس کے منہ پر سختی سے ٹیپ باندھا اور بولی۔ ''میرا باپ کہا کرتا تھا کہ تمام آگ لگانے والے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ استقبالیہ ڈیسک پر آئی جہاں اسٹیلا پولیس کو فون کر رہی تھی۔ ''ہاں، وہ اندر ہی ہے، ہم نے اسے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ برائے مہربانی اسے لے جاؤ۔''

میری نے دفتر میں جھانک کر دیکھا۔ اسے فرش پر این کی پھٹی ہوئی قمیص نظر آئی۔ پولیس کے آنے سے پہلے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ وہ اسے کوڑے دان میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ پولیس والے ایسی جگہوں کی تلاشی ضرور لیتے ہیں۔ دفعتاً اس کے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا۔ اس نے دروازے سے باہر جھانک کر اسٹیلا سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ این کے پاس کون سی کار ہے؟"

اسٹیلا نے جواب دیا۔ "بالکل نئی بیوک۔ میں نے اسے یہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر دیکھا ہے۔"

"اسی کار کو دیکھ کر تمہیں معلوم ہوا کہ وہ یہاں ہے؟"

اسٹیلا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب پولیس والوں نے بتایا کہ کار بھی غائب ہے۔ ان کا اندازہ تھا کہ ڈاکو وہ کار اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے لیکن میں جانتی تھی کہ وہ تمہارے پاس آئی ہوگی۔ اس سے پہلے وہ ایک دفعہ میرے اور جینی کے پاس آچکی تھی اور دونوں مرتبہ بروس نے اسے تلاش کرلیا تھا۔ اس بار اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں وہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

میری یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اگر این کا شوہر بچ گیا تو کیا ہوگا۔ کیا وہ اس کے ساتھ واپس چلی جائے گی تاکہ وہ اسے بار بار مارتا رہے۔ جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔ اس نے دستانے چڑھائے اور بیگ اٹھا کر باہر چلی گئی۔ گلی سرد اور تاریک تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے این کی کار نظر آگئی۔ اس کی اندرونی لائٹ روشن تھی اور دروازے مقفل نظر آرہے تھے لیکن قریب جا کر معلوم ہوا کہ ڈرائیور کی طرف والا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ میری نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور قمیص کے ٹکڑے فرش پر ڈال دیے پھر اس نے بیگ کو توڑ مروڑ کر عقبی کھڑکی سے باہر پھینک دیا پھر اسے انگلیوں کے نشان کا خیال آیا۔ اس نے کپڑا لے کر اسٹیئرنگ وہیل، دروازے کا ہینڈل اور ہر اس جگہ کو صاف کردیا جسے این نے ڈرائیونگ کے دوران ہاتھ لگایا ہوگا۔ انگلیوں کے نشانات کی عدم موجودگی سے پولیس اسے ڈکیتی کی واردات ہی سمجھے گی کیونکہ کوئی جرائم پیشہ ہی کار پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کرسکتا ہے۔

اس کام سے فارغ ہوکر میری واپس جم چلی آئی۔

کچھ دیر بعد پولیس کی گاڑی بھی آگئی اور اس میں سے ایک پولیس آفیسر برآمد ہوا۔ اسٹیلا اس کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔ "شکر ہے کہ تم آگئے۔ اس آدمی نے میری دوست پر حملہ کیا اور پھسل پڑا۔ میں نہیں جانتی کہ اگر یہ کامیاب ہو جاتا تو کیا ہوتا۔"

میری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن آفیسر کا چہرہ دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ وہ اسٹیلا کی بات پر یقین کرچکا تھا۔ آفیسر نے اپنا سر آہستہ سے ہلایا اور اپنے ساتھی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اسٹیلا نے اسے کوڑے دان میں پڑی ہوئی بوتلیں دکھائیں اور انہیں لے کر جم میں آگئی۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے وہی اس واقعے سے متاثر ہوئی ہو۔

پولیس والوں نے اس شخص کو عمارت سے باہر نکالا۔ اسٹیلا نے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن جائے گی تاکہ اس شخص پر الزامات عائد کرسکے۔ اس نے میری کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ پہلے انکار کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر تیار ہوگئی کہ نہ جانے اسٹیلا وہاں جا کر کیا الٹا سیدھا بول دے۔

دوسرے دن ایگل نے فون کرکے بتایا کہ وہ این کو اسپتال لے گئی تھی اور وہاں سے وہ اسے اساکرامینٹو لے گئی ہے جبکہ برکلے پولیس کو یقین تھا کہ ڈاکو این کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس پر وحشیانہ تشدد کیا اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کہیں پھینک دی۔ اس کے علاوہ پولیس کے پاس کچھ معلومات نہیں تھیں۔

پولیس نے جس شخص کو این کے جم سے گرفتار کیا۔ اس کا نام ریان کوسگروو تھا لیکن وہ اس پر وہیلر ہال یا گرٹن ہال میں آگ لگانے کا الزام عائد نہ کرسکے۔ البتہ اس پر یہ الزام ضرور تھا کہ اس نے میری پر حملہ کیا اور جم کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ اس پر مقدمہ چلا اور جج نے اسے ریاست بدر کرنے کے احکامات صادر کردیے۔ اس کا ماضی کا ریکارڈ بے داغ تھا اور گزشتہ دس سال کے دوران ہونے والے کسی آتش زنی کے واقعہ میں وہ ملوث نہیں تھا۔

اس واقعے سے میری کے جم کو بہت شہرت ملی اور اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ اس کے پاس آنے والی عورتوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ وہ انہیں ذاتی دفاع کا سبق دیتی اور بتاتی کہ جب معاملہ قابو سے باہر ہونے لگے تو کس طرح اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ کاش این نے بھی اس سبق پر عمل کیا ہوتا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا شوہر موت کے منہ سے واپس آگیا اور پولیس اسے ڈکیتی کی واردات سمجھتی رہی۔ اگر وہ اس کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے جم تک پہنچ جاتے تو کہانی مختلف ہوسکتی تھی اور این کے ساتھ میری کو بھی سلاخوں کے پیچھے ہونا پڑتا۔ اب وہ مطمئن تھی کہ اس نے این کو محفوظ مقام تک پہنچانے کے ساتھ اس آتشِ زن کو بھی انجام تک پہنچا دیا تھا ورنہ آگ لگنے کے مزید واقعات ہو سکتے تھے۔

دوسرا چہرہ

جمال دستی

کہا جاتا ہے کہ عورت کو صرف باتوں سے تسخیر و مسمار کیا جا سکتا ہے... اور... باتیں وہ تو گفتگو کے تاج محل تعمیر کر سکتا تھا... پیمانِ وفا میں باندھی ایک ایسی ہی عورت کا ماجرا... وہ ایک ہرجائی سے تعلق جوڑ بیٹھی تھی...

ایک تیر سے دو شکار کرنے والے شکاری کی حکمتِ عملی.....

''سوچو، کیا پیارا شوہر اس سے لطف اندوز ہوگا؟ آؤ پتا کرتے ہیں یا...... آؤ بات چیت کرتے ہیں۔ ہم رابطے میں رہیں گے۔''

کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر یہ پیغام تحریر تھا شیلبائی کی انگلیوں سے پھسل کر اس تصویر پر گر پڑا جو اس پیغام کے ساتھ ایک سفید لفافے میں موصول ہوئی تھی۔ تصویر میں اسے مارکس ریورز کے ہمراہ شرمناک حالت میں دکھایا گیا تھا۔

"یہ کس طرح ہوا؟" شیلبائی سوچ میں پڑ گئی۔ "ہم تو بے حد محتاط رہے تھے! کوئی بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا!"

اس ویک اینڈ پر اس کا شوہر گریگ بزنس کے سلسلے میں بذریعہ پرواز شکاگو گیا ہوا تھا اور شیلبائی نے اپنے دفتر میں یہ تذکرہ کر دیا تھا کہ وہ ویک اینڈ پر اپنی کزن سے ملنے کے لیے اپنی کار میں مس سیپسی جائے گی۔

مارکس ریورز اور شیلبائی نے تمام تر احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں جیسے کہ سیاحتی مقامات سے گریز، مس سیپسی کے شہر بلوکسی سے باہر عقبی علاقے میں ایک غیر معروف موٹیل میں کرائے کا کمرا، حتیٰ کہ اپنی کار کے بجائے کرائے کی کار میں سفر کیا تاکہ کوئی شناسا کار کو پہچان نہ سکے۔

لیکن تمام احتیاطی تدابیر بیکار ثابت ہوئی تھیں اس لیے کہ ان کی رنگ رلیوں کا ثبوت اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔

شیلبائی نے تصویر اور وہ پیغام دوبارہ لفافے میں رکھ دیے۔ اس اثنا میں دفتر کا دروازہ کھلا اور میریم معمول کے مطابق اچھلتے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔

"ہیلو شیلبائی!" وہ باہر کے دھندلے موسم کی بے کیفی سے قطعی بے نیاز لگ رہی تھی۔ "یہ کیا تھا؟" اس نے اپنا شولڈر بیگ اپنی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا اور کافی میکر کی جانب بڑھ گئی۔

شیلبائی نے لفافہ اپنی دراز میں ڈال کر اس میں تالا لگا دیا۔ "کچھ نہیں، کچھ کاغذات ہیں۔"

میریم اپنا کافی کا کپ بھر کر اپنی میز پر آ گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "اور تمہارا ویک اینڈ کیسا رہا؟" اس نے بناوٹی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

شیلبائی کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ "کیا مطلب کیسا رہا؟ میری اپنی کزن سے ملاقات ہو گئی اور بس۔"

میریم کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ "اوہ، ہاں، تمہاری کزن۔" اس نے اپنے کپ میں سے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "اسی بات پر چپٹی رہو گی، ایں؟" اس نے دوبارہ کافی کا گھونٹ بھرا۔ "کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی؟ شاید وہاں ہوئی ہو جہاں دریا (ریورز) آپس میں ملتے ہیں؟"

"مجھے کوئی آئیڈیا نہیں کہ تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو۔" شیلبائی نے اپنا رخ میریم کی جانب سے دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

میریم تیکھی نظروں سے شیلبائی کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

شیلبائی کا صبح کا وقت مصروفیت میں گزر گیا۔ بلیک میلنگ کے لیے بھیجی جانے والی تصویر کا خیال اُس کے ذہن سے دور رہا تھا۔

پھر لنچ ٹائم میں شیلبائی، میریم کے علم میں لائے بغیر دفتر کی عمارت سے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ تیزی سے اپنی کار میں سوار ہو کر ایک قریبی شاپنگ مال کی پارکنگ میں پہنچی اور کار روک کر مارکس ریورز کے سیل فون کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہاں، شیلبائی۔ کیا بات ہے، بے بی؟"

شیلبائی نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر اسے تصویر اس کے ساتھ موصول ہونے والے تحریری پیغام اور میریم کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"تمہارے خیال میں اُسے ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے؟ کیا واقعی؟" مارکس نے پوچھا۔ "کیا اس نے تمہارا پیچھا کیا تھا؟" یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" شیلبائی نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں، ہو سکتا ہے کہ اُس نے تمہارا پیچھا کیا ہو؟ دیکھو، میں نے یہ بات تمہیں کبھی نہیں بتائی لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ہم چند مرتبہ باہمی رضامندی سے ملاقاتیں کر چکے ہیں۔"

"کیا؟ کب؟" شیلبائی کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ "تم نے مجھے پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟"

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" مارکس نے جواب دیا۔ "یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ میں نے اس سے تعلقات منقطع کر لیے تھے لیکن وہ بہت زیادہ جوشیلی اور خبطی ہے۔ وہ کچھ عرصے تک میرا بھی پیچھا کرتی رہی ہے۔"

شیلبائی کے حلق سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔ "تب تو پھر یہ وہی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم، ہو بھی سکتی ہے۔" مارکس نے کہا۔ "لیکن ابھی انتظار کرو جب تک وہ دوبارہ رابطہ نہیں کرتی۔"

دفتر میں سہ پہر کا وقت بھی دھیرے دھیرے گزر گیا۔ اس دوران میں میریم نے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ جس سے شیلبائی چوکنا ہو جاتی۔ دفتر کا وقت ختم ہونے تک شیلبائی کی ٹینشن کی کیفیت بڑی حد تک کم ہو چکی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے وہ دفتر سے نکل کر اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

اس کا ذہنی سکون صرف اس وقت تک برقرار رہا جب تک اس کی نگاہ اس سفید لفافے پر نہیں پڑی جو اس کی کار کی پسنجر سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔

لفافے میں موجود پیغام یہ تھا:

''آؤ، تمہاری کزن کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ منگل کی رات۔ ٹھیک دس بجے۔ میموریل پارک میں' سپاہی کے مجسمے کے پاس۔''

جب شیلبائی نے اس نئے پیغام کی خبر مارکس کو سنائی تو اس نے نہایت اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''او کے!''

مارکس کے پُرسکون انداز پر شیلبائی کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے چیخنا شروع کر دے۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اور مارکس تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

''تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟'' شیلبائی نے ہسٹریائی انداز میں کہا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ گریگ کیا کر گزرے گا......''

''دل جمعی سے کام لو اور پُرسکون ہو جاؤ۔ اپنے اعصاب کو قابو میں رکھو۔ ہم اس سے بھی نمٹ لیں گے۔'' مارکس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

شیلبائی خاموش رہی۔

''تمہارا شوہر بدھ سے پہلے گھر واپس نہیں آئے گا، ٹھیک؟ او کے، تو پھر ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ......''

جب مارکس نے اسے اپنا پلان بتایا تو شیلبائی پر دہشت طاری ہوگئی۔

''میں یہ ہرگز نہیں کر سکتی! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے......''

''ہم ایسا کر سکتے ہیں! یا تم چاہتی ہو کہ آئندہ تم اس کے دام میں اسی طرح پھنسی رہو جیسے کہ مچھلی کانٹے میں پھنستی ہے؟ تم چاہتی ہو کہ تمہارے شوہر گریگ کو سب کچھ پتا چل جائے؟ بعض اوقات آپ کو بس وہی کرنا پڑتا ہے جو آپ کو کرنا چاہیے۔''

ایک طویل وقفے کے بعد شیلبائی نے سرگوشی کے انداز میں ہامی بھر لی۔ ''آل رائٹ۔ او کے!''

☆☆☆

رات ابر آلود، گرم اور مرطوب تھی لیکن شیلبائی کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

وہ اس وقت میموریل پارک میں سپاہی کے مجسمے کے پاس کھڑی تھی۔ مارکس کا دیا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب اس نے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تو اس کے دل کی دھڑکن بے ربط سی ہوگئی۔ مارکس نے اسے تاکید کی تھی کہ پہلے اسے اس بات کا یقین کرنا ہوگا کہ وہ میریم ہی ہے۔ پھر وہ اسے شوٹ کرے۔

شیلبائی نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور تان لیا۔

قدموں کی آہٹ اس حد تک قریب آ گئی کہ شیلبائی کو آنے والے فرد کی شناخت میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ بلاشبہ میریم ہی تھی۔

میریم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ شیلبائی کے ہاتھ میں دبے ریوالور پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیرت سے بولی۔ ''شیلبائی، یہ تم کیا کر رہی ہو؟ اس نے تمہیں......''

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی کیونکہ شیلبائی نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ ریوالور کے تڑاتے میں میریم کی آواز دب کر معدوم ہو گئی۔

مارکس وہیں موجود تھا جہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ شیلبائی کا انتظار کر رہا ہوگا۔

شیلبائی لپک کر اس کی کار میں سوار ہوگئی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے ریوالور کار کے گیئر بکس کے اوپر رکھ دیا۔

مارکس نے کار آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر ڈرائیو کرنے کے بعد مارکس نے کار ایک خالی ویئر ہاؤس کے نزدیک روک دی۔ اس نے برابر میں رکھا ہوا ریوالور اپنے رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

پھر اس نے اپنا رخ شیلبائی کی جانب کیا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اب وہ پاگل کُتیا تو راستے سے ہٹ چکی ہے تو پھر تمہاری کزن کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔''

شیلبائی نے چونک کر مارکس کی طرف دیکھا۔

مارکس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ''میرا منہ بند رکھنے کے معاوضے کے طور پر دس ہزار ڈالر بہ طور پہلی قسط ادا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اندھی سازش

محمد یاسر اعوان

دولت سرمایۂ حیات ہے... دولت پروانۂ موت ہے... حصولِ زر ایسی گتھیوں میں الجھاتا ہے کہ اردگرد کے زندہ کرداروں پر موت کا سناٹا چھا جاتا ہے... زن... زر اور زمین کی تکون نے ہمیشہ سازشوں کے ایسے جال بُنے ہیں... جس میں الجھاوے ہی الجھاوے ہوتے ہیں... بڑی بڑی حویلیوں اور غلام گردشوں میں چکراتی تحریر... اپنے اور بیگانے آپس...... میں مدغم ہو چکے تھے... سب ایک دوجے... کے قریب تھے مگر درمیان میں فاصلے حائل تھے... ایک دوسرے کی زندگیوں سے کھیلنے والے شاطر ذہن کی ناقابلِ گرفت حیلہ سازیاں...

اسرار و تحیر میں ڈوبا لحہ بہ لحہ رنگ بدلتا سنسنی اور تجسس سے بھرپور شاہکار......

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، آسمان دور تک سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک ہر مرتبہ یوں لگتی تھی کہ جیسے اب کسی پر گر پڑے گی اور جلا کر خاکستر کردے گی۔ چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ راولپنڈی کے پرانے شہر کی تنگ گلیاں اور سڑکیں ویران وسنسان نظر آرہی تھیں۔ اہلِ شہر اپنے چھوٹے بڑے پختہ اور نیم پختہ مکانات میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ اس قسم کی بارشیں ان کے لیے کسی غیر معمولی نوعیت کی حامل نہیں تھیں مگر پنج باٹا محلہ کی اس بڑی اور عالیشان حویلی کے مکین ابھی تک جاگ رہے تھے۔ اس وسیع اور کشادہ عمارت میں اس وقت صرف چار افراد موجود تھے۔ چاہیں تو انہیں پانچ بھی کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ ایک پالتو قد آور بلی بھی اس گنتی میں شامل کرلیں۔

ایک ملازمہ جو اس وقت باورچی خانے میں دودھ تیار کررہی تھی، ایک پختہ عمر، گرانڈیل آدمی جس کے چہرے کے کرخت خدوخال اور چمک دار بھوری آنکھیں، اس کے جذبات وخیالات کی سرد مہری اور انتہائی شاطرانہ فطرت کی عکاسی کررہی تھیں۔ ایک خوب صورت پُروقار نوجوان جس کی عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور ایک بوڑھی خاتون جو طویل قامت، بھاری بھرکم مردانہ جسم اور بھاری آواز کی مالک تھیں۔

نوجوان دو گھنٹے قبل ہی اپنی جدّی اور آبائی اقامت گاہ پہنچا تھا۔ اسے بعض نازک اور اہم حالات کے نتیجے میں ہنگامی طور پر امریکا سے تار دے کر بلوایا گیا تھا۔

وہ امریکا سے لاہور تک ہوائی جہاز میں اور پھر لاہور سے راولپنڈی تک ٹرین کے ذریعے پہنچا تھا۔ نوجوان کی آمد کے بعد سب نے ایک ساتھ رات کا کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد عمر رسیدہ خاتون نے جن کی عمر پچاس پچپن کے درمیان تھی، اسے جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ اس کے وضاحت طلب سوالات کا جواب دیا اور بعد میں ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ بارش رکے یا نہ رکے، وہ ہر صورت میں صبح کی پہلی یا دوسری کوچ سے روانہ ہوجائیں گے۔

رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے اور ملازمہ کو تاکید کردی گئی کہ وہ دس منٹ کے اندر دودھ کے گلاس ہر کمرے میں پہنچا دے۔ رات کو تھوڑا دودھ پی کر سونا اس حویلی کے مکینوں کے معمولات میں شامل تھا۔ خاتون کے ساتھ ان کی پالتو بلی بھی جس کو وہ بے حد چاہتی تھیں، ان کے ساتھ ہی کمرے میں چلی گئی جہاں رات کو اس کے آرام کے لیے ایک علیٰحدہ آرام دہ گدیلے.... کا انتظام تھا۔

طویل قامت آدمی...... ان دونوں کے کمروں میں جاتے ہی، دبے پاؤں چلتے ہوئے کچن میں پہنچا جہاں خوب صورت ملازمہ ایک چاندی کی ٹرے میں دودھ کے تین گلاس تیار کر کے رکھ چکی تھی۔ ٹرے میں ایک خالی طشتری بھی تھی جس کی موجودگی کی غایت یہ تھی کہ اگر بیگم صاحبہ چاہیں تو کچھ دودھ اپنی ایرانی بلی کو بھی دے سکیں۔

اس آدمی نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جس میں پانی کی طرح بے رنگ سا محلول بھرا ہوا تھا۔ اس نے شیشی کا ڈھکنا کھول کر دو گلاسوں میں اس محلول کے آٹھ دس قطرے ٹپکا دیے، پھر چمچے سے انہیں دودھ میں مکمل طور پر حل کر دیا۔ نوجوان ملازمہ کسی قدر خوف زدہ انداز میں اس آدمی کی یہ حرکت دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو یقین ہے کہ دوا کارگر ثابت ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''سو فیصد یقین ہے۔'' گرانڈیل آدمی نے جواب دیا۔ ''یہ ایک نایاب زہر ہے، جسے میں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔''

''معدے یا خون میں اس کے ذرات باقی تو نہیں رہ جائیں گے کہ بعد میں اگر پوسٹ مارٹم کی نوبت آجائے تو راز فاش ہو جائے؟''

''اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' مرد نے جواب دیا۔ ''لیکن میں حالات کو اس طرح ترتیب دوں گا کہ پوسٹ مارٹم کا کوئی امکان ہی پیدا نہ ہو، تم اپنے ذہن کو پریشان مت کرو، وقت ہو گیا ہے، گلاس کمروں میں پہنچا دو۔''

''میں آپ کے کہنے سے اس سنگین جرم میں آپ کی مدد تو کر رہی ہوں مگر مجھے دھوکا مت دینا۔ جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کیجیے گا، ورنہ عاقبت کے ساتھ میری دنیا بھی تباہ ہو جائے گی۔''

''بہت شکی ذہن کی مالک ہو میری جان۔'' آدمی مسکرایا۔ ''کیا آج تک تم سے کیا ہوا میرا کوئی وعدہ جھوٹا ثابت ہوا ہے؟ یقین رکھو، ایک سال سے بھی کم مدت میں تم اس حویلی کی مالک بن کر یہاں داخل ہو گی۔'' وہ مسکراتا ہوا باورچی خانے سے نکل گیا۔

ملازمہ نے ٹرے اٹھائی اور سب سے پہلے بوڑھی خاتون کے کمرے کی جانب چل دی۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر آہستہ سے دستک دی۔ اندر آنے کی اجازت پا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے سے ایک گلاس جو طشتری میں جالی دار کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، اٹھا کر خاتون کی مسہری کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ بلی کی پلیٹ بھی رکھی اور سلام کر کے باہر نکل گئی۔

خاتون نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا، پلیٹ فرش پر رکھ کر اس میں تھوڑا دودھ انڈیلا، چمکار کر بلی کو بلایا جو ایک گوشے میں اپنے آرام دہ گدیلے پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی، چمکاری سن کر وہ اٹھی، ہلکی سی جست مار کر گدیلے سے اتری اور آ کر پلیٹ میں سے دودھ پینے لگی۔

دوسری طرف خاتون بھی گلاس منہ سے لگائے بڑے بڑے گھونٹ بھر رہی تھی۔ بلی کی پلیٹ خالی ہونے سے پہلے، اس نے دودھ پی کر گلاس واپس میز پر رکھ دیا اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اگر وہ چند لمحے بھی ٹھہر جاتی تو دیکھتی کہ بلی نے دودھ پیتے پیتے اچانک ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ میاؤں کی آواز نکالی اور وہیں پلیٹ کے قریب گر کر بے حس و حرکت ہو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس طویل قامت آدمی نے دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا۔ خاتون اور بلی دونوں کی کیفیت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر سنگ دلانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اندر آیا بلی کو ایک ٹھوکر ماری، مسہری پر جھک کر خاتون کو دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے واپس چلا گیا۔ یہی منظر وہ نوجوان کے کمرے میں پہلے ہی دیکھ آیا تھا۔

بارش اسی زور شور سے جاری تھی۔ وہ حویلی کے عقبی حصے میں پہنچا۔ جہاں ایک چھوٹے سے قطع پر کچھ درخت اور کیاریوں میں مختلف پھولوں کے پودے بارش میں نہا رہے تھے۔ درمیان کے چھوٹے سے لان میں ایک گڑھا تقریباً چھ سات فٹ لمبا اور چار پانچ فٹ چوڑا کھدا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کدال سے گڑھے کو مزید گہرا کیا اور بیلچے سے کھودی ہوئی مٹی اٹھا کر باہر ڈالتا رہا۔ ایک گھنٹے کی مزید محنت سے وہ گڑھے کو کم و بیش پانچ چھ فٹ گہرا کر چکا تھا۔

وہ رومال سے اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے گڑھے سے باہر نکلا۔ بارش سے اس کے کپڑے شرابور ہو چکے تھے مگر اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی اور اس کی مدد سے پہلے نوجوان کی لاش اٹھا کر گڑھے میں ڈالی، پھر خاتون کے کمرے میں گیا اور یہی سلوک اُس کے بے جان جسم کے ساتھ بھی کیا گیا۔ ملازمہ گڑھے کے کنارے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا وہ خوف زدہ نظروں سے گڑھے میں پڑی ہوئی لاشوں کو گھور رہی تھی۔ طویل قامت شخص نے کدال اٹھائی۔ ملازمہ کے پیچھے پہنچا اور اس سے پہلے کہ ملازمہ اس کے ارادے سے باخبر ہو، کدال کا ایک بھرپور وار اس کی پشت پر کیا، ملازمہ کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔ کدال کی تیز نوک پشت سے سینے تک آر پار ہو گئی تھی۔ ایک بھی سسکی نکالے بغیر ملازمہ مٹی کے ڈھیر پر گری۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ مرد نے ایک جھٹکے سے کدال کو اس کے جسم سے نکالا اور ایک ٹھوکر مار کر اس کی لاش بھی گڑھے میں ڈال دی۔

''میں اپنے جرم کے گواہ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔''

اس نے جھک کر گڑھے میں ملازمہ کی لاش کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر بیلچہ اٹھا کر بڑے اطمینان سے نکالی ہوئی مٹی دوبارہ گڑھے میں بھرنے لگا۔ ابھی گڑھا نصف بھی نہ بھرا تھا کہ اسے دفعتاً ایک خیال آیا۔ وہ مٹی ڈالتے ڈالتے رک گیا اور ایک مرتبہ پھر خاتون کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ اس ایرانی بلی کو تو بھول ہی گیا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے کمرے میں قدم رکھا اور مسہری کی طرف نظر ڈالی جس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر وہ بلی کو مردہ پڑے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک دم بری طرح چونک گیا، بیلچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ بات تھی بھی شدید حیرت و تعجب کی، بلی کی لاش کمرے سے غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

میرا نام جمال احمد ہے۔ میری عمر ابھی پانچ سال ہی تھی کہ والدین ایک اندوہناک حادثے میں چل بسے۔ میری پرورش میری پھوپی اور ماموں کے زیرِ سایہ ہوئی۔

مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں ایک محنتی، ہوشیار اور ذہین طالب علم ثابت ہوا۔ میں نے پہلے ایف ایس سی اور پھر ایم بی بی ایس کی ڈگری لی اور بعد میں نفسیات میں ایم اے کیا۔ مجھے بچپن سے ہی پُراسرار باتوں اور پُراسرار علوم سے دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے خود اپنے اندر کئی مخفی صلاحیتوں کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً میں عموماً صرف دوسروں کو نگاہ بھر کے دیکھنے ہی سے ان کے خیالات سے واقف ہو جاتا تھا ہمیشہ نہیں، کبھی کبھی۔ اسی طرح جانوروں کے جذبات و محسوسات بھی ان کی آنکھوں میں جھانک کر جان لیتا تھا۔ یہ بھی عام طور پر نہیں بلکہ صرف گاہے گاہے۔ اپنی اس

صلاحیت کے باعث مجھے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اپنی تعلیم کے دوران ہی ان دونوں علوم کے بارے میں مطالعہ اور ریاضی مشقوں کا سلسلہ جاری رکھا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے کافی عبور حاصل ہوتا گیا۔

یوں میں نے ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد جب ذاتی پریکٹس شروع کی تو میرے اندر اتنی قوت اور صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ میں اپنی آنکھوں کی طاقت سے لوگوں کو تنویمی کیفیت میں مبتلا کر کے ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔ بے جان چیزوں میں حرکت پیدا کرنا، حرکت کرتی ہوئی بنیاد کو ساکت کر دینا، انہیں غیر معمولی طور پر ٹھنڈا یا ناقابل برداشت حد تک گرم کر دینا اور ایسی ہی کئی اور بظاہر مافوق الفطرت حرکات پر مجھے کافی قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ اسی طرح میں دوسروں کے خیالات جاننے اور پڑھنے میں بھی عام طور پر کامیاب ہو جاتا تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ دوسرے شخص کی قوتِ ارادی معمول سے کچھ زیادہ طاقتور ہو۔

میں نے قدرت کی عطا کردہ اور پھر خود کی حاصل کردہ ان صلاحیتوں کا کبھی کوئی چرچا نہیں ہونے دیا تھا اور نہ ہی ان سے کبھی کوئی غلط یا ناجائز کام لینے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر بننے سے، جب کبھی مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی تھی تو لوگ اس پر تعجب ضرور کرتے تھے مگر وہ اسے محض اتفاق یا پھر میری ہوشیاری اور ذہانت خیال کرتے تھے اور میں خود بھی کچھ منطقی دلائل پیش کر کے ان کے اس تصور کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنی پریکٹس شروع کرنے کے بعد میں نے ان صلاحیتوں کو بطور علاج و معالجے کے استعمال کیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب صرف نبض پر ہاتھ رکھ کر سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جب میں ان پر ہپناٹزم کے ذریعے عمل تنویم کر کے ان سے کہتا کہ وہ صحت یاب ہو چکے ہیں اور پھر جب وہ حقیقت میں صحت یاب ہو جاتے تھے تو اسے میری صداقت خیال کرتے اور کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ نے شفایابی کی بڑی صلاحیت دی ہے۔ وہ فوراً مرض جان لیتے ہیں اور ان کی دوا کی چند خوراکیں پی کر صحت حاصل ہو جاتی ہے۔

میں لوگوں کی عجیب الجھنیں اور دلچسپ مسائل حل کرنے میں خاصی دلچسپی لیتا تھا مگر میں نے اپنے اس شوق کو صرف اپنے طبی میدان تک ہی محدود رکھا تھا۔ کئی پولیس افسران میرے دوست تھے، وکلا سے بھی کافی واقفیت تھی مگر میں نے کبھی ان کے معاملات میں دخل اندازی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ میں خاموشی سے اپنی خداداد صلاحیتیں خلق خدا کے مفاد میں استعمال کرنا پسند کرتا تھا۔

میری پریکٹس بڑی کامیابی سے چل رہی تھی اور میں اپنی سادہ اور پُرسکون زندگی سے مطمئن تھا لیکن آدمی جو کچھ چاہتا ہے، ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا۔ ایک معمولی سے واقعے نے میری زندگی کا انداز بھی بدل دیا۔ کوئی ارادہ اور خواہش نہ رکھتے ہوئے بھی مجھے ایک عجیب و غریب کیس میں ملوث ہونا پڑا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پہلا واقعہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ میں موسم گرما میں حسبِ معمول کچھ دن مری کے پُرفضا مقام پر گزارنے پہنچا۔ اس زمانے میں مری کے مضافات میں مکانات عموماً چھ مہینے، کرائے کی بنیاد پر مل جاتے تھے۔ چھ ماہ کا کرایہ یکمشت دینا پڑتا تھا پھر مکان میں آپ ایک ہفتہ ٹھہریں یا ایک ماہ قیام کریں یا پھر چھ ماہ تک رہتے رہیں۔

گھڑیال چوک سے بائیں مڑنے والے راستے پر میں نے بھی ایک چھوٹا سا خوب صورت سا مکان لے رکھا تھا جو پچھلے دو تین سال سے میرے پاس تھا۔ میں گرمیوں کے سیزن میں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں آجاتا۔ اس گھر میں قیام کرتا۔ کھانا ہوٹلوں سے کھاتا، ناشتا خود تیار کر لیتا۔ ایک دو ماہ ٹھہر کر واپس آجاتا۔

اس سال اتفاق سے میری روانگی کچھ تاخیر سے ہوئی تھی۔ وادی نیلم میں برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ نیلم کی دلچسپیاں، کھیل تماشے، ٹورنامنٹس، برسات کے موسم سے پہلے ہی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس لیے جو رنگینی وہاں مئی، جون میں نظر آتی تھی وہ جولائی، اگست میں ماند پڑ جاتی تھی۔ میرا ارادہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ قیام کرنے کا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔ میں علی الصباح فجر کی نماز کے بعد ہمیشہ سے ایک دو میل چہل قدمی کا عادی تھا۔ اس روز بھی میں حسبِ معمول سیر کے لیے نکلا۔ مین بازار سے گزرتے ہوئے چھپر جھیل تک آیا۔ جھیل میں دوسرے کنارے کی پگڈنڈی نما سڑک پر صبح کی تروتازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میرے داہنے ہاتھ کی جانب پہاڑی کی ڈھلوان تھی جو سرسبز درختوں اور خودرو پہاڑی پودوں سے بھری ہوئی تھی۔

میں تقریباً ایک دو فرلانگ ہی چلا تھا کہ اچانک پہاڑی سے ایک سیاہ بلی کود کر میرے سامنے آگئی۔ بلی بڑی خوب صورت تھی اور ایرانی نسل کی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں چھڑی ہونے کے باوجود اس نے کسی خوف کا اظہار

نہیں کیا اور ایک ہلکی سی میاؤں کے ساتھ وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی چمک دار آنکھوں کو غور سے دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ مجھ سے کسی قسم کی امداد کی طالب ہو۔ مین نے اس کی دماغی لہروں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ اور معلوم کرنے سے قاصر رہا۔ میں نے سوچا شاید وہ بھوکی ہے اور کچھ کھانے کی خواہش مند ہے۔

مجھے کتّے، بلّیوں سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں ہے، ویسے بھی اس وقت میرے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی جو اسے دے سکتا۔ اس لیے میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو بلی میرے ساتھ آرہی تھی۔ میں نے پھر بھی کوئی خیال نہیں کیا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر کے میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ ناشتے کا وقت قریب تھا۔ میں واپس لوٹ پڑا۔ بلی بھی واپس گھوم گئی۔ وہ مجھ سے چار پانچ قدم پیچھے یوں چل رہی تھی جیسے میری پالتو بلی ہو۔

مین بازار سے گزر کر جب میں اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا تو بلی اس وقت بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے سوچا، چلو آنے دو، گھر پہنچ کر اسے تھوڑا دودھ دے دوں گا۔ میں نے سوچا کہ ایسی قیمتی بلیاں یقیناً سڑکوں پر آوارہ نہیں پھرتیں، یہ کسی بڑے آدمی کی بلی ہوگی، جو کسی وجہ سے گھر سے بھاگ آئی ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ دودھ پی کر اگر یہ جانا چاہے گی تو چلی جائے گی ورنہ میں اسے اپنے پاس رکھ لوں گا۔ ممکن ہے دو چار دن تک اس کے مالک کا پتا چل جائے۔

گھر پہنچ کر میں نے ناشتا کیا اور ڈبل روٹی کا ایک توس دودھ میں بھگو کر ایک پلیٹ میں رکھ کر بلی کو دیا۔ اس نے توس تو کھالیا مگر اس طرح جیسے وہ محض میرا دل رکھنے کو کھا رہی ہو، ورنہ حقیقت میں اسے کوئی خواہش نہ ہو۔

میں نے کچھ تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اس کی ذہنیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ واضح تھا کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی امداد چاہتی تھی مگر کیسی مدد؟ یہ میں اب بھی سمجھنے سے قاصر رہا۔ ناشتے کے بعد میں کچھ دیر اخبار پڑھتا رہا۔ بلی ایک جانب خاموشی سے بیٹھی رہی۔ مجھے کچھ ضروری کام تھا۔ میں لباس تبدیل کر کے باہر جانے لگا تو بلی نے بھی میرے ساتھ آنے کی کوشش کی۔ اب ظاہر تھا کہ میں اسے اپنا دُم چھلا تو نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ دماغی لہروں کے ذریعے حکم دیا کہ وہ گھر میں رہنا چاہتی ہے تو رہ سکتی ہے مگر ہر جگہ میرے ساتھ نہیں جاسکتی۔ وہ میری بات سمجھ گئی اور دوبارہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ میں نے جاتے ہوئے اپنے ملازم سے کہہ دیا کہ میں اب رات کو واپس آؤں گا۔ اگر بلی گھر میں رہے تو وہ دوپہر کو اسے کچھ کھانے کے لیے دے دے۔

دن بھر اپنی مصروفیت کے دوران بلّی کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ رات گیارہ بجے واپس آیا تو اسے اپنے کمرے میں ایک اضطراب کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے دیکھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے پھر وہی احساس ہوا کہ جیسے وہ کسی اہم ضرورت کے سلسلے میں میری مدد کی طالب ہو۔ میں تھکا ہوا تھا۔ کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ملازم نے بتایا کہ اس نے دوپہر اور شام کو خاص طور سے بلی کو گوشت اور دودھ، روٹی کھلانے کی کوشش کی مگر بلی نے دودھ پینے کے علاوہ کسی شے کو منہ نہیں لگایا۔ دن بھر وہ بڑی بے قراری کی کیفیت میں سارے گھر میں چکر لگاتی اور بار بار میرے کمرے میں آتی رہی، جیسے میری واپسی کا انتظار کررہی ہو اور پھر مغرب کے بعد سے تو میرے کمرے میں ہی گھس کر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک بار پھر غور سے بلّی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس ایک بات کے علاوہ کہ وہ کسی مخصوص کام میں میری مدد چاہتی ہے، کچھ اور معلوم نہ کرسکا...... میں نے اسے اپنی دماغی لہروں سے ہدایت کی کہ رات زیادہ ہوچکی ہے، میں تھکا ہوا بھی ہوں۔ وہ رات بھر صبر کرے۔ صبح اٹھ کر میں اس کی مشکل کو سمجھنے اور ممکن ہوا تو مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ بلی کچھ مطمئن ہو کر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد سوگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح میں حسب معمول چہل قدمی کے لیے چلا تو مجھے محسوس ہوا جیسے بلی بھی میرے ساتھ آنا چاہتی ہو۔ میں نے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ راستے میں، میں نے اسے بتایا کہ چونکہ اب ایسا لگتا ہے جیسے اس کا اور میرا ساتھ کچھ عرصے کے لیے مقدر ہوچکا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اس کا کوئی نام رکھ دیا جائے، چنانچہ میں اسے آئندہ بجلی کہہ کر پکاروں گا۔ بلی نے اس کا جواب ایک ہلکی سی میاؤں سے دیا۔ گویا اسے اس نام پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہی، لیکن جب میں جھیل کے پاس فلیٹس کے مقام پر پہنچ کر اسی تپلی پگڈنڈی کی جانب مڑنے لگا تو وہ رک

گئی اور مخالف سمت میں اس جانب دیکھنے لگی، جہاں سے ایک پہاڑی سڑک، گل ڈنہ کالج کی طرف جاتی تھی۔

میں اس کا مقصد سمجھ کر اسی راستے کی طرف چل دیا۔ بجلی، کو میری اس حرکت سے خوشی ہوئی۔ وہ جوش کے عالم میں بھاگ کر کچھ دور جاتی، پھر رک کر میرے پہنچنے کا انتظار کرتی۔ میں قریب پہنچتا تو وہ پھر بھاگ کر آگے بڑھ جاتی۔ اس پہاڑی راستے پر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے میسر آنے والی کشادہ جگہ کے اعتبار سے چھوٹے بڑے مکانات اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔ راستے میں ملنے والا تیسرا بنگلا ڈاکٹر ہاشمی کا تھا جو ایک مشہور ڈاکٹر سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ مری میونسپل کمیٹی کا ممبر بھی تھا۔ میں اس سے خاصی اچھی طرح واقف تھا۔

بجلی، ڈاکٹر ہاشمی کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ میں آگے بڑھ گیا مگر وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چاہتی ہے کہ میں ڈاکٹر ہاشمی سے ملاقات کروں۔ ڈاکٹر ہاشمی سے میری ملاقات گزشتہ سال ہوئی تھی۔ اس سال میں جب سے آیا تھا ان سے ملنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا تھا اور نہ ہی شام کے اوقات میں کسی تفریح گاہ میں ان سے مڈبھیڑ ہو سکی تھی۔

میں نے سوچا کہ چلو اس بہانے ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ شاید بجلی انہیں پہچانتی ہو یا وہ جانتے ہوں کہ یہ کس کی بلی ہے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

چنانچہ میں نے گیٹ پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ مجھے پتا تھا کہ ڈاکٹر ہاشمی کا کنبہ بہت مختصر ہے۔ یعنی وہ، ان کی بیگم اور ایک بیٹی۔ بس اتنے ہی افراد بنگلے میں رہتے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔

گھنٹی کے جواب میں خود ڈاکٹر ہاشمی صاحب ایک اونی گاؤن پہنے نمودار ہوئے۔ مجھے دیکھ کر بڑے تپاک اور گرم جوشی کا اظہار کیا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ انہوں نے بلی کو میرے ساتھ دیکھ کر کسی حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میری پالتو بلی ہے۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ بہرحال میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب آگئے اور مسز ہاشمی ناشتے کے لوازمات بھی لے آئیں۔ میں نے ناشتے کے دوران بجلی کی طرف دیکھا وہ کچھ اضطراب آمیز انداز سے میری طرف متوجہ تھی۔

میں ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ ان سے ان کے کسی دلچسپ یا پیچیدہ کیس کے بارے میں پوچھوں۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے بجلی کی جانب دیکھا، وہ پُرسکون نظر آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی اس امر سے واقف ہو گئی ہے کہ میں اس کے خیالات سمجھ سکتا ہوں۔

میں نے ڈاکٹر ہاشمی سے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ جواب میں بلا تامل انہوں نے بتایا کہ وہ آج کل ایک نوجوان لڑکی کے کیس کے سلسلے میں کافی پریشان اور فکرمند ہیں۔

''راولپنڈی میں میرے ایک پرانے واقف کار سردار جہاں داد خان مرحوم تھے۔ ان کا تعلق چند واسطوں سے روہیل کھنڈ کے حکمران سردار خاندان سے تھا۔ تقریباً ایک سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا اور خاندان کی سربراہی ان کے اکلوتے بیٹے رحیم داد خان کے ورثے میں آئی۔ وہ امریکا میں اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے۔ سردار جہاں داد خان (مرحوم) نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی ان کے خاندان ہی سے تھی۔

شادی کے پانچ برس بعد جب بہت منتوں، مرادوں سے انہیں اولاد کی امید ہوئی تو بدقسمتی سے کیس بگڑ جانے کی وجہ سے نومولود بچہ چند گھنٹوں کے بعد مر گیا اور جسم میں زہر پھیل جانے کے باعث خود بیگم صاحبہ بھی دوسرے دن دنیا سے سدھار گئیں۔ ان کی وفات کے دو سال بعد سردار جہاں داد خان نے اپنی پسند سے ایک طوائف سے شادی کر لی جو ان کے بقول حالات کی مجبوری سے کوٹھے تک پہنچ گئی تھی۔

اس خاتون کا نام چندن بائی تھا جسے سردار صاحب نے شادی کے بعد سردار بیگم کا خطاب دیا۔ سردار بیگم کا ایک بیٹا تھا جس کا نام عمران تھا جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ان کے پہلے شوہر سے تھا۔ حقیقت کیا تھی یہ خدا بہتر جانتا ہے۔

بہرحال سردار بیگم نے واقعی شریف بیگمات کی طرح سردار جہاں داد کے اجڑے ہوئے اور بکھرتے ہوئے گھر کو سنبھال لیا۔ ان سے سردار صاحب کے یہاں دو بچے ہوئے۔ پہلا لڑکا جس کا نام رحیم داد خان رکھا گیا اور دوسری ایک لڑکی جسے ثریا خانم کا نام دیا گیا۔ رحیم داد خان بچپن سے ہی بہت ذہین، ہوشیار اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اس نے ایل ایل بی اچھے نمبروں سے پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے امریکا چلا گیا۔ امریکا جانے سے قبل اس کی شادی خاندان ہی کی ایک شریف، نیک سیرت وخوب صورت لڑکی شبانہ سے کر دی گئی تھی۔ رحیم داد کا سوتیلا بھائی عمران ہزار کوشش کے باوجود مڈل سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر تعلیم سے قطع نظر وہ بہت چالاک، موقع شناس اور انتقامی امور میں فطرتاً مہارت رکھنے

والا نوجوان تھا۔ سردار جہاں داد نے اپنی جائداد، زمینوں اور باغات وغیرہ کا نظم ونسق اس کے سپرد کردیا جسے اس نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، سردار (مرحوم) کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا مگر رحیم داد سے اس کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے اور چونکہ سردار بیگم بھی اپنی نمک خواری یا معاملہ فہمی کی وجہ سے رحیم داد کو ہی فوقیت دیتی رہی تھیں۔ اس لیے عمران اپنی سگی ماں سے بھی کبھی زیادہ خوش نہیں رہا۔

سردار جہاں داد خان کے انتقال کے بعد جب ان کا وصیت نامہ پڑھا گیا، تو جیسے کہ توقع تھی، انہوں نے اپنی جملہ املاک، مال وجائداد اور خطاب کا وارث رحیم داد خان کو قرار دیا تھا لیکن اسے پابند کردیا تھا کہ وہ اپنی والدہ، سردار بیگم کو علاوہ گھریلو اخراجات کے دو ہزار ماہانہ وظیفہ دے گا، اسی طرح دو ہزار روپے کا وظیفہ اپنی بہن ثریا خانم کو اور ایک ہزار روپیا ماہانہ وظیفہ عمران کو تاحیات دیتا رہے گا اور اگر یہ سب یا ان میں سے کوئی ایک، وظیفے کا خواہش مند نہ ہو تو اس کے عوض جائداد میں سے مکان یا زمین جس کو نام بنام خود سردار صاحب نے مقرر کردیا تھا، ان افراد کو دے دی جائے گی اور پھر ان کا ہر حق ساقط ہوجائے گا۔

میرا اندازہ ہے کہ عمران کو وصیت نامے کی یہ شرائط پسند نہیں تھیں مگر بظاہر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور حسبِ سابق جائداد کا انتظام چلاتا رہا۔ رحیم داد خان نے خود زیرِ تعلیم ہونے کے باعث اسے اس منصب پر برقرار رکھا تھا۔

رحیم داد اپنے والد کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اس کی واپسی کے دو ماہ بعد پتا چلا کہ اس کی بیوی شبانہ خاتون حاملہ ہیں۔ خاندانی دستور کے مطابق ہر طرح سے ان کی احتیاط اور نگہداشت کی جانے لگی مگر کسی نامعلوم وجہ سے شبانہ خاتون کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ ڈاکٹروں نے ابتدا میں اسے زمانہ حمل کی فطری کمزوری پر معمول کیا اور ان کے لیے مقوی ادویات، ٹانک اور حیاتین و پروٹین سے بھرپور غذائیں تجویز کیں۔ لیکن اس تمام علاج معالجے کے باوجود شبانہ کی صحت گرتی چلی گئی۔

ایک رات جب اس پر کمزوری کے سبب غشی کا دورہ پڑا اور...... اسے کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد ہوش میں لایا جا سکا تو ڈاکٹروں نے اس کے لیے تبدیلی آب و ہوا تجویز کی۔ مری میں سردار (مرحوم) صاحب کے تین بنگلے تھے۔

اپریل کے ابتدائی ہفتے میں سردار بیگم نے شبانہ کو گھر کے ایک پرانے خاندانی نمک خوار ملازم بابا دلبر اور اپنی بیٹی ثریا کے ہمراہ یہاں مری بھیج دیا۔ جب سے وہ مسلسل میرے زیرِ علاج ہے۔

بیگم صاحب خود راولپنڈی میں عمران کے ساتھ ہی ٹھہری رہیں۔ کیونکہ شبانہ کی بیماری کا ٹیلی گرام، رحیم داد خان کو امریکا بھیجا گیا تھا، جس کے جواب میں اس نے بذریعہ تار ہی اطلاع دی تھی کہ وہ خود شبانہ کی حالت دیکھنے اور ضروری انتظامات کرنے کے لیے راولپنڈی پہنچ رہا ہے مگر اس کا قیام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ سردار بیگم اور عمران راولپنڈی میں رحیم داد خان کی آمد کے منتظر تھے۔ اسے خلافِ توقع آنے میں تاخیر ہوگئی۔

وہ جون کے آخری ہفتے میں راولپنڈی پہنچا۔ ایک رات اپنی آبائی حویلی میں قیام کیا۔ دوسرے دن سردار بیگم بذریعہ ہیلی کاپٹر اور عمران اور رحیم داد بذریعہ کار مری کے لیے روانہ ہوگئے۔

سردار بیگم بخیریت یہاں پہنچ گئیں مگر عمران اور رحیم داد کبھی نہ پہنچ سکے۔ جب وہ دوسرے دن تک غائب رہے تو ان کی تلاش شروع ہوئی۔ بارہ کہو اور چھتر پارک، تک ایسی شہادتیں اور گواہ مل گئے جنہوں نے ان کی کار کو گزرتے دیکھا تھا مگر آگے کوئی سراغ ناپید تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڈوں میں دیکھ بھال شروع ہوئی اور آخر چوتھے دن ایک بہت ہی گہرے اور عمودی سطح کے کھڈ میں ان کی کار بالکل جلی ہوئی حالت میں دیکھ لی گئی۔ کھڈ کی گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ وہاں اترنا اس قدر خطرناک تھا کہ بڑے انعام کے لالچ میں بھی کسی نے اترنے کی ہمت نہیں کی۔ دوربین کی مدد سے کار کی جو حالت دیکھی گئی تھی اس سے سو فیصد یقین تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔ یہ جانکاہ حادثہ سردار بیگم اور ان سے کہیں زیادہ شبانہ کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اس کی حالت ایک دم بگڑ گئی۔

ایک ہفتے کی مسلسل کوشش اور خدا کی مہربانی سے وہ سردست مرنے سے بچ گئی مگر وہ اب زندہ درگور ہے۔ جینے کی اگر کوئی امنگ اس کے اندر تھی بھی، تو وہ بالکل ختم ہوچکی ہے۔ اگرچہ وہ خود بھی جانتی ہے اور سردار بیگم بھی اسے سمجھاتی ہیں کہ اسے اپنے لیے نہیں تو خاندان کے وارث کو بخیر وخوبی جنم دینے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کا مرض ابھی تک کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ مری کی صحت بخش آب و ہوا میں اس کا بہترین علاج ہورہا ہے۔ مہنگی ادویات، انجکشن اور طاقت پہنچانے والی بہترین غذا استعمال کرائی جارہی ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر

کسی دوا اور غذا کا اثر ہی نہیں ہو رہا ہو۔ تمام رپورٹس نارمل ہیں۔ اس اعتبار سے اسے مکمل طور پر صحت مند ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہے۔ تم چونکہ ایسے پُراسرار معاملات سے دلچسپی رکھتے ہو، اس لیے میں نے اس کا کیس اپنے تمام پس منظر کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب بتاؤ! تم ان حالات کی بنا پر کیا رائے قائم کرتے ہو؟''

''آپ نے سردار (مرحوم) کے خاندانی پس منظر اور ان کے وصیت نامے کا ذکر غالباً اسی لیے کیا۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا ''کہ آپ کے خیال میں شبانہ کی بیماری کا اس سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے ایسی صورت میں، جبکہ ان کے صاحب زادے رحیم داد بھی بظاہر ایک حادثے کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رحیم داد خان نے بھی کوئی وصیت نامہ چھوڑا ہے یا نہیں؟''

''سردار (مرحوم) صاحب کے یہاں یہ خاندانی روایت رہی ہے کہ ایک سربراہ کے انتقال اور دوسرے کی جانشینی کے وقت ہی نیا سربراہ اپنا وصیت نامہ تحریر کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ آخری نہیں ہوتا۔ اپنی زندگی کے دوران وہ جب چاہے اس میں اپنی مرضی کے مطابق ردّوبدل کر سکتا ہے۔ چنانچہ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ رحیم داد کا وصیت نامہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اس میں جائداد کا سربراہ اور وارث اس بچے کو قرار دیا گیا ہے جو شبانہ کے بطن سے پیدا ہونے والا ہے۔ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اس کی موت کی صورت میں رحیم داد کی ہمشیرہ ثریا خانم اور شبانہ مشترکہ وارث ہوں گی۔ تاکہ شبانہ دوسری شادی نہ کر لے اور سردار بیگم کا وظیفہ وہی رکھا گیا ہے جو سردار (مرحوم) نے طے کیا تھا اور باقی تفصیلات بھی کم و بیش وہی ہیں جو سردار جہاں داد (مرحوم) کی وصیت کا جزو ہیں۔''

''اور اس بنا پر آپ کا خیال ہے کہ غالباً کوئی فرد شبانہ اور اس کے بچے کی زندگی کے درپے ہے؟''

ڈاکٹر ہاشمی نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کسی سوچ میں گم لگ رہے تھے۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کوئی فرد وہی ہو سکتا ہے جسے شبانہ اور اس کے بچے کی موت سے فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ رحیم داد خان کی زندگی میں تو صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ شبانہ یا اس کے بچے کی موت کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی جبکہ آپ کے بقول اس کی بیماری کئی ماہ سے یعنی رحیم داد کی حادثاتی موت کے قبل سے جاری ہے۔''

''میں اسی پہلو پر سوچ رہا تھا۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے جواب دیا۔ ''اور سچ پوچھو تو اُس وقت میرا شبہ یہ تھا کہ کوئی شخص باقاعدہ پلاننگ کے تحت سردار جہاں داد خان کی وسیع جائداد کے وارثوں کو ایک ایک کر کے ختم کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اس کا پہلا نشانہ وہ بچہ ہے جو عنقریب پیدا ہونے والا ہے۔ لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سمجھوں۔ کیونکہ جو شخص میری نظر میں مشکوک تھا وہ اب خود بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔''

''آپ کا اشارہ عمران کی طرف ہے۔''

''ہاں...... ثریا خانم اور شبانہ کے بقول وہ بہت خودغرض، سنگ دل اور اذیت پسند آدمی تھا۔ اس نے کبھی کھلم کھلا سردار مرحوم اور رحیم داد کے خلاف کوئی کام نہیں کیا مگر وہ بار ہا ان سب سے اپنی حقیقی ماں سردار بیگم سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صرف حالات کی مجبوری نے اسے سردار جہاں داد کی چاکری اور ملازمت پر مجبور کر دیا ہے اور اسے جب بھی موقع ملا وہ اس قید و بند سے آزاد ہو جائے گا۔ اسے اپنی ماں سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اول تو اس کی ولدیت مشکوک کر دی پھر ایک بیٹے کو جنم دے کر سردار جہاں داد کو ایک وارث فراہم کر دیا۔ وہ چاہتیں تو، پیدا ہوتے ہی رحیم داد کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھیں، اس کے بعد صرف ثریا رہ جاتی اسے راستے سے ہٹانا بہت آسان تھا، اس طرح وہ پوری جائداد کا وارث بن جاتا۔

''عمران نے اگر کوئی سازشی منصوبہ سوچا بھی تھا'' میں نے کہا۔ ''تو وہ اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی موت کے بعد تو شبانہ کی صحت بہتر ہونا چاہیے تھی۔ لیکن یہ اس صورت میں کہ عمران کسی بھی طرح اس کی خرابیٔ صحت کا ذمّے دار سمجھا جائے تب۔ تو، اب اس کی حالت کیوں خراب ہوتی جا رہی ہے، اس کا ذمّے دار کون ہے؟''

''یہ اپنے شوہر کی موت کا صدمہ بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے کہا۔ ''ویسے میں سوچ رہا تھا کہ تم سے ملاقات ہو جائے تو کہوں کہ ایک بار تم بھی شبانہ کو دیکھ لو، شاید تمہارا ہپناٹزم اس کی کچھ مدد کر سکے۔''

ڈاکٹر ہاشمی اُن چند گنے چنے افراد میں شامل تھے جو میری ان صلاحیتوں سے واقف تھے۔ اگرچہ شاید انہیں یقین نہ تھا۔

میں نے بلّی، بجلی کی طرف دیکھا، وہ اس صورتِ حال سے کافی مطمئن نظر آتی تھی۔ غالباً اسی وقت ڈاکٹر ہاشمی نے بھی پہلی مرتبہ اسے کچھ توجہ کا مستحق سمجھا۔

''یہ تمہاری بلّی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''نہیں میری تو نہیں۔ بس اتفاقاً مل گئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''یہ بہت خوب صورت ایرانی بلّی ہے۔'' وہ بولے۔
''سردار بیگم کو بھی ایرانی بلیوں کا بڑا شوق ہے بلکہ کہنا چاہیے تھا کہ میں نے ہمیشہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بلّی ضرور دیکھی مگر اس دفعہ وہ مری آئی ہیں تو ان کی بلی جسے وہ ملکہ کہتی ہیں ان کے ساتھ نہیں تھی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بات ٹال گئیں۔ اچھا تم بتاؤ کہ شبانہ کو دیکھنے کب چل رہے ہو؟''
''جب آپ چاہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں تقریباً روزانہ ایک چکر لگا آتا ہوں۔ ہمہ وقت دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک اچھی نرس کا انتظام کر دیا ہے۔ اس کا نام شازیہ ہے۔ وہ بہت اچھی طرح شبانہ کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے تم آج شام میرے ساتھ چلو۔ سردار مرحوم کا خوب صورت بنگلا گلڈنہ کالج کے بیک میں ہے، زیادہ دور نہیں۔ سڑک بھی اچھی ہے چھوٹی کار جیسی کہ میرے پاس ہے یا سردار مرحوم کی اپنی کار ہے، آسانی سے آجا سکتی ہے۔''
''بہتر ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو اب اجازت دیں، میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ کس وقت وہاں جائیں گے؟''
''یہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے۔'' ڈاکٹر ہاشمی بھی میرے ساتھ کھڑے ہوگئے۔

☆☆☆

میں دن بھر ڈاکٹر ہاشمی کے بتائے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا اور شام کو مغرب کے بعد جب ان کے گھر گیا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں واقعی کوئی مفید خدمت انجام دے سکوں تو سردار (مرحوم) کے بنگلے میں میرے مستقل قیام کی گنجائش پیدا کریں۔ میں اس داستان کے ہر کردار کو اس کے ہر رنگ اور ہر موڈ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ میرا تعارف ڈاکٹر جمال کی حیثیت سے تو کرائیں گے ہی، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں گے کہ انہوں نے مجھے خاص طور سے وادی نیلم (کشمیر) سے شبانہ کے علاج میں مشورہ دینے کے لیے طلب کیا ہے اس لیے میں بنگلے میں ہی قیام کروں گا۔
ہم لوگ ڈاکٹر ہاشمی کی منی کار میں تقریباً آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ بجلی، میرے ساتھ تھی۔ وہ خود بھی ساتھ آنا چاہتی تھی اور میں نے بھی اس کی موجودگی کو بہتر خیال کیا تھا۔ راستہ دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا پھر بھی ہمیں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ بنگلے کے گیٹ پر ملازم بابا دلبر نے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک ایماندار، مخلص اور وفادار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی کار سے اترے، تو اس نے ان کا بیگ سنبھال لیا۔ میں اور ڈاکٹر صاحب آگے چلے۔ برآمدے کے پہلے کمرے کے دروازے پر ایک طویل قامت، چوڑے چکلے، تندرست جسم کی مالک خاتون، بہت قیمتی مگر سادہ تراش کا شلوار قمیص کا سوٹ پہنے کھڑی تھیں۔ جسم کی مناسبت سے چہرہ بھی بھاری اور پھیلا ہوا تھا۔ سر کے نصف سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ پیشانی کشادہ، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، آنکھیں قدرے چھوٹی مگر روشن اور چمک دار تھیں۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہی سردار بیگم ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ہاشمی نے تعارف کروایا تو اس اندازے کی تصدیق ہوگئی۔
''یہ ڈاکٹر جمال ہیں۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ پیچیدہ نفسیاتی کیسوں کا خاص تجربہ رکھتے ہیں۔ میں نے شبانہ بیٹی کے علاج کے لیے انہیں خاص طور سے کشمیر سے بلایا ہے۔ آپ بنگلے میں ان کی رہائش کا انتظام کرا دیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔''
سردار بیگم نے غور سے میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے حفاظتی طور پر اپنے خیالات کے گرد ایک حصار بنا لیا اور پھر بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اتنا اندازہ بہرحال ہو گیا کہ وہ مضبوط قوت ارادی کی مالک ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں بھی یہ قدرت حاصل ہے کہ دوسروں کو اپنے خیالات کا پتا نہ چلنے دیں۔
''قیام کا انتظام تو ہو جائے گا۔'' وہ بولیں۔ ''مگر کیا یہ ضروری تھا؟''
''میرے خیال میں بہت ضروری تھا۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے جواب دیا۔ ''میں ہر قیمت پر شبانہ کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔'' سردار بیگم کی آواز بھی مردانہ اور سخت تھی۔ ''خاص طور سے اس لیے کہ اب اس کی صحت سے اس خاندان کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہمیں اس سے سردار خاندان کا نیا وارث ملنے کی امید ہے۔''

وہ اور ڈاکٹر ہاشمی باتیں کرتے ہوئے آگے چلے، میں ایک قدم پیچھے تھا۔ بابا دلبر واپس جاچکا تھا۔ بجلی، جو نہ جانے کیوں ایک پلر کی آڑ میں ہوگئی تھی۔ اب بہت خاموشی سے ہمارے پیچھے آرہی تھی۔

ہم ایک بہترین کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے ایک گوشے میں خوب صورت مسہری پر ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ خوب صورت کتابی چہرہ، جو کبھی سرخ وسفید رہا ہوگا، اس وقت بجلی کی روشنی میں پھیکا اور زرد نظر آرہا تھا۔ گال پچک گئے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور کتاب ایک طرف رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''آرام سے لیٹی رہو بیٹی۔'' ڈاکٹر ہاشم نے جلدی سے قدم بڑھا کر مسہری کے قریب پہنچتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اٹھنے سے روک دیا۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''بس جیسی روز ہوتی ہے۔'' شبانہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اور میری طرف دیکھا۔

''یہ ڈاکٹر جمال ہیں۔'' ہاشمی صاحب نے بتایا۔ ''لوگ انہیں جادوگر کہتے ہیں، ایسے پیچیدہ کیس جو کسی کی سمجھ میں نہ آتے ہوں، ایسے مریض جو اپنی صحت سے مایوس ہو جاتے ہوں، یہ انہیں دوبارہ تندرست وتوانا بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے انہیں خاص طور سے تمہارے علاج کے لیے بلایا ہے۔''

شبانہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری نظریں ملیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی انجانی بات سے بہت خوف زدہ اور اپنی زندگی سے مایوس ہے مگر بڑی مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ میں نے اسے اپنی ذہنی لہروں سے تسکین دینے کی کوشش کی۔

''واقعی۔'' اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ قدرے زندگی کی حامل تھی۔ ''آپ نے سچ کہا۔ ان سے مل کر ہی مجھے یک گونا سکون کا احساس ہوا ہے۔''

سردار بیگم، قریب ہی صوفے پر بیٹھ چکی تھیں۔ اچانک ان کی نظریں دروازے کی طرف گئیں اور انہوں نے بلی (بجلی) کو دیکھ لیا۔ میں شبانہ کو مخاطب کر کے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔

''یہ بلی کس کی ہے اور یہاں کیسے آئی؟'' وہ صوفے پر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ سب لوگ چونک پڑے۔

شبانہ کچھ اور خوف زدہ ہوگئی تھی۔

''یہ بلی میری ہے بیگم صاحبہ۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کو ایرانی بلیاں پسند ہیں اس لیے اسے ساتھ لے آیا کہ آپ پسند کریں تو اسے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔''

''پسند ہیں نہیں، پسند تھیں۔'' سردار بیگم نے چلا کر کہا۔ ''مگر یہ منحوس ہوتی ہیں۔ یہ کالی بلیاں۔ انہوں نے پہلے میرا سہاگ لوٹا، پھر میرے بیٹے کو کھا گئیں۔ جس رات سردار جہاں داد صاحب کا انتقال ہوا، میری بلی 'ملکہ' ایسی خوفناک آواز میں چیخ رہی تھی، جیسے ساری شیطانی روحیں ایک ساتھ ماتم کر رہی ہوں اور...... اور جس کار میں میرا بیٹا رحیم داد خان مری آرہا تھا۔ اس کار میں 'ملکہ' بھی اس کے ساتھ تھی۔ اب مجھے ان کالی بلیوں کی صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔ آپ اسے لے جائیں اور اس کو واپس کردیں۔''

''مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا نہ جانے کیوں مجھے بیگم صاحبہ کی باتیں ایک من گھڑت جھوٹ لگ رہی تھیں۔ ''میں اسے ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ واپس بھیج دوں گا۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! شبانہ اچانک بول اٹھی۔'' امی جان کو بلاوجہ وہم ہوگیا ہے۔ ملکہ، مجھے بہت پسند تھی۔ رحیم داد بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ آپ کی یہ بلی، بالکل ملکہ کی طرح معلوم ہورہی ہے، یہاں کتابوں کے علاوہ میرا دل بہلانے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ اسے یہیں رہنے دیں، میں اسے اپنے کمرے میں رکھوں گی۔ میرا کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔''

عجیب بات تھی، بجلی خود کمرے میں آتے ہی اچک کر شبانہ کی مسہری پر چڑھ گئی تھی اور اب شبانہ اٹھ کر اسے پیار کرنے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے بیگم صاحبہ!'' ڈاکٹر ہاشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو واقعی بلاوجہ وہم ہوگیا ہے۔ شبانہ بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے، بلی کو اس کے پاس رہنے دیں۔''

سردار بیگم نے غصے سے شبانہ اور پھر بلی کی طرف دیکھا اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''آپ نے اس کا نام کیا رکھا ہے ڈاکٹر جمال!'' شبانہ نے پیار سے پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کوئی خاص نام نہیں آیا، اس لیے میں اسے بجلی کہتا ہوں۔''

''میں اسے ملکہ کہوں گی۔'' شبانہ نے جواب دیا اور بڑے پیار سے بلی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆☆☆

بنگلے میں رات کا کھانا نو بجے میز پر لگتا تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی دس پندرہ منٹ ٹھہر کر چلے گئے تھے۔ سردار بیگم کی ہدایت پر مجھے عقبی حصے کا ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ میں نے اپنا مختصر سامان کمرے کی الماری میں رکھا منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں بابا دلبر نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو پہلی مرتبہ ثریا اور نرس شازیہ سے ملاقات ہوئی۔ ثریا خانم ایک صحت مند، دراز قد، متناسب جسم کی حسین لڑکی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں اس نے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ نرس شازیہ سانولی سلونی رنگت کی ایک جاذبِ نظر نوجوان لڑکی تھی۔ ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتی تھی۔ سردار بیگم نے ان دونوں سے میرا تعارف کرایا۔ شبانہ بھی کھانے کی ٹیبل پر موجود تھی۔ کھانے کے دوران ہلکی ہلکی گفتگو ہوتی رہی۔ جس میں سردار بیگم اور ثریا نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ میں، شبانہ اور شازیہ ہی باتیں کرتے رہے، میں نے خاص طور پر کوشش کی کہ دلچسپ باتوں اور چٹکلوں سے ماحول کو شگفتہ رکھا جائے۔ جواباً نرس شازیہ نے بھی کچھ لطیفے سنائے۔ وہ کافی باتونی لگتی تھی۔ اس کی دماغی لہروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکپن سے اب تک مسلسل محنت اور جدوجہد سے تنگ آ چکی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اب اسے کوئی ایسا موقع حاصل ہو جائے جس سے وہ آرام دہ اور محفوظ زندگی گزار سکے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ اخلاقیات کی بھی کچھ ایسی زیادہ قائل نہیں۔ کوئی چاہے تو اسے خوش گوار مستقبل کا جھانسا دے کر اپنا آلۂ کار بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

دو تین دن ہی میں مجھے نگرانی اور بنگلے کے افراد کی حرکات و سکنات کے جائزے سے یقین ہو گیا کہ اگر شبانہ کے خلاف کوئی سازش کام کر رہی ہے اور اسے آہستہ آہستہ کوئی زہر دیا جا رہا ہے تو اس کا ذریعہ کسی بھی قسم کی خوراک نہیں ہو سکتی۔ سب کا کھانا اور ناشتا ایک جگہ تیار ہوتا تھا اور لوگ خواہ ایک ساتھ کھانا کھائیں یا الگ الگ اپنے کمروں میں کھائیں یا ڈائننگ روم میں، کھانے میں زہر کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کیونکہ بابا دلبر، جو خود ہی کھانا پکانے میں ماہر تھا۔ بہت محتاط اور صفائی پسند انسان تھا اور اس کی موجودگی میں کسی کو اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانا مشکل تھا پھر چونکہ کسی کے لیے کوئی مخصوص کھانا یا ناشتا الگ سے تیار نہیں ہوتا تھا اور شبانہ کے علاوہ کسی پر کوئی مضر اثرات ظاہر نہیں ہو رہے تھے، اس لیے میرا قیاس یہی تھا کہ اگر کوئی زہر استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کا طریقہ کچھ اور ہوگا۔ دوائیں اور پھل جو خصوصی طور پر شبانہ کے لیے آتے تھے، میں نے پوشیدہ طور پر یہ چیزیں کچھ پالتو جانوروں کو کھلا کر دیکھیں اور کوئی خراب اثر نوٹ نہیں کیا۔ پھر جیسا کہ ڈاکٹر ہاشمی نے بھی کہا تھا کہ اگر کسی سازش کا وجود تسلیم کر بھی لیا جائے تو آخر یہ سازش کون کر رہا تھا؟ ہر جرم کا کوئی مقصد، کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ یہاں شبانہ یا اس کے بچے کی موت سے کسے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ بنیادی طور پر عمران کو، مگر وہ خود ایک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ دوسرے نمبر پر ثریا کو، لیکن میرا تجربہ تھا کہ عورت کی پشت پر جب تک کوئی مرد نہ ہو وہ کوئی ایسی سازش خاص طور سے ایسی کم عمری میں بمشکل ہی کر سکتی ہے۔ سردار بیگم کو بھی فائدہ پہنچ سکتا تھا بشرطیکہ جائداد کے تمام ورثا راستے سے ہٹ جائیں۔ لیکن جس شرافت اور وفاداری سے انہوں نے سردار (مرحوم) کا ساتھ دیا تھا اور پھر عمر کے جس دور میں وہ داخل ہو چکی تھیں، اس کے پیشِ نظر ان سے یہ لالچ متوقع نہیں ہوتا تھا مگر اس بات میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت مضبوط قوتِ ارادی کی مالک تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی ذہنی لہروں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ ثریا نہ جانے کیوں زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ میں نے ایک دو دفعہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ البتہ اتنا اندازہ میں بہرحال کر چکا تھا کہ شبانہ کی طرح وہ بھی کسی بات سے خوف زدہ تھی۔

شبانہ کا علاج میں نے دوسرے دن ہی شروع کر دیا تھا۔ میں نے کوئی دوا تجویز نہیں کی۔ اس کے لیے ڈاکٹر ہاشمی کا نسخہ ہی کافی تھا۔ میں نے اس پر تنویمی کیفیت طاری کر کے اس کے شعور اور تحت الشعور دونوں کو یہ ہدایت دینا شروع کر دی کہ وہ صحت یاب ہو رہی ہے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ اور ایک دو بار کے عمل کے بعد ہی اس کی مجموعی کیفیت بہت بہتر اور صحت پذیر نظر آنے لگی۔ ظاہر تھا کہ گھر والوں پر اس کا ردِعمل یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ میری صداقت سے متاثر ہو جائیں۔ خاص طور سے بابا دلبر تو گویا جیسے میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ عمل کے دوران میں اور شبانہ کمرے میں تنہا ہوتے تھے اور کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کام میں رات کو سونے سے قبل کرتا تھا۔

غالباً یہ پانچویں دن کی بات ہے کہ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو شبانہ نے کتاب جو اس کے ہاتھ میں تھی، قریبی چھوٹی میز پر یونہی کھلی حالت میں رکھ دی۔ میں حسبِ معمول مسہری کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور ضروری ہدایات

دینے لگا۔ ''مثلاً یہ کہ جسم ڈھیلا اور پُرسکون حالت میں چھوڑ دو، ذہن سے ہر خیال نکال دو، آنکھیں بند کرلو اور سوچو کہ تمہیں نیند آرہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔'' میں اپنے مخصوص فقرے پوری ذہنی توجہ کے ساتھ ادا کررہا تھا۔ شبانہ پر غنودگی طاری ہوچکی تھی۔ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ بہت آسانی سے ہپناٹائز ہوجاتی تھی۔ اچانک میری نظریں کھلی کتاب پر پڑیں نہ جانے کہاں سے کوئی پتنگا اُڑتا ہوا آیا اور کتاب کے کھلے صفحے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے رینگنا شروع کیا۔ ورق کے کنارے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک لمحے بعد میں نے اسے تڑپتے دیکھا اور دوسرے ثانیے وہ مرچکا تھا۔

شبانہ کی زہرخورانی کا ذریعہ واضح ہوگیا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کوئی اسے واقعی زہر دے رہا ہے۔ میں نے اسی تنویمی کیفیت میں اس سے پوچھا کہ جو کتابیں وہ پڑھتی ہے، انہیں کون لاکر دیتا ہے؟ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ ''سسٹر شازیہ......''

میں نے شبانہ کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ کسی کی بھی لائی ہوئی کوئی کتاب نہیں پڑھے گی۔ اس کے مطالعے کے لیے میں اُسے کتابیں لاکر دوں گا۔ اس نے وعدہ کیا، میں نے اسے آرام سے سونے اور صبح فطری انداز میں نیند سے جاگنے کی ہدایت کی اور کمرے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

میں چاہتا تھا کہ کم ازکم ایک کتاب حاصل کرکے کسی اچھی سائنس لیبارٹری سے اس کا تجزیہ کراؤں، لیکن اول تو اس اقدام سے مجرم کو شبہ ہوسکتا تھا، دوسرے مری میں کوئی ایسی مکمل سائنس لیبارٹری موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اتنا ہی کافی سمجھا کہ شبانہ وہ زہریلی کتابیں پڑھنا بند کردے۔ خود میرے پاس مختلف موضوعات پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ میں اسے اپنے کرائے والے گھر سے کتابیں لاکر دینے لگا۔ میرے علاج کے ساتھ زہرخورانی بند ہونے کا اثر حیرت انگیز تھا۔ دو ہی دن میں شبانہ کے زرد چہرے پر ہلکی سرخی آگئی۔ ڈاکٹر ہاشمی بھی حیرت زدہ تھے مگر میں نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں یہ گتھی سلجھانے میں مصروف تھا کہ نرس شازیہ یہ حرکت خود کررہی تھی یا کسی کے اشارے پر...... یا کہ وہ اس حرکت سے بالکل انجان تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ لائبریری سے جاری کراتے وقت کتاب زہریلی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے صفحات پر زہر کا اسپرے بعد میں کیا جاتا ہوگا۔ تو یہ حرکت کون کرتا تھا؟ میں نے کئی دفعہ شازیہ کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی اور صرف اتنا معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکا کہ یہ کام وہ کسی مرد کے اشارے پر کررہی تھی۔ زہر کا اسپرے بھی وہ مرد ہی کرتا تھا۔ شازیہ شام کو کتابیں لاکر اپنے کمرے میں رکھ دیتی تھی اور دوسری صبح شبانہ کو دے دیتی تھی۔ کارروائی جو بھی ہوتی تھی، وہ رات میں ہوتی تھی اور کب ہوتی تھی؟ اس کا پتا شازیہ کو بھی نہیں تھا۔

مجھے بنگلے میں آئے غالباً ساتواں دن تھا۔ سب لوگ رات کا کھانا کھارہے تھے۔ شبانہ، سردار بیگم کی ناراضگی کے خیال سے 'ملکہ' کے بارے میں بہت احتیاط رکھتی تھی، اسے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔

اس روز صبح سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہوتے خاصی تیز بارش شروع ہوچکی تھی۔ ہم سب کھانا کھاتے ہوئے باتیں کررہے تھے کہ اچانک شبانہ کے کمرے سے 'ملکہ' کے خوفناک انداز میں کربناک آوازیں نکالنے کی صدائیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے اٹھ کر کمرے کی طرف لپکا۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے آئے۔ میں نے جلدی سے دروازے کا پٹ کھولا۔ سامنے ملکہ فرش پر بڑے تکلیف دہ...انداز میں اُدھر سے اِدھر لوٹ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر وہ پلیٹ رکھی تھی جس میں اسے دودھ یا کھانا دیا جاتا تھا۔ پلیٹ میں کچے گوشت کی ایک دو بوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ بلی دیکھتے دیکھتے ساکت ہوگئی۔ اس پلیٹ میں بوٹیاں کہاں سے آئیں؟ کسی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ شبانہ نے بتایا کہ وہ رات کو ملکہ کو صرف دودھ پلاتی تھی۔ کھانا یا گوشت ...اسے دوپہر کو دیا جاتا تھا۔

اس حادثے سے فطری طور پر شبانہ افسردہ ہوگئی۔ بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ بلی کی لاش اٹھاکر باہر پھینک دی جائے۔ شبانہ نے کہا، اس وقت رات اور بارش میں کون باہر جانے کی ہمت کرے گا۔ صبح بابا دلبر اسے کسی کھڈ میں ڈال آئیں گے۔ بات بظاہر ختم ہوگئی۔ بابا دلبر نے ملکہ کا بے جان جسم ایک کپڑے میں لپیٹ کر بنگلے کے عقبی برآمدے کے ایک گوشے میں رکھ دیا مگر دوسری صبح ناشتے کے وقت لوگوں کے حیرت و تعجب کی حد نہ رہی جب انہوں نے 'ملکہ' کو بالکل چاق وچوبند حالت میں عقبی برآمدے سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔

شبانہ خوشی سے اچھل پڑی۔ سب نے یہی سوچا کہ غالباً گوشت کھاکر 'ملکہ' کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تکلیف سے وہ بے ہوش ہوگئی اور سب نے اسے مردہ سمجھ لیا۔ میں نے شازیہ کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ ثریا کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہورہا تھا اور سردار بیگم صاحبہ، میں نے دیکھا کہ دہشت کے عالم میں اُن کے ہاتھوں سے وہ چھری گر

پڑی جس سے وہ اپنے توس پر مکھن لگا رہی تھیں۔

☆☆☆

شبانہ کی صحت اب کافی بہتر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ہاشمی بہت خوش اور پُرامید تھے کہ بچے کی ولادت بھی، جس میں اندازاً صرف ایک ماہ باقی رہ گیا تھا، نارمل طریقے سے بخیر وخوبی ہو جائے گی۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں نے کیا جادو کیا ہے، کون سا عمل پڑھا ہے کہ شبانہ کی کایا پلٹ گئی؟ میں سرِدست انہیں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے ٹال جاتا۔

اس دن جبکہ سب لوگ ماسوائے بیگم صاحبہ کے، جو سر درد کے عذر کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں، سہ پہر کے وقت بنگلے کے لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر ہاشمی بھی موجود تھے اور وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ میں نے کیا پڑھ کر پھونکا ہے جو شبانہ صحت مند ہوتی جا رہی ہے۔ ہم لوگ عقبی برآمدے کے قریب گھاس پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ میری کرسی تو بالکل دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ نکلی ہوئی کارنس پر مختلف خوب صورت پھولوں کے چھوٹے گملے ایک قطار کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ سردار بیگم چونکہ کمرے میں تھیں اس لیے شبانہ، ملکہ کو بھی ساتھ لے آئی تھی اور وہ اس وقت گھاس پر ایک چھوٹی چڑیا کی تاک میں بیٹھی تھی جو اِدھر اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ملکہ نے ایک جست لگائی اور چڑیا کو دبوچ لیا۔ میں ایک دم سے اپنی کرسی سے اٹھا اور ملکہ کی طرف لپکا تاکہ چڑیا کو اس کی گرفت سے آزاد کرا سکوں۔

ابھی میں ایک قدم ہی بڑھا ہوں گا کہ میرے پیچھے ہلکا سا دھما کا ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ برآمدے کی دیوار پر رکھا ہوا ایک گملا میری کرسی کی پشت سے ایک دو انچ کے فاصلے پر ٹوٹ کر بکھرا پڑا تھا۔ دھماکے کی آواز سن کر ملکہ نے نہ جانے کیوں خود ہی چڑیا کو چھوڑ دیا تھا اور چڑیا، جسے ذرا سا بھی زخم نہیں آیا تھا' ہوا میں پرواز کرتے ہوئے نظروں سے غائب ہوگئی۔ سب لوگ اس حادثے پر تبصرہ کرنے لگے۔ وہ شکر کر رہے تھے کہ گملا گرتے وقت میں کرسی پر نہ تھا ورنہ وہ میرے سر پر گرتا اور میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ شکر میں بھی کر رہا تھا مگر میرے نزدیک یہ حادثہ نہیں تھا، کوئی مجھے دانستہ ہلاک کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

گملے کے حادثے سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مجرم، جو کوئی بھی ہے، احمق نہیں ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ اس کی سازش میری نظروں میں آچکی ہے۔ غالباً وہ پہلے ملکہ، بلّی کی نحوست کو اس کی وجہ سمجھ رہا تھا لیکن نرس شازیہ کے ذریعے کتابوں کا بند کرانا اب اس کے نزدیک ایک اتفاقی امر نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ اب سوال یہی تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟

چائے کی میز پر سے بیگم صاحبہ بھی غیر حاضر تھیں اور نرس شازیہ بھی...... شازیہ پہلے ہی دانستہ اس کی آلۂ کار بن چکی ہے۔ گملے کو اس طرح رکھ دینا کہ وہ ذرا سے اشارے سے گر پڑے، کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بظاہر سردار بیگم سے اس کی توقع نہیں تھی۔ یہ کام شازیہ ہی کا ہو سکتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ رات کے کھانے کے بعد کچھ زیادہ توجہ سے شازیہ کے خیالات پڑھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن شازیہ کھانے کی میز پر بھی موجود نہیں تھی۔ پوچھنے پر سردار بیگم نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ سرِدست وہ اپنے کمرے میں ہے لیکن اس نے چھٹی کی درخواست کی ہے، اس لیے وہ کل ڈاکٹر ہاشمی سے کسی دوسری نرس کا انتظام کرنے کے لیے کہیں گی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں شازیہ کے کمرے میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دی اور کہا کہ اگر اس کی طبیعت خراب ہے تو مجھے دیکھنے کا موقع دے۔ میں اسے ایسی دوا تجویز کروں گا جس سے اس کی طبیعت بحال ہو جائے گی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو شازیہ ایک دم چیخ کر بولی۔ ''خدا کے لیے آپ چلے جائیں ڈاکٹر جمال! میں اس وقت بہت اَپ سیٹ ہوں۔ آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' میں مجبوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رات کو سونے سے پہلے میں کافی دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا کہ وہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ جو سردار (مرحوم) کے تمام وارثوں کو ختم کر کے خود ان کی دولت و جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے؟ بظاہر جو نام سامنے تھے، ان میں سے کوئی بھی یقینی طور پر اس پوشیدہ دشمن کی پہچان پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں اس امکان پر غور کر رہا تھا کہ ممکن ہے سردار (مرحوم) کے خاندان کے کچھ دوسرے دور کے عزیز رشتے داروں میں سے کوئی اس سازش کا بانی ہو۔ ثریا کا طرزِ عمل ابھی تک میرے نزدیک بالکل واضح نہ تھا۔ وہ عجیب قسم کی خاموش اور پُراسرار لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے تعلقات شبانہ سے بھی بس واجبی سے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔

پتا نہیں کس وقت یہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا اور یہ بھی اندازہ نہیں کہ کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک

ایک خوفناک چیخ نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ قریب ہی کرسی پر رکھا ہوا اونی گاؤن پہن کر باہر نکلا...... میں نے دیکھا کہ ثریا خانم اور سردار بیگم بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل کر اس طرف جا رہی تھیں جس جانب شازیہ کا کمرا تھا۔

بابا دلبر بھی ایک لاٹھی ہاتھ میں لیے موجود تھا۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ چیخ کی آواز شازیہ نرس کے کمرے کی طرف سے آئی ہے۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا کمرے کی طرف چلا۔ دروازہ اب بھی اندر سے بند تھا۔ سردار بیگم آوازیں دے رہی تھیں مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ تاخیر کا موقع نہیں تھا۔ میں نے فوراً بیگم صاحبہ کو ایک طرف ہٹایا اور پوری قوت سے ایک لات دروازے پر رسید کی، شاید اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی صرف قفل ہی بند تھا کہ اس کا کھٹکا اس ضرب کو نہ سہہ سکا اور دونوں پٹ ایک دھماکے سے کھل گئے۔

ایک حیرت انگیز المناک منظر ہمارے سامنے تھا۔ شازیہ کی گردن میں رسی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چھت میں لگے ہوئے ایک کنڈے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ پیروں کے پاس ایک اسٹول گرا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اسٹول سیدھا کیا۔ جیب سے چاقو نکالا اور رسی کاٹ دی۔ شازیہ کو بازوؤں سے سہارا دے کر نیچے اتارا اور فرش پر لٹا دیا۔ اس کی گردن سے پھندا کھولا اور پوری ذہنی توجہ اس کی طرف مرکوز کر دی۔ اس کے دل کی دھڑکن ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات ہے شازیہ؟'' سردار بیگم نے اپنی سخت آواز میں پوچھا۔

''میں خودکشی نہیں کرنا چاہتی تھی بیگم صاحبہ۔'' شازیہ نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟'' سردار بیگم کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' شازیہ کا جواب تھا۔ میری نظریں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

''میری طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں تھی۔ میں بستر پر لیٹی ہوئی سونے کی کوشش کر رہی تھی، اچانک کسی نے کھڑکی پر دستک دی اور اس کے ساتھ ہی دونوں پٹ خود بخود ہی کھل گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا، کھڑکی میں سے دو خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کون آدمی ہے، جو یوں بنگلے میں رات کے وقت گھس آیا ہے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میری نظریں اس کی نظروں سے ملیں اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے کہ میں چھت کے کنڈے سے رسی باندھ کر اس کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لوں، اسٹول پر کھڑی ہو جاؤں اور پھر پیر مار کر اسٹول گرا دوں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں۔ میں کھڑکی سے واپس پلٹی تو اللہ جانے ایک رسی کہاں سے میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اسے چھت کے کنڈے میں ڈال کر باندھ دیا۔ اسٹول پر کھڑے ہو کر دوسرے سرے پر پھندا بنایا اور اسے اپنے گلے میں ڈال لیا پھر میں نے پیر مار کر اسٹول گرا دیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی اس طرح جیسے سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی ہو، مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ میں کیا کر گزری ہوں اور یہ کہ اب میری موت یقینی ہے۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی اور پھر مجھے نہیں پتا کہ کیا ہوا، شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔''

سردار بیگم کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔

''پھندا ڈال کر لٹکنے سے اس کے ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''پتا نہیں کیا ہذیان بک رہی ہے۔''

''کوئی جلدی سے ڈاکٹر ہاشمی کو فون کر دے۔'' شبانہ بولی۔ اتنی دیر میں وہ بھی آگئی تھی۔ اسی وقت اچانک شازیہ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ بری طرح اینٹھ کر اکڑ گیا اور پھر فوراً ہی ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

''یہ مر گئی ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''میں ڈاکٹر ہاشمی کو فون کرتی ہوں۔'' سردار بیگم کمرے سے باہر نکل گئیں مگر چند منٹ بعد انہوں نے واپس آکر بتایا کہ بنگلے کے دونوں فون ڈیڈ پڑے ہیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ باہر بارش بدستور ہو رہی تھی۔ اب نہ ڈاکٹر ہاشمی کو بلانے کا کوئی فائدہ تھا اور نہ پولیس کو فون کیا جا سکتا تھا۔ سردار بیگم کے حکم پر شازیہ کی لاش اسی کمرے میں چھوڑ کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

میں نے شبانہ کو خواب آور دوا کی دو گولیاں دے دیں۔ اس لیے وہ تو سکون سے سو گئی تھی مگر گھر کے باقی افراد صبح تک جاگتے رہے۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ کیونکہ سردار بیگم اور ثریا دونوں ہی اپنے اپنے کمروں میں تھیں اور میں ان کے ساتھ نہیں تھا لیکن جب وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اپنے

کمروں سے نکلیں تو ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ جاگتی رہی تھیں۔

دلبر بابا نے ناشتا تیار کرلیا تھا مگر اس سوگوار ماحول میں کسی کا دل کچھ کھانے کے لیے نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی میں نے زور دے کر انہیں کافی کی ایک پیالی اور ایک ہاف بوائل انڈا کھانے پر مجبور کر دیا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے بابا دلبر کار لے کر پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ فون اس وقت بھی ڈیڈ تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ خرابی بارش کا نتیجہ تھی یا کسی نے دانستہ کہیں سے فون کے تار کاٹ دیے تھے۔ بظاہر گھر میں ایسی کوئی حرکت نوٹ نہیں کی گئی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہی مقامی پولیس کا ایک انسپکٹر سلطان شاہ دو کانسٹیبلو کے ساتھ پہنچ گیا۔ میری اس سے کوئی واقفیت نہیں تھی مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ سردار بیگم اور سردار جہاں داد (مرحوم) سے بخوبی واقف تھا اور ان کے مرتبے کا احترام کرتا تھا۔ گھر کا بزرگ ہونے کی حیثیت سے سردار بیگم نے ہی انسپکٹر کو رات کے حادثے کی تمام تفصیلات بتائیں، انہوں نے شازیہ کے آخری ہذیانی بیان کا بھی ذکر کیا اور یہ کہ بیان دینے کے فوراً بعد ہی وہ مرگئی۔

اسی وقت پولیس اور ڈاکٹر ہاشمی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر فون کی لائن خراب تھی اور ڈاکٹر جمال بہرحال ایک ڈاکٹر تھے جو اس کی موت کی تصدیق کر چکے تھے پھر بارش بھی ہورہی تھی۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ لاش کمرے میں بند کر دی جائے اور صبح ہونے پر پولیس میں رپورٹ کی جائے۔

انسپکٹر سلطان شاہ نے کوئی مزید سوال یا جرح کرنے سے پہلے لاش دیکھنا چاہی۔

شبانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ ثریا نے کہا کہ وہ دوبارہ اس خوفناک منظر کا نظارہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس لیے میں اور سردار بیگم ہی انسپکٹر کے ساتھ چلے۔ میں نے آگے بڑھ کر لگی ہوئی کنڈی کھولی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرا مطلب تھا کہ پہلے انسپکٹر کمرے میں داخل ہو۔

چنانچہ پہلے سلطان شاہ، اس کے پیچھے میں اور آخر میں سردار بیگم نے کمرے میں قدم رکھا مگر...... ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ شازیہ کی لاش غائب ہوچکی تھی۔

☆☆☆

پورے بنگلے میں ایک ایک فرد کے کمرے میں دیکھا گیا، بنگلے کے باہر بھی دور تک تلاش کی گئی۔ بنگلے کی دیوار کے ساتھ ہی کافی گہرے کھڈ کا بھی دوربین کی مدد سے جائزہ لیا گیا مگر شازیہ کی لاش یوں غائب ہوچکی تھی جیسے کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔

انسپکٹر سلطان شاہ نے ایک ایک فرد پر اچھی طرح جرح کی۔ دو تین گھنٹے سب کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بعد آخر انسپکٹر سلطان ایک عجیب الجھے ہوئے کیس کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے واپس چلا گیا۔ چیکنگ سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ کسی نے بنگلے کے باہر فون کا تار کاٹ دیا تھا۔

شازیہ کی ماں جو کہ بہت ضعیف تھی، کے لیے یہ حادثہ بڑا جانکاہ ثابت ہوا تھا۔ سردار بیگم نے اسے بلا کر تسلی دی اور کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے اسے ماہانہ رقم ملتی رہے گی۔ بُڑھیا بیگم صاحبہ کو دعائیں دیتی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

پولیس کا نظریہ یہ تھا کہ شازیہ کے کسی سے ناجائز تعلقات تھے جس کے نتیجے میں وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کا عاشق راتوں کو اس سے ملنے آتا تھا۔ اس رات وہ آیا تو شازیہ نے اسے یہ خبر سنائی، عاشق اسے ٹھکرا کر چلا گیا۔ اس صدمے سے شازیہ نے خودکشی کرلی۔ عاشق کو غالباً بعد میں اندیشہ ہوا ہوگا کہ شازیہ اسے بدنام نہ کر دے، وہ اسے سمجھانے یا کسی طرح اس کی زبان بند کرنے واپس آیا۔ اس نے شازیہ کی لاش دیکھی اور اس ڈر سے کہ لوگ شازیہ کی موت کا ذمے دار اسے نہ ٹھہرانے لگیں۔ لاش اٹھا کر لے گیا۔

میں نے ابھی کہا کہ یہ پولیس کا نظریہ تھا مگر حقیقت میں انسپکٹر سلطان کے...... دماغ کی اختراع تھی۔ اسے اردو، انگریزی کے جاسوسی ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اسی نظریے کی روشنی میں شازیہ کے چال، چلن اور اس کے دوستوں کے بارے میں تحقیق کرتا پھر رہا تھا۔ حیرت تو مجھے ڈاکٹر ہاشمی کے خیالات سن کر ہوئی، وہ بھی اسے شازیہ کی نجی زندگی کا کوئی راز تصور کر رہا تھا۔ اسے بھی یہ گمان نہیں گزرا کہ اس واقعے کا تعلق بھی شبانہ کے خلاف سازش سے ہوسکتا ہے۔

شازیہ کی موت اور اس کی لاش کی پُراسرار گمشدگی کو تین دن گزر چکے تھے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے کسی دوسری نرس کا انتظام کرنے کے لیے کہا مگر شبانہ نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے اس لیے اسے کسی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ سردار بیگم نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا چنانچہ کوئی اور نرس نہیں آئی۔

چوتھے دن میں، بیگم صاحبہ اور شبانہ سہ پہر کے وقت لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ مختلف باتیں ہورہی تھیں۔ سہ پہر کی چائے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ بلی، ملکہ، اب

شبانہ کے کمرے تک محدود نہیں رہتی تھی بلکہ جب بھی اسے موقع مل جاتا تھا وہ کمرے سے نکل کر سارے بنگلے میں گھومتی پھرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ہم لوگوں سے کچھ فاصلے پر پھولوں کی کیاریوں کے پاس گھاس پر آرام سے بیٹھی تھی۔

دفعتاً اس نے ایک عجیب سی آواز میں میاؤں کی اور اپنی جگہ اچھلنے کودنے لگی جیسے کسی چیز کو اپنے جسم سے جھاڑنے کی کوشش کررہی ہو۔ میں جلدی سے اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ چار پانچ انتہائی زہریلے پہاڑی بچھو، کافی بڑے اور سیاہ، اس کے اوپر چڑھے ہوئے اسے ڈنک مار رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ملکہ، ان کے زہر سے نیم جان ہوکر گھاس پر گر پڑی۔

بچھوؤں کی موجودگی اتنی حیرت انگیز نہیں تھی لیکن ایک دم سے چار پانچ بچھو کہاں سے نکل کر اس سے لپٹ گئے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے اپنے بھاری بوٹ سے ان تمام بچھوؤں کو کچل کر مار دیا، مگر بلی لبِ دم معلوم ہوتی تھی۔ وہ گھاس پر تکلیف سے اِدھر اُدھر لوٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ ہی دیر میں وہ بالکل بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس واقعے نے شبانہ کو افسردہ کردیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔ سردار بیگم نے بابا دلبر سے کہا کہ وہ سب کی چائے ان کے کمروں میں پہنچا دے۔ لیکن رات کو جب سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو ہماری حیرت کی حد نہ رہی...... جب ہم نے ملکہ کو بھی بڑے پُرسکون انداز میں چلتے ہوئے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ بلی ملکہ جبکہ ہم اسے مردہ سمجھ چکے تھے، دوبارہ زندہ سلامت ہماری نظروں کے سامنے موجود تھی۔ شبانہ کچھ خوش اور کچھ خوف زدہ معلوم ہورہی تھی۔ سردار بیگم کی کیفیت عجیب تھی، وہ اس طرح آنکھیں پھاڑے ملکہ کو گھور رہی تھی، جیسے اسے اپنی نظروں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ میں نے ماحول کو بدلنے کے لیے مزاحیہ لہجے میں کہا کہ بلی کے بارے میں یہ بات بطور روایت، صدیوں سے مشہور چلی آرہی ہے کہ قدرت نے اسے نُو زندگیاں دی ہیں یعنی وہ آٹھ مرتبہ مر کر زندہ ہوسکتی ہے۔ اب تک یہ بات ہم صرف کتابوں یا اشتہاروں میں پڑھتے آئے تھے، اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ پتا نہیں دوسروں پر میری بات کا کیا اثر ہوا مگر سردار بیگم ایک دم چیخ کر بولیں۔

”یہ بلی نہیں ہے، کوئی بدروح ہے۔ جب تک یہ اس گھر میں موجود ہے، گھر کا ہر فرد خطرے میں ہے۔ بابا دلبر! اسے ابھی پکڑ کر کہیں دور پھینک آؤ۔ ایسی جگہ جہاں سے یہ پھر واپس نہ آسکے۔“

شبانہ بھی کچھ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اس نے بیگم صاحبہ کے حکم پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن دلبر بابا 'ملکہ' کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو وہ جست لگا کر بھاگ نکلی۔ اس نے بابا دلبر کو پورے بنگلے میں خوب گھمایا اور اسی آنکھ مچولی میں نہ جانے کہاں غائب ہوگئی کہ شام تک ہر کمرا، برآمدہ، لان، پلنگوں اور الماریوں کے نیچے دیکھنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئی۔

بلی دوسرے دن بھی غائب تھی۔ مجھے ایک ضروری کام سے چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر جانا پڑا۔ واپسی پر پولیس اسٹیشن، میں انسپکٹر سلطان شاہ سے ملنے چلا گیا مگر شازیہ کی لاش یا اس کے قاتل کا کوئی پتا نہیں چلا تھا اور نہ ہی سلطان شاہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکا تھا کہ شازیہ کے دورانِ تعلیم، تعلیم کے بعد، زمانہ تربیت میں یا پھر ملازمت کے دو برسوں میں کسی سے بھی کوئی غیر معمولی نوعیت کے تعلقات رہے ہوں۔

میں بنگلے واپس پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ بابا دلبر باورچی خانے میں رات کے کھانے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھا۔ بیگم صاحبہ کے بارے میں پتا چلا کہ ان کے سر میں درد ہے۔ (یہ درد اکثر ان کے سر میں رہتا تھا۔ عموماً شام یا رات کو ہوتا تھا اور وہ اس درد کے باعث کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے خاموش لیٹ جاتی تھیں۔ اس دوران بنگلے کے ہر فرد کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ کسی قیمت پر انہیں پریشان نہ کرے)

شبانہ کے متعلق پوچھا تو بابا دلبر نے بتایا کہ وہ بنگلے کی چھت پر گردوپیش کے مناظر سے لطف اندوز ہونے گئی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ بنگلے کے ایک جانب کافی گہرا کھڈ واقع تھا جس کی ڈھلان بالکل سیدھی تھی۔ اس کھڈ میں چند گز نیچے اترنا بھی انتہائی مشکل تھا۔ میں چھت پر گیا مگر زینے سے ہی یہ دیکھ کر لوٹ آیا کہ شبانہ ریلنگ کے سہارے کھڑی ہوئی یا تو کسی گہری سوچ میں گم ہے، یا آس پاس کے قریب، خوب صورت نظارے بڑی محویت سے دیکھ رہی ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی پہاڑیوں پر واقع مکانات، بنگلوں اور کیبنوں میں جب بجلی کے بلب جلتے تھے تو سرسبز درختوں کے درمیان یہ رنگ برنگی روشنیاں بہت ہی دلفریب نظر آتی تھیں۔ میں اسے محفوظ پاکر مطمئن انداز میں چپ چاپ نیچے اتر گیا اسے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

ثریا خانم کا کمرا میرے کمرے کے سامنے دوسرے

برآمدے کے انتہائی آخری کنارے پر واقع تھا۔ اسی جانب دو تین کمرے درمیان میں چھوڑ کر سردار بیگم کا کمرا تھا۔ میں نہ جانے کس خیال کے تحت درمیانی صحن سے گزر کر برآمدے میں پہنچا۔ ثریا کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے اندر سے باتیں کرنے کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے غور کیا، آواز آہستہ ہونے کے باوجود میں نے پہچان لیا کہ دوسری آواز کسی مرد کی ہے۔ گفتگو کے موضوع نے میرے کان کھڑے کر دیے۔ میں بالکل دروازے سے لگ کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی باتیں سمجھ میں آگئیں مگر ذہنی لہروں سے کام لینے کے باوجود یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ مرد کون ہوسکتا ہے؟ وہ ثریا کو مطمئن کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ ''بس اب زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی بات اور ہے، اس کے بعد آخری رکاوٹ بھی دور ہوجائے گی، یہ کم بخت ڈاکٹر جمال نہ جانے کہاں سے آمرا۔ یہ نہ آیا ہوتا تو اب تک بھی کا قصہ تمام ہوچکا ہوتا۔ میں نے کارنس سے گملا گرا کر اسے مارنے کی کوشش کی مگر اس کی زندگی ابھی باقی تھی کہ وہ بچ گیا تھا۔

ثریا نے کہا کہ وہ مہینوں سے ایسی ہی تسلیاں دیتا آرہا ہے مگر اب پانی سر سے اونچا ہونے والا ہے۔ وہ کمرے میں بند رہتے رہتے تنگ آچکی ہے اور زیادہ وقت لگا تو کمرے میں بند رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لوگ پہچان لیں گے جس کے بعد اس کے لیے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔''

مرد نے پھر اطمینان دلایا کہ وہ پریشان نہ ہو، یہ اس کا آخری وعدہ ہے، ایک ہفتے کے اندر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

مجھے زیادہ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ کم و بیش تمام پیچیدگیاں واضح ہوچکی تھیں جو دو چار باتیں وضاحت طلب تھیں، انہیں بھی حل کرنے کا میں نے ایک طریقہ سوچ لیا تھا۔ مجھے آج رات کسی نہ کسی طرح ثریا خانم کے کمرے میں داخل ہو کر ایک اور کوشش کرنا تھی جس کے لیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔

☆☆☆

شبانہ کچھ دنوں سے شام اور رات کا ابتدائی حصہ بنگلے کی چھت پر گزارنے لگی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شام کے بعد چاروں طرف کے دلفریب نظاروں کے علاوہ اسے بنگلے کی چھت کی یہ پُرسکون خاموشی اور تروتازہ ہوا میں بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ جب بھی وہ کھڈ کی طرف دیکھتی ہے تو اگرچہ یہ وہ کھڈ نہیں تھا جہاں رحیم داد کار حادثے کا شکار ہوئی تھی پھر بھی اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے مرحوم شوہر کی روح اس کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ اور اس احساس سے اسے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے جیسے رحیم داد کی روح اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو، کوئی پیغام دینا چاہتی ہو۔

سردار بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ چھت کی یہ سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا اس کے لیے مناسب نہیں۔ پھر یوں اکیلے بیٹھنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ وہ بلی 'ملکہ' کی نحوست سے خائف ہیں۔ خدا خدا کر کے تو وہ اب کچھ صحت یاب ہوئی ہے۔ اگر کسی بدروح نے اسے دیکھ لیا تو یہ بڑا المیہ ہوگا جب اس پر بھی شبانہ چھت پر جانے پر مُصر رہی تو آخر سردار بیگم نے بھی اس کے ساتھ جانا شروع کر دیا مگر شبانہ انہیں وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ اس بہانے سے واپس بھیج دیتی تھی کہ بس وہ بھی اب نیچے جانے والی ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ اس کے بعد بھی گھنٹا گھنٹا بھر نہ اترتی تھی۔ کبھی کسی شام میں بھی ان دونوں کے ساتھ چھت پر چلا جاتا تھا اور پھر دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس چلا آتا تھا۔

اس رات شبانہ کھانے کے وقت بھی نیچے نہیں اتری۔ بابا دلبر کئی مرتبہ اسے بلانے گیا۔ وہ خود بھی چند دنوں سے کافی پریشان اور فکرمند نظر آرہا تھا۔ کھانے کے دوران جب شبانہ کہنے کے باوجود نہیں آئی تو شاید اس سے صبر نہ ہوسکا اور وہ بول اٹھا۔

''بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ آپ یہ بنگلا چھوڑ دیں۔ بہو بیگم اب بالکل ٹھیک ہیں یا تو پنڈی واپس چلیں یا یہاں ٹھہرنا ہی ہے تو کسی اور جگہ قیام کریں۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی بابا؟'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ''کہ تم بنگلا چھوڑنے کا مشورہ دینے لگے۔''

''اب آپ کو کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب۔'' بابا دلبر کے رویّے سے ہچکچاہٹ نمایاں تھی۔ ''آپ کہیں گے بابا دلبر سٹھیا گیا ہے مگر میں وہمی نہیں ہوں نہ ہی میری بینائی کمزور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگلے پر بدروحوں کا قبضہ ہے اور ہم نے بنگلا نہ چھوڑا تو وہ بدروحیں ضرور کوئی بڑا نقصان پہنچا کر رہیں گی۔''

''تمہیں یہ خیال کیسے ہوا بابا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کہ بنگلے پر بدروحوں نے قبضہ کرلیا ہے؟''

''میں نے...... میں نے کئی بار روحوں کو بنگلے میں اِدھر سے اُدھر آوارہ پھرتے دیکھا ہے۔'' بابا دلبر نے جواب دیا۔

''یہ سب اس کم بخت بلی 'ملکہ' کی نحوست کے اثرات ہیں۔'' سردار بیگم بول اٹھیں۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر ضرور کوئی بدروح تھی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ثریا نے بھی تائید کی۔

اگرچہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سر جھکائے خاموشی سے کھانے میں مصروف تھی۔ ''میں نے بھی اکثر راتوں کو کسی کے قدموں کی آوازیں سنی ہیں۔''

''میرا دل ڈر رہا ہے۔'' سردار بیگم نے کہا۔ ''خدا خیر کرے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔''

''تم نے جو روحیں دیکھیں بابا۔'' میں نے بابا دلبر کو مخاطب کیا۔ ''کیا وہ جانے پہچانے افراد کی تھیں؟'' بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور جیسے کچھ ٹھٹکتے ہوئے بولا۔

''ان میں سے ایک روح تو صاحب زادے عمران صاحب کی ہے۔ اسے میں بہت پہلے سے دیکھ رہا ہوں۔''

''کھڈ میں کار کے گرنے کے تین چار دن کے بعد سے ہی میں نے ان کی روح کو بنگلے میں گھومتے دیکھ لیا تھا مگر میں اسے اپنا وہم سمجھا، مگر اس نرس کی لاش غائب ہونے کے بعد سے میں اس کی روح کو بھی دیکھ چکا ہوں اور کل رات تو مجھے 'ملکہ' بھی نظر آئی تھی۔ وہ بھی کوئی روح ہی تھی کیونکہ میں نے رات کو اور دن کو بھی بنگلے کا کونا، کونا دیکھ لیا لیکن ملکہ کہیں دکھائی نہیں دی۔''

سردار بیگم بھی دلبر بابا کی باتیں سن کر کچھ چونکی چونکی اور حیرت زدہ نظر آ رہی تھیں۔

''اگر تم سچ کہہ رہے ہو بابا۔'' وہ بولیں۔ ''تو میں دو تین دن میں ہی یہ بنگلا چھوڑ دوں گی۔''

بیگم صاحبہ نے اپنے دائیں جانب شبانہ کی خالی کرسی کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو یہ ضدی لڑکی ابھی تک نہیں آئی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''میں خود اسے جا کر لاتی ہوں اور بس کل سے اس کا چھت پر چڑھنا بالکل بند۔''

وہ چلیں تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ رات کے وقت پورا بنگلا روشن رکھا جاتا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک سب لوگ، خاص طور سے دلبر بابا سونے کے لیے لیٹ نہ جاتا۔ برآمدہ، زینہ اور چھت ہر جگہ دودھیا بلب اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ ہم لوگ اوپر پہنچے تو شبانہ چھت کے اردگرد لگے ہوئے لوہے کے حفاظتی پائپ کی ریلنگ کے سہارے کھڑی کھڈ کی گہرائیوں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

سردار بیگم نے سخت لہجے میں اسے پکارا۔ ''شبانہ! کتنی بار تم سے......'' مگر ان کا فقرہ مکمل نہ ہو سکا۔ شبانہ ان کی آواز سن کر بری طرح چونکی۔ وہ جھکی کھڑی تھی، چونکنے سے اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور نہ جانے کیسے لوہے کا پائپ اپنے ساکٹ سے نکل گیا۔ شبانہ نے ایک چیخ ماری، اپنا توازن سنبھالنے اور خلا میں جیسے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے وہ نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔

اتنی دیر میں جست لگا کر میں ریلنگ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ مجھے شبانہ کے کپڑے پھڑپھڑاتے نظر آئے۔ میں نے اپنی پوری ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس پر نظریں گاڑ دیں۔ چند لمحوں بعد تیزی سے گھوما۔ سردار بیگم ایک سکتے جیسے عالم میں ٹوٹے ہوئے ریلنگ کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں نیچے جا رہا ہوں۔'' میں چیخ کر بولا۔ ''شاید وہ کسی درخت کی شاخوں میں الجھ کر بچ گئی ہو۔''

بیگم صاحبہ کے جواب یا کسی ردِعمل کا انتظار کیے بغیر میں تیزی سے دو، دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا، اور پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے بنگلے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں واپس لوٹا تو بنگلے کے بڑے کمرے میں سردار بیگم، ثریا خانم اور دلبر بابا کے علاوہ وہ انسپکٹر سلطان شاہ بھی دو سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔

میں بہت تھکا ہوا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردار بیگم ہی نہیں بلکہ سب کی نظریں متوقع انداز میں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''کوئی پتا چلا؟'' سردار بیگم نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''میں نے نیچے جہاں تک اتر سکتا تھا اتر کر تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔''

سردار بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''یا خدا!'' وہ بولیں۔ ''جہاں داد اور رحیم داد خان کے خاندان کا یہ انجام ہونا تھا۔''

''آپ تقریباً ایک گھنٹا غائب رہے ہیں۔'' سلطان شاہ نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بتایا نا کہ میں نیچے اتر کر شبانہ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''پہلے رحیم داد صاحب اور عمران کا کھڈ میں کار سمیت گر کر ہلاک ہونا۔'' سلطان شاہ بولا۔ ''پھر شبانہ خاتون کی پُراسرار بیماری اور اب یوں چھت سے گر کر ہلاکت یہ تو واقعی کوئی سازش معلوم ہوتی ہے، بلکہ عین ممکن ہے نرس شازیہ کی موت اور لاش کی گمشدگی بھی اس سلسلے کی کوئی کڑی ہو۔ میں نے چھت پر جا کر ریلنگ کا معائنہ کیا ہے۔ کسی نے اس کے ساکٹ کی چوڑیاں کھول کر اسے اس طرح ڈھیلا کر دیا تھا کہ ریلنگ کا پائپ ذرا سے دباؤ سے نکل جائے۔ صاف لگتا ہے کہ کوئی شبانہ خاتون کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔''

''بہت تاخیر سے آپ اس نتیجے تک پہنچے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

انسپکٹر سلطان شاہ نے دانستہ میری بات نظرانداز کردی۔

''بیگم صاحبہ! آپ بتاسکتی ہیں۔'' اس نے سردار بیگم کو مخاطب کیا۔ ''کہ سردار (مرحوم) کے خاندان میں کوئی ان کا دشمن تو نہیں تھا؟''

''دوست، دشمن کس کے نہیں ہوتے۔'' بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ ''سردار (مرحوم) صاحب کے اپنے خاندان کے دوسرے اعزّہ سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ یقیناً کچھ لوگ ان کے دشمن ہوں گے مگر میں کسی کا نام لینا نہیں چاہتی۔ اگر کوئی مجرم ہے تو اسے تلاش کرنا اور قانون کے حوالے کرنا پولیس کا کام ہے۔''

''آپ درست کہتی ہیں۔ میں کل ہی راولپنڈی پولیس سے رابطہ قائم کروں گا۔'' سلطان شاہ نے کہا۔ ''مگر یہ بتائیے کہ اب سردار (مرحوم) صاحب کی جملہ املاک کا وارث کون ہے؟''

''ان کی بیٹی ثریا خانم، یا پھر آخری درجے میں، میں۔'' سردار بیگم نے جواب دیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سلطان شاہ تو اپنی رسمی کارروائی پوری کرکے اور سردار بیگم، ثریا، بابا دلبر اور میرے بیانات لے کر چلا گیا مگر وہ رات بنگلے کے مکینوں کے لیے ایک انقلاب انگیز رات تھی۔

سردار بیگم کا ارادہ شبانہ کے سوم سے فارغ ہو کر فوراً ہی مری چھوڑ دینے کا تھا۔ وہ بابا دلبر اور ثریا سے انتظامات کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے سب لوگ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہر طرف ایک اداس خاموشی تھی مگر ابھی آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ملکہ کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بڑی دردناک آواز میں اس طرح میاؤں، میاؤں کررہی تھی جیسے کوئی بین کررہا ہو۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ آوازیں بنگلے میں ہر طرف سے آتی محسوس ہورہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید سردار بیگم غصے میں بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلیں گی اور بابا دلبر کو بلا کر بلی کو تلاش کرنے کی ہدایت کریں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

کم وبیش دس پندرہ منٹ تک بولنے کے بعد ملکہ کی آواز آنا بند ہوگئی اور اسی کے ساتھ ہی بنگلے کی بجلی چلی گئی۔ ہر طرف گہری تاریکی چھاگئی۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ ثریا کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ میں اپنے کمرے سے باہر آگیا۔ اسی لمحے ثریا انتہائی خوف زدہ حالت میں ایک دھماکے کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی۔

''مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا مگر وہ...... وہ سب مل کر مجھے مارنے آئے ہیں۔''

اس کی کانپتی ہوئی انگلی کمرے کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ میں ہاتھ میں شمع دان لیے کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس کا فقرہ پورا ہی ہوا تھا کہ کمرے سے دو عجیب طرح کے ہیولے سے برآمد ہوئے۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید لبادے میں ملبوس تھے۔ یہ لباس تاریکی میں عجیب پُراسرار نیلی روشنی سے چمک رہے تھے۔ ان کے چہروں کی جگہ تین سوراخ تھے۔ دو آنکھوں کی جگہ اور ایک منہ کے مقام پر، اور ان سوراخوں کے پیچھے بہت ہی خوفناک آنکھیں روشن نظر آرہی تھیں۔

اچانک ایک ہیولا بول اٹھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی آواز شبانہ سے مشابہت رکھتی تھی۔

''آج تمہیں اپنے انجام سے کوئی نہیں بچاسکتا ثریا۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے دولت کے لالچ میں تین بے گناہوں کا خون کیا ہے۔''

''خون۔'' ثریا چیخی۔ ''نہیں، میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ یہ سارا کچھ عمران کا کیا دھرا ہے۔''

اسی وقت سردار بیگم صاحبہ شمع دان ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے باہر آچکی تھیں۔

''ہوش میں آؤ ثریا۔'' انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''کیا بکواس کررہی ہو؟''

''امی مجھے بچائیے۔'' ثریا اُن کی طرف لپکی۔ ''یہ روحیں مجھے مار ڈالیں گی۔''

''یہ روحیں نہیں، کسی طرح کی شرارت ہے۔'' بیگم صاحبہ بولیں اور گھور کر میری طرف دیکھا۔

''سردار بیگم اب تمہارا انجام بھی قریب آپہنچا ہے۔'' دوسرے ہیولے نے کہا۔ ''تم نے اپنے بیٹے کی سازش میں اس کا ساتھ دیا ہے۔''

بیگم صاحبہ چونک گئیں۔ پہلی مرتبہ اُن کے چہرے پر حیرت اور قدرے خوف کے تاثرات ظاہر ہوئے کیونکہ دوسرے ہیولے کی آواز ہوبہو شازیہ کی آواز لگ رہی تھی۔

''عمران کو ذمے دار ٹھہرا کر تم اپنے آپ کو نہیں بچا سکتیں ثریا۔'' پہلا ہیولا بدستور ثریا کو گھور رہا تھا۔ ''وہ تمہاری آمادگی اور تعاون کے بغیر اتنی بڑی سازش نہیں کرسکتا تھا۔''

''میں مجبور ہوگئی تھی۔'' ثریا جیسے کراہ کر بولی۔ ''مجھے

اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر اس نے دھوکے سے میری آبرو برباد کردی، میری تصویریں کھینچیں اور پھر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ مجھے ساری دنیا میں ذلیل کردے گا۔ میری کہیں شادی نہ ہوسکے گی۔ اس کے برعکس اگر میں اس کا ساتھ دوں تو وہ...... وہ راستے کی تمام رکاوٹیں دور کردے گا اور پھر ابا جان کی لاکھوں، کروڑوں کی جائداد کے ہم تنہا مالک ہوں گے۔ اسی نے مجھے وہ زہر لا کر دیا تھا جو پنڈی میں، میں تمہیں دیتی رہی، مگر بھائی رحیم داد کی موت کے بعد میں ڈرگئی۔ مجھ سے تمہاری حالت نہ دیکھی گئی اور میں نے مزید زہر دینے سے انکار کردیا۔ اس پر عمران نے نرس شازیہ کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔ یہ تمہارے ساتھ اگر شازیہ کی روح ہے تو تم اس سے پوچھ سکتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ ؟''

''مگر عمران تو رحیم داد کے ساتھ کار کے حادثے میں مرچکا تھا؟''

''نہیں، وہ زندہ ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن رات کو ایک دو بجے کے درمیان مجھ سے ملنے آتا ہے۔'' ثریا بولی۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ حادثے کے وقت وہ کار میں نہیں تھا، اسے صرف بھائی جان اکیلے ہی چلا رہے تھے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے بھائی جان کو پہلے ہی مار کر ان کی لاش کار میں رکھ کر کار کو گہرے کھڈ میں گرا دیا ہوگا، تاکہ ایک طرف بھائی جان کا قصہ پاک ہوجائے اور دوسری طرف خود کو بھی پولیس کی نظروں میں آنے سے بچا لے گا۔ نرس شازیہ کو بھی اسی نے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر چھت سے لٹکایا تھا۔ شازیہ اپنی خاموشی کے لیے بہت بڑی رقم کا مطالبہ کررہی تھی اور مجھے شک ہے کہ اسی نے شازیہ کی لاش بھی غائب کردی۔ آپ شروع سے اس کا ہدف تھیں مگر نہ جانے کس طرح ڈاکٹر جمال کو زہر دینے کے طریقے کا پتا چل گیا اور ان کی وجہ سے آپ کی جان بچ گئی، لیکن پھر عمران نے آخرکار چھت پر لگے ہوئے ریلنگ کے پائپ کو ساکٹ سے ڈھیلا کرکے آپ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور.....''

''میں کہہ رہی ہوں، بکواس بند کرو۔'' سردار بیگم اتنی دیر میں خود پر قابو پاچکی تھیں۔ ''عمران کار کے حادثے میں مرچکا ہے، شازیہ اور شبانہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ جو کچھ ہورہا ہے، ڈاکٹر جمال کی سازش ہے۔ غالباً یہ سردار (مرحوم) کے خاندانی دشمنوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور وہ لوگ ایک مدت سے اس کوشش میں ہیں کہ سردار (مرحوم) کی اپنی اولاد میں سے کوئی باقی نہ بچے تو ساری جائداد اور بے شمار دولت اُن کے ننھیالی عزیزوں میں منتقل ہوجائے۔''

''بیگم صاحبہ! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔'' میں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ اس پورے منصوبے میں، میں ابھی تک یہ معلوم نہیں کرسکا کہ اس میں آپ کا حصہ کس قدر تھا اور کب سے تھا لیکن عمران زندہ ہے، یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے اُسے راتوں کو دو تین مرتبہ آپ کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ رہا شبانہ اور شازیہ کا معاملہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں ان کی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ نقاب پوش روحیں نہیں بلکہ خود شبانہ اور شازیہ ہیں۔ ان کے اس بھیس میں آنے کا مطلب ثریا سے اعتراف کرانا تھا اور وہ مقصد حاصل ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ عمران زیادہ دیر قانون سے نہیں بچ سکے گا۔'' میں نے ابھی اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ راہداری میں، جہاں ہم سب اس وقت موم بتیوں کی روشنی میں اس داستان کا آخری ایکٹ پیش کررہے تھے۔

دفعتاً ملکہ کی میاؤں گونجی اور اس کے ساتھ ہی وہ پتا نہیں کس طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آگئی۔ اس کا رخ سردار بیگم کی طرف تھا۔ بیگم صاحبہ اسے دیکھتے ہی گھبرا کر یوں پیچھے ہٹیں جیسے کسی نے ان پر مہلک ہتھیار سے وار کیا ہو، مگر ملکہ، اس وقت غیظ و غضب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ غرا رہی تھی اور اس کے جسم کے سارے بال کھڑے ہوچکے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک زوردار جست لگائی اور ٹھیک بیگم صاحبہ کے سر پر گری۔ وہ انہیں پنجوں سے بری طرح نوچ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ چیخیں مارتی جارہی تھیں اور اس سے بچنے کی کوشش بھی کررہی تھیں۔ شمع دان ان کے ہاتھ سے گرچکا تھا۔ اسی لمحے ملکہ نے ایک پنجہ بیگم صاحبہ کے سر پر مارا تو ہمیں یوں لگا جیسے ان کی کھوپڑی ٹوٹ کر ملکہ کے پنجوں میں آگئی ہو، مگر ایسا نہیں تھا۔ صرف ان کے سر پر مضبوطی سے جمی ہوئی مصنوعی بالوں کی وگ ہی الگ ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت بجلی آگئی اور راہداری میں جلتے ہوئے تیز بلبوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے عمران، انتہائی خوف زدہ عالم میں کھڑا ہوا پلکیں جھپکا رہا تھا۔

دوسروں کے جذبات اور ردِعمل کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے مگر میں اپنے طور پر زیادہ حیران نہیں تھا۔ مجھے کسی ایسے ہی انکشاف کی توقع تھی۔

میں نے یہ آواز بلند کہا۔ ''انسپکٹر سلطان شاہ! اب آپ اپنی کمین گاہ سے نکل کر قاتل کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال سکتے ہیں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔''

سلطان شاہ دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک قریبی

کمرے میں پوشیدہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی اب تک کا تمام ڈراما دیکھتے اور سنتے رہے تھے۔ شبانہ کے حادثے کی تحقیقات کے بعد جب وہ بنگلے سے واپس جارہا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ رات کے ٹھیک بارہ بجے بنگلے پہنچ کر اس کمرے میں چھپ کر بیٹھ جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر حقیقی مجرم کو پکڑ سکتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا تھا مگر اس وقت عمران کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتے ہوئے اس کی ساری برہمی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اتنی پھرتی سے کام لے رہا تھا جیسے کم وقت میں مجرم کو ہتھکڑی پہنانے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتا ہو۔

☆☆☆

دوسرے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی عمران نے اپنی مکمل سازش کا اعتراف کرلیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بات سے اتنا خوف زدہ نہیں جتنا ملکہ سے ہے۔ جب سے اُسے گرفتار کیا گیا تھا تو وہ مسلسل یہی چیخ رہا تھا کہ خدا کے لیے اس شیطانی بدروح کو یہاں سے لے جاؤ، اس سے میرا پیچھا چھڑا دو، میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔ پھر اس نے اپنے اقبالی بیان میں اعتراف کیا کہ اسے سردار جہاں داد (مرحوم) اور ان کے پورے خاندان سے نفرت تھی۔ وہ اپنی ماں سے بھی نفرت کرتا تھا۔ جس کی جوانی کی لغزشیں اسے کوٹھے تک لے گئیں اور اس نے اپنا مستقبل بچانے کے لیے اسے اپنے سوتیلے باپ کا خدمت گار بنا دیا۔

اس نے اپنی ماں سے بارہا کہا کہ وہ سردار (مرحوم) کے وارث جائداد کو بچپن ہی میں زہر دے، دے یا کہیں پھنکوا دے تاکہ سردار صاحب اسے اپنی جائداد کا وارث بنانے پر مجبور ہو جائیں لیکن ماں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس پر اس نے خود ہی تمام مال وجائداد پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنائی۔

اس کا ارادہ تھا کہ جب رحیم داد تعلیم کے لیے امریکا روانہ ہوگا تو وہ کہیں راستے میں ہی اس کا کام تمام کردے گا مگر سردار (مرحوم) نے امریکا جانے سے قبل رحیم داد کی شادی کردی اور اس کے نتیجے میں شبانہ کی کوکھ میں ایک اور وارث جائداد پرورش پانے لگا۔ اب رحیم داد کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا، چنانچہ اس نے ایک خاص زہر کی مدد سے شبانہ کو آہستہ آہستہ قبر میں پہنچانے کا انتظام کرلیا۔ اس دوران اس نے ثریا کو بھی اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ یہاں اس کی ماں ایک بار پھر آڑے آئی اور اس نے صحت یابی کے لیے شبانہ کو مری روانہ کردیا۔ رحیم داد کو بھی تار دے دیا۔

ماں کی اس حرکت سے اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اس رات جبکہ رحیم داد خان امریکا سے راولپنڈی پہنچا۔ اپنی ماں، رازدار ملازمہ اور رحیم داد، تینوں کو قتل کردیا۔ اس نے ملکہ بلی کو بھی زہر دے دیا تھا لیکن جب وہ ان سب کی لاشیں حویلی کے پائیں باغ میں دفن کرنے لگا تو ملکہ کی لاش غائب ہوگئی۔ تب ہی سے اس کے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا مگر اس نے اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ صورت وشکل اور قدوقامت میں وہ اپنی ماں سے بہت مشابہ تھا۔ حد یہ کہ آواز بھی بڑی حد تک ملتی تھی۔ چنانچہ اس نے بالوں کی وگ لگا کر خود اپنی ماں کی شخصیت اختیار کرلی۔ کار میں مری روانہ ہوا۔ بھارہ کہو اور چھتر پارک تک وہ اپنی شکل میں رہا۔ پھر خالی کار کو ایک گہرے کھڈ میں گرا کر، جہاں اسے معلوم تھا کہ نیچے جا کر تحقیق کرنا ناممکن ہوگا اور خود سردار بیگم بن کر مری آگیا۔

یہاں ثریا، رحیم داد کی موت سے اس قدر خوف زدہ ہوگئی کہ اسے شبانہ کو برابر زہر دیتے رہنے کے لیے نرس شازیہ کو رازدار بنانا پڑا۔ البتہ اس نے یہ بات ثریا کو بھی نہیں بتائی تھی کہ اپنی ماں کے میک اپ میں وہ خود موجود ہے۔ سب کچھ بہت اچھی طرح ہورہا تھا کہ اس کی بدقسمتی، ملکہ اور ڈاکٹر جمال کے بھیس میں بنگلے میں داخل ہوئی اور اس کے بعد ہر کام بگڑتا چلا گیا۔ وہ ملکہ کو دیکھ کر ڈر گیا تھا پھر بھی اس نے اسے دو مرتبہ مارنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں مرتبہ مرگئی لیکن چونکہ شیطانی روح تھی اس لیے مر کر زندہ ہوتی رہی۔ نرس شازیہ نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ اس نے اسے رسی سے گلا گھونٹ کر ماردیا۔ شبانہ کو چھت سے کھڈ میں گرادیا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ دونوں بچ کس طرح گئیں؟ شازیہ کی لاش غائب ہونے پر وہ بہت گھبرا گیا تھا مگر چونکہ پولیس نے اس سلسلے میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی، اس لیے وہ مطمئن ہوگیا تھا۔ اگرچہ اس کے ذہن میں یہ خوف بری طرح جاگزیں ہو چکا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ ملکہ کی بدروح کررہی ہے لیکن اتنی دور آنے کے بعد اس کے لیے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس نے تخت یا تختہ جان کر شبانہ کو ٹھکانے لگا دیا۔ مگر وہ بدروحوں سے کیسے لڑ سکتا تھا۔ وہ ہار گیا اور اب ظاہر ہے کہ اس کے نصیب میں پھانسی کے تختے کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ گیا ہے۔

عمران کے اقبالی بیان سے تمام گتھی بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی، مگر میں جانتا تھا کہ شبانہ، ڈاکٹر ہاشمی، ثریا اور سب سے زیادہ انسپکٹر سلطان شاہ ابھی کئی باتوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ شبانہ، ثریا، ڈاکٹر ہاشمی کو سلطانی گواہ بنا لیا گیا تھا۔

چنانچہ اس دن صبح جبکہ شبانہ، ثریا خانم اور دلبر بابا واپس

راولپنڈی روانہ ہو رہے تھے۔ مجھے ان سب کے سامنے کچھ وضاحتیں کرنا پڑیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے تھوڑا بہت ہپناٹزم میں دخل ہے۔ (اس کی تائید ڈاکٹر ہاشمی نے کی) اپنی اس صلاحیت سے کام لے کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شازیہ، عمران کا فراہم کردہ زہر کتابوں کے اوراق پر لگا کر شبانہ کو پڑھنے کے لیے دیتی ہے (قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ یہ سو فیصد حقیقت نہیں تھی، مجھے محض اتفاقیہ طور پر اس کا علم ہوا تھا) چنانچہ میں نے اس کی لائی ہوئی کتابیں واپس کرا دیں اور خود کتابیں لا کر دینے لگا۔ پھر جس رات عمران نے شازیہ کو مارنے کی کوشش کی۔ تو میں حسنِ اتفاق سے عین وقت پر پہنچ گیا۔ میں نے اسے بچا لیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ اگر درست بیان دے گی تو عمران ہوشیار ہو جائے گا۔ اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ہے کہاں، اگرچہ یہ شبہ ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ وہ کار کے حادثے میں نہیں مرا۔ چنانچہ میں نے شازیہ کو ہپناٹزم سے مسحور کر کے اس سے وہ بیان دلوایا جس سے آپ واقف ہیں۔ عمران یہ سمجھا تھا کہ موت کے قریب پہنچ کر شازیہ ہذیان بک رہی ہے۔ چنانچہ وہ بھی مطمئن رہا۔ جب شازیہ بیان دے چکی تو میں نے ہپناٹزم سے اس پر مصنوعی موت طاری کر دی۔ عمران پہلے ہی فون کے تار بنگلے کے باہر سے کاٹ کر رابطے کا یہ ذریعہ بیکار کر چکا تھا۔ اس لیے شازیہ کی لاش صبح تک کے لیے کمرے میں بند کر دی گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے، اس لیے سب کے سونے کے بعد اس کی لاش کمرے سے نکال کر بیگم صاحبہ کی کار میں ڈال کر اپنے مری والے گھر لے گیا۔ (میرے پاس کار کی چابی نہیں تھی یکار کا اسٹارٹ ہو جانا میری ذہنی اور بصری قوت کا کمال تھا) جہاں وہ اپنے نمودار ہونے کے دن تک رہی اور میرا وفادار ملازم اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ میں نے شازیہ کو بتا دیا تھا کہ اس کی سلامتی اسی بات میں ہے کہ وہ اصل مجرم کو پکڑنے میں میرا ساتھ دے اس طرح شاید قانون اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرے۔

رہا شبانہ خاتون کا معاملہ تو ابھی ان کی قسمت میں موت نہیں تھی۔ اتفاق سے وہ جب اوپر سے گریں تو کھڈ کی ڈھلان پر اُگے ہوئے ایک درخت میں اُلجھ کر گہرائی میں گر کر مرنے سے بچ گئیں۔ چنانچہ میں شازیہ کی طرح انہیں بھی اپنے گھر لے گیا۔

اس سے قبل ایک رات کو میں عمران اور ثریا کی باتیں سن چکا تھا۔ عمران کے جانے کے بعد میں نے ثریا کو ہپناٹائز کیا اور اس پلان میں جو کچھ اس کا کردار تھا وہ معلوم کر لیا۔ اس سے پہلے وہ چونکہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی، اس لیے مجھے اس پر مکمل طور پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جب انسپکٹر سلطان شاہ بنگلے سے واپس چلا گیا تو میں سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ شبانہ کو بھی تمام حالات بتائے اور کہا کہ آج کی رات ہی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جانا چاہیے۔ میں نے ان دونوں کو روحوں کا کردار ادا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ انسپکٹر سلطان شاہ کو میں پہلے ہی بارہ بجے آنے کی دعوت دے چکا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔

☆☆☆

میری باتوں سے پتا نہیں ان سب کی خصوصاً انسپکٹر سلطان شاہ کی تسلی ہوئی یا نہیں، لیکن ایک بات ایسی تھی جس کا جواب مجھ سمیت کسی کے پاس نہیں تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے جی ہاں۔ اس سوال کا تعلق 'بلی ملکہ' سے ہے۔ اس رات عمران کو بے نقاب کر کے وہ ایک بار پھر غائب ہو گئی تھی اور آج تک اسے گھر کے یا اس واقعے سے متعلق کسی فرد نے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اسے پنڈی میں بھی زہر دیا گیا تھا مگر وہ مری نہیں اور غائب ہو گئی۔ پھر وہ بغیر کسی کے ساتھ آئے ہوئے مری میں، میرے راستے میں نمودار ہوئی۔ مجھے ڈاکٹر ہاشمی کے گھر تک لے گئی اور اس دوران عام بلیوں کی طرح کھاتی پیتی رہی۔ ڈاکٹر ہاشمی کے ذریعے میں اور ملکہ سردار (مرحوم) کے بنگلے تک پہنچے، وہاں اسے ایک بار پھر زہر دیا گیا مگر وہ پھر بھی زندہ رہی۔ تیسری مرتبہ اسے زہریلے بچھوؤں سے ڈسوایا گیا لیکن وہ زندہ ہو گئی اور جب اسے گھر سے زبردستی نکالنے کی کوشش کی گئی تو غائب ہو گئی۔ اس کے بعد بنگلے میں اس کی آوازیں بھی سنائی دیں مگر وہ خود کسی جگہ نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ آخری شب جب واقعات اپنے کلائمکس کو پہنچ چکے تھے، وہ اچانک کہیں سے نمودار ہوئی اور عمران کو بے نقاب کر کے پھر غائب ہو گئی۔ اس ہنگامہ پرور ماحول میں مجھ سمیت کسی نے بھی اُسے جاتے نہیں دیکھا۔ تب سے اب تک میں اس کی مختلف توجیہات سوچ چکا ہوں، مگر کوئی بھی توجیہہ مجھے مطمئن نہیں کر سکی۔ ہاں مجھے اس کہاوت یا روایت پر بالکل بھی اعتقاد نہیں ہے کہ بلی کو قدرت نے نو مرتبہ زندہ ہونے کی قوت یا صلاحیت دی ہے اس لیے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات میں بہت ہی پُراسرار باتیں اور واقعات ایسے ہیں جہاں اتنی ترقی کے باوجود ابھی تک انسانی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ غالباً ملکہ بھی کوئی اسی طرح کا راز تھی۔

سرورق کی پہلی کہانی

مظلوم ظالم

اسما قادری

پریشانیاں اور الجھنیں زندگی کے ساتھ ہیں۔ انسان ان کے حل اور بچائو کا تدارک کرتا ہے... مگر کچھ الجھنیں انسان کی خود پیدا کردہ ہوتی ہیں... ان مشکلات اور الجھنوں کا جنم خواہشات کے بے ہنگام ریلے سے ہوتا ہے... کہا جاتا ہے کہ خواہشات کے دریا میں طغیانی آجائے پھر خود پر اختیار نہیں رہتا... اس کا تیز رفتار بہائو اپنے ساتھ عقل و شعور کو بھی بہالے جاتا ہے اور وہ اچھے بُرے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے... محرومیوں سے دوچار ایک ایسے ہی کردار کا ماجرا... اس کے بہکے ہوئے قدموں نے اس کے ساتھ ساتھ خاندان کے باقی افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

زندگی کی باریکیوں اور رازوں میں گم کرداروں کے سنسنی خیز انکشافات

سیاہ چمچماتی ہوئی مرسڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس سے بھی زیادہ چمچماتی ہوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت کو قدرت نے حسن کی جس نعمت سے نوازا تھا وہ اپنی جگہ تھی لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ حسن کی اس نعمت کو بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی جلد، کمان سے ابرو، سنہری اور براؤن امتزاج میں نہایت مہارت سے رنگے ہوئے بال، شفاف ہاتھ پاؤں اور خوب صورتی و ترتیب سے تراشے ہوئے ناخن گواہی دے رہے تھے کہ وہ باقاعدگی سے کسی بہت عمدہ اور مہنگے پارلر کی خدمات حاصل کرتی رہی ہے۔

اوپر والا حسن کی دولت سے بہت سوں کو نوازتا ہے لیکن نچلے اور متوسط طبقے کی خواتین میں سے بہت محدود تعداد ہی اس دولت کو سنبھال پاتی ہے۔ وسائل کے مقابلے میں مسائل کی بہتات انہیں فرصت ہی نہیں لینے دیتی کہ وہ دولتِ حسن کی حفاظت کے لیے عملی اقدامات کرسکیں یوں یہ دولت جوانی کے چند سال سرکتے ہی ان کے ہاتھوں سے پھسلنے لگتی ہے۔

مرسڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ پر جو عورت بیٹھی تھی، وہ فی الحال جوان ہی تھی اور اس کے وسائل کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ وہ آئندہ بھی کئی برسوں تک جوان ہی رہے گی۔ وہ اس طبقے کی نمائندہ عورت نظر آتی تھی جو جوانی کو طویل مدت تک ٹھہرائے رکھنے کا ہنر جانتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں اس امر کی طاقت رکھتی ہیں۔ حسن اور دولت کے ساتھ عورت کو ان چیزوں کو سنبھالنے کا سلیقہ بھی ہو تو وہ دو آتشہ بن جاتی ہے۔ مرسڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی عورت کو یقیناً یہ ہنر آتا تھا۔ گرم موسم کی مناسبت سے اس نے ہلکے رنگوں کے امتزاج کا لان کا ایمبرائیڈڈ سوٹ پہن رکھا تھا جو ان ڈیزائنرز سوٹس میں سے تھا جن کی قیمت عموماً ایک سفید پوش شخص کی ماہانہ تنخواہ جتنی یا کچھ کم و بیش ہوتی ہے۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے اس نے بہت ہی ہلکے میک اَپ کا استعمال کیا تھا۔ حقیقتاً یہ میک اپ ایسا تھا کہ دیکھنے والی آنکھوں کو اس کے ہونے یا نہ ہونے کے درمیان شبہ ہی رہتا کہ آیا جو نظر آرہا ہے وہی اصل ہے یا کچھ ملمع کاری بھی کی گئی ہے۔ اس نے سائز اور وزن کے اعتبار سے بہت ہلکی لیکن حقیقتاً بیش قیمت ہیرے جڑی جیولری پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر براؤن رنگ کے امپورٹڈ سن گلاسز چڑھے ہوئے تھے اور بہت مہارت سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اپنی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چھ سالہ بچے سے گفتگو

میں مصروف تھی۔ بچے سے اس کی گفتگو کا انداز دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ بچہ اس کی زندگی میں بہت اہم مقام رکھتا ہے اور وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی ہے۔ بچہ بھی اس کی معیت میں بہت خوش اور شاداں وفرحاں نظر آ رہا تھا اور بہت جوش وخروش سے اسے اپنے اسکول میں گزرے وقت کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔

''سب باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمہارا سائنس کا ٹیسٹ کیسا ہوا؟ تم ہیومن آئی کی ڈایا گرام بنانے میں بہت پریشان ہو رہے تھے۔ ٹیسٹ میں وہ ڈایا گرام تو ٹھیک سے بن گئی تھی یا نہیں؟'' اس نے نرمی اور محبت سے بچے سے دریافت کیا۔

''وہ تو ایک دم فرسٹ کلاس بنی ہے مام! اس پر مجھے ایکسیلنٹ بھی ملا ہے۔ رکیں میں آپ کو دکھاتا ہوں۔'' بچہ بیگ کھول کر اس میں سے اپنی ٹیسٹ کاپی نکالنے لگا۔ کاپی نکال کر اس نے ڈایا گرام والا صفحہ کھولا اور اس کے سامنے کیا۔ وہ کم رفتار سے اور محتاط ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ایک نظر کاپی کے کھلے صفحے پر ڈالی اور وہاں موجود ایکسیلنٹ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''مجھے معلوم تھا کہ میرا بیٹا ایکسیلنٹ ہی لے گا۔ میرے بیٹے جیسا جینئس اور بریلینٹ بچہ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس کے لہجے میں وہی یقین اور فخر تھا جو ہر ذہین بچے کی ماں کے لہجے میں خود بخود ہی در آتا ہے۔ بچہ اس کے الفاظ پر کھلکھلا کر ہنس دیا اور کاپی واپس بیگ میں رکھنے لگا۔

''اس کامیابی پر فوری طور پر آئسکریم کھانا تو تمہارا رائٹ بنتا ہے۔ میں ابھی تمہیں تمہاری پسند کی آئسکریم دلا سکتی ہوں لیکن شرط یہ ہو گی کہ تم گھر پہنچ کر اپنا لنچ گول نہیں کرو گے۔''

''بالکل نہیں کروں گا مام پر اس بس آپ جلدی سے مجھے آئسکریم دلا دیں۔'' بچہ فوراً ایکسائٹڈ ہو گیا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے ایک اشارے پر مہنگی سے مہنگی شے اس کے سامنے حاضر ہو جاتی تھی لیکن طبیعت کی نازک مزاجی کی وجہ سے کھانے پینے کے معاملات میں اس پر بہت سی پابندیاں عائد کرنی پڑتی تھیں۔ آئسکریم بھی ان اشیا میں سے ایک تھی جنہیں کھانے سے وہ اکثر گلے کی خرابی یا نزلہ زکام میں مبتلا ہو جاتا تھا اور اسے اس کی یہ پسندیدہ شے بہت دیکھ بھال کر مہیا کی جاتی تھی۔ آج بھی یہ عنایت شاید اس لیے کی گئی تھی کہ پچھلے پندرہ دنوں میں وہ صحت کے کسی مسئلے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اور موسم بھی گرم تھا جس میں ٹھنڈی اشیا کے استعمال سے بیمار پڑنے کا کم ہی احتمال ہوتا ہے۔

''ٹھیک ہے میں راستے میں کسی مناسب شاپ پر گاڑی روک لوں گی۔ تم وہاں سے اپنی فیورٹ آئسکریم لے لینا۔'' اس کی یقین دہانی پر عورت نے آئسکریم دلانے کا پروگرام فائنل کر دیا۔

''آئسکریم بار پر چلتے ہیں نا مام۔ وہاں بیٹھ کر آئسکریم کھانے میں زیادہ انجوائے منٹ ہوتی ہے۔'' موقع دیکھ کر بچے نے ایک اور فرمائش کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔

''نو سویٹ ہارٹ! آج لنچ پر تمہارے پاپا گھر آنے والے ہیں اور ظاہر ہے ہمیں انہیں جوائن کرنا ہے اس لیے ہم آئسکریم پارلر پر رک کر لیٹ نہیں ہو سکتے۔ تم راستے سے آئسکریم لے لینا اور گاڑی ہی میں بیٹھ کر کھا لینا۔'' عورت نے پیار سے اسے سمجھایا تو اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ زیادہ ضد کرنے والا بچہ نہیں تھا اور اس کی بات تو فوراً ہی مان لیتا تھا۔ اسے بچے کی یہ فرمانبرداری ہمیشہ قابلِ فخر محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے آسانی سے راضی ہو جانے پر کھل کر مسکرائی اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھاتی رہی۔ اپنی رہائش گاہ سے چند بلاک پہلے اس نے ایک معیاری کولڈ شاپ کے قریب گاڑی روک لی۔ گاڑی رکتے ہی بچہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''ایک منٹ جانو! میں بھی آرہی ہوں۔'' اس نے بچے سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے کے لیے پیر باہر نکالا لیکن اس کا شیفون کا مہین سا دوپٹا دونوں سیٹوں کے درمیان کہیں اٹک گیا تھا۔ وہ جھک کر احتیاط سے دوپٹا نکال رہی تھی کہ اس نے کتے کے بھونکنے کی خوفناک آواز سنی۔ وہ سٹپٹا کر سیدھی ہوئی۔ بچہ اس کی ہدایت کے باوجود گاڑی سے چند قدم آگے جا چکا تھا۔ فرمانبردار ہونے کے باوجود بہرحال وہ تھا تو بچہ ہی جسے اپنی پسندیدہ شے کے حصول کے لیے بہت بے چینی تھی اور یہ بے چینی ہی اسے گاڑی سے ذرا آگے لے گئی تھی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز بچے نے بھی سن لی تھی اور گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گیا کہ کتا اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور اسی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ بچاؤ کی فطری خواہش کے تحت وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گاڑی اور کولڈ شاپ دونوں ہی کے دروازے بند تھے اس لیے بچہ بے اختیار ہی آگے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک سروس روڈ تھی جس پر گاڑیاں بہت کم ہوتی تھیں اور دوپہر کے اس وقت تو روڈ تقریباً سنسان ہی پڑی تھی۔ وہ جو دوپٹا نکالنے کے لیے بائیں پہلو پر ذرا سا جھکی ہوئی تھی اس منظر کو دیکھ کر بوکھلا گئی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں دوپٹا اسی جگہ اٹکا چھوڑ کر تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی۔ باہر نکلتے ہی وہ اس سمت دوڑنے لگی جس سمت میں بچہ اور اس کے پیچھے کتا بھاگا تھا لیکن وہ چند قدم سے زیادہ آگے نہیں بھاگ سکی۔ اس کے پیروں میں لمبی ہیل کی نازک سی سینڈلیں تھیں جو بھاگنے میں مزاحم ہو

گئیں اور وہ توازن بگڑ جانے کے باعث بری طرح روڈ پر گر گئی۔ گرنے سے اس کی دائیں ہتھیلی اور کہنی پر چوٹیں لگیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ کھڑے ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کی ایک سینڈل کا نازک اسٹریپ ٹوٹ چکا ہے اور وہ اس سینڈل کو پیر میں پہن کر نہیں بھاگ سکتی۔ اس نے پھرتی سے دونوں پیروں کو سینڈلوں کی قید سے آزاد کیا اور ننگے پیر ہی اس سمت بھاگنے لگی جہاں اس نے ایک گلی کے کونے سے بچے، کتے اور پھر ان کے پیچھے ایک موٹر سائیکل سوار کو گلی میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔ گرم دوپہر میں ننگے پیر سڑک پر دوڑنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے تلوے جھلسنے لگے تھے لیکن اس نے پروا نہیں کی اور دوڑتی چلی گئی۔ وہاں موجود اکا دکا راہ گیر بھی اس منظر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک عورت وہ بھی بہت حسین، مشکل سے دوچار نظر آرہی تھی اور وہ اس کی مدد کی کوشش نہ کرتے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی دوڑنے لگے لیکن مطلوبہ گلی تک پہنچ کر وہ سب ہی دم بخود رہ گئے۔ گلی بالکل خالی پڑی تھی اور وہاں بچے اور کتے سمیت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

''کیا ہوا میڈم! کیا مسئلہ ہے؟'' ایک نوجوان نے عورت سے دریافت کیا۔

''وہ...... وہ میرا بیٹا......'' اس کے لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے اور وہ ایک بار پھر سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ بھاگتے ہوئے اس نے پوری گلی طے کر لی اور دوسری سمت نکل کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں بھی کچھ ایسا نہیں تھا جس سے بچے کا پتا مل پاتا، وہ مزید بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔

''آپ ٹھیک سے بتائیں میڈم! پرابلم کیا ہے؟'' نوجوان جو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا گلی کے اس سرے پر بھی پہنچ گیا تھا اس سے پوچھنے لگا۔ اس نے دہشت زدہ سے لہجے میں مختصراً اسے واقعے سے آگاہ کیا۔

''کمال ہے۔ اتنی سی دیر میں بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ بچے یا کتے میں سے کسی کو تو دکھائی دینا چاہیے تھا۔ آپ ٹھہریں میں آس پاس بچے کو تلاش کرتا ہوں۔'' نوجوان کا جذبۂ ہمدردی عروج پر تھا۔

''میں اپنی گاڑی لے کر آتی ہوں۔ گاڑی میں ڈھونڈنا آسان رہے گا۔'' وہ متوحش سی واپس پلٹی اور پہلے ہی کی طرح ننگے پیر دوڑتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف جانے لگی۔ اس کی دیوانگی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ

بچے کی ماں ہے اور بچے کے غیاب پر شدید بوکھلاہٹ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ نوجوان سمیت اس کے پیچھے آنے والے دو مزید راہ گیروں نے ترحم سے اس ثروت مند عورت کو دیکھا جس کے پیر چپلوں سے محروم تھے اور توے کی طرح تپتی سڑک اس کے پیروں کو جھلسا رہی تھی پھر بھی وہ رکے بغیر دوڑتی جا رہی تھی۔ اس نے سڑک پر پڑی اپنی ٹوٹی ہوئی سینڈلوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور سیدھی گاڑی تک پہنچ گئی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیونگ سیٹ والی طرف کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی چلنا شروع کرتی اس سے قبل ہی ڈیش بورڈ پر رکھا اس کا اسمارٹ فون بجنے لگا۔ اس نے جیسے غیر ارادی طور پر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھے بغیر ہی کال ریسیو کرلی۔

”زیادہ بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی اپنے گھر جاؤ اور اپنے شوہر سے کہو کہ ہمارے فون کا انتظار کرے۔“ دوسری طرف سے نہایت سرد لہجے میں اسے یہ حکم دے کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ جیسے اپنی جگہ ساکت ہوگئی لیکن پھر اس کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسے فون کرنے والے کے حکم کی تعمیل کرنی ہو گی۔ وہ بہت شکست خوردہ سے انداز میں گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر کی سمت چل دی۔

☆☆☆

”تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تم وہی جواد ہو جسے میں دس سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ دس سال پہلے جب میں کینیڈا گیا تھا تو تم اچھے خاصے ہینڈسم اور صحت مند آدمی ہوتے تھے لیکن ان دس سالوں میں تمہارا جو حال ہوا ہے اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں دس کے بجائے بیس پچیس سال بعد تم سے مل رہا ہوں۔ ابھی تم پورے پچاس سال کے بھی نہیں ہوئے ہو لیکن تمہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال سے اوپر کا آدمی میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ تم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہو وہاں ساٹھ پینسٹھ سال والے بھی مشکل سے پچاس پچپن کے دکھائی دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے ان برسوں میں اپنی صحت کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا اور خود کو تباہ کرتے رہے ہو۔“ وہ دو افراد ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور ان میں سے جو زیادہ خوش شکل، صحت مند اور کم عمر دکھائی دے رہا تھا وہ اپنے سامنے والے سے مخاطب تھا۔ اس کا نام مراد رضا تھا اور وہ جواد احمد کا دور طالب علمی کا دوست تھا۔ جواد احمد ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں جبکہ رضا مراد کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ طبقاتی فرق کے باوجود دونوں میں اچھی دوستی تھی اور اس کا واحد سبب یہ تھا کہ دونوں ہی بہت اچھے طالب علم تھے۔ دور طالب علمی کے بعد بھی ان کی دوستی قائم رہی اور طبقاتی فرق بھی۔ جواد نے اپنے والد کا کاروبار سنبھال لیا اور ایک اور ایک گیارہ بنانے لگا جبکہ مراد نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت اختیار کرلی جو اس کے والدین اور اعزاء کے مطابق بہت اچھی ملازمت تھی چنانچہ ملازمت کے دو سال بعد ہی اس کے والدین کو اس کی شادی کا شوق چرایا اور ان کی خواہش پر مراد کے چچا نے اپنی خوب صورت وسلیقہ مند بیٹی خوشی خوشی ہونہار بھتیجے کے سنگ رخصت کردی۔ ادھر جواد نے تمام تر وسائل میسر ہونے کے باوجود شادی کا طوق گلے میں ڈالنا پسند نہیں کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال وہ آزاد رہ کر اپنی لائف کو انجوائے کرنا چاہتا ہے اور آزادی کا یہ دور اتنے لمبے عرصے پر محیط تھا کہ اس عرصے میں مراد تین عدد بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد مراد نے محسوس کیا کہ وہ اپنی اس ملازمت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو وہ زندگی نہیں دے سکتا جس کی اس کے دل میں خواہش ہے چنانچہ اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے شروع کردیے اور بالآخر کینیڈا کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے کینیڈا جانے سے کچھ عرصہ قبل ہی جواد نے بالکل اچانک شادی کا فیصلہ کرلیا اور اپنے والد کے ایک کاروباری دوست کی اکلوتی لندن پلٹ بیٹی شرمین عرف شیری کو اپنی شریک حیات بنا بیٹھا۔ مراد نے اس شادی میں شرکت کی تھی اور اعتراف کیا تھا کہ اگر جواد نے اتنے سال شادی کو ٹالا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ شیری جیسی کسی نایاب حسن کی مالک ہی سے شادی کا خواہش مند تھا اور اپنا جو ہر مراد سامنے آتے ہی اس نے شادی کرلی تھی۔ خود جواد بھی بہت شاندار شخصیت کا مالک تھا اور اس کی اور شیری کی جوڑی کو چاند سورج کی جوڑی کہا جاتا تو کچھ غلط نہیں ہوتا۔ جواد کی شادی اور اس کے کینیڈا روانگی میں اتنا کم وقفہ تھا کہ وہ خواہش کے باوجود جواد اور شیری کی دعوت نہیں کر سکا تھا۔ یہاں تک کہ شادی کے بعد اس کی جواد سے الوداعی ملاقات بھی نہیں ہوسکی تھی اور وہ بس فون پر ہی اسے ”بائے“ کہہ کر کینیڈا روانہ ہوگیا تھا۔ کینیڈا میں سیٹل ہونے اور بیوی بچوں کو اپنے پاس بلانے کی جدوجہد میں اسے دوستی نبھانے کی

مہلت بہت کم مل سکی بس چند مختصر دورانیے کی فون کالز کے ذریعے ایک دوسرے کی خیر و عافیت معلوم کرنے تک ہی دوستی کا رشتہ محدود رہا اور اس میں بھی زیادہ حصہ مراد ہی کا تھا۔ جواد تو جیسے اپنی زندگی میں مگن ہی ہو کر رہ گیا تھا اور اسے خود سے شاذ و نادر ہی یہ خیال آتا تھا کہ پردیس میں بیٹھے ہوئے دوست کا حال احوال معلوم کر لے۔ اس کے اس رویے پر مراد کے دل میں ہلکا سا شکوہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کی طرف سے بھی رابطے کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے یہ نوبت آگئی کہ پچھلے تین سال سے ان دونوں کے درمیان سرے سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا تھا۔ مراد چند دن قبل اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آیا تھا۔ دس سالوں میں اس نے پہلی بار پاکستان آنے کی زحمت کی تھی اس لیے آتے ہی وہ اور اس کی فیملی عزیز و اقارب کے ہجوم میں گھر گئی تھی اور ملاقاتوں اور دعوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اتنے برس پردیس میں کاٹنے والے مراد کو اس ہجوم سے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی اسی لیے آج وہ موقع دیکھ کر اکیلا ہی گھر سے نکل گیا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ اس سڑک پر نکل گیا جس پر جواد کی کمپنی کا ہیڈ آفس موجود تھا۔ بورڈ پر لکھا نام دیکھ کر اس کے دل میں اچانک ہی دوست کی محبت جاگ اٹھی اور اس نے جواد سے ملاقات کے ارادے سے اس کے آفس کا رخ کر لیا۔ جواد اس سے بہت گرم جوشی سے ملا اور یہ بتاتے ہوئے کہ وہ لنچ کے لیے گھر جا رہا ہے اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گیا۔ اسے جواد کو دیکھ کر دھچکا لگا تھا اور فوری طور پر تو نہیں لیکن اب اس کے ساتھ اس کے گھر میں بیٹھ کر وہ اس کی حالت پر تبصرہ کر رہا تھا۔ اس کا تبصرہ سن کر جواد عجیب سے انداز میں ہنسا پھر بولا۔

''ابھی تو تم مجھے بہت بہتر حالت میں دیکھ رہے ہو۔ تین سال پہلے میری حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی اور اگر مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا تو شاید آج میں تمہارے سامنے زندہ بھی نہ بیٹھا ہوتا۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم کسی بہت بڑی مشکل سے گزرے ہو؟ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے؟ تم نے تو کبھی مجھے اپنے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں بتائی۔'' مراد اس کے جواب پر چونک گیا اور بے چینی سے پوچھنے لگا۔ اتنے عرصے تک رابطے میں نہ رہنا الگ بات تھی لیکن ایک دوست کو دوسرے دوست کی تکلیف اور پریشانی کے خیال سے تڑپنا ہی چاہیے تھا۔

''بیماری ہی سمجھو، عشق سے بڑھ کر بھلا کون سی بیماری ہوتی ہے۔'' جواد اپنی بات کہہ کر گویا اپنے آپ پر ہی ہنسنے لگا۔

''عشق......؟ عشق تو تمہیں میرے سامنے ہی شرمین بھابی سے ہوا تھا اور تم نے ان سے شادی کر کے اپنے عشق کو پایۂ تکمیل تک بھی پہنچا دیا تھا تو پھر کسی محروم عاشق کی طرح اس حال تک پہنچنا چہ معنی دارد؟'' مراد کو حیرت ہوئی۔

''یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے چندا! یہاں کسی کے بھی ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے میرے عشق کی تکمیل نے ہی اس حال کو پہنچایا۔ شیری کتنی عجیب و غریب عورت تھی میں تمہیں الفاظ میں نہیں بتا سکتا اور کمال یہ تھا کہ مجھے اس عجیب عورت سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ اس محبت یا جنون ہی کا نتیجہ تھا کہ میں اس کے ساتھ اس کی رو میں بہتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ نے مجھے شراب سمیت ہر نشے کا عادی بنا دیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئی تھی اور وہاں سے ڈگری کے علاوہ جانے کون کون سی علتیں لے کر واپس لوٹی۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں اس نے ہپیوں کے ساتھ بھی کافی وقت گزارا تھا اور یقیناً اسی ساتھ نے اسے ان ساری علتوں میں مبتلا کیا تھا۔ بہرحال مجھ سے اس کی شادی ہوئی تو بجائے یہ کہ میں اسے ان برائیوں سے نجات دلانے کی کوشش کرتا وہ مجھے اپنے ڈھب پر لے آئی۔ اس نے مجھے باور کروایا کہ شراب اور ڈرگز ہمارے ساتھ کو اور بھی زیادہ پُرلطف اور پُرکیف بنانے والی چیزیں ہیں اور واقعی مجھے ایسا ہی محسوس ہونے لگا۔ زندگی کے کئی سال میں نے اسی رو میں بہتے ہوئے گزار دیے۔ ان برسوں میں شیری کی مرضی کے برخلاف اللہ نے ہمیں ایک بیٹا بھی دے دیا حالانکہ ہم دونوں ہی اس نعمت کے اہل نہیں تھے۔ شیری تو جیسے تیسے اس بچے کو دنیا میں لانے کی سزاوار ہی ٹھہری۔ میری ممی ہی نے گورنس کی مدد سے اس بچے کو پالا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اپنے سارے بگاڑ کے باوجود میری بزنس میں دلچسپی برقرار رہی حالانکہ میں اس عرصے میں شیری اور نشے کے سوا سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ تمہیں خود بھی اندازہ ہوگا کہ میں تم سے بھی اس طرح پیش نہیں آتا تھا جیسے آنا چاہیے تھا اور شاید اسی وجہ سے تم نے خود بھی مجھ سے رابطہ ختم کر لیا تھا۔ اس زمانے میں مجھے ان چیزوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ بس میں شیری اور اس کے عجیب و غریب مشاغل میں مگن تھا۔ شیری میری محبت کی معترف تھی لیکن اس کے اندر جانے کیسی بے

چینی اور بے قراری تھی جو اسے پُرسکون نہیں ہونے دیتی تھی اور سکون کے حصول کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ خود کو نشے میں ڈبونے کی کوشش کرتی تھی۔ ممی نے کئی بار مجھے سمجھایا۔ میری اور شیری کی روش پر ہمیں سرزنش کی، دوستوں سے مدد لینے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ شیری تو اس میدان میں پہلے ہی بہت آگے جا چکی تھی اور میں بھی اس کے پیچھے سرپٹ دوڑا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی فکر نہیں تھی کہ میری صحت روز بروز تباہ ہو رہی ہے کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں زندگی کے ہر لمحے سے لطف کشید کر رہا ہوں۔ شیری کہتی تھی کہ مرنا تو آدمی کو ہر حال میں ہے اور اپنے طے شدہ وقت پر ہی مرنا ہے تو فضول کی ٹینشن کیوں لیں اور زندگی کو کھل کر انجوائے کیوں نہ کریں۔ یوں انجوائے کرتے کرتے ایک دن وہ اس انتہا پر پہنچ گئی کہ ایک صبح ہمیں اس کی لاش ہی ملی۔ اس رات اس نے جانے کون کون سے نشوں کو ملا کر اپنی بے قرار روح کو سکون دینا چاہا تھا اور نتیجے میں ہمیشہ کی نیند سو کر سکون پا گئی تھی۔ شیری کی موت میرے لیے کتنا بڑا صدمہ تھا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ غم کی شدت سے میں شاید پاگل ہو جاتا یا پھر خودکشی کر لیتا لیکن ممی نے غیر معمولی حوصلے سے کام لیا۔ بزنس وہ پہلے ہی میرے ساتھ دیکھتی تھیں اس حادثے کے بعد انہوں نے مکمل ذمّے داری اپنے شانوں پر لے لی اور ساتھ ہی میرے علاج کا بیڑا بھی اٹھایا۔ یہ کوشش وہ پہلے بھی کئی بار کر چکی تھیں لیکن شیری کی رفاقت کے باعث ان کی ہر کوشش بے کار گئی تھی۔ شیری کے نہ ہونے اور نیلی کے مل جانے سے گویا ہر مسئلہ حل ہو گیا۔ نیلی یعنی نائلہ وہ نرس تھی جس کو ممی نے میری کل وقتی اٹینڈنٹ مقرر کیا۔ یہ بات مجھے بہت بعد میں پتا چلی کہ نیلی کی خدمات صرف میری فزیکل صحت کے حوالے سے حاصل نہیں کی گئی تھیں۔ اسے مجھے جذباتی سہارا دینے کی ذمّے داری بھی تفویض کی گئی تھی اور اس نے یہ کام اتنی خوبی سے کیا کہ میں شیری کی جدائی اور ڈرگز دونوں کو آہستہ آہستہ فراموش کرتا گیا۔ آج نیلی میری لائف پارٹنر ہے۔ اس نے مجھے اور میرے بیٹے کو اچھی طرح سنبھال لیا ہے۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کیئرنگ بھی ہے۔ شیری کی محبت آج بھی میرے دل میں موجود ہے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک چڑھی ہوئی ندی کی سی عورت کے سنگ ہیجان خیز زندگی گزارنے اور ایک سبک روندی کی سی عورت کے ساتھ پُرسکون زندگی جینے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ نیلی نے میری بے ترتیب زندگی نئے سرے سے ترتیب دے دی ہے۔ ممی کا چند ماہ پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے نیلی کی رفاقت دے کر وہ بہت خوش ہیں اور انہیں اطمینان ہے کہ وہ نہیں ہوں گی تو نیلی مجھے سنبھال لے گی۔ انہوں نے نیلی کو اس کی بے پناہ خوبیوں کی وجہ سے ہی منتخب کیا تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے کی واحد کفیل تھی اور اپنے کنبے کی خاطر ہی اس نے ایسی پُرآزمائش ملازمت قبول کر لی تھی۔ مجھ سے شادی ہوئی تو ممی نے اس کے والد کو ایک بڑا جنرل اسٹور کھلوا کر دے دیا۔ اب اس کی فیملی کا اچھا گزارا ہو جاتا ہے اور انہیں اس کی سپورٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیلی بھی ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو دن رات شوہر کا مال میکے میں بھرنے کی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ میں ہی عید، بقرعید اور خاص مواقع پر اصرار کر کے اسے ان لوگوں کے لیے قیمتی تحائف بھجوانے پر مجبور کرتا ہوں۔ غرض یہ کہ نیلی ایک اچھی رفیق ہے جس نے مجھے اور میرے گھر کو سنبھال لیا ہے۔ بس اتنا ہے کہ میں اپنی پچھلی زندگی کی بداعمالیوں کے چکر سے پوری طرح نہیں نکل سکا ہوں۔ مجھے کڈنی پرابلم ہے، بی پی بی اکثر ہائی ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بہت کچھ چھوڑ دینے کے باوجود میں شراب کی لت سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں۔ نیلی کے روکنے ٹوکنے کی وجہ سے میں ایک حد میں رہ کر تو پیتا ہوں لیکن بہرحال پیتا ہوں اور یہ میری صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔'' دس سالوں کی داستان اختصار سے سنا کر جواد خاموش ہو گیا تو مراد نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

''امیزنگ، تمہاری داستان واقعی بہت حیران کن ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا ذہین اور سمجھ دار دوست ایسے حالات سے گزر رہا ہوگا۔ شکر ہے آنٹی نے ان مشکل حالات میں ہمت نہیں ہاری اور نائلہ بھابی جیسی بہترین خاتون کو تمہاری زندگی کا ساتھی بنا دیا۔ مجھے بہت اشتیاق ہو رہا ہے ان خاتون سے ملاقات کا۔''

''نیلی، شانی کو اسکول سے لینے گئی ہوئی ہے بس وہ لوگ واپس آتے ہی ہوں گے پھر ہم مل کر لنچ کریں گے۔ آج مجھے ذرا فرصت تھی تو میں نے نیلی سے کہہ دیا تھا کہ میں لنچ گھر پر کروں گا۔ اس نے یقیناً ٹھیک ٹھاک اہتمام کروایا ہوگا۔ اسی لیے میں نے اس وقت تمہاری خاطر کے لیے سوفٹ ڈرنکس کے علاوہ کچھ اور طلب نہیں کیا کہ کھانے سے پہلے ہی بھوک نہ مر جائے۔ میں لنچ گھر پر کروں تو نیلی ایک آدھ ڈش لازماً اپنے ہاتھوں سے بھی تیار کرتی ہے۔ بہت اچھی کک ہے وہ۔ تمہیں اس کے ہاتھ کا کھانا پسند آئے گا۔''

جواد کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے ایک فخر سا تھا۔
''تھینک گاڈ تمہیں شیری بھابی کی بھیانک رفاقت کے بعد ایک پُرخلوص ساتھی مل گئی ہیں۔ تم شیری سے محبت کے جتنے بھی دعوے کرو لیکن میرے حساب سے تو ایسی عورت ایک آسیب کے مانند ہی ہے جو مرد کو سکون اور خوشی دینے کے بجائے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دے۔'' مراد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
''تمہارے شیری کے بارے میں ریمارکس ٹھیک ہی ہیں لیکن میں اپنے دل سے مجبور ہوں کہ آج بھی اسے بُرا نہیں کہہ سکتا۔ وہ میری پہلی محبت تھی جسے بہر حال میں فراموش نہیں کر سکا۔'' جواب میں جواد نے بھی صاف گوئی سے کام لیا۔
''نائلہ بھابی اس بات کا بُرا نہیں مانتیں؟'' مراد نے اسے ٹٹولا۔
''نہیں۔ وہ بہت کشادہ دل کی عورت ہے جس نے سوکن کی نشانی کو بھی یوں سنبھال رکھا ہے کہ کوئی گمان ہی نہیں کر سکتا کہ شانی اس کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ڈرائیور ہوتے ہوئے بھی وہ خود بیٹے کو اس کے اسکول تک پک اینڈ ڈراپ دیتی ہے اور چاہے کتنی بھی مصروفیت ہو اس معمول کو ترک نہیں کرتی۔ شانی اس کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہو گیا ہے۔ دراصل نیلی کے آنے کے بعد ہی اس نے ممتا کا مزہ چکھا ہے ورنہ وہ بے چارہ گورنس کی آغوش میں پلنے والا ماں سے واقف ہی کہاں تھا۔'' جواد کے لہجے میں ہلکا سا تاسف آ گیا۔
''دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے لیکن ان اچھے لوگوں کی تعداد بہت محدود ہو چکی ہے اس لیے ان سے ملاقات بھی آدمی کے لیے ایک شرف ہی ہے۔ میں آج یہ شرف حاصل کر کے ہی تمہارے گھر سے واپس جاؤں گا۔'' مراد خوش دلی سے بولتا ہوا اپنی بات کے اختتام پر دھیرے سے مسکرایا، جواد نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن اگلے ہی پل ان دونوں کی مسکراہٹ ساکت سی ہو گئی۔ اس سکوت کا سبب بہت زور سے کھلنے والا دروازہ اور اس دروازے سے اندر داخل ہوتی حواس باختہ و بے حال لیکن خوب صورت عورت تھی۔ وہ ننگے پیر بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی لیکن حقیقت میں اس کے قدم بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے اور صاف لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گرنے والی ہے۔ جواد نے دوڑ کر اسے سہارا دیا اور تیز لہجے میں بولا۔
''کیا ہوا نیلی؟ تمہاری ایسی حالت کیوں ہے؟''
''شش...... شا...... شانی......'' جواب میں عورت کے لبوں سے بمشکل ایک لفظ برآمد ہو سکا اور مراد ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نائلہ عرف نیلی نامی باکمال عورت سے اس کی بہت بُرے حالات میں ملاقات ہونے جا رہی ہے۔

☆☆☆

''تمہیں سب سے پہلے پولیس کو انفارم کرنا چاہیے جواد؟'' نیلی نے ذرا سے حواس سنبھلتے ہی تفصیل سے بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی اور کیسے شانی اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ ساری داستان سن کر جواد تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور مراد نے مخلصانہ لہجے میں اسے مشورہ دیا تھا۔
''نہیں، پولیس کو مت بتانا۔ اس حرکت پر شانی کو کڈنیپ کرنے والے اسے نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔'' مراد کا مشورہ سن کر نیلی ہذیانی لہجے میں بولی۔ اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ جذباتی ہی نہیں جسمانی طور پر بھی اذیت میں مبتلا دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور پر اس کے پیروں کا بہت برا حال تھا۔ دونوں پیروں کے تلووں پر آبلے آ گئے تھے۔ یہ تپتی ہوئی سڑک پر ننگے پیر بھاگنے کا نتیجہ تھا لیکن فی الحال اس کی اپنے پیروں پر اتنی زیادہ توجہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور ایک طرح سے وہ شرمندگی اور احساسِ جرم میں مبتلا تھی کہ شانی کی حفاظت نہیں کر سکی تھی۔
''پولیس کو اطلاع نہ دینا بے وقوفی ہو گی۔ اس طرح کے واقعات میں پولیس سے رابطہ نہ کرنے ہی کی وجہ سے مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔'' مراد نے سمجھانا چاہا۔
''نیلی ٹھیک کہہ رہی ہے مراد! ہم پولیس کو انفارم کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ تم اتنے سال کینیڈا میں رہے ہو شاید اسی لیے تمہیں ہماری پولیس کی کارکردگی یاد نہیں ہے۔ یہاں کی پولیس باہر ملکوں کی پولیس جتنی ایفی شینٹ نہیں ہے کہ تیزی سے مجرموں تک پہنچ جائے۔ ہماری پولیس کچھ کرے کرائے گی نہیں اور الٹا ہماری جان مشکل میں پڑ جائے گی۔ نیلی نے بتایا ہے تاکہ اسے گھر جا کر فون کا انتظار کرنے کو کہا گیا ہے۔ تو ہم یہ کر لیتے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہے۔ وہ لوگ مجھ سے شانی کی واپسی کے بدلے میں کچھ ڈیمانڈ کریں گے۔ میں ان کی ہر ڈیمانڈ پوری کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔'' جواد نے قدرے تلخ لہجے میں مراد کو ٹوکا اور اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ وہ

شدید اعصابی کشیدگی میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہونے والا شکنوں کا اضافہ اسے کچھ اور عمر رسیدہ ظاہر کررہا تھا۔

''ایز یو وِش۔ میں بہرحال آپ لوگوں کے ساتھ ہوں اور اس مشکل وقت میں ہر ممکن طور پر آپ کی مدد کے لیے تیار بھی۔'' ان دونوں کی ذہنی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے مراد نے فوراً پسپائی اختیار کرلی۔

''آپ بس شانی کی خیریت سے واپسی کی دعا کریں مراد صاحب! باقی معاملات تو انشاء اللہ میں اور جواد مل کر سنبھال ہی لیں گے۔'' نیلی کا لہجہ نرم ہی تھا لیکن مراد نے اس کے پیچھے چھپی ہلکی سی رکھائی کو محسوس کرلیا۔ ایسا لگتا تھا کہ مراد کی اس موقع پر موجودگی اسے بُری طرح کھٹک رہی ہے۔ اپنی حواس باختگی میں اس نے مراد کے سامنے ساری بات بتا تو دی تھی لیکن شاید اب پچھتا رہی تھی کہ یہ معاملہ اس کے سامنے کیوں بیان کیا۔ مراد نے اس پر ایک خنک بھری نظر ڈالی۔ وہ جواد کے مقابلے میں بہت کم عمر اور خوب صورت عورت تھی جس کی جواد کے بیٹے سے بے پناہ محبت بھی مراد کے نزدیک کچھ مشکوک تھی لیکن اس کے چہرے پر رنج و پریشانی کے جو تاثرات تھے مراد انہیں اداکاری بھی قرار نہیں دے سکا۔ وہ ایک حقیقی ماں جیسے ہی تاثرات دکھائی دیتے تھے اور اگر وہ اداکاری کررہی تھی تو واقعی کمال کی اداکارہ تھی۔

''تمہیں بھابی کے زخموں پر کوئی مرہم لگانا چاہیے جواد۔'' اس نے یک دم ہی اپنی توجہ دوسرے پہلو پر مبذول کرلی۔

''آں...... ہاں۔ میں لاتا ہوں کوئی مرہم۔'' جواد اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی حرکات وسکنات میں عجیب سی تھکاوٹ تھی اور لگتا تھا وہ مشکل سے خود کو گھسیٹ رہا ہے تاہم کچھ دیر میں وہ زخموں پر لگانے والی ایک دوا کی ٹیوب، جراثیم کش دوا کی شیشی اور روئی لے کر واپس آ گیا۔ اس نے روئی کو جراثیم کش دوا میں بھگو کر پہلے نیلی کے زخموں کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی انگلیاں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ مراد کو اندازہ ہوگیا کہ اپنی اعصابی کشیدگی کے باعث یہ کام ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکے گا۔ اس نے نرمی سے جواد کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''اگر تم بُرا نہ مانو تو یہ کام میں کردیتا ہوں۔''

''تھینک یُو۔ مجھ سے واقعی اس وقت کچھ نہیں ہو پا رہا۔'' جواد فوراً پیچھے ہٹ گیا اور مراد نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ اس نے بہت احتیاط سے نیلی کے زخموں کو صاف کرکے ان پر مرہم لگایا۔ نیلی کے پیر نرم اور گداز تھے لیکن مراد نے محسوس کیا کہ اس کا جسم شدید تناؤ کی کیفیت میں ہے۔

''ریلیکس بھابی! اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' مراد نے اسے تسلی دی۔

''آپ دعا کریں مراد بھائی! اگر شانی کو کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔'' نیلی کی آنکھوں سے ایک ساتھ بہت سے آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر ٹپکے۔ ان آنسوؤں کو دائیں ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آہستہ سے بولی۔

''جواد کی زبانی میں نے آپ کے بارے میں کافی باتیں سن رکھی ہیں لیکن افسوس کہ ہماری ملاقات اتنے بُرے حالات میں ہورہی ہے کہ......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے تو ہم بہت اچھی سی گیدرنگ رکھ لیں گے۔ پھر میں آپ کو اپنی فیملی سے بھی ملواؤں گا۔'' مراد نے جیسے اسے تسلی دی۔ اسی وقت ایک ملازم دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبیا جتنا ایک پارسل اور سفید رنگ کا لفافہ تھا۔ اس نے دونوں چیزیں جواد کی طرف بڑھائیں۔

''کیا ہے یہ؟'' جواد نے غیر دلچسپی سے پوچھا۔ اس کی ساری توجہ اپنے موبائل فون کی طرف مبذول تھی۔ اسے یقین تھا کہ اغواکاروں کی طرف سے جلد کوئی کال آئے گی۔ نیلی کے فون پر اس سے ایسا ہی کچھ کہا گیا تھا۔ جس نمبر سے نیلی کے موبائل پر کال آئی تھی جواد اس نمبر پر بھی کئی بار کال کرکے دیکھ چکا تھا لیکن وہ نمبر مسلسل بند جارہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ جواد کی اعصابی کشیدگی بڑھتی جارہی تھی۔

''یہ ابھی کوریئر سروس والا دے کر گیا ہے سر! لفافے پر ارجنٹ لکھا ہوا ہے اس لیے میں فوراً اسے آپ کے پاس لے آیا۔'' ملازم نے جواب دیا۔ وہ ماحول میں موجود تناؤ کو محسوس کررہا تھا۔ نیلی جس حال میں شانی کے بغیر گھر آئی تھی اس سے بھی اس نے گڑبڑ کا اندازہ لگالیا تھا لیکن اتنی ہمت نہیں تھی کہ مالکوں سے کوئی سوال کرسکتا۔ اس سے قبل خانساماں بھی کھانا لگانے کے بارے میں معلوم کرکے جاچکا تھا لیکن وہاں کسی کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ کھانے کے

بارے میں سوچ پاتا۔ اب بھی جواد لفافے پر لکھے ''ارجنٹ'' کے لفظ کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ملازم کو واپس جانے کا اشارہ کر کے اس نے لفافہ کھول کر اس میں موجود کاغذ نکالا۔ یہ انگریزی میں ٹائپ شدہ خط تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

ڈیئر جواد احمد!

ہم تمہیں زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتے اور ہماری کوشش ہے کہ ہمارے درمیان معاملات بغیر کسی بارگیننگ کے فوری طور پر طے پا جائیں۔ تمہاری ذہنی آمادگی کے لیے ہماری طرف سے ایک تحفہ بھیجا جا رہا ہے۔ امید ہے اس تحفے کے بعد تم ہماری طرف سے کسی اور تحفے کے طالب نہیں ہو گے اور جب ہمارا نمائندہ تم سے رابطہ کرے گا تو تم بے چون وچرا اس کا مطالبہ مان لو گے۔

تمہارا خیر اندیش

تحریر ختم ہوتے ہی جواد نے بے قراری سے پارسل پر چڑھا کاغذ پھاڑ کر اتارا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر مراد بھی اس کے قریب چلا آیا تھا اور اب کاغذ پر موجود تحریر پڑھ رہا تھا۔ نیلی کو البتہ پیروں پر لگی دوا کی وجہ سے اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہنا پڑا تھا۔ جواد نے پارسل پر چڑھا کاغذ اتارا تو اس میں سے نیلے رنگ کی مخملی ڈبیا برآمد ہوئی۔ یہ ڈبیا بالکل ایسی تھی جیسے چھوٹے سائز کا کوئی جیولری کیس ہو۔ جواد نے کچھ حیرانی کے عالم میں ڈبیا کا ڈھکن کھولا اور اگلے ہی پل اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ پر مراد نے چونک کر ڈبیا کی طرف دیکھا تو اس کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈبیا کی اندرونی سطح پر بھی نیلے رنگ کا مخمل چڑھا ہوا تھا اور اس پر رکھی چھوٹی سی سفید انسانی انگلی بہت نمایاں تھی۔ انگلی کے سائز کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ کسی بچے کی انگلی ہے اور یہ اندازہ ہی ان لوگوں کو دہشت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس انگلی اور خط کے مندرجات کی روشنی میں قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ شانی کی انگلی ہے۔

''کیا ہے اس ڈبیا میں؟'' نیلی نے جواد کے زرد چہرے اور بھنچے ہوئے لبوں کو دیکھا اور مراد کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ آپ کا اسے نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔'' مراد نے جواد کے ہاتھ سے ڈبیا لے کر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔

''یہ کون شقی القلب لوگ ہیں یار! میرے معصوم بچے نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟'' جواد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''حوصلے سے کام لو جواد! وہ لوگ صرف تم پر دباؤ بڑھا رہے ہیں تاکہ تم ان کے مطالبے پر کسی قسم کی حیل و حجت نہ کرو۔'' مراد نے اس کے شانے پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی لفافے اور پارسل کے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

''یہ خط اور پارسل کسی کوریئر کمپنی کے ذریعے نہیں بھیجا گیا ہے ورنہ ان چیزوں پر کمپنی کی اسٹیمپ موجود ہوتی۔ شاید اغوا کاروں کا کوئی ساتھی ہی یہ چیزیں دے کر گیا ہے۔''

''ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرا بیٹا مجھے صحیح سلامت واپس مل جائے۔'' جواد کے لہجے میں بے پناہ درد تھا اور جسم میں لرزش سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے مراد اور نیلی کی طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''میں آپ لوگوں سے معذرت چاہتا ہوں لیکن اس وقت اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالنے کے لیے مجھے ڈرنک لینی پڑے گی۔'' اس نے کسی کے جواب دینے کا انتظار نہیں کیا اور دیوار میں موجود ایک کیبنٹ کھول کر اس میں سے بوتل نکالنے لگا۔ مراد اسے ٹوکنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنے موبائل کی گھنٹی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ دوسری طرف اس کی بیوی تھی جو اس سے اس کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ مراد نے اسے بتایا کہ وہ اپنے ایک دوست کے گھر ہے اور اسے واپس گھر آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ اس مختصر سی بات چیت کے دوران جواد بوتل منہ سے لگا کر اس کا ایک چوتھائی حصہ حلق سے نیچے اتار چکا تھا۔ نیٹ اور اتنی تیزی سے پینے کی وجہ سے اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی تھی اور ہچکیاں آ رہی تھیں۔ نیلی نے اس کی طرف تشویش سے دیکھا اور اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے اتنی احتیاط البتہ کی تھی کہ پنجوں کے بل چل رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے پیروں پر لگا مرہم زیادہ نہیں ہٹا تھا۔

''بس کریں جواد! اس طرح پینا آپ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔'' جواد کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''بھابی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں جواد! تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ اس طرح کی حرکتوں سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' مراد نے بھی نیلی کا ساتھ دیا۔

''میں اندر بیڈروم میں جارہا ہوں۔ کوئی کال آئی تو آپ لوگوں کو بتادوں گا۔'' جواد نے جواب میں اتنا کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے واضح تھا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کی عمومی صحت ویسے بھی خاص اچھی نہیں تھی اور اس جھٹکے نے اس کا مزید بُرا حال کردیا تھا۔

''اب یہ بیڈروم میں بند ہوکر بھی پیتے رہیں گے۔ ڈاکٹرز نے ایک حد سے زیادہ شراب نوشی کو ان کے لیے شدید خطرناک قرار دیا ہے۔'' نیلی نے روہانسی آواز میں مراد کو آگاہ کیا۔

''آپ اسے سنبھالنے کی کوشش کریں۔'' مراد نے مضطربانہ کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب وہ میرے لیے بیڈروم کا دروازہ نہیں کھولیں گے۔'' اس کے چہرے پر شکست خوردگی اور حزن تھا۔

مراد تاسف سے ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور بولا ''ہمارے پاس انتظار کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ پولیس والا آپشن آپ لوگ مکمل طور پر رد کرچکے ہیں۔''

''اغوا کے کیسز میں پولیس کی انوالمنٹ کے خطرناک نتائج سے ہم اچھی طرح واقف ہیں اس لیے آپ کی تمام نیک نیتی کے باوجود آپ کا مشورہ نہیں مان سکتے۔'' نیلی کا لہجہ اب بھی اٹل تھا۔

''میں بھی اسی لیے زیادہ زور نہیں دے رہا ہوں۔'' مراد نے جواب دیا۔

''آپ چاہیں تو اپنے گھر جاسکتے ہیں مراد بھائی۔ وہاں یقیناً آپ کا انتظار ہورہا ہوگا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نیلی نے مراد سے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اس کڑے وقت میں آپ لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' مراد نے اسے جواب دیا۔ اسی وقت ایک ملازم گھبرایا ہوا وہاں آیا۔ اس کے ہاتھ میں پولی تھین میں لپٹی کوئی شے تھی۔

''کیا بات ہے افضل! کیوں اتنے گھبرائے ہوئے ہو؟'' نیلی نے مالکانہ لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''یہ کوئی باہر سے اندر اچھال کر بھاگ گیا ہے میڈم! ٹونی کے بھونکنے پر ہم لوگوں نے دیکھا۔'' ملازم نے بتایا اور پولی تھین میں لپٹی وہ شے نیلی کی طرف بڑھائی۔ نیلی نے ہاتھ میں لے کر وہ شے دیکھی تو اس کے حلق سے بے اختیار ایک ساتھ کئی چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ وہ ایک چھوٹا سا انسانی پیر کا پنجہ تھا۔ نیلی کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ بیڈروم میں مقید جواد بھی باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں کی حد سے بڑھی ہوئی سرخی گواہی دے رہی تھی کہ وہ اس دوران مسلسل پیتا رہا ہے۔ وہ آگے آیا تو اسے بھی نیلی کے ہاتھ میں موجود پنجہ دکھائی دے گیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا۔ مراد اس وقت اس کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے میں مصروف تھا جو اسی پولی تھین کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اور نیلی کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

ڈیئر جواد احمد!

پہلا تحفہ ذرا چھوٹا تھا، ہمیں تمہارے شایانِ شان نہیں لگ اس لیے مجبوراً ذرا بڑا تحفہ روانہ کرنا پڑا۔ امید ہے اس تحفے کو پانے کے بعد تمہارے اندر اگر کوئی مزاحمت تھی بھی تو اب بالکل ختم ہوجائے گی۔ اب ایسا کرو کہ وہ زیادہ سے زیادہ کیش جو تم اپنے بیٹے کی واپسی کے لیے ادا کرسکتے ہو اکٹھا کرلو۔ اس کیش کے ساتھ گولڈ اور جواہرات کو شامل کرنا مت بھولنا۔ ہم جلد تم سے رابطہ کریں گے۔''

تحریر یہاں آکر ختم ہوگئی تھی۔ مراد نے کاغذ پر سے نظر ہٹائی تو اس کی نظر جواد پر پڑی۔ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا ہوا بری طرح اپنا سینہ مسل رہا تھا اور اس کے ہر مسام سے پانی کی طرح پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ نیلی اور ملازم مل کر اسے سنبھالنے کی کوشش کررہے تھے۔

''بھابی جلدی سے جواد کی زبان کے نیچے گولی رکھیں۔'' اسے اندازہ ہوگیا کہ جواد کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اسے ہارٹ اٹیک بھی ہوسکتا ہے اس لیے تیز لہجے میں نیلی سے بولا۔ نیلی دوڑتی ہوئی بیڈروم میں گئی اور دوا کی شیشی لے آئی۔ مراد دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے ہیں اس لیے اس نے خود شیشی لے کر کھولی اور گولی نکال کر جواد کی زبان کے نیچے رکھ دی۔ گولی رکھنے سے جواد کی حالت کچھ سنبھلنے لگی۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ صاحب کو فوراً اسپتال شفٹ کرنا ہوگا۔'' مراد نے بوکھلائے ہوئے ملازم کو حکم دیا۔ اس اثنا میں نیلی نے مراد کا میز پر رکھا ہوا کاغذ اٹھا کر پڑھنا شروع کردیا تھا۔ پھر متوحش سے لہجے میں بولی۔

''جواد اسپتال چلے جائیں گے تو کیش وغیرہ کا انتظام کیسے ہوگا؟''

''فی الحال جو آپ ارینج کرسکتی ہیں کرلیں۔ اگر جواد کو اسپتال شفٹ نہیں کیا گیا تو اس کی اپنی جان کو خطرہ

ہے۔'' مراد نے اسے جواب دیا اور ان دو ملازمین کی مدد سے جو شاید کسی گڑبڑ کو محسوس کر کے از خود وہاں چلے آئے تھے جواد کو ڈرائنگ روم سے اس کی گاڑی میں منتقل کروانے لگا۔ ان حالات میں بھی اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ نکلتے نکلتے وہاں سے دو چیزیں اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

''میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔'' نیلی بھی اس کے پیچھے لپکی۔

''نہیں، آپ کا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی رابطہ کرے۔ آپ جواد کے فون پر مجھے صورتِ حال سے آگاہ کرتی رہیے گا۔'' مراد نے رک کر اسے سمجھایا اور پھر تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے جو دو چیزیں اپنے ساتھ لی تھیں ان میں سے ایک جواد کا موبائل تھا۔ راستے میں اس نے ڈرائیور سے معلوم کر لیا تھا کہ جواد کس اسپتال سے اپنا علاج کرواتا ہے۔ ڈرائیور کو اس نے اسی اسپتال چلنے کی ہدایت کی تھی۔ اسپتال پہنچتے ہی جواد کا ٹریٹمنٹ شروع ہوگیا۔ ڈاکٹرز کی رائے کے مطابق اسے بہت بروقت طبی امداد میسر آگئی تھی ورنہ صورتِ حال اس سے بہت زیادہ سنگین ہوسکتی تھی۔ مراد صرف اس وقت تک وہاں ٹھہرا جب اس نے جواد کی حالت کو قدرے تسلی بخش پایا، ساتھ آئے ڈرائیور کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ جلد وہاں سے روانہ ہوگیا۔ روانگی سے قبل وہ ڈرائیور سے اس کا موبائل نمبر لینا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

نیلی اس وقت اپنے بیڈروم میں موجود تھی۔ اس نے بیڈروم میں نصب خفیہ لاکر کھول رکھا تھا اور اس میں سے زیورات اور رقم نکال کر ایک بڑے سائز کے بریف کیس میں منتقل کرتی جا رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے بے چینی و بے قراری مترشح تھی۔ ایسے میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو وہ بری طرح چونک گئی اور تیزی سے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین پر نام کے بجائے صرف نمبر آ رہا تھا لیکن نمبر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے کال ریسیو کر لی۔

''فیضی۔'' کال ریسیو کرتے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک نام برآمد ہوا۔

''کیسی ہو جانِ فیضی!'' دوسری طرف موجود شخص نے بہت محبت سے اس سے دریافت کیا۔

''میں بہت پریشان ہوں فیضی۔ جواد اسپتال میں ہیں اور......'' وہ شاید کال کرنے والے کو پوری صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن دوسری طرف موجود شخص نے اس کی پوری بات سننے کی زحمت نہیں کی اور بولا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم کسی مشکل میں ہو۔ تمہاری پریشانی کی خبر میرے دل کو نہ ہوتی یہ کیسے ممکن تھا۔''

''فیضی......'' نیلی کے ہونٹوں سے ایک سسکی سی نکلی۔

فیضان عرف فیضی اس کا پڑوسی ہوا کرتا تھا۔ محبت کی راہ گزر پر سفر کرتے ان دونوں نے ایک دوسرے کے حوالے سے ڈھیروں خواب دیکھے تھے لیکن حالات نے ان کے کسی خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ فیضی بہت جدوجہد سے حاصل کی گئی تعلیم کے بل پر جو ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا اس سے اس کے اپنے گھر کے مسائل ہی حل ہوجاتے تو بہت تھا، وہ نائلہ کے مسائل کے حل کے لیے اس کی کیا مدد کر پاتا۔ مجبوراً نائلہ کو اپنی محبت کی قربانی دے کر اپنے گھر کے مسائل حل کرنے پڑے اور یوں ایک اور داستانِ محبت ادھوری رہ گئی۔

''میں اس وقت خود کو بہت تنہا اور اداس محسوس کر رہی ہوں فیضی! مجھے کسی اپنے کے سہارے کی شدید ضرورت ہے۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد نیلی نے فیضان سے کہا۔

''تو پھر چلی آؤ۔'' اس کے لہجے میں ایک آس اور بے چینی تھی۔

''لیکن......'' نیلی تذبذب کا شکار ہوئی اور پھر یک دم ہی جیسے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی۔

''میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ تم سے ملے بغیر شاید میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوسکوں گی۔''

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہاں محبت کرنے والوں کی ازلی بے تابی بول رہی تھی۔

نائلہ نے سلسلہ منقطع کیا اور بریف کیس کو بند کر کے اسے سنبھال کر لاکر میں رکھنے کے بعد آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ اس کا حلیہ مناسب ہی تھا۔ صرف رونے سے آنکھیں سرخ اور سوجی سوجی سی ہوگئی تھیں جنہیں اس نے سن گلاسز کے پیچھے چھپا لیا اور ملازمین کو چند ہدایات دے کر گھر سے روانہ ہوگئی۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی گاڑی شہر کے پسماندہ اور گنجان آبادی والے علاقے میں جس گھر کے سامنے رکی اس کی دیوار پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

عامل فیضان شاہ۔ قسمت بدل دے۔ بڑی سے بڑی مشکل کا حل صرف ایک ملاقات میں۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔

نائلہ کی جواد احمد سے شادی کے بعد فیضان نے اپنی ملازمت ترک کر کے یہ نیا "پیشہ" اختیار کیا تھا۔ نیلی کی جواد احمد جیسے دولت مند سے شادی نے اسے بڑے انقلاب سے دوچار کیا تھا اور پہلی بار اس نے اپنی ذہانت کو منفی رخ سے استعمال کر کے بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ معلوم نہیں وہ اپنے اس دھندے میں دعوے کے مطابق دوسروں کی قسمت بدلنے میں کامیاب ہو پاتا تھا یا نہیں لیکن خود اس کے اپنے دن پھر گئے تھے اور اب اس کی فیملی شہر کے ایک خوش حال علاقے میں خاصے بڑے مکان میں رہائش پذیر تھی لیکن بہرحال قسمت کی یہ ستم ظریفی اپنی جگہ تھی کہ دوسروں کے محبوب کو ان کے قدموں میں لانے کا دعویٰ کرنے والا خود نارسائی کا عذاب سہہ رہا تھا۔ نائلہ کی گاڑی مکان کے سامنے رکی تو ایک آدمی لپک کر اس کے قریب چلا آیا۔ اس کا انداز استقبال کرنے والا تھا۔

"آیئے بیگم صاحبہ! شاہ جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ بے حد مؤدبانہ تھا۔ نیلی اس کی معیت میں مکان کے اندر داخل ہوگئی۔ وسیع احاطے والے اس مکان میں فی الحال چند لوگ ہی نظر آرہے تھے حالانکہ آدھا گھنٹا قبل یہاں معتقدین کا رش لگا ہوا تھا۔ نیلی کی آمد کی اطلاع سن کر فیضی نے انہیں یہاں سے رخصت کروا دیا تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی ہی اہم تھی کہ وہ اس کی خاطر اپنے "بزنس" کا نقصان برداشت کرتے ہوئے اپنے "کلائنٹس" سے بے رخی برتنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔ نائلہ کا استقبال کرنے والا شخص اسے عام نشست والے کمرے سے ہٹ کر ایک الگ کمرے تک لے گیا اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اسے یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہاں سے آگے آپ خود جائیں کہ اس سے آگے جاتے ہوئے میرے تو پَر جلتے ہیں۔ نیلی نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے دروازے کی ناب گھما کر اسے دھکیلا اور خود اندر داخل ہوگئی۔ کمرے میں ہلکی نارنجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نارنجی روشنی میں اس نے فضا میں چکراتے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے دیکھے اور آنکھوں پر موجود سن گلاسز اتار دیے۔ سامنے ہی فیضی ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس نے نہایت نفیس کپڑے کا ہلکے رنگ کا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا لیکن کمرے میں پھیلی نارنجی روشنی کے باعث لباس کا رنگ واضح نہیں تھا اور اس سے بھی نارنجی شیڈ ہی منعکس ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کسی زمانے میں فیضی سارے شریف اور مہذب نوجوانوں کی طرح چھوٹے بال رکھ کر ان بالوں کو آڑھی مانگ کے ساتھ نہایت سلیقے سے سنوارا کرتا تھا لیکن اب اس کے بال شانوں تک آتے تھے جنہیں سنہری رنگ میں ڈائی کیا گیا تھا۔ اس وقت ان سنہری بالوں پر بھی نارنجی روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ بال بہرحال اب بھی سلیقے ہی سے سنورے ہوئے تھے اور انہیں پیچھے کی طرف الٹ کر سنوارا گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی خفیف سی آواز پر وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہونٹوں میں دبی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر ایک ٹک نائلہ کو دیکھنے لگا۔

اس کے دیکھنے کے انداز نے آج بھی نائلہ کی دھڑکنوں میں ہلچل مچادی اور وہ مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو فیضی!"

"دیکھ رہا ہوں کہ میری نیلی بیگم صاحبہ بن کر کتنی بدل گئی ہے۔ تمہارے سیاہ ریشمی بال مجھے کتنے پسند تھے اور وہ تمہاری نیلی نیلی سی آنکھیں کیسا جادو جگاتی تھیں لیکن اب وہ سب کچھ مصنوعی رنگوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ اب وہ عام سا لباس پہننے والی سادی سی نیلی نہ جانے کہاں ہے جس کا دل میرے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا تھا۔" فیضی جیسے چشمِ تصور سے ماضی کی نیلی کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا اب میں اچھی نہیں لگ رہی؟" نائلہ کے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن فیضی کے سامنے آکر وہ خود کو وہی الھڑ دوشیزہ محسوس کرنے لگی جس کی آنکھیں فیضی کی راہ تکا کرتی تھیں۔

"اچھی تو شاید اب تم پہلے سے بھی زیادہ لگ رہی ہو۔ دولت کی چمک نے تمہاری شخصیت کو پہلے سے بھی زیادہ نکھار دیا ہے لیکن اب تم وہ نیلی نہیں رہیں جو مجھے میری اپنی لگا کرتی تھیں۔"

"سچ بھی تو یہی ہے فیضی! اب میں تمہاری اپنی کہاں رہی ہوں۔" نائلہ کی آواز میں یاسیت سی اُتر آئی۔

"تم ہی نہیں مانتیں ورنہ اب بھی جواد احمد کو چھوڑ کر میری بن سکتی تھیں۔" فیضان نے جیسے شکوہ کیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جواد احمد کو چھوڑنے کی شرائط کتنی کڑی ہیں۔ میں نے اسے چھوڑا تو نہ صرف اس کی تمام دولت و جائداد سے محروم ہو جاؤں گی بلکہ مجھے اور میرے گھر والوں کو وہ سب بھی واپس لوٹانا ہوگا جو اب تک جواد احمد نے کسی بھی مد میں انہیں دیا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ اس صورت میں میری قربانی کا کیا فائدہ ہوگا۔ میں اور میرے گھر والے تو دوبارہ اسی مقام پر آجائیں گے جہاں سے چلے تھے۔"

''بہت چالاک ہے جواد احمد، تمہیں اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے بڑی تدبیر سے کام لیا ہے اس نے۔'' فیضی نے جیسے دانت کچکچائے۔

''یہ جواد نہیں اس کی ماں کی تدبیر تھی۔ نچلے طبقے سے بیٹے کے لیے بیوی لاتے ہوئے انہیں یقیناً کچھ خدشات تھے اسی لیے انہوں نے یہ سارا انتظام کیا تھا۔'' نیلی نے حقیقت بیان کی۔

''کاروباری لوگ اپنے نفع و نقصان کا حساب رکھنا خوب جانتے ہیں۔ چاہے خود دوسروں کی زندگی برباد کر دیں۔'' فیضان کے لہجے میں وہی دل جلا عاشق بول رہا تھا جو شاید دنیا کے سارے دولت مندوں سے نفرت کرتا ہے۔

''جو ہوا سو ہوا فیضی اب آگے کی طرف دیکھو اور آگے کا سوچو۔'' نیلی نے رسان سے اسے ٹوکا۔

''تمہارے سوا مجھے کچھ سوجھتا ہی کہاں ہے۔ کہو تو جواد احمد کو جان سے مروا کر تمہیں اس کی بیوہ بنوا دوں۔ بیوہ سے عقد تو بڑے ثواب کا کام ہے۔''

''شاید میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ جواد احمد کے قتل یا حادثاتی موت کی صورت میں بھی مجھے اس کی دولت میں سے کچھ نہیں ملے گا بلکہ شاید مجھ ہی پر شک ظاہر کرتے ہوئے میرے خلاف ہی تفتیش شروع ہو جائے۔'' فیضی کی جذباتیت کے مقابلے میں نیلی کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ اب تک وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھی وہ فیضی کے سامنے آ کر کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ فیضی سے اس کا تعلق ایسا ہی تھا۔ اس کی سنگت میں گویا دنیا کے سب دکھ اور غم اس سے کہیں دور چلے جاتے تھے۔

''ہاں......! کیسا ستم ہے۔ میرے دیے ایک تعویذ سے لوگوں کی تقدیریں سنور جاتی ہیں لیکن میں اپنا مقدر نہیں سنوار پاتا۔'' فیضی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور اپنے بائیں ہاتھ میں دبے چند تعویذوں کو ایک جھٹکے سے ہوا میں اچھال دیا۔ یہ چاندی کے خول میں لپٹے وہ خاص تعویذ تھے جو وہ اپنے خصوصی ''کلائنٹس'' کو بڑے اہتمام سے تیار کروا کر دیا کرتا تھا۔ چاندی کے اس خول پر خوب صورت چاند اور ستارہ ابھرا ہوا تھا اور تعویذ سے منسلک ڈوریوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان گرہوں کے بارے میں فیضی کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر گرہ خصوصی ورد کے بعد لگاتا ہے۔ وہ اپنے دعوے میں سچا تھا یا نہیں لیکن حیرت انگیز طور پر اس کا دھندا اچھا چل رہا تھا اور لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عامل فیضان شاہ سے انہیں بہت فیض حاصل ہوتا ہے۔ بات شاید یہ تھی کہ فی الحال فیضی کا ستارہ عروج پر تھا اور وہ مٹی میں ہاتھ ڈال کر اسے سونا بنانے کی پوزیشن میں آیا ہوا تھا۔

''تم کچھ دیر ان باتوں کو بھول جاؤ تو ہم اس موضوع پر بات کر سکیں گے جس پر بات کرنے کے لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں زیادہ دیر تمہارے پاس ٹھہر سکوں۔'' شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد بھی فیضی کی بے قراری نیلی کے دل کو کھینچتی تھی لیکن اس وقت اس نے فیضی کو ٹوک دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' فیضی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہیں جو کہنا ہے کہو، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

''بتاتی ہوں لیکن ایک منٹ رکو۔ میں ذرا اسپتال فون کر کے جواد کی خیریت معلوم کر لوں۔'' نیلی کو خیال آیا تو وہ اپنا موبائل نکال کر جواد کا نمبر ملانے لگی۔ کال مراد نے ریسیو کی۔

''جواد کی حالت اب کیسی ہے مراد بھائی۔'' اس نے بغیر کسی تمہید کے دریافت کیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں بھابی! ڈاکٹر اسے دیکھ رہے ہیں۔ انشاءاللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' مراد نے اسے تسلی دی۔

''کیا میں اسپتال آ جاؤں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''آپ کا گھر میں رہنا ہی مناسب ہوگا۔ کڈنیپرز کی طرف سے کچھ بھی کارروائی ہوگی تو اس کا پتا گھر ہی سے چل سکے گا۔ آپ گھر پر ہی رکی ہوئی ہیں نا؟'' اسے مشورہ دیتے ہوئے مراد نے اچانک ہی پوچھا۔

''ج...... جی......'' نیلی ذرا سا گڑبڑائی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''جی نہیں۔ فی الحال میں گھر پر نہیں ہوں۔ میرے شناسا ایک پہنچے ہوئے عامل ہیں۔ شانی کی واپسی میں مدد لینے کے لیے میں ان عامل صاحب کے پاس آئی ہوئی ہوں۔''

''اوہ!'' مراد حیران ہوا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ جیسی ماڈرن نظر آنے والی خاتون بھی عاملوں وغیرہ پر اعتقاد رکھتی ہوگی۔''

''جب بات دل کی ہو تو انسان عاملوں سے بھی رابطہ رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' نائلہ کے لہجے میں ذو معنویت تھی جسے مراد تو کیا خاک سمجھتا لیکن فیضی سمجھ کر مسکرانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ نیلی کا دل آج بھی اسی کا ہے۔

''چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ بس کوشش کریں کہ جلد

از جلد گھر واپس پہنچ جائیں اور اگر کوئی نئی بات ہوتی ہے تو فون پر مجھے اس سے آگاہ کر دیں۔" مراد نے فوراً ہی بات ختم کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ نائلہ موبائل واپس پرس میں رکھ کر فیضی کی طرف متوجہ ہوگئی اور اس سے وہ باتیں کرنے لگی جنہیں کرنے کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔ فیضی پوری توجہ اور دھیان سے اس کی بات سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے بھی چند جملے ادا کیے۔ آخر کار ٹھوس لہجے میں یقین دہانی کروانے کے انداز میں بولا۔

"تم گھر جاؤ نیلی! اب تمہیں کچھ کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں خود اس معاملے کو دیکھ لوں گا۔"

"شکریہ فیضی! بس اب میں چلتی ہوں۔ اگرچہ تمہارے پاس بیٹھنے سے میرے دل کو سکون مل رہا ہے لیکن مناسب یہی ہوگا کہ اب میں گھر چلی جاؤں۔" وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں نہیں روک سکتا، یہ میری بے بسی ہے۔" فیضی کے لہجے میں اس کی محرومی بول رہی تھی۔

"میرے خیال میں، میں یہ تعویذ اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا ایک جواز ثبوت کے طور پر میرے پاس رہے گا۔" اس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے نیلی نے فرش پر گرے ہوئے وہ تعویذ اٹھا لیے جو کچھ دیر قبل فیضان نے پھینکے تھے۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ فیضان پیاسی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا لیکن اسے رخصت کرنے اس کے ساتھ باہر تک نہیں گیا۔ وہ جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جو بہروپ اختیار کر رکھا تھا اس میں یہ چھوٹی چھوٹی احتیاطیں ضروری تھیں۔ کسی قسم کی بدنامی مول لے کر وہ اپنا جما جمایا "کاروبار" ٹھپ نہیں کر سکتا تھا۔ نائلہ بھی اس بات کو سمجھتی تھی اس لیے اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ باہر جانے والے راستے پر چل پڑی۔ اچانک ہی اس کی نظر احاطے میں موجود ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے چند افراد میں سے ایک پر پڑی تو وہ بری طرح چونک گئی۔ اس شخص کی یہاں موجودگی اس کے لیے حیرت انگیز تھی۔ بہرحال اس نے اس شخص کو دیکھنے میں اپنا زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور رخ موڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ شخص اسے یہاں دیکھ پائے، اس کی یہاں موجودگی کا سبب بعد میں فیضی سے پوچھا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے مراد! اتنے کم وقت میں باقاعدہ ٹیسٹ وغیرہ تو نہیں ہو سکتے تھے لیکن میں نے ڈاکٹر گیفی کی رائے لے لی ہے اور ان جیسے قابل اور ماہر ڈاکٹر نے تمہارے اندازے کی تصدیق کی ہے۔ باقی حتمی رپورٹس کل تک میرے پاس آجائیں گی۔" مراد ایک بار پھر اسپتال واپس آچکا تھا اور ڈاکٹر سے جواد کی طبیعت کے بارے میں معلوم کر کے ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے موبائل پر اس کے کزن ڈی ایس پی ساجد کی کال آگئی۔

اتنے سال ملک سے باہر رہ کر مراد کی عادت و اطوار میں بڑی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ وہ اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح کسی معاملے میں پولیس کو ملوث کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار نہیں تھا اور اس بات کا قائل تھا کہ ہر جرم اور غیر قانونی عمل کی اطلاع پولیس کو دینی چاہیے۔ اس کیس میں بھی وہ اپنے اس اصول پر عمل کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا لیکن اتنی احتیاط اس نے کی تھی کہ پولیس کے محکمے میں موجود اپنے کزن سے ذاتی طور پر مل کر اس سے اس کیس پر کام کرنے کی درخواست کی تھی اور اس کی فرمائش پر اسے جواد کے تمام حالات اور دیگر تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس اپنے اسی ڈی ایس پی کزن کا فون آیا ہوا تھا اور وہ اسے ایک اہم اطلاع دے رہا تھا۔

"میرے خیال میں فی الحال رپورٹس کی اتنی زیادہ اہمیت ہے بھی نہیں۔ تم لوگوں کا اصل زور تو بچے کی بازیابی پر ہونا چاہیے۔" ساجد کی بات سن کر مراد بے ساختگی سے بولا تو ساجد ہنس دیا اور بولا۔

"ہمیں اتنا نکما بھی نہیں سمجھو یار! ہم نے کام شروع کر دیا ہے۔ تمہارے دوست جواد اور اس کی مسز کے موبائلز کے علاوہ ان کے گھر کے فون پر بھی آبزرویشن لگوا دی ہے۔ اب اگر کوئی کال آئے گی تو اسے ٹریس کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی۔ باقی دوسرے چند پہلوؤں سے بھی ہم نے کام شروع کر دیا ہے۔"

"میں نے اپنی صوابدید پر گھر والوں کی اجازت کے بغیر اس معاملے میں پولیس کو انوالو کیا ہے اس لیے زیادہ کانشس ہوں۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میں جواد اور اس کی بیگم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" اس نے وضاحت کی۔

"ڈونٹ وری۔ کچھ نہیں ہوگا، کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ بس تم ویسا کرتے رہو جیسا میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔" ساجد نے اسے تسلی دی اور مزید دو ایک باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ مراد نے اپنا موبائل جیب میں رکھ کر جواد کا موبائل

نکالا اور یونہی خالی ذہن سے اس کی اسکرین کو تکنے لگا۔ اچانک ہی موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر نام کے بجائے صرف نمبر آرہا تھا۔ مراد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اس نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ ساجد کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنی آواز سے کمزوری اور بے چینی کی کیفیت ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کیسے ہو جواد احمد! ہمارے تحائف تمہیں پسند آئے یا نہیں۔" اس کی ہیلو کے جواب میں ایک کھرکھراتی ہوئی آواز نے استہزائیہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"خدا کے لیے یہ سب مت کرو۔ میرے معصوم بچے کے ساتھ اتنا ظلم نہ کرو۔ میں اس کے بغیر بھی تمہارا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔ میں اپنا سب کچھ اپنے بیٹے کے بدلے تمہیں دے سکتا ہوں لیکن تم جو کچھ کررہے ہو اس سے تو میری جان ہی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی میں اسپتال میں ہوں اور صرف اس وجہ سے سنبھل گیا ہوں کہ مجھے بروقت طبی امداد مل گئی تھی۔ اب اگر تم نے شانی کو کوئی نقصان پہنچایا تو شاید میری جان ہی چلی جائے اور جب میں نہیں رہوں گا تو تمہارے مطالبات کون پورے کرے گا۔" مراد نے پوری پوری کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے اور الفاظ سے ایک ایسے باپ کی کیفیات جھلک سکیں جو اپنے بیٹے کے لیے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش یقیناً کامیاب رہی کیونکہ دوسری طرف سے فوراً ہی ایک لطف اندوز ہوتا ہوا قہقہہ لگایا گیا پھر کال کرنے والا بولا۔

"تمہیں شوق ہو رہا ہے تو خوشی سے بیٹے کی فکر میں جان دے دو بس اتنا انتظام کر جانا کہ ہم تمہارے بعد تمہاری بیوی سے تاوان وصول کرسکیں۔ اصولاً تو تم جیسے بڈھے کے بجائے ویسے بھی مالی معاملات اسی کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ وہ جوان ہے اور اس کے تم سے زیادہ جینے کے امکانات ہیں۔"

"تم میرے معاملات کو چھوڑو اور شانی کی واپسی کی بات کرو کہ اسے کتنی رقم کے بدلے چھوڑو گے۔ میں اپنے بیٹے کے بدلے تمہارا ہر مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔" مراد نہایت عمدگی سے بیمار جواد کا کردار ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"مطالبہ تو تمہیں بتا دیا گیا تھا۔" دوسری طرف سے معنی خیز لہجے میں کہا گیا۔

"وہ بڑا مبہم مطالبہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں جو زیادہ سے زیادہ رقم وغیرہ جمع کروں، وہ تمہیں قبول نہ ہو اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم خود اپنے منہ سے اپنی ڈیمانڈ بتادو۔" بات کے اختتام پر مراد یوں ہانپنے لگا جیسے بات کرنے کے لیے بھی اسے بے پناہ توانائی خرچ کرنی پڑ رہی ہو اور وہ بہت مشکل سے یہ بات کررہا ہو۔

"ٹھیک ہے ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تم جب تک ڈاکٹروں سے اپنے اوپر تجربات کرواؤ۔" دوسری طرف سے قہقہہ لگا کر فون بند کردیا گیا۔ مراد نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر چند گہری سانسیں لیں پھر اپنے موبائل سے ساجد کا نمبر ملانے لگا۔

"ابھی ابھی جواد کے نمبر پر کڈنیپر کی کال آئی تھی اور میں نے کوشش کی تھی کہ لمبی بات کرسکوں۔ تم معلوم کرو کہ کال ٹریس ہوسکی یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں متعلقہ آدمی سے رپورٹ لیتا ہوں۔ فی الحال تم زبانی مجھے بتادو کہ تمہاری کیا بات ہوئی۔" ساجد نے اس سے کہا تو وہ اسے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

"بس تم اپنی جگہ رہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے۔" ساجد نے غور سے ساری تفصیل سن کر کہا۔ اس کے بعد بھی اس نے چند ایک سوالات اور ہدایات کیں اور آخر کار سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کال سے فارغ ہوکر وہ جواد کی خیریت معلوم کرنے کے ارادے سے ویٹنگ روم سے باہر نکلا۔ معلومات حاصل کرنے پر اسے پتا چلا کہ جواد کی حالت اب قابلِ اطمینان ہے اور اسے آئی سی یو سے روم میں شفٹ کیا جارہا ہے۔ کچھ دیر میں ہی یہ عمل مکمل کرلیا گیا تو مراد، جواد کے روبرو پہنچ گیا۔ وہ ہوش میں تھا لیکن اس کے چہرے سے نقاہت اور تکلیف کا اظہار ہورہا تھا۔

"شانی کا کچھ پتا چلا مراد! ان لوگوں کی کوئی کال وغیرہ آئی؟" اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جواد بے چینی سے پوچھنے لگا۔

"ریلیکس یار ٹینشن نہیں لو۔ ٹینشن لینے سے تمہاری طبیعت دوبارہ بگڑ سکتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ کوئی تمہیں ٹینشن دے کر ہی مارنے کی کوشش کررہا ہے۔" مراد نے اس کا بایاں ہاتھ تھام کر کہا تو وہ چونک گیا۔

"کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" جواب میں مراد اسے چیدہ چیدہ باتوں سے آگاہ کرنے لگا۔

"لیکن کوئی ایسا کیوں کرے گا۔ میرے مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟" جواد کے دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اس لیے وہ اسے حرکت نہیں دے سکتا تھا

چنانچہ بائیں ہاتھ پر زور دے کر خود کو ذرا اونچا کرنے کی کوشش کرنے لگا مراد نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سہارا دے کر اسے تکیوں کی مدد سے نیم دراز کروادیا پھر بولا۔

''مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو گے کہ تمہارے مرنے سے کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے نیلی.....'' جواد کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ جواب میں مراد خاموش ہی رہا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد جواد خود ہی بولنے لگا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میری اور نائلہ کی شادی کے پیچھے مالی فائدہ ہی سب سے بڑی وجہ تھی۔ نائلہ اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں ہم لوگوں نے اس کے گھر والوں سے تعاون بھی کیا لیکن شادی کے بعد میں نے نائلہ کو ایک وفادار بیوی پایا۔ شیری سے مجھے جنون کی حد تک محبت تھی اور وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت مجھے اچھی لگتی تھی لیکن نائلہ نے بہت دھیرے دھیرے اپنی خدمت اور محنت سے میرے دل میں جگہ بنائی۔ شانی کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت عمدہ رہا ہے اور کہیں بھی کسی بھی مرحلے پر مجھے یہ گمان نہیں گزرا کہ وہ اداکاری کررہی ہے لیکن جو کچھ تم نے بتایا ہے اور جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے میں خود شک میں پڑ گیا ہوں۔ نائلہ جوان اور خوب صورت ہے۔ اس کی رفاقت نے مجھے خوشی اور مسرت کے احساس سے دوچار کیا ہے لیکن ہوسکتا ہے خود اس کے ساتھ الٹا معاملہ ہو اس کے لیے یہ عرصہ ایک بوجھ کی طرح رہا ہو۔ مجھے بہرحال کسی مرحلے پر اس نے احساس نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ اچھی بیوی کا کردار ادا کرتی رہی۔'' جواد کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''میں نے بھی صرف شک کا اظہار کیا ہے۔ موجودہ حالات میں تمہاری بیوی ہی سب سے زیادہ مشکوک فرد ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ معاملہ اس کے برخلاف ہو۔ فی الحال تو ہماری سب سے پہلی ترجیح شانی کی واپسی ہے۔ کسی بھی طرح بچہ گھر واپس آجائے پھر مجرم کو بھی ڈھونڈ لیا جائے گا۔'' مراد کے لہجے میں عزم تھا۔

''تم کتنے اچھے موقع پر مجھے دوبارہ ملے ہو مراد! تمہارے ہونے سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے ورنہ شاید اب تک میرا دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔''

''تم انشاء اللہ لمبے عرصے تک جیو گے میرے یار! اللہ تمہیں شانی کی خوشیاں دکھائے گا بس تم ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ اسپتال کا یہ بستر تمہاری جگہ نہیں ہے، تمہیں اس بستر سے اٹھ کر دوبارہ اپنا کاروبار اور گھر سنبھالنا ہے۔''

مراد نے اس کا حوصلہ بڑھایا تو وہ مسکرا دیا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی نے ان دونوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مراد نے چیک کیا تو جواد کا موبائل بج رہا تھا اور اسکرین پر نیلی کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے جواد کی طرف موبائل بڑھا دیا۔ اس نے موبائل تھام لیا اور نہایت سنجیدہ تاثرات کے ساتھ دھیمی آواز میں ہیلو کہتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔

''اوہ جواد آپ! میں سمجھ رہی تھی کہ اب بھی آپ کا موبائل مراد بھائی کے پاس ہی ہوگا۔ آپ آئی سی یو میں تھے نا، کیا کمرے میں شفٹ ہو گئے ہیں؟'' نائلہ کو جیسے اس کی آواز سن کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''تمہیں میرا آئی سی یو سے نکل آنا اچھا نہیں لگا کیا جو اتنی حیران ہو رہی ہو؟'' اس کی حیرت کو محسوس کر کے جواد خود کو طنز کرنے سے نہیں روک سکا۔

''کیسی بات کررہے ہیں آپ؟ آپ کی طبیعت خراب ہونے سے تو میری ٹینشن بہت بڑھ گئی تھی اور سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اکیلی کیسے اس سچویشن کو ہینڈل کروں گی۔ میں تو آپ کے ساتھ اسپتال بھی جانا چاہتی تھی لیکن مراد بھائی نے کہا کہ میرا گھر پر رہنا ٹھیک رہے گا۔ میں گھر میں رہ کر بھی پریشان ہو رہی تھی پھر مجھے خیال آیا کہ دوا تو اسپتال میں ہو ہی رہی ہے میں کسی سے دعا بھی کروالوں۔ کورنگی کے علاقے میں فیضان شاہ نامی ایک کافی مشہور عامل ہوتے ہیں۔ میں دعا کے لیے ان کے آستانے پر گئی تھی۔ انہوں نے آپ کے لیے تعویذ دیا ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں وہ تعویذ لے کر آپ کے پاس اسپتال آجاتی ہوں۔'' جواد کے طنز پر نائلہ نے کافی وضاحت سے جواب دیا۔ اس سے گفتگو کے دوران جواد نے اسپیکر آن کر دیا تھا اس لیے مراد بھی ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے اشارے سے جواد کو منع کیا کہ وہ نائلہ سے ایسی گفتگو نہ کرے جس سے وہ چونک جائے۔

''کم آن نیلی! تم ان پیروں فقیروں کے چکر میں کہاں پڑ گئیں۔ یہ سارے دھوکے باز ہوتے ہیں۔'' جواد نے اپنے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''اس وقت میرے دل کو تسلی کی ضرورت ہے اور دل کی تسلی جھوٹے عامل سے بھی مل جاتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا اور اصرار کرنے کے انداز میں بولی۔ ''آپ مجھے اپنا روم نمبر بتائیں۔ میں ابھی اسپتال کے لیے نکلتی ہوں۔''

''تم رہنے دو، ہوسکتا ہے تمہیں گھر پر رہ کر کچھ انتظامات کرنے پڑیں۔ میں یہاں سے ڈرائیور کو بھجوا دیتا ہوں۔'' جواد نے گویا جان چھڑوائی۔

''نہیں ڈرائیور کو مت بھیجیں۔ اس کی اسپتال میں کسی کام کے لیے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں افضل کو ٹیکسی میں بھیج دیتی ہوں۔ آپ بس اپنا روم نمبر بتا دیں۔'' نائلہ نے دوسری تجویز پیش کی جو ایسی نامناسب نہیں تھی اس لیے جواد نے قبول کر لی۔ افضل ان کے ہاں کام کرنے والا ایک ایسا ملازم تھا جسے ہر فن مولا کہا جا سکتا تھا۔ وہ صفائی ستھرائی سے لے کر کھانا پکانے اور باغبانی کرنے تک ہر کام میں ماہر تھا۔

''ملازم تعویذ لے کر آئے گا تو میں خود اس سے وصول کر لوں گا، اب تم تھوڑی دیر سو جاؤ۔ تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ تم اتنی دیر تک باتیں کر سکو۔ جلد سے جلد ریکور کرنے کے لیے تمہارا میڈیسنز کے ساتھ بھرپور آرام کرنا بھی ضروری ہے۔'' نائلہ نے فون بند کیا تو مراد، جواد کو نصیحت کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے تکیوں کو درست کر کے جواد کو دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ جواد کو ڈرپ کے ذریعے گلوکوز کے ساتھ کچھ دوائیں بھی دی جا رہی تھیں۔ ان دواؤں میں مسکن اثرات رکھنے والی بھی یقیناً کوئی دوا شامل تھی اس لیے جواد آنکھیں بند کر کے لیٹا تو پریشانی اور تفکر کے باوجود کچھ دیر میں اسے نیند آ گئی۔ مراد وہیں بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اسپتال کے عملے کا ایک شخص وہاں آیا اور ہاتھ میں تھاما ایک پارسل مراد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''نیچے ریسپشن پر کوئی شخص یہ مسٹر جواد کے لیے دے کر گیا تھا۔'' مراد نے ہاتھ بڑھا کر پارسل تھام لیا اور پوچھنے لگا۔

''کچھ معلوم ہے کہ کون یہ پارسل دے کر گیا ہے؟'' پارسل کی ساخت دیکھ کر اسے وہ پہلا پارسل یاد آ گیا تھا جس میں اغوا کاروں کے مطابق انہوں نے شانی کی انگلی بھیجی تھی۔

''اس بارے میں تو کچھ نہیں معلوم! ریسپشن پر موجود لڑکی اس وقت بہت مصروف تھی۔ اس لیے پارسل دینے والے کی شکل پر دھیان نہیں دے سکی البتہ آپ پریشان نہ ہوں سیکیورٹی والوں نے آلات کی مدد سے چیک کر لیا ہے۔ اس میں کوئی ہتھیار یا بارودی مواد وغیرہ موجود نہیں ہے پھر بھی اگر آپ کو کسی قسم کا شبہ ہے تو اس پارسل کو مزید چیک کروایا جا سکتا ہے۔ اس نے مراد کی تسلی کروانے کے ساتھ مستعدی سے ایک اور پیشکش کی۔

''نہیں بھئی! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ پارسل یہیں چھوڑ دو۔ جواد جاگنے کے بعد خود دیکھ لے گا۔'' مراد نے قدرے مسکرا کر جواب دیا تو وہ مطمئن ہو گیا اور خود بھی جوابی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر ''ایز یو وش سر!'' کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد مراد نے احتیاط سے وہ پارسل کھولا تو حسب توقع اس میں سے پہلے جیسا ہی ایک مخملیں ڈبا برآمد ہوا۔ مراد نے ڈبا کھول کر اس کے اندر سے برآمد ہونے والے اس ننھے سے انسانی انگوٹھے کو دیکھا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ اپنا موبائل نکال کر ڈی ایس پی ساجد کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

''تم نے کچھ کیا فیضی! کسی کامیابی کی امید بندھی۔'' اپنے شاندار بیڈ روم میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی نائلہ اس وقت موبائل پر فیضی سے مخاطب تھی۔ وہ اس نائلہ سے کافی مختلف لگ رہی تھی جس کی خوب صورتی اور جامہ زیبی کے سب ہی مداح تھے۔ اس نے ابھی تک صبح والا لباس ہی پہن رکھا تھا جو خاصا ملگجا اور سلوٹ زدہ محسوس ہو رہا تھا۔ بال بھی کافی بے ترتیب ہو چکے تھے۔

''اتنی بے چین کیوں ہو رہی ہو یار! ابھی تو چند گھنٹے ہی گزرے ہیں اور تم نے میرے ذمے کوئی آسان کام نہیں لگایا ہے۔ میں اپنے طور پر پوری کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی کوئی نتیجہ برآمد ہوا تمہیں خوش خبری مل جائے گی۔ اتنا تو تمہیں بھی اعتماد ہونا چاہیے کہ تمہاری خاطر میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔'' اسے سمجھاتے ہوئے فیضی کا لہجہ تھوڑا نرم اور تھوڑا گرم تھا۔

''تم پر تو ہمیشہ سے ہی بہت اعتماد ہے لیکن کیا کروں شانی کا معاملہ مختلف ہے، اس بچے سے میری اتنی اٹیچمنٹ ہو چکی ہے کہ مجھے ایسا لگتا ہے وہ میری اپنی ہی اولاد ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ میں اس کے لیے کتنی بے تاب ہوں۔'' نائلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔

''سوکن کی اولاد سے اتنی محبت! بڑی عجیب عورت ہو تم۔'' فیضان شاہ کا لہجہ خود بخود ہی زہرخند ہو گیا۔

''مری ہوئی سوکن سے کیسا حسد اور اگر حسد ہو بھی تو ایک معصوم بچے کو اس حسد کی آگ میں جلانا کہاں کا انصاف ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے ممتا کے جذبات پیدا نہ

ہوتے تب بھی انسانیت کے ناتے ہی میں خود کو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر مجبور پاتی۔ کسی معصوم بچے سے حسد کرنے کی ہمت تم میں ہو سکتی ہے مجھ میں بہرحال نہیں ہے۔'' فیضان کا طنز اسے بُرا لگا سو جل بلا کر اسے جواب دیا۔

''اوکے! تم جیتیں، میں ہارا۔ اب میں ایسی کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کروں گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ جلد تمہارا شانی تمہارے پاس ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ کسی کے ہاتھ ایک چیز میرے پاس بھجوادو۔'' فیضان نے اسے اپنی مطلوبہ شے کا نام بتایا۔

''تھوڑی دیر میں بھجواتی ہیں۔ ڈرائیور اسپتال میں ہے اور فی الحال افضل کو بھی میں نے تعویذ دینے کے لیے اسپتال بھیجا ہوا ہے۔ وہ واپس آجائے تو میں اسے تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔'' فیضان کا انداز بدلتے ہی اس نے بھی اپنے لہجے کو سنبھال لیا۔

''تعویذ دینے یعنی تم سچ مچ جواد کو میرا دیا ہوا تعویذ پہنانے کا ارادہ رکھتی ہو جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ تعویذ جعلی ہے۔ اگر میں سچ مچ کا کوئی عامل ہوتا تو سب سے پہلے ایسا کوئی عمل کرتا کہ جواد از خود تمہیں چھوڑ دیتا لیکن افسوس......'' فیضان کے لہجے میں حسرت اُتر آئی۔

''تم جعلی عامل صحیح لیکن تمہارے تعویذ سے میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہوں نا! عورت کو شوہر کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کبھی کبھی ایسے ڈرامے کرنے پڑتے ہیں خصوصاً مجھ جیسی عورت کو جو جانتی ہو کہ وہ اپنے شوہر سے محبت نہیں کرتی۔'' اس کے لہجے میں وہی درد تھا جو نارسائی کا عذاب سہنے والوں کے دل میں ہمیشہ بسا رہتا ہے۔

''ٹھیک ہے تم ڈرامے کرو۔ یہاں میں اپنے حصے کا کام کرتا ہوں۔'' فیضی نے یک دم ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ وہ مزید نیلی کے درد میں ڈوبے لہجے کو سنتا رہتا۔ نائلہ فون بند ہونے کے بعد بھی کچھ دیر اپنی جگہ بیٹھی رہی پھر کوئی خیال آنے پر اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کی تلاشی لینے لگی۔ اس کی یہ تلاش بیکار نہیں گئی۔ درازوں میں بھی اچھی خاصی جیولری موجود تھی۔ جیولری اس کے پاس بے حساب تھی کہ اسے ہر سوٹ کے ساتھ اس کی مناسبت سے زیورات پہننے کا شوق تھا اور جواد آرٹیفیشل جیولری پہننے کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے تقریباً ہر رنگ میں اسے سونے کے زیورات تیار کروا کر دے رکھے تھے جن پر جڑے نگینے نیلم، پکھراج، زرقون، زمرد اور یاقوت کے علاوہ ہیرے تک بالکل اصلی اور سچے تھے۔ میچنگ سے پہنے جانے والے ان زیورات کو وہ اکثر ڈریسنگ کی دراز میں ہی ڈال کر رکھتی تھی اور اب انہیں وہاں سے برآمد کیا تھا تو وہ اچھی خاصی تعداد میں نکل آئے تھے۔ ان کی اچھی مالیت کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے انہیں بھی اسی بریف کیس میں رکھ دیا جس میں اس سے قبل لاکر سے نکالی ہوئی رقم اور زیورات وغیرہ سنبھال کر رکھے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اسے یاد آیا کہ اس نے فیضان سے ایک بات تو پوچھی ہی نہیں۔ خیال آتے ہی اس نے دوبارہ فیضان کا نمبر ڈائل کر ڈالا۔

''اب کیا ہے؟ تم اس طرح بار بار مجھے فون کرتی رہیں تو میں تمہیں مایوس کن رپورٹ پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' فیضان کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی تھی فیضی!'' نائلہ نے اس کے لہجے کا نوٹس لیے بغیر رسان سے کہا۔

''پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔ تم عورتوں سے بڑھ کر تفتیشی افسر کوئی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''میں نے آج توقیر کو تمہارے آستانے پر دیکھا تھا۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟'' اس کے الفاظ و انداز کو خاطر میں لائے بغیر نائلہ نے اس سے سوال کیا۔

''یہ تو مجھے خود بھی نہیں پتا کہ وہ کیا کرتا رہتا ہے لیکن کئی دنوں سے میں اسے اکثر آتے جاتے دیکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے ساتھیوں کے ساتھ اچھا خاصا گھل مل گیا ہے۔ شاید اسے تمہارا کھلوا کر دیا گیا جنرل اسٹور اتنا فائدہ بخش نہیں لگ رہا جتنا میرا دھندا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں رہ کر میرے کاروبار کے اسرار و رموز سیکھ رہا ہو اور جلد میرے مقابلے میں شہر میں کہیں زیادہ اچھا سیٹ اپ بنا کر بیٹھ جائے۔ یہ جو ہم سے چھوٹے ہیں نا وہ ہم سے زیادہ تیز اور چالاک ہیں۔''

''تمہیں مجھے اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔ اگر وہ مجھے وہاں دیکھ لیتا تو کیا سوچتا؟'' نائلہ نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔

''یہی سوچتا کہ بہن صاحبہ نے ابھی تک چوری چوری سابقہ عاشق سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔''

''اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے بھائی کی نظروں میں میری عزت کم ہو جاتی۔'' فیضان کے غیر سنجیدگی سے کیے تبصرے پر اس کے لہجے میں تندی آگئی۔

''سوری نیلی! میں بس ایسے ہی مذاق میں کہہ رہا تھا ورنہ تمہاری عزت تو مجھے خود بھی بہت پیاری ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ تمہاری آمد سے پہلے میں نے تمام ملاقاتیوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ توقیر کی شاید میرے ساتھیوں سے زیادہ ہی دوستی ہوگئی ہے کہ انہوں نے اسے باقی سب کی طرح وہاں سے روانہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ مجھے خود بھی اس وقت اس کی وہاں موجودگی کا علم نہیں تھا ورنہ میں خود اس کی غیر موجودگی کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا۔'' فیضان نے نرمی سے وضاحت کی۔

''خیر جو ہونا تھا ہوگیا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس نے مجھے وہاں نہیں دیکھا۔ میں موجودہ حالات سے نکل آؤں تو پھر اس سے اس کی مصروفیت کے بارے میں استفسار کروں گی۔ اس نے تو اپنی تعلیم بھی اس بہانے سے ادھوری چھوڑ دی تھی کہ بے شک بہت سے ملازمین موجود ہیں لیکن ابا اکیلے اتنے بڑے اسٹور کا انتظام نہیں سنبھال سکیں گے۔ ملازمین پر نظر رکھنے کے لیے بھی ایک سے دو لوگ موجود ہونے چاہئیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ تعلیمی میدان میں یونہی واجبی سا ہی تھا۔ اس لیے میں نے اس کی تاویل کو درست تسلیم کرلیا۔ ویسے بھی اس کی بات اتنی زیادہ غلط نہیں تھی۔ ابا کا جنرل اسٹور لگ بھگ کسی سپر اسٹور جیسا ہی ہے اور مجھے بھی یہی بہتر لگا تھا کہ برائے نام تعلیم میں وقت برباد کرنے کے بجائے توقیر کاروبار کی سمجھ بوجھ حاصل کرے تو یہ اس کے لیے اچھا ہوگا۔ سکس ڈیجٹس میں انکم ہے اس جنرل اسٹور کی جو ظاہر ہے کسی ملازمت سے توقیر کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی لیکن وہ نکما آج کل پتا نہیں کہاں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں خفگی سی آگئی۔

''تم کہو تو میں اس کے کان کھینچ کر دیکھتا ہوں۔'' فیضان نے خلوص سے پیشکش کی۔

''اوں...... ابھی رہنے دو۔ اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔ فی الحال تم اس کام پر دھیان دو جو میں نے تمہارے ذمے لگایا ہے۔'' نائلہ نے اسے منع کردیا۔

''اوکے باس! جیسا آپ کا حکم۔ اگر کوئی اور حکم دینا ہو تو وہ بھی دے سکتی ہو۔ خادم بجا آوری کے لیے تیار ملے گا۔''

''تم میرا دیا ہوا واحد کام ہی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو کافی ہوگا۔ باقی مجھے تمہاری کسی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔'' فیضی کے نیم مزاحیہ لہجے کے جواب میں بھی اس کے لہجے کی سنجیدگی برقرار رہی تو وہ بھی سنجیدہ ہوگیا اور بولا۔

''تمہارے کام کو میں بھولا نہیں ہوں۔ بس تم مجھے میری مطلوبہ شے بھجوادو۔''

''افضل جیسے ہی اسپتال سے واپس آئے گا میں اسے تمہاری طرف روانہ کردوں گی۔'' اس نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کردیا اور آنکھیں بند کرکے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ سخت اعصابی تناؤ کا شکار تھی اور اس طریقے سے تناؤ کو کم کرنے کی اپنی سی سعی ہی کرسکتی تھی۔

☆☆☆

''یہ...... یہ دیکھو یہ شخص ہے جس نے پارسل اسپتال پہنچایا تھا۔ اس ویڈیو میں وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر پارسل رکھتا ہوا صاف نظر آرہا ہے۔'' ڈی ایس پی ساجد اپنے ایک ماتحت کے ساتھ اس وقت اسپتال کے ہی ایک کمرے میں موجود تھا اور مراد کو اس شخص کی ویڈیو دکھا رہا تھا جس نے پارسل اسپتال پہنچایا تھا۔ اسپتال میں سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے نصب کیے گئے کیمروں نے اس شخص کی ویڈیو بہت واضح بنائی تھی۔ ساجد کے ساتھ آیا ہوا اس کا ماتحت بھی اس ویڈیو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ بول پڑا۔

''یہ تو مستان ہے سر!''

''اوہ، تو تم اس شخص کو جانتے ہو؟'' ساجد نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا۔

''یس سر! یہ ایسا ہی نوسرباز سا بندہ ہے۔ کوئی نہ کوئی شعبدہ بازی دکھا کر لوگوں سے پیسے کھینچنے کے چکر میں لگا رہتا ہے۔ آج کل کورنگی کے علاقے میں ایک عامل فیضان شاہ کے آستانے پر ہوتا ہے اور لوگوں کو فیضان شاہ کی کرامت کے قصے سنا سنا کر انہیں اس کے آستانے پر آنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ایک آدھ بار حوالات کی ہوا بھی کھا چکا ہے لیکن کبھی کسی لمبے چکر میں نہیں پھنسا۔'' ماتحت نے پوری تفصیل بتا ڈالی۔

''عامل فیضان شاہ! یہ نام تو میرا جانا پہچانا ہے۔'' تفصیل سن کر مراد چونکا اور اسے اپنی جیب میں پڑے اس تعویذ کا خیال آیا جو جواد کا ملازم افضل اس کے لیے دے کر گیا تھا۔ مراد کو یاد تھا کہ اس نے جواد اور نائلہ کے درمیان فون پر ہونے والی گفتگو سنی تھی اس میں نائلہ نے بھی بتایا تھا کہ وہ جواد کی صحت یابی کے لیے کورنگی کے علاقے میں بیٹھنے والے ایک عامل فیضان شاہ سے یہ تعویذ لے کر آئی ہے اور اب پھر اسی شخص کا نام سامنے آگیا تھا۔ اس نے ساجد کو اس بارے میں آگاہ کردیا۔

''اوہ! یہ تو بہت زبردست پوائنٹ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم نے جواد کے نمبر پر آنے والی جو کال ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی کورنگی ہی کے علاقے سے کی جارہی تھی لیکن ہم بالکل صحیح لوکیشن ٹریس نہیں کر پائے تھے۔ کورنگی تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ اتنے بڑے علاقے میں ہم کوئی کارروائی کیسے کرتے۔ کال کے فوراً بعد اس نمبر کو بھی بند کر دیا گیا تھا جس سے کال کی جارہی تھی اور ایسے معاملات میں یہ معلوم کرنا بھی بیکار ہی جاتا ہے کہ سم کس کے نام رجسٹرڈ ہے۔ وہ سم بھی ایک ایسے شخص کے نام پر رجسٹرڈ تھی جسے مرے ہوئے بھی سال بھر کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' ساجد نے قدرے جوش سے مراد کو مطلع کیا۔

''جواد کی بیوی نائلہ اور اس عامل فیضان شاہ کے درمیان کوئی کنکشن محسوس ہورہا ہے۔ تم اس بارے میں معلومات حاصل کرو پھر ہی ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کچھ ٹھوس ثبوت ہاتھ آسکیں گے۔'' مراد نے مشورہ دیا۔

''تم فکر نہیں کرو۔ ہمیں کافی کلیوز مل گئے ہیں۔ انہیں پکڑ کر ہم جلد مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔'' ساجد نے اسے تسلی دی۔

''جواد کی حالت کی وجہ سے میری خواہش ہے کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے، اس نے بہت حوصلے سے کام لے کر خود کو سنبھال لیا ہے لیکن اپنے بیٹے کے لیے بہرحال وہ پریشان ہے۔ جب تک اس کا بیٹا اسے نہیں ملے گا وہ مکمل طور پر پُرسکون نہیں ہوسکے گا۔ میں نے تم پر پہلے ہی شک ظاہر کیا تھا کہ اس معاملے میں مجھے تاوان کی وصولی سے زیادہ جواد کی جان لینے کا چکر نظر آرہا ہے۔ جواد سے میری اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی والدہ نے وصیت کی تیاری کچھ اس طرح سے کروائی ہے کہ طلاق یا اس کی حادثاتی موت کی صورت میں اس کی بیوی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جواد کو طبعی طریقے سے قتل کرنے کی پوری جدوجہد کی جارہی ہے۔ ایک ایسا شخص جو پہلے ہی بیمار رہتا ہے' اپنے بیٹے کے کٹے ہوئے جسمانی اعضا وصول کر کے کیسے خود کو سنبھال سکتا ہے۔ دشمن تو شاید لمحے گن رہے ہیں کہ کب جواد کا دم نکلتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس کی حالت ذرا سی سنبھلتے ہی اس کے لیے ایک اور پارسل بھجوا دیا گیا تھا۔ اگر میں یہاں موجود نہیں ہوتا تو وہ کٹا ہوا انگوٹھا دیکھ کر جواد کا دم ہی نکل جانا تھا۔'' مراد کے لہجے میں غصہ اور چہرے پر سرخی تھی۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ دولت کے حصول کے لیے جواد کی بظاہر وفادار بیوی اس کی جان لینے کی بھرپور کوشش کررہی ہے۔ اپنے اسی شک کی بنیاد پر اس نے نائلہ کو کانوں کان اس بات کی خبر نہیں ہونے دی تھی کہ وہ اس معاملے میں پولیس کو ملوث کر چکا ہے اور وہ لوگ شانی کی بازیابی کے لیے سرگرم ہوچکے ہیں۔

''تمہارے شکوک وشبہات میں خاصا دم محسوس ہورہا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اغواکاروں کی طرف سے تاوان کی وصولی کے لیے اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جارہی ورنہ ان کا تو سارا زور ہی تاوان کی وصولی پر ہوتا ہے اور یہاں ابھی تک تاوان کی حتمی رقم بھی نہیں بتائی گئی ہے۔'' ساجد نے مراد کے خیال سے اتفاق کیا۔ عین اسی وقت مراد کی جیب میں پڑا جواد کا موبائل بجنے لگا۔ مراد نے جلدی سے موبائل باہر نکالا، کسی اجنبی نمبر سے ہی کال آرہی تھی۔ اس نے ساجد کو اشارہ کرتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔ اس وقت اس نے اپنی اصل آواز میں ہی ''ہیلو'' کہا تھا۔

''کون بول رہا ہے؟ فون جواد کو دو۔'' اس کی آواز سنتے ہی دوسری طرف سے سخت لہجے میں حکم دیا گیا۔ مراد نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے اس کی پہلے بھی بات ہوچکی ہے۔

''میں جواد کا دوست بات کررہا ہوں۔ جواد کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ اس وقت کسی سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ میں تو آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنا پیغام دے دیں، میں بعد میں جواد تک آپ کا پیغام پہنچادوں گا۔ ابھی تو آپ سے یہی درخواست ہے کہ اللہ سے جواد کی زندگی کے لیے دعا کریں اس کی حالت بہت سیریس ہے۔'' آواز پہچان کر اس نے جان بوجھ کر جواد کی حالت کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں اس کی بیوی سے بات کرلیتا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواد کی حالت کے بارے میں سن کر کوئی تبصرہ یا تشویش ظاہر کرنے کے بجائے اتنا کہہ کر فون بند کردیا گیا۔ مراد نے ساجد کو ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سارے متعلقہ نمبرز انڈر آبزرویشن ہیں۔ کال کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ تم ذرا یہ دیکھ لو کہ مسٹر جواد اگر جاگ رہے ہیں تو میں ان سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چند ضروری اور بنیادی معلومات ان سے ہی حاصل ہوجائیں گی۔'' ساجد

نے اس سے فرمائش کی۔

''ٹھیک ہے تم میرے ساتھ ہی آجاؤ۔ اگر جواد جاگ رہا ہو تو تم اس سے بات کر لینا۔'' مراد اسے ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ اس کا ماتحت البتہ وہیں تھا اور ویڈیو وغیرہ کو سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ مراد اور ساجد باہر نکلے تو انہیں سامنے برآمدے ہی میں جواد کا ڈرائیور موبائل پر کسی سے بات کرتا ہوا دکھائی دیا۔ انہیں آتا دیکھ کر اس نے سلسلہ منقطع کیا اور ان کے نزدیک چلا آیا۔

''کس کا فون تھا؟'' مراد نے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''افضل تھا جی! مجھ سے صاحب کی طبیعت کے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔'' ڈرائیور نے سادگی سے جواب دیا۔

''کیا پہلے بھی اس نے فون کر کے جواد کی طبیعت معلوم کی تھی؟'' مراد کو اس وقت ہر شخص ہی مشکوک لگ رہا تھا۔

''جی ہاں صاحب! افضل ہی کیا دوسرے ملازمین بھی کئی بار مجھ سے فون پر صاحب کی طبیعت کے بارے میں معلوم کر چکے ہیں۔ ہم سب کو ہی صاحب کی طرف سے فکر ہے۔ ابھی میں نے افضل کو بتایا کہ صاحب کو دوبارہ آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا ہے تو وہ بہت پریشان ہو گیا اور کہنے لگا کہ ابھی سارے ملازمین کو جمع کروا کر گھر میں آیت کریمہ کا ورد شروع کروا دیتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو صاحب کی حالت سنبھل جائے گی۔'' ڈرائیور نے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔ وہ خود بھی خاصا غم زدہ نظر آرہا تھا۔ مراد نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے ایک خاموش تسلی دی اور بولا۔

''اللہ نے چاہا تو جواد جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اسی وجہ سے میں خود یہاں سے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ یہ جو صاحب تمہیں میرے ساتھ نظر آرہے ہیں۔ یہ میرے ایک کزن ہیں جو میرے لیے پریشان ہو کر اپنے ایک جاننے والے کے ساتھ یہاں اسپتال پہنچ گئے ہیں۔ ان کی خواہش پر میں انہیں جواد کو دکھانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔'' ساجد اور اس کا ماتحت سادہ لباس میں ہی آئے تھے اس لیے مراد کا یہ جھوٹ نبھ سکتا تھا۔ ڈرائیور کو یہ بات بتا کر وہ ساجد کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''تم تو خود اچھی خاصی کارکردگی دکھا رہے ہو یار! بڑی باریک بینی سے ہر طرف دھیان رکھا ہوا ہے۔'' اس کے ساتھ چلتے ساجد نے اس کی تعریف کی۔

''بس ذرا عقل سے کام لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر کسی ذریعے سے اسپتال پر نظر رکھی جا رہی ہے تو نظر رکھنے والوں کو یقین آجائے کہ جواد کی حالت سچ مچ بہت خراب ہے۔ میں نے خصوصی درخواست کر کے جواد کو دوبارہ آئی سی یو میں بھی اسی لیے شفٹ کروایا ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک سمت میں کام کر رہے ہو۔ کاش تم ہمارے محکمے میں ہوتے تو ہمیں ایک اچھا ساتھی میسر آجاتا۔'' ساجد کے لہجے میں اب بھی اس کے لیے ستائش تھی۔ وہ اس تعریف پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ ابھی وہ آئی سی یو سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھے کہ ایک بار پھر جواد والے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس بار اسکرین پر نائلہ کا نام نظر آرہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے فون کر کے جواد کی خیریت معلوم کر رہی تھی۔ مراد نے جب اسے بتایا تھا کہ جواد کو دوبارہ آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا ہے تو اس نے ایک بار پھر اسپتال آنے پر اصرار کیا تھا لیکن مراد نے سمجھا بجھا کر اسے گھر پر رکنے پر راضی کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نائلہ یہاں آئے اور جواد کی ٹھیک ہوتی حالت کا اندازہ لگا سکے۔

''جی بھابی!'' کال ریسیو کر کے اس نے طوعاً و کرہاً نرم لہجے میں نائلہ سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ابھی گھر کے نمبر پر ایک کڈنیپر کا فون آیا تھا مراد بھائی! اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں شانی کی زندگی چاہتی ہوں تو دو کروڑ کی رقم اور اپنے سارے زیورات ایک جگہ رکھ کر اس کی دوسری کال کا انتظار کروں۔ میں نے اسے بتایا کہ جواد کی حالت سیریس ہونے کی وجہ سے اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکتا البتہ اپنی جیولری اور گھر میں موجود پینسٹھ لاکھ روپے میں پہلے ہی ایک بریف کیس میں رکھ چکی ہوں، اگر وہ کہے تو میں یہ چیزیں اس کی مرضی کی جگہ پر ابھی پہنچا دیتی ہوں۔ رقم کے معاملے پر تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن وصولی کے لیے فوری طور پر راضی نہیں ہوا اور کہا کہ وصولی کا وقت اور طریقہ کار وہ خود بعد میں بتائے گا۔'' جلدی جلدی یہ سب مراد کے گوش گزار کرنے کے چکر میں نائلہ کی سانس پھولنے لگی تھی۔

''اچھی بات ہے آپ انتظار کریں کال کا۔ یہاں میں جواد کا خیال رکھنے کے لیے موجود ہوں۔'' مراد نے نرم لہجے میں اسے جواب دیا۔

''تھینک یو سو مچ مراد بھائی! آپ کی موجودگی سے مجھے بہت سہارا ملا ہے۔ ورنہ ان حالات میں مجھ اکیلی عورت کے لیے سب کچھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔'' ممنونیت سے یہ جملے ادا کرتی نائلہ کی آواز مراد کو بھیگی بھیگی سی محسوس ہوئی۔ یوں جیسے وہ رو رہی ہو۔ ایک ایسی عورت جو اپنے شوہر کی موت کی متمنی تھی کیونکر رو سکتی تھی؟ مراد کے دل میں سوال ابھرا اور پھر اس نے اسے نائلہ کی اداکاری قرار دے کر خود کو مطمئن کر لیا۔

''میں جو کچھ کر رہا ہوں' اس کے لیے آپ کو میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک دوست کا فرض ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے دوست کے کام آئے اور آپ دیکھیے گا کہ میں کس حد تک اس دوستی کو نبھاتا ہوں۔'' آخر میں مراد کا لہجہ کچھ معنی خیز ہو گیا تھا جسے نائلہ سمجھ نہیں پائی اور چند ایک رسمی جملے ادا کر کے فون بند کر دیا۔

مراد، ساجد کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اسے نائلہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کرتا رہا۔ ساجد نے توجہ سے اس کی بات سنی۔ اس کے بعد اس نے جواد سے ایک مختصر ملاقات کی اور مراد کو حتمی کارروائی کی یقین دہانی کرواتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مراد، جواد کے پاس ہی رک گیا، آگے جو بھی کارروائی ہونی تھی' وہ ساجد کے محکمے کے لوگوں ہی کو کرنی تھی اور وہ صرف یہاں بیٹھ کر انتظار ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''اوہ تو یہ جعلی عامل فیضان شاہ اور جواد احمد کی بیوی نائلہ ماضی میں پڑوسی رہ چکے ہیں یعنی ان کا تعلق بہت پرانا ہے۔'' ساجد کے ماتحت مکرم نے اس کے سامنے فیضان شاہ سے متعلق معلومات پر مشتمل پرچہ رکھا تو وہ چونک گیا۔ نائلہ کے متعلق اہم معلومات وہ جواد سے حاصل کر چکا تھا اور اس نے فوراً ہی یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ فیضان اور نائلہ ماضی میں پڑوسی رہ چکے ہیں۔

''یس سر! وہی پرانی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً ماضی میں دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں گے لیکن دولت کی خاطر نائلہ نے جواد احمد سے شادی کر لی اور اب جبکہ اس کے میکے کے حالات سنور چکے ہیں اسے جواد احمد کا ساتھ بوجھ لگنے لگا ہو گا۔ اسی لیے اس نے جواد احمد سے جان چھڑا کر اس کی دولت پر قابض ہونے کی یہ راہ نکالی۔ اس کا یار عامل فیضان اس منصوبے میں اس کا ساتھی اور مددگار ہو گا۔ جو شخص دولت کے حصول کے لیے جعلی عامل بن کر بیٹھ سکتا ہے وہ اس قسم کی پلاننگ بھی کر سکتا ہے۔'' مکرم نے ڈی ایس پی ساجد کی تائید کی۔

''کیا خیال ہے پھر ڈائریکٹ ایکشن لے لیں۔ تھانے میں الٹا لٹکا کر چھترول کرنا اس جعلی عامل پر تو سب سچ اگل دے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس نے بچے کو بھی اپنے آستانے پر ہی کہیں رکھا ہوا ہوگا۔ تلاشی لینے پر بچہ وہاں سے بازیاب ہو جائے گا۔'' ساجد اب کچھ کر گزرنے کے موڈ میں تھا۔

''میرے خیال میں خاموشی سے سادہ لباس والوں کے ساتھ ریڈ کرنا ٹھیک رہے گا۔ سر! ہمیں مغوی کے تحفظ کا ہر حال میں خیال رکھنا ہے۔'' مکرم نے اپنے افسر کی توجہ اہم امر کی طرف دلوائی۔

''بالکل ٹھیک۔ ہم سادہ لباس میں ہی وہاں جائیں گے۔ اس علاقے کے ایس ایچ او کو بھی ساتھ لے لیتا لیکن اسے وہاں پہنچ کر ہی کال کرنا۔ ایسے جعلی عامل وغیرہ علاقے کے تھانے میں پابندی سے نذرانے بھیجتے ہیں۔ ان نذرانوں کا حق ادا کرنے کے لیے کہیں ایس ایچ او خود ہی مخبری نہ کر دے۔'' ساجد نے خدشے کا اظہار کیا۔

''آپ بے فکر رہیں سر! مجھے ساری باریکیوں کا علم ہے۔ کارروائی نہایت رازداری اور ہوشیاری سے کی جائے گی۔'' مکرم نے یقین دہانی کروائی۔

''جواد احمد کے گھر کی نگرانی تو ہو رہی ہے نا۔ اس کی بیوی کو وہاں سے نکلنے نہیں دینا ہے۔ فیضان کی گرفتاری کے بعد اس کی گرفتاری بھی ضروری ہو جائے گی۔''

''میں نے اپنے دو نہایت ہوشیار بندے وہاں لگائے ہوئے ہیں۔ وہ نائلہ تو کیا وہاں سے کسی ملازم کو بھی باہر نہیں نکلنے دیں گے۔'' مکرم بہت پُراعتماد تھا۔

''گڈ! تو تیاری کرو۔ ہم آدھے گھنٹے میں روانہ ہو جائیں گے۔ کافی رات ہو چکی ہے۔ آستانے پر ریڈ کے لیے یہ وقت خاصا مناسب رہے گا۔ ہم بے خبری میں ان لوگوں کو جالیں گے۔'' ساجد نے حتمی حکم سنا دیا۔ تھانے میں ریڈ سے پہلے کی روایتی ہلچل مچ گئی۔ ساجد اور مکرم کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ کہاں ریڈ کے لیے جا رہے ہیں۔ سادہ لباس میں روانگی کی ہدایت سے البتہ سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اہم معاملہ ہے۔ دوسرے افراد کی طرح خود ساجد نے بھی وردی نہیں پہنی تھی۔ وہ اور مکرم مسکسل عام لباس میں تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ دو گاڑیوں میں فیضان شاہ کے آستانے کی طرف روانہ

ہوئے۔ آستانے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی گاڑیاں روک لیں اور مکرم نے علاقے کے تھانے کا نمبر ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی اور کسی نے غنودہ آواز میں ''ہیلو'' کہا۔

''ڈی ایس پی ساجد اقبال بات کریں گے۔ تھانہ ایس ایچ او سے بات کرواؤ۔'' مکرم نے تحکمانہ لہجے میں فون اٹھانے والے سے کہا۔

''صاحب تو گشت پر ہیں۔'' فون اٹھانے والے کی نیند فوراً اڑن چھو ہوگئی اور اس نے بڑے چوکس لب و لہجے میں وہی روایتی جواب دیا جو تھانہ انچارج کی غیر حاضری کی صورت میں اس کے ماتحت دیا کرتے ہیں۔

''اپنے صاحب سے رابطہ کر کے اسے بتاؤ کہ ہم اس کے علاقے میں ایک جگہ کارروائی ڈال رہے ہیں بعد میں وہ شکایت نہ کرتا پھرے کہ اس کو بتایا نہیں گیا۔'' مکرم کا لہجہ اکھڑ اور طنزیہ تھا۔

''کہاں کارروائی ڈال رہے ہیں آپ لوگ؟'' دوسری طرف سے تیزی سے پوچھا گیا۔

''تمہارا تعارف کیا ہے چاند؟'' مکرم نے استہزائیہ لہجے میں دریافت کیا۔

''میں اے ایس آئی انوار بیگ بات کر رہا ہوں۔'' صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مکرم کے لب و لہجے نے اس شخص کو خاصا کنفیوز کر دیا ہے لیکن وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کی اپنی سی سعی کر رہا ہے۔

''تو جناب عالی اے ایس آئی انوار بیگ صاحب آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ بڑا کانفیڈنشل معاملہ ہے جس کے بارے میں صرف آپ کے انچارج صاحب کو ہی آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر آپ ان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان سے ہماری بات کروا دیجیے گا ورنہ پہلے کی طرح چین کی نیند سو جایئے گا۔ ہمیں جو کارروائی کرنی ہے کر کے خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ امید ہے میرا نمبر تو آپ کو سی ایل آئی پر مل ہی جائے گا۔'' اپنی بات کہہ کر مکرم نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ دوسری طرف وہ اے ایس آئی انوار بیگ تو اپنی جگہ ہکا بکا ہی رہ گیا ہوگا۔

''چلیں سر! یہ تو قصہ ہی مک گیا۔ جب تک یہ اے ایس آئی انوار بیگ اپنے افسر سے رابطہ کر کے اسے اطلاع دے گا ہم اپنا کام پورا کر لیں گے بلکہ درمیان میں اگر علاقہ ایس ایچ او کی کال آئی بھی تو میں ریسیو نہیں کروں گا۔ بعد میں کہہ دیں گے کہ کارروائی کے دوران کال ریسیو کرنے کی مہلت نہیں ملی۔'' مکرم خاصا گرگ باراں دیدہ پولیس والا تھا اور اسے پبلک کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو چکما دینے کا ہنر بھی آتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا معترف ساجد اس کی بات سن کر مسکرایا اور اشارے سے چلنے کی اجازت دے دی۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی رکی ہوئی گاڑیاں حرکت میں آگئیں اور اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگیں۔

☆☆☆

''مستان!'' فیضان شاہ کی آواز کی گونج پورے آستانے پر سنی گئی۔ ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ میں چرس بھرتا مستان اپنا کام بھول گیا اور سٹپٹا کر اس کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کمرے میں فیضان شاہ کے علاوہ علاقے کا ایس ایچ او نوید کاظمی بھی موجود تھا۔ اس کے سامنے رکھی میز بے شمار لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور ان لوازمات کا انتظام کرنے میں مستان پیش پیش رہا تھا۔ علاقہ ایس ایچ او سے بنا کر رکھنا ان کی سب سے بڑی ضرورت تھی اس لیے وہ اسے خوش رکھنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اب بھی فیضان شاہ کی جلالی آواز سن کر مستان کو یہ گمان ہوا تھا کہ شاید ایس ایچ او کو کسی معاملے میں شکایت ہوگئی ہے چنانچہ وہ گرتا پڑتا گھبرایا ہوا ملاقات کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اندر پہنچتے ہی اس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ ایس ایچ او کے سامنے رکھے لوازمات کی مقدار میں خاطر خواہ کمی ہو چکی تھی اور اس وقت وہ پیر پسارے کولڈ ڈرنک سے شغل کر رہا تھا۔ شغل شاید وہ دیگر چیزوں سے بھی کرتا ہو لیکن آستانے کی حدود میں ان چیزوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ مستان سمیت یہاں موجود جو چند ایک لوگ چرس وغیرہ کے شوقین تھے، وہ چوری چھپے ہی اپنا یہ شوق پورا کرتے تھے اور کسی کو کھلے عام ایسی چیزوں کے استعمال کی اجازت نہیں تھی۔

''حکم سائیں۔'' ماحول سے کسی بات کا اندازہ نہ کر پانے کے بعد مستان نے مسکین سے لہجے میں فیضان شاہ سے دریافت کیا۔

''ایس ایچ او صاحب تمہاری شکایت لے کر آئے ہیں اور شکایت خاصی سنگین ہے۔'' فیضان شاہ نے مستان کو گھورتے ہوئے اس سے کہا۔

''کیسی شکایت سائیں؟ میں تو پابندی سے صاحب کو تحفے اور نذرانے پہنچاتا رہتا ہوں، آپ جانتے ہو میں ہیرا پھیری کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔'' مستان کے چہرے کی مسکینی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''ایسی کوئی شکایت کی بھی نہیں ہے کاظمی صاحب نے۔ یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ جس نے میری بھی آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم مجھ سے بالا ہی بالا.... کچھ دھندے کرتے پھر رہے ہو۔'' فیضان شاہ کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی تپش تھی۔

''توبہ سائیں توبہ! میری ایسی مجال کہاں؟'' مستان فوراً اپنے گال پیٹنے لگا۔

''اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم دو دن پہلے ہفتے کی رات کو کہاں تھے؟'' فیضان شاہ نے اپنی نظریں مستان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اس بار مستان گڑبڑا گیا اور نظریں چرانے لگا۔ اس کے انداز پر فیضان شاہ کے ہونٹوں پر ایک زہرخندسی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر وہ نفرت زدہ لہجے میں بولا۔

''مجھے تم سے اتنی گراوٹ کی امید نہیں تھی مستان! تم نے میرے اعتماد کو ہی دھوکا نہیں دیا ہے بلکہ انسانیت سے بھی بہت زیادہ گری ہوئی حرکت کی ہے۔ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''معاف کر دیں سائیں! میں تھوڑا لالچ اور تھوڑا آپ کی محبت میں ایسی حرکت کر بیٹھا۔'' مستان اس کی بات سمجھ کر کانپنے لگا اور فوراً ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور انسپکٹر مکرم ریوالور ہاتھ میں لیے سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ڈی ایس پی ساجد اور دو مزید سادہ پوش موجود تھے۔ ساجد نے اپنا ریوالور ہولسٹر سے نہیں نکالا تھا اور بڑے اطمینان سے کمرے میں داخل ہو کر ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور اس طرح بدمعاشوں کی طرح اندر کیوں گھس آئے ہو؟'' مسلح افراد کو اس طرح اندر گھستے دیکھ کر فیضان بھی گھبرا گیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''خبردار! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ہم وہ ہیں جن کی بدمعاشی سے بڑے بڑے بدمعاشوں کی روح کانپتی ہے کیونکہ ہم ان کی بدمعاشی ناک کے راستے نکالنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' مکرم نے گرج کر فیضان کو ٹوکا اور پھر استہزائیہ نظروں سے علاقہ ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو جناب یہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ لگتا ہے موبائل بھی آف ہے جب ہی بے چارہ اے ایس آئی انوار بیگ بروقت ''صاحب'' کو مطلع نہیں کر سکا۔''

''میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے اس لیے آف پڑا ہے۔ ویسے میں ڈیوٹی پر ہی ہوں اور یہاں سے سیدھا تھانے ہی جاؤں گا۔'' ایس ایچ او نوید کاظمی جو سادہ لباس کے باوجود اپنے محکمے کے لوگوں کو پہچان کر اضطراری طور پر کھڑا ہو گیا تھا صفائی دینے کے انداز میں بولا۔ حقیقتاً اسے مکرم کی اتنی پروا نہیں تھی لیکن ڈی ایس پی ساجد کی موجودگی کی وجہ سے ذرا ادب کر بات کر رہا تھا۔

''جناب کی ڈیوٹی کی نوعیت کا ہمیں بھی اندازہ ہے۔ اگر تم ڈھنگ سے ڈیوٹی کر رہے ہوتے تو علاقے میں تمہاری ناک کے نیچے ایسے تماشے نہیں ہو رہے ہوتے۔'' مکرم کے لہجے میں طنز کی آمیزش میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''کوئی مجھے بتائے گا کہ یہاں میرے آستانے پر آخر کیا ہو رہا ہے؟'' ان کی آپس کی گفتگو سے فیضان شاہ کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ آنے والوں کا تعلق پولیس کے محکمے سے ہی ہے۔ اسے باہر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اس لیے وہ مضطرب سے لہجے میں سوال کر بیٹھا تھا۔

''تمہیں تو ہم بعد میں پوچھتے ہیں۔ ایک طرف تم جعلی پیری فقیری کا دھندا چلا رہے ہو اور دوسری طرف اغوا برائے تاوان کی وارداتیں کرتے پھرتے ہو۔'' مکرم نے کڑک کر اسے جھاڑا۔

''اوہ مائی گاڈ! آپ لوگ اس چکر میں یہاں آئے ہیں۔ دیکھ لو خبیث مستان تمہاری کرنی میری اتنے عرصے کی محنت پر کیسے پانی پھیرنے لگی ہے۔'' فیضان شاہ نے پہلے اپنا سر تھاما پھر غصے سے مستان پر الٹ پڑا۔ مستان میں تو اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ پاتا۔ وہ بس لب کچل کر رہ گیا۔

''یہاں کچھ نہیں ملا سر! ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، کوئی انسان کا بچہ تو دور کی بات یہاں کسی چوہے کے بچے کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں۔'' اسی وقت ایک سپاہی نے اندر آ کر رپورٹ پیش کی۔

''ٹھیک ہے۔ اب یہ لوگ خود بتائیں گے کہ بچہ کہاں ہے؟'' مکرم نے کینہ توز نظروں سے فیضان شاہ کو گھورا تو وہ اندر ہی اندر کانپ گیا لیکن خود کو سنبھال کر رسان سے بولا۔

''اگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں سر اور کچھ اپنی اور کچھ میری سنیں تو صورتِ حال زیادہ واضح ہو جائے گی۔''

''اطمینان سے بیٹھنا اب تیرے نصیب میں نہیں ہے

بچو، اب تو تھانے میں الٹا لٹک کر ہی ہمارے سوالوں کے جواب دے گا۔'' اس کے مہذبانہ لہجے کا مکرم پر کوئی اثر نہیں ہوا اور غضبناک انداز میں اسے جواب دیا۔

''میرے خیال میں اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں فیضان شاہ کی بات بہرحال سن لینی چاہیے۔'' اس بار ایس ایچ او نوید کاظمی نے بھی فیضان کی حمایت کی۔ اس کی سفارش پر مکرم نے کاٹ دار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس پر زبان سے طنز کا کوئی وار بھی کر ڈالتا لیکن پھر ساجد کا اشارہ پا کر ٹھنڈا پڑ گیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے گویا گفتگو کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

اس رات پولیس والے فیضان شاہ کے آستانے سے روانہ ہوئے تو ان کی گاڑی میں فیضان شاہ کے علاوہ مستان بھی سوار تھا۔ علاقہ ایس ایچ او نوید کاظمی سے مکرم کے سلوک میں تبدیلی آگئی تھی اور وہ خاصے دوستانہ انداز میں اس سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ آستانے سے روانہ ہو کر پولیس کی ایک گاڑی تو سیدھی تھانے کی طرف چلی گئی جبکہ دوسری گاڑی نے ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کا رخ کیا تھا۔ ساجد اس گاڑی میں سوار تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ جس کام کے لیے وہ لوگ جا رہے ہیں، وہ مکرم کی سرپرستی میں بخیر و خوبی انجام پا جائے گا۔ مکرم ان کے ڈپارٹمنٹ کا ایک نہایت چست اور فرض شناس افسر تھا جس کی کارکردگی پر کبھی کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔ بلڈنگ کے چوکیدار کو اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا کر وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ لفٹ کے ذریعے پھرتی سے تیسری منزل پر واقع فلیٹ نمبر چوبیس تک پہنچا اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ردعمل میں فوراً ہی اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' کسی نے دروازے کے قریب آ کر سراسیمہ لہجے میں دریافت کیا۔

''پولیس، دروازہ کھولو ورنہ ہم لاک توڑ کر بھی اندر آ سکتے ہیں۔'' مکرم نے سخت لہجے میں حکم دیا۔ اس حکم پر لمحہ بھر کے لیے اندر سناٹا چھا گیا پھر آہستہ سے لاک کھول دیا گیا۔ مکرم اور اس کے ساتھی پوزیشن لے کر تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ فوراً ہی ان کا سامنا ایک بیس بائیس سالہ لڑکے سے ہوا جس کے شانے شکست خوردہ انداز میں جھکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی تب بھی اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر ایک کمرے میں انہیں شانی ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ سوتا ہوا مل گیا۔

اس کمرے میں ایک کتا بھی موجود تھا جو رسی سے بندھا ہوا تھا لیکن اس کی یہاں موجودگی کی وجہ مکرم سمجھ سکتا تھا۔ جواد سے ساجد نے جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق شانی کتوں سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ کسی قسم کی مزاحمت یا شور شرابے کی کوشش نہ کرے یقیناً اسی لیے اسے دھمکانے کے لیے اس کے کمرے میں یہ کتا باندھا گیا تھا۔ شانی کو مکرم نے اس تصویر کی وجہ سے شناخت کیا تھا جو ساجد نے جواد کے موبائل سے حاصل کی تھی۔ وہ انہیں بالکل ٹھیک حالت میں ملا تھا اور اس کے جسم پر ایک خراش تک موجود نہیں تھی۔ بچے کی بازیابی اور اصل مجرم کی گرفتاری کی توقع سے بھی زیادہ اہم مہم سے نمٹ کر پولیس پارٹی تھانے کے لیے روانہ ہوئی تو پو پھٹنے کا وقت ہو چکا تھا اور شاید یہ پولیس کی کارکردگی کا ایک مثالی ریکارڈ تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مغوی کی بازیابی کے علاوہ مجرم کی گرفتاری بھی عمل میں آچکی تھی۔ راستے ہی میں مکرم نے اپنے ایک ماتحت کو کال کی۔ وہ جواد احمد کے گھر کی نگرانی پر مامور تھا۔ مکرم نے اپنے ماتحت کو جواد احمد کے گھر سے ایک فرد کی گرفتاری کا حکم صادر کیا تو گاڑی میں بیٹھے ہتھکڑی پہنے شخص کا چہرہ مزید بجھ گیا۔

''اب کیوں اُداس بیٹھے ہو میرے چاند! اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' مکرم نے اس کی حالت دیکھ کر اسے چھیڑا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر مزید جھکا کر بیٹھ گیا۔ مکرم کو محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکی نکلی ہے۔ اس کے دل میں نوجوان کے لیے تاسف کی لہر سی اٹھی لیکن وہ سوائے افسوس کرنے کے کر بھی کیا سکتا تھا۔ نوجوان نے جذبات میں آ کر جو غلطی کی تھی، اسے اس کی سزا تو بہرحال بھگتنی ہی تھی۔

☆☆☆

نائلہ نے جواد احمد کے کمرے میں قدم رکھا تو وہاں موجود اجنبی چہروں کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ صبح فجر کے وقت اسے مراد کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس نے اسے پیغام دیا تھا کہ جواد اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ اسپتال آجائے۔ اس نے نائلہ کو لینے ڈرائیور کو بھی بھیج دیا تھا اور اب وہ جواد کے کمرے میں کھڑی الجھی ہوئی نظروں سے ایک ایک کے چہرے کو تک رہی تھی۔ ابھی تو اس کی یہ الجھن ہی دور نہیں ہوئی تھی کہ پولیس صبح فجر سے بھی پہلے ان کے ملازم افضل کو کیوں گرفتار کر کے لے گئی تھی اور اب یہاں کچھ اجنبی صورتیں اس کی الجھن میں اضافے کے لیے موجود

تھیں۔

''یہاں میرے پاس آجاؤ نیلی! میں ابھی ان لوگوں سے تمہارا تعارف کروادیتا ہوں۔'' جواد کی نرم آواز کمرے میں اُبھری تو وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس وقت بستر کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد موجود کمزوری اور بیماری کا پتا دینے والے حلقوں کے باوجود اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی بشاشت نظر آرہی تھی۔ اس کے مقابلے میں نائلہ کا چہرہ بے حد ستا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عجلت میں بے دلی سے صرف کپڑے بدل کر وہاں آگئی ہے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے میک اَپ کے آثار نہیں تھے اور بال بھی یونہی سرسری سا برش مار کر ایک کیچر میں سمیٹ لیے گئے تھے۔

''یہاں میرے برابر میں ہی بیٹھ جاؤ۔'' جواد احمد نے اپنے بائیں پہلو کی طرف اشارہ کیا تو وہ وہاں ٹک گئی۔

''یہ ڈی ایس پی ساجد ہیں جو مراد کے کزن بھی ہوتے ہیں اور یہ انسپکٹر مکرم ہیں جنہیں صحیح معنوں میں پولیس ڈپارٹمنٹ کی آبرو قرار دیا جاسکتا ہے۔'' جواد نے خوش دلی سے کمرے میں موجود اجنبی چہروں کا تعارف کروانا شروع کیا تو نائلہ نے تڑپ کر شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ نظروں میں شکایت کے ساتھ ساتھ خوف بھی موجود تھا۔ شاید اسے اغواکاروں کی دھمکی یاد آگئی تھی کہ پولیس کو ملوث کرنے کی صورت میں شانی کی زندگی کے لیے خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواد نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور مکرم سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میرے خیال میں انسپکٹر صاحب آپ ہی ساری تفصیل بیان کریں۔ ابھی بہت سی باتیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں۔ اچھا ہو گا کہ آپ ساری الجھنوں کو دور کر دیں۔''

''تفصیلات تو میں یقینا بیان کردوں گا جواد صاحب لیکن کچھ بھی بتانے سے پہلے میں آپ سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ آپ اس داستان کو سنتے ہوئے اس بات کا لحاظ رکھیں گے کہ بعض جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں جن پر انسان کا خود بھی اختیار نہیں ہوتا ہے بلکہ میرے حساب سے تو اس کا تصور قابلِ گرفت ہی نہیں ہوتا کہ دل کی بے اختیاری پر کسی کا اختیار ہی نہیں چلتا۔'' مکرم نے دزدیدہ نظروں سے نائلہ کو دیکھتے ہوئے تمہید باندھی۔

''آپ اطمینان سے بات کیجیے انسپکٹر صاحب! میں ایک میچور آدمی ہوں اور ایسی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' جواد نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ پُرسوچ انداز میں ذرا سا کھنکھارا پھر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔

''یہ کہانی ایک لڑکی کے اپنے گھر والوں کے لیے ایثار سے شروع ہوتی ہے۔ اپنے گھر والوں کو معاشی طور پر سپورٹ کرنے کے لیے وہ لڑکی نہ صرف اپنے سے کہیں بڑی عمر کے دولت مند آدمی سے شادی کرلیتی ہے بلکہ اس چکر میں اپنے بچپن کی محبت سے بھی دستبردار ہونا قبول کر لیتی ہے۔ اس کے اس عمل میں کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا لیکن یہ اس کی بے بسی اور بے اختیاری تھی کہ شوہر کی وفادار ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے سابقہ محبوب کو بہرحال فراموش نہیں کرسکی اور جب زندگی میں ایک نازک صورتِ حال سے دوچار ہوئی تو خود کو اپنے محبوب کو پکارنے سے نہیں روک سکی۔ عورت کی فطرت میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ جس سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہے اسی سے سب سے زیادہ امید بھی رکھتی ہے۔ اس عورت کو بھی ایسا لگا کہ اس کے مشکل حالات میں اس کا محبوب ضرور اس کی مدد کرے گا اور اس کا یہ یقین اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ ماضی میں غریب اور بے اختیار اس کا محبوب جعل سازی ہی کے ذریعے سہی ایک اہم مقام حاصل کرچکا تھا اور مشکل وقت میں لڑکی کی مدد کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس شخص کے تعاون نے ہمارے کام کو آسان بنانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن بہرحال اسے کچھ عرصہ جعل سازی کے جرم میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے وقت گزارنا پڑے گا بعد میں ہم خود کوشش کریں گے کہ وہ باعزت اور اچھا روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ بہرحال یہ بعد کی باتیں ہیں فی الحال میں اس معاملے کے اہم پہلوؤں کو بیان کرتا ہوں۔ تو اصل بات یہ ہے کہ یہ صرف ایک لڑکے اور لڑکی کی بے مثل محبت کی کہانی ہی نہیں ہے۔ یہ ایک بھائی کی اپنی بہن سے بے تحاشا محبت کی بھی کہانی ہے۔ وہ بھائی عمر میں اپنی بہن سے کافی چھوٹا ہے لیکن اس بات کا بہرحال ادراک رکھتا ہے کہ اس کی بہن نے ان کی زندگیاں سنوارنے کے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ بہن کی اس قربانی کے بوجھ تلے دبا وہ بہن کو اس کے حصے کی خوشیاں دینے کا شدت سے خواہاں ہے اور اس خواہش میں ایک سنگین جرم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ گھر کا بھیدی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے طور پر ایک ایسا

منصوبہ تیار کرتا ہے جس کی مدد سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ بہن کو اس کے عمر رسیدہ شوہر سے جان چھڑانے اور دولت سے محروم نہ ہونے کے لیے بڑی ہوشیاری سے ایک منصوبہ بناتا ہے اور بہنوئی کے اکلوتے بیٹے کو اغوا کروا لیتا ہے۔ بظاہر یہ اغوا برائے تاوان کی واردات ہے لیکن اصل مقصد بہنوئی کو ذہنی اذیت دے کر ہلاک کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک خاص ترکیب استعمال کرتا ہے۔ اس ترکیب پر عمل کے لیے وہ پہلے سے عامل فیضان شاہ کے آستانے پر دوستیاں گانٹھ لیتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس طرح کے آستانوں پر لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے قبرستانوں میں چلے کاٹنے اور قبروں میں راتیں گزارنے جیسے ڈرامے کیے جاتے ہیں اس لیے آستانے والوں کے گورکنوں وغیرہ سے اچھے تعلقات ہوتے ہیں اور ان کی قبرستانوں میں آمدورفت پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ وہ لڑکا بہنوئی کے بیٹے کو اغوا کروانے سے پہلے حال ہی میں مرنے والے ایک بچے کی لاش حاصل کر کے اس کے کچھ اعضا کاٹ کر اپنے پاس ایک محلول میں محفوظ کر لیتا ہے اور وقتاً فوقتاً ان اعضا کو بہنوئی تک پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہے تاکہ اسے دھچکے پر دھچکا لگتا رہے اور صدمے سے خود بخود اس کی جان چلی جائے۔ ان محفوظ شدہ اعضا پر وہ مرغی کا تازہ خون لگا کر یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کرتا ہے کہ ان اعضا کو ابھی بچے کے جسم سے کاٹا گیا ہے۔ اس کا ہر کام منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا لیکن بہنوئی کے دوست مراد کی غیر متوقع آمد نے سب گڑبڑ کر دی۔ مراد نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے دوست کو جو انسانی اعضا بھیجے جا رہے ہیں وہ کسی کیمیکل میں محفوظ شدہ ہیں۔ گھر والوں کی مرضی نہ ہونے کے باوجود مراد خفیہ طور پر اپنے کزن ڈی ایس پی ساجد سے رابطہ کر لیتا ہے اور اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ انسانی اعضا کئی دن سے الکحل میں محفوظ شدہ ہیں اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ شانی کے اعضا ہوں۔ مراد یہ حقیقت جواد پر بھی افشاں کر دیتا ہے جس کے باعث جواد کی حالت سنبھل جاتی ہے لیکن حالات و واقعات ایسے ہیں کہ سب سے زیادہ مسز جواد شک کی زد میں آ جاتی ہیں۔ تفتیش و تحقیق کے نتیجے میں عامل فیضان شاہ کا نام سامنے آتا ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ فیضان شاہ ماضی میں مسز جواد کا پڑوسی رہ چکا ہے۔ مسز جواد کے اس سے حالیہ رابطوں کا بھی موبائل کمپنی کے ریکارڈ سے علم ہو جاتا ہے اس لیے شک مزید قوی ہو جاتا ہے اور پولیس فیضان شاہ پر ہاتھ ڈالنے کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے۔ پولیس آستانے پر ریڈ کرتی ہے تو فیضان شاہ کے ساتھ علاقے کا ایس ایچ او بھی وہیں پایا جاتا ہے۔ وہاں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فیضان شاہ تو اصل میں خود مسز جواد کی درخواست پر شانی کی بازیابی کے سلسلے میں اپنے طور پر کوشش کر رہا ہے۔ مسز جواد سے کٹی ہوئی انگلی کا نمونہ منگوا کر وہ اور ایس ایچ او نوید اقبال بھی یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ یہ انگلی کئی دن پہلے کاٹ کر محفوظ کی گئی ہے۔ ایس ایچ او نوید اقبال تیزی سے تحقیق و تفتیش کرتا ہے تو اسے علم ہوتا ہے کہ مستان نامی شخص نے جو فیضان شاہ کے آستانے پر کام کرتا ہے چلہ کاٹنے کے بہانے حال ہی میں مرنے والے ایک بچے کی قبر کھود کر اس کے چند اعضا کاٹ لیے تھے لیکن گورکن سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی اور مستان نے رقم دے کر اسے منہ بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال پولیس کی انکوائری پر گورکن کو اپنا منہ کھولنا پڑا اور یوں اس کھیل کی ساری کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ مستان نے اعتراف کر لیا کہ اس نے توقیر نامی لڑکے کے کہنے پر اچھی خاصی رقم کے عوض اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ توقیر نے جواد احمد کے ملازم افضل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا لیکن افضل کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اسے اندر کی رپورٹ دیتا رہے اور اس بات سے ہوشیار رکھے کہ کہیں پولیس سے رابطہ تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ افضل کو ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی کیونکہ مراد نے اس بات کو کسی پر ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا اور مسلسل یہ ظاہر کر رہا تھا کہ جواد احمد کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس تاثر سے توقیر کو اپنی کامیابی بہت قریب نظر آ رہی تھی اور وہ بہت اطمینان سے اس اپارٹمنٹ میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں اس نے شانی کو رکھا تھا۔ پولیس کو اس اپارٹمنٹ کا پتا مستان سے ملا اور پولیس پارٹی نے وہاں ریڈ کر کے نہایت آسانی سے بچے کی بازیابی کے ساتھ مجرم کی گرفتاری کا کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اس اپارٹمنٹ میں توقیر نے مستان کی بڑی بہن کو بچے کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی بچے کو خوف زدہ رکھنے کے لیے ایک کتا بھی موجود تھا۔ توقیر جانتا تھا کہ شانی کتوں سے ڈرتا ہے اسی لیے اسے اغوا کرنے اور بعد میں قابو میں رکھنے کے لیے اس نے بڑی چالاکی سے کتے کا استعمال کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے یہ سب بہن کو اس کی خوشیاں لوٹانے کے لیے کیا تھا اور اس کا شانی کو نقصان

پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن سچ مچ شانی سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ بہن کی فیضان شاہ سے محبت سے بھی واقف تھا لیکن اس نکتے کو نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس کی بہن کے دل میں بے شک فیضان شاہ کی محبت ہے لیکن ہر مشرقی عورت کی طرح وہ اپنے شوہر کی وفادار ہے اور اسے اپنا محسن بھی سمجھتی ہے اس لیے اسے کوئی نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس نکتے کو فیضان شاہ سمجھتا تھا اس لیے اس نے کبھی جواد احمد کو کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا تک نہیں تھا جبکہ توقیر اپنی جذباتیت میں نہ صرف اتنا بڑا قدم اٹھا گیا بلکہ اپنے لیے گڑھا بھی کھود بیٹھا۔ اب وہ اور اس کے ساتھ دوسرے کئی لوگ حوالات میں بند ہیں اور انہیں ان کے جرم کی شدت کے اعتبار سے عدالت سے مختلف سزائیں دی جائیں گی۔'' مکرم اپنی بات ختم کر کے خاموش ہوا تو کمرے میں ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ اس خاموشی کو نائلہ کی سسکیوں نے توڑا۔ وہ اب تک آنکھیں پھاڑے صدمے کی کیفیت میں سب سُن رہی تھی لیکن اب اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''حوصلے سے کام لو نیلی! میں پوری کوشش کروں گا کہ توقیر کو زیادہ سخت سزا نہ ملے۔'' جواد نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''مجھے توقیر سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔ امی اور ابو کو علم ہوگا تو وہ سخت صدمے میں مبتلا ہو جائیں گے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

''ہم معذرت خواہ ہیں مسز جواد لیکن اس طرح کے کیسز میں متعلقین کو اس اذیت سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے۔ توقیر نے جو کچھ کیا، بے شک اس میں اس کی جذباتیت اور حماقت کا دخل تھا لیکن بہرحال وہ سنگین نوعیت کے جرائم کا مرتکب ہوا ہے۔ کسی مرے ہوئے بچے کی قبر کھدوا کر اس کے اعضا کاٹنا اور کسی شخص کی موت کا سامان کرنا اتنے معمولی جرائم نہیں ہیں جنہیں نظرانداز کیا جا سکے۔ جواد صاحب کی سفارش پر بے شک ہم نرم چالان بنائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ سزا تو آپ کے بھائی کو بھگتنی ہی پڑے گی۔'' ساجد نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے نائلہ پر حقیقت عیاں کی تو اس نے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آنسو صاف کر لیے اور ساجد کی طرف دیکھ کر بولی۔

''آپ اپنا فرض ادا کیجیے ڈی ایس پی صاحب! میں آپ کے فرض کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کرنا چاہتی لیکن ایک بہن کی حیثیت سے مجھے اپنے بھائی کے لیے دکھی ہونے کا تو حق ہے نا، وہ بھی ایسے بھائی کے لیے جو میری ہی خاطر یہ سب کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ میں ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی جیسا وہ سوچ رہا تھا۔''

''میں اچھی طرح سب سمجھتا ہوں مسز جواد! بہرحال آپ اپنے بیٹے سے ملاقات کر لیں، وہ بہت شدت سے آپ کو یاد کر رہا ہے۔'' ساجد نے نرمی سے جواب دیتے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے شانی ایک سپاہی کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نائلہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ شانی دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور نائلہ نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی لیکن اس بار اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

''اب ہمیں اجازت دو مراد! تمہاری بھابی کے فون پر فون آ رہے ہیں۔ رات پھر میرے گھر سے غائب رہنے پر وہ میری طرف سے سخت مشکوک ہو چکی ہوگی۔ میں تو یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا البتہ مکرم کو تھانے جا کر ابھی کچھ کام نمٹانے ہوں گے۔'' ڈی ایس پی ساجد اچانک ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مراد سے بات کرتے کرتے آخر میں انسپکٹر مکرم کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

''نو پرابلم سر! میری بیوی میرے راتوں کو گھر سے غائب رہنے کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اگر کسی رات میں گھر پر موجود رہوں تو اسے تشویش ہونے لگتی ہے۔'' مکرم نے کہا تو سب ہنس پڑے پھر وہ لوگ مراد اور جواد احمد سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

''اب آپ لوگ مجھے بھی اجازت دیجیے۔ میری بیوی کو بے شک مجھ پر کوئی شک نہیں ہے لیکن وہ پریشان ضرور ہے کہ میں کل دوپہر سے کس چکر میں پڑ کے گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ جواد کے اسپتال سے ڈسچارج ہو جانے پر انشاء اللہ میں بہن کی شادی کا کارڈ دینے اپنی وائف کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔ میرے خیال میں آج شام تک جواد کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔'' ساجد اور مکرم کی روانگی کے بعد مراد بھی جانے کے لیے پَر تولنے لگا۔

''میری ڈاکٹر سے بات ہو گئی ہے۔ شام سے پہلے ہی مجھے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ تم آج رات کے کھانے پر ہی اپنی مسز کے ساتھ آ جاؤ۔'' جواد نے فراخ دلی سے دعوت دی۔

"ٹھیک ہے اگر پروگرام طے ہو گیا تو میں فون پر تمہیں کنفرم کر دوں گا۔ فی الحال تم مجھے اجازت دو۔" مراد نے جواد کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا پھر شانی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور نائلہ کو ایک الوداعی مسکراہٹ سے نواز کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔ ہمیشہ چہکنے والا شانی بھی ابھی تک خود پر بیتے حالات کے زیر اثر تھا اس لیے نائلہ کے سینے سے لگا خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ سکوت کی اس دبیز تہ کو جواد احمد نے توڑا اور نائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تو قیر کی جو حرکت اور اس کی وجہ میرے علم میں آئی ہے اس کے بعد سے میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم محسوس کر رہا ہوں نیلی! میری ماں اور میں نے جس سودے بازی کے ذریعے تمہاری رفاقت کا انتظام کیا وہ یقیناً ہماری خودغرضی تھی۔ ہم تمہارے جذبات سے کھیلے بغیر بھی تمہارے گھر والوں کو سپورٹ کر سکتے تھے۔ آخر اتنی دولت تھی ہمارے پاس۔ کیا ہم ایک خاندان کو اس دولت سے بغیر کسی فائدے کے عزت کی زندگی جینے کا موقع نہیں دے سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور ایک نیکی کو بھی کاروبار بنا دیا۔ اپنی اس غلطی کا ادراک ہونے پر میں تم سے سخت شرمندہ ہوں اور تمہیں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ تم چاہو تو مجھ سے طلاق لے کر اپنی امنگوں اور خواہشات کی تکمیل کر لو۔ اس طلاق سے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں ہو گا۔ میں تمہاری فیملی اور تمہیں تحائف کی صورت جو کچھ دے چکا ہوں وہ تمہارا ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں تمہاری اتنے عرصے کی خدمت اور دیانت داری کا خیال کرتے ہوئے تمہیں اتنا کچھ دے کر اپنے پاس سے رخصت کروں گا کہ تم ایک خوش حال زندگی گزار سکو۔"

"پلیز جواد! خاموش ہو جائیں۔ آپ ایسی باتیں کر کے میری توہین کر رہے ہیں۔" نائلہ کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔

"تم میری بات کا مطلب سمجھو نیلی! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں پورے خلوص سے کہہ رہا ہوں۔ تم میرے مقابلے میں جوان اور خوب صورت ہو۔ تمہارا حق ہے کہ تم اپنی پسند کے ساتھی کے ساتھ زندگی گزارو۔" جواد احمد نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

"یہ حق میرے پاس اس وقت بھی موجود تھا جب میں نے آپ سے شادی کی تھی۔ اس شادی کے لیے مجھے مجبور نہیں کیا گیا تھا صرف آفر دی گئی تھی اور میں نے اپنی مرضی سے اس آفر کو قبول کر لیا تھا۔ میں اپنے دلی جذبات کی بات نہیں کروں گی لیکن حقیقتاً میں نے پوری دیانت داری سے اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی اور کبھی آپ کو دھوکا دینے کا نہیں سوچا۔ بے شک بدلتے وقت کے ساتھ ہمارے معاشرے کی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ میں بھی دیکھنے میں ایک ماڈرن اور فیشن ایبل عورت نظر آتی ہوں لیکن بہرحال میرے اندر مشرق کی وہ عورت زندہ ہے جو ایک بار شوہر کے گھر میں قدم رکھتی ہے تو پھر جنازہ اٹھانے تک اسی گھر میں بسے رہنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ فیضان میرے ماضی کا ایک باب ہے اور میں اس کی محبت میں مبتلا ہونے کا اعتراف بھی کرتی ہوں لیکن رہنا بہرحال میں آپ ہی کے ساتھ چاہتی ہوں۔ میں صرف آپ کی بیوی ہی نہیں شانی کی ماں بھی ہوں اور ایک ماں اپنے معصوم بچے کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی چاہے بدلے میں اسے کتنا ہی بڑا لالچ کیوں نہ دیا جائے۔" نائلہ نے کہتے ہوئے کچھ اور شدت سے شانی کو اپنے ساتھ بھینچ لیا تو وہ دھیرے سے کسمسایا۔ اس کے کسمسانے پر نائلہ اور جواد کو احساس ہوا کہ وہ سو چکا ہے۔ یقیناً نائلہ کی آغوش میں آ کر اسے سکون ملا تھا اور وہ سو گیا تھا۔ نائلہ نے بہت آہستگی سے اسے جواد کے برابر میں ہی لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"دیکھیں یہ کتنی پیاری نعمت ہے۔ اس نعمت کو چھوڑ کر میں کہیں جانے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہوں۔"

"نعمت تو تم بھی ہو نیلی! بس اس بات کا ادراک مجھے اب ہوا ہے۔ شیری سے میرا تعلق جنون کا تھا لیکن تم سے میری محبت کسی پرسکون دریا کی طرح بے حد گہری ہے جسے میں نے ابھی ابھی دریافت کیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس رفاقت کو طویل بنانے کے لیے تم سے ہر ممکن تعاون کروں گا اور اپنے اندر رہ جانے والی بچی کچھی بری عادتوں سے بھی نجات حاصل کر لوں گا۔ آج سے میں، میرا بیٹا، میرا گھر اور سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جیسے چاہے ہم پر راج کرنا۔" جواد احمد کے دھیمے لہجے میں کہی گئی باتیں نائلہ پر کسی پھوار کی طرح برس رہی تھیں۔ اس پھوار میں بھیگتی وہ گہری طمانیت محسوس کر رہی تھی کہ جس عورت کا شوہر اس کا بن جائے اس سے بڑھ کر مطمئن عورت کوئی اور نہیں ہوتی۔

خنجر بکف
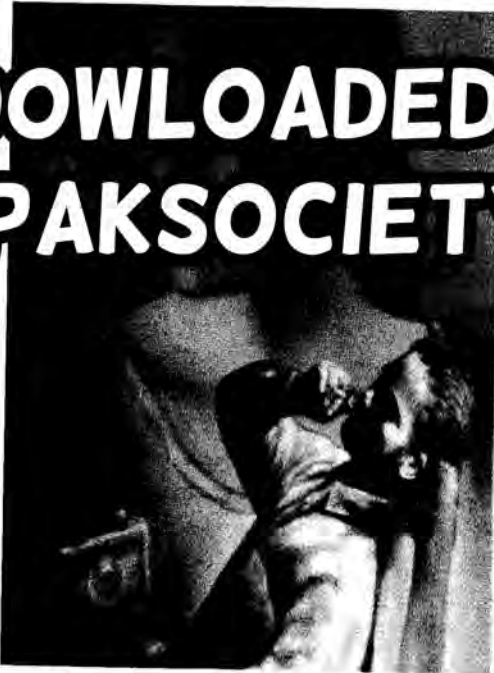
امجد جاوید

جرم کے راستے خودرُو پودے کے مانند ہوتے ہیں... ایک قدم رکھا اور دوسرا از خود اپنی جگہ بنا لیتا ہے... جرم پرور باقاعدہ اس پودے کی آبیاری کا اہتمام کرتے ہیں... درحقیقت جرم کو پنپنے اور بڑھاوا دینے والے اصل مجرم اور سزاوار یہی ہوتے ہیں... مگر ایسے لوگ کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آتے... لیکن کبھی کبھی ایسا نامہربان وقت آہی جاتا ہے جب ان کے لگائے ہوئے پودے اپنے سرپرستوں کے سامنے سرکش گھوڑے کے مانند سرکشی اختیار کریں تو وہ ضرور جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں... چلتے چلتے اچانک ہی جرم کی پگڈنڈی پر قدم رکھنے والے نوجوان کی کہانی... ضرورت و مجبوری نے اسے جرم کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا... اور پھر وہ جرم کے راستوں کی مجبوری بنتا چلا گیا... قتل و غارت گری... خوف و اسیری کی جادونگری سے تعلق رکھتی کہانی کے اتار چڑھاؤ...

وقت کی بے رحم موجوں سے ٹکراتے خنجر بکف کی بے لگام کتھا......

ممبئی کے علاقے جوہو میں موجود تین منزلہ پرانی عمارت کے نیچے ٹیکسی رُکی۔ اس میں سے نارائن داس نکلا۔ وہ جدید تراش کی پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھا۔ اُس نے ایک نگاہ اُڑی ہوئی رنگت والی عمارت پر ڈالی۔ اُترتی ہوئی شام میں اس کا رنگ مزید بھدا لگ رہا تھا۔ اس کی پشت پر سمندر اور دائیں جانب نیم دائرے میں کہیں دور تک پھیلا ہوا ساحلی علاقہ تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا اور عمارت کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ

گیا۔ بارش ہو جانے کے بعد موسم اچھا ہو گیا تھا۔ سمندر سے آنے والی ہوا میں انجانی مستی بھر گئی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچا۔ اس کا سامنا تین آدمیوں سے ہوا جو اسے تیز نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ شکل ہی سے غنڈے لگ رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے دائیں جانب مڑنا چاہا، وہ تینوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے زیادہ عمر کے بندے نے نارائن داس سے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''کدھر جانے کا؟''

''تاؤ جی سے ملنا ہے۔'' نارائن نے سکون سے کہا تو وہ تینوں الرٹ ہو گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر اسی نے پوچھا۔

''کون ہو تم اور کیا کام ہے؟''

''میں کام انہیں ہی بتاؤں......'' اس نے کہنا چاہا تو سامنے کھڑے بندے نے تیزی سے کہا۔

''وہ نہیں ملے گا، سو رہا ہے، کل آنا۔''

''میں نے فون کیا ہے۔ بولو نارائن داس آیا ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں سختی سے کہا تو چند لمحے سوچنے کے بعد بات کرنے والے نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک تیزی سے اٹھا اور چلا گیا۔ وہ تینوں وہیں کھڑے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بندہ واپس آ گیا۔ اس نے سر کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ۔''

وہ اس کے پیچھے چلتا چلا گیا۔

اس گھر کی ہر شے پرانی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ستر کی دہائی والے کسی گھر میں آ گیا ہو۔ کھڑکی کے ساتھ ایک پلنگ پر وہ بوڑھا ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سفید بال، کلین شیو، بنیان کے ساتھ دھوتی باندھے ہوئے۔ وہ اس کے چہرے پر دیکھتا رہا تھا جیسے کچھ ٹٹولنے کی کوشش میں ہو۔ نارائن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا۔ بوڑھے تاؤ نے بھی نمشکار کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب پڑی ایک پرانی طرز کی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اتنے برس بعد آیا، کہاں چلا گیا تھا۔ ویرولی والے واقعے کے بعد تو ایک دم سے غائب ہو گیا؟'' تاؤ نے پوچھا۔

''تاؤ، کیا اتنا کچھ سننے کو وقت ہے آپ کے پاس؟''

نارائن نے دھیمے سے پوچھا پھر لحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔

''دوبارہ اگر میں مل سکا تو ضرور بتاؤں گا۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ تاؤ نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''بول، کام کیا ہے؟''

نارائن نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اس کے ہاتھ میں کسی فیشن میگزین کا صفحہ تھا۔ اس نے وہ کھولا اور تاؤ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ویرولی والے معاملے میں اس رات یہی میرے ساتھ تھی۔ اسی سے اس گینگ کا پتا چلے گا۔''

''یہ تو فلم اسٹار ہے؟'' تاؤ نے وہ صفحہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا ''کیا چاہتا ہے؟''

''اسے کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔'' نارائن نے کہا۔ اس پر تاؤ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور پھر بولا۔

''کب......؟''

''آج شام، ساری فیلڈنگ کر لی ہے، بس آپ کی یہی مدد چاہیے، کوئی محفوظ جگہ، صرف اتنی دیر کے لیے، جب تک وہ کچھ بتا نہیں دیتی۔'' نارائن نے کہا تو اس کے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا تھا۔

''میرے فون کا انتظار کر۔'' تاؤ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تاؤ، اس کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

شام پھیل کر رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو اس کے انتظار میں کھڑا ایک نوجوان غیر محسوس انداز میں اس کی جانب بڑھا۔ وہ اجنبیوں کے انداز میں قریب آیا اور دھیمے لہجے میں کہا۔

''وہ اندر ہے اور صرف دو افراد ہیں۔ اس کے ساتھ سیکیورٹی کے لیے۔''

''اس کے نکلنے پر نگاہ رکھنا۔'' نارائن نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ اس ہال کی جانب تھا جہاں وہ فلم اسٹار تھی۔ ہال کے دروازے پر چند افراد کھڑے تھے۔ ان کے طلب کرنے سے پہلے ہی نارائن نے دعوتی کارڈ ان کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے ایک بندہ ہلکا سا جھکا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ خواب ناک ماحول میں اس نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اندر پچاس سے زیادہ لوگ تھے۔ وہ ایسے کونے کی جانب چلا گیا جو نیم تاریک تھا۔ وہاں کسی فلم کے مہورت کے بعد ہونے والی پارٹی تھی۔ وہ فلم اسٹار اسی فلم کی ہیروئن تھی۔ اس کے ارد گرد بہت سارے لوگ تھے۔ نارائن نے دیکھا، وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ وہ خود پر جبر کیے اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب

اسے وہاں سے نکلنا تھا۔ یہ فلم اسٹار لڑکیاں جب گھر سے کسی تقریب کے لیے نکلتی ہیں تو ان کا بہت سے لوگ انتظار کرتے ہیں، یہ خود انتظار کرواتی ہیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ پبلسٹی مل سکے مگر جب کسی بھی تقریب سے نکلتی ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا۔ انہیں اپنی سیکیورٹی بھی چاہیے ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اچانک ہی رفو چکر ہو جاتی ہیں۔

دو گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد اس نے فلم اسٹار کی بے چینی بھانپ لی۔ نارائن اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ اس دروازے سے باہر چلی گئی۔ نارائن سرعت سے اٹھا اور اسی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ایک راہداری میں تیزی سے جا رہی تھی جس کے اختتام پر دروازہ تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے وہ دروازہ کھولا تو باہر سیکیورٹی والے کھڑے تھے۔ نارائن تیزی سے آگے بڑھا اور دروازے تک جا پہنچا۔ فلم اسٹار اپنی کار کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ اس نے اپنے دونوں پسٹل نکالے اور انتہائی تیزی سے ان کے سر پر جا پہنچا۔ اس میں کسی بھی مہارت سے زیادہ صرف حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھتے، نارائن نے پسٹل فلم اسٹار کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ماردوں گا اگر کوئی حرکت ہوئی۔''

''کک...... کون ہو......'' فلم اسٹار نے کہنا چاہا تو اس نے نال سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کار میں بیٹھو، بتاتا ہوں۔'' یہ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک سیکیورٹی والے نے اس کی جانب اپنا پسٹل کیا ہی تھا کہ نارائن نے دوسرے ہاتھ میں پکڑے پسٹل سے اس پر فائر کر دیا۔ وہ ڈکارتا ہوا نیچے گرا۔ وہ سب صورتِ حال سمجھ گئے تھے۔ فلم اسٹار تیزی سے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی تو نارائن بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک پسٹل اس نے فلم اسٹار کے پہلو میں لگا دیا اور دوسرا ڈرائیور کی گردن پر رکھتے ہوئے سرد لہجے کہا۔

''نکلو باہر۔''

جب تک ڈرائیور باہر نکلا، تب تک اندھیرے میں موجود ایک نوجوان نکلا اور انتہائی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے گیئر لگایا اور کار تیزی سے بھگا دی۔ اسے معلوم تھا کہ دو چار منٹ بعد ہر طرف خبر پھیل جائے گی۔ یہی دو چار منٹ انتہائی قیمتی تھے۔ ہوٹل سے باہر آ جانے تک کا انتہائی رسک تھا۔ اس لیے وہ پوری طرح محتاط تھا۔ نوجوان بڑی مہارت کے ساتھ کار کو ہوٹل کی پچھلی طرف سے نکال کر سامنے کی طرف لایا اور پھر نکلتا چلا گیا۔ وہ ہوٹل سے باہر آ گئے۔ چند منٹ مین روڈ پر رہنے کے بعد اس نے کار ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دی۔ ایک جگہ سامنے سڑک کنارے سیاہ وین کھڑی تھی۔ نوجوان نے کار وہیں روکی اور خود باہر نکل آیا۔ نارائن نے فلم اسٹار کو گھسیٹ کر اس وین میں ڈالا۔ تب تک نوجوان وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر آن پہنچا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ وہاں سے نکلتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

وہ سمندر کنارے ساحلی پٹی کے ویرانے میں ایک پرانا سا لکڑی کا بنا ہوا کاٹیج تھا۔ اندھیرے میں وہ کوئی بھوت بنگلا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ نوجوان نے وین اس کاٹیج کے سامنے جا روکی، اس نے بڑے سکون سے باہر والا پھاٹک کھولا اور واپس آ کر وین اندرونی دروازے کے قریب لے جا کر روک دی۔ نارائن نے خوف زدہ سی فلم اسٹار کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چل نکل باہر۔''

وہ وین سے اتر کے اس کاٹیج میں چلے گئے جو نجانے کب سے کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ وین سمیت وہ نوجوان باہر ہی سے پلٹ گیا تھا۔ ایک ڈھول جمی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے فلم اسٹار نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''ارے میری جان، اتنی جلدی بھی کیا ہے مگر......! افسوس مجھے اس بات پر ہے کہ تم اتنی جلدی مجھے بھول گئی ہو؟'' نارائن نے اس کی پشت سے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھی نہیں؟''

''تم اس وقت بھی نا سمجھ تھیں میری جان۔ مگر اب تم نا سمجھی نہیں کرو گی۔ جو پوچھوں گا، وہ سب بتا دو گی۔ ورنہ......'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں حد درجہ غصہ بھڑک اٹھا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' فلم اسٹار نے خوف زدہ لہجے میں الجھتے ہوئے پوچھا۔

''صرف اتنا بتا دو، داوڑے اور اس کے لوگوں کو کس نے مروایا تھا؟'' نارائن اس کے بالکل سامنے لکڑی کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک سگریٹ سلگا لی تھی۔

''تتا......'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں، میں تتا...... جس کی تم صرف تین دن رکھیل رہیں اور بدلے میں کیا ہوا، تم نے میرے سارے ساتھی مروا

دیے۔ پھر مجھے مارنے کو کتنا تلاش کیا میرے دشمنوں نے؟ یہ تم نہیں جانتیں کیونکہ تم تو ایک فلم اسٹار بن گئیں اچھا ہے، ہر کوئی اپنا فائدہ لیتا ہے، تم نے بھی لیا، کوئی بات نہیں، بس اب جلدی سے بک دو، کون تھے وہ لوگ۔'' یہ کہتے ہی نتا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تو وہ الٹ کر فرش پر جا پڑی۔ فلم اسٹار کی آنکھوں سے خوف ابل رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نارائن کو دیکھنے لگی۔ اس کے لپ اسٹک لگے لبوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''نتا...... یہ تب کی بات تھی، تین برس پہلے، مجھے صرف تم لوگوں کا پتا بتانے کے لیے بڑی رقم دی گئی تھی۔ میں نے ایک ماہ میں تم لوگوں کو تلاش کیا تھا۔ میں نہیں جانتی ہوں، کون تھے وہ لوگ اور......'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ نارائن نے اسے بالوں سے پکڑا اور اس کا سر فرش پر دے مارا، فلم اسٹار کی پیشانی سے خون بہہ نکلا۔

''صرف سچ بتاؤ، ورنہ ایک ایک بوٹی الگ کردوں گا تمہاری۔'' اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔ وہ گڑگڑانے والے انداز میں روتے ہوئے بولی۔

''بھگوان کے لیے نتا، میرا یقین کرو۔ مجھے تو سلیم سٹکا نے یہ آفر کی تھی، اسی نے مجھے فلم میں ہیروئن بنایا اور دو تین فلمیں لے کر دیں۔ یہ آج جس فلم کی مہورت والی پارٹی تھی، یہ اس کی دوسری فلم ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی نتا، میرا یقین کرو۔''

''ارے چکنی، تو کاہے کو اس بھری جوانی میں مرنا چاہتی ہے، بتادے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا، پھر بولا، ''دیکھ ہمارے بعد اس علاقے میں رگھوٹانڈیا نے سارا کام سنبھالا، وہی ہے یا اس کے پیچھے کوئی دوسرا ہے، چل کنفرم کر، جلدی بول۔'' نارائن نے دیوانوں کے مانند اس کے بال پکڑ کر پوچھا تو وہ ایک دم ساکت ہوگئی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نتا، تم بہت بڑی غلطی کررہے ہو۔ میں نے تمہیں بتا دیا تو تم ان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے ہو، لیکن وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اب تم مارو یا وہ، ایک ہی بات ہے لیکن تمہارا کیا حشر ہوگا، تم نہیں جانتے ہو۔''

''میں روز مرا ہوں اور روز جیا ہوں۔ میں کب کا مر گیا ہوتا، مجھے صرف ان کے انتقام نے زندہ رکھا ہے۔ تو بتا دے، بس تیرے پاس یہ آخری منٹ ہے، بتادے تو ٹھیک ورنہ اب میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔'' اس نے پاگلوں کی طرح کہتے ہوئے اپنا پسٹل نکال لیا۔ فلم اسٹار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نارائن نے نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔

''راج مٹھل......'' فلم اسٹار نے تیزی سے کہا، ''جوہو، ویرولی اور دادر میں اسی کا راج ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسی کے ایک اشارے پر داوڑے کا گینگ ختم ہوگیا۔ سلیم سٹکا، رگھوٹانڈیا جیسے کئی لوگ اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ تجھے تو وہ چٹکی میں لے کر مسل دے گا۔''

''راج مٹھل......'' نارائن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ جس بندے کا نام لے رہی ہے، وہ کون ہے۔ اسے پہلے ہی شک تھا، اب یقین ہوگیا تھا۔

''کیوں ہوگئی نا بولتی بند۔ چھوڑ دے مجھے اور اپنی زندگی میں واپس لوٹ جا، اسی میں تیری بھلائی ہے۔'' فلم اسٹار کو تھوڑا حوصلہ ملا تو وہ تیزی سے کہتی چلی گئی۔

''تو سچ کہہ رہی ہے نا، وہ راج مٹھل ہے؟'' نارائن نے پوچھا۔

''ہاں ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔'' فلم اسٹار نے دہرایا۔

''چل پھر لگا فون اس کو، بول اسے کہ نتا نے تجھے اغوا کیا ہے۔'' نارائن نے غراتے ہوئے کہا تو فلم اسٹار کی آنکھوں میں شدید حیرت تیرنے لگی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نتا اپنی موت کو خود کیسے گلے لگا رہا ہے۔ نارائن نے کار سے اس کا سیل فون اٹھالیا تھا۔ اس نے وہ اپنی جیب سے نکالا اور فلم اسٹار کے سامنے رکھ دیا۔ ''لگا فون۔''

''وہ تجھے......'' فلم اسٹار نے کہنا چاہا تو نارائن نے گھما کے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''تیری ماں کی...... لگا فون۔''

فلم اسٹار نے فون لیا اور نمبر پش کرنے لگی۔ رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔ اس نے اسپیکر آن کردیا۔

''اے آئیٹم کہاں ہے تو۔'' دوسری طرف سے آواز ابھری۔

''راج بھائی سے بات کراؤ۔'' فلم اسٹار نے تیزی سے کہا۔

''مجھ سے کرلونا۔'' دوسری طرف سے کسی نے کہا اور قہقہہ لگادیا۔

''ابے...... بات کرا راج بھائی سے۔'' وہ چیخی۔

''چل کراتا ہوں، پن اتنی جلدی کاہے کی ہے۔'' اس نے کہا اور چند لمحوں کے بعد ایک بھاری آواز گونجی۔

''ہاں بول، سنا ہے تجھے کسی نے اٹھالیا ہے۔''

''ہاں راج بھائی، میں اسی کے سامنے ہوں۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ارے واہ، اتنی ہمت کس سالے میں پیدا ہوگئی، کرا بات۔'' بھاری آواز میں کسی نے غصے میں کہا تو نارائن نے فون پکڑلیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''مجھے تم سے بات ہی نہیں کرنی، حساب بھی چکتا کرنا ہے گتے۔ صرف اتنا بول، ویرولی میں داوڑے اور اس کے لوگوں کو تو نے مروایا تھا؟''

''کون ہے بے تُو......؟'' بھاری آواز والے نے پوچھا۔

''بتا دے تو ٹھیک، خود تم سے ملوں گا، ورنہ اس آئیٹم نے جو کہا، وہی مان لوں گا۔ بول اگر ہمت ہے تو۔'' نارائن نے اسے غصہ دلانے کے انداز میں کہا۔

''ہاں، میں نے خلاس کروا کے اپن کا گینگ لگایا اُدھر، چل بول کون ہے تُو؟'' بھاری آواز والے راج نے کہا تو نارائن کے پورے بدن میں آگ پھیل گئی۔ اسے خود پر قابو پانے میں چند لمحے لگے پھر بولا۔

''نتا، جسے تم لوگوں نے......''

''ابے تیری ماں کی آنکھ، تُو جندہ ہے ابھی۔'' دوسری طرف سے راج نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ نارائن نے فون بند کردیا۔ پھر فلم اسٹار کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''چل، تجھے چھوڑا۔'' اس نے کہا اور اسے کرسی کے ساتھ باندھنے کے لیے رسی اٹھالی۔ اسے معلوم تھا کہ فون کال کی وجہ سے چند منٹوں میں اس جگہ کی نشان دہی ہوجائے گی اور کسی کو بھی یہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگے گا۔ اتنے وقت میں وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''اگر تو نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو ایک کام کر، مجھے شہر میں کسی جگہ چھوڑ دے۔'' فلم اسٹار نے کہا تو نارائن اسے باندھتے ہوئے بولا۔

''آدھا گھنٹا انتظار کر، وہ لے جائیں گے تجھے۔''

''نہیں، وہ نہیں آئیں گے۔ اگر آئے بھی تو مجھے مار دیں گے۔ پولیس کو بھی نہیں بتائیں گے۔ تو مجھے چھوڑ دے بس۔'' فلم اسٹار نے کہا تو نارائن نے رسی ایک طرف پھینکی۔ اس کے گلے میں پڑا اسکارف لے کر اس کے ہاتھ باندھے اور اسے لے کر باہر آگیا۔ وہ چند قدم ہی بڑھا تھا کہ دروازے پر وہی وین آرکی۔ نوجوان ڈرائیور نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا جیسے ہی وہ دونوں بیٹھے، اس نے وین آگے بڑھادی۔

ساحلی پٹی پر دور چند ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں رات گئے تک غنڈے موالی عیاشی کرتے تھے۔ نارائن نے اس طرف دیکھ کر فلم اسٹار سے پوچھا۔

''یہاں چھوڑ دوں؟''

''ہاں۔ یہیں چھوڑ دو۔'' اس نے کہا تو نوجوان نے بریک لگادیے۔ فلم اسٹار اتر کر بولی۔

''تو نے مجھے چھوڑ دیا، اس کا انعام لیتا جاتا۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا پھر بولی۔ ''راج سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے مایا دیوی، تجھے وہی بچاسکتی ہے بس۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور ان ہوٹلوں کی جانب بھاگ نکلی۔

''مایا دیوی۔'' نارائن بڑبڑا کر رہ گیا۔ تب تک نوجوان ڈرائیور نے وین بھگالی تھی۔

☆☆☆

''کون ہے یہ مایا دیوی؟'' نارائن نے اپنے دوست مانتے سے پوچھا۔ جس کے پاس وہ کچھ دیر پہلے پہنچا تھا۔ مانتے نے اسے چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں پوچھوں گا کہ یہ تمھیں کس نے بتایا، لیکن میں مایا دیوی کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک خوف کا نام ہے۔ ایک سال کے آس پاس ہوگیا ہے اس مارکیٹ میں آئے۔ لیکن وہ ہے کون، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکا۔''

''تو پھر اس نے مجھے غلط راہ پر ڈال دیا، مجھے اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' نارائن نے افسوس سے کہا۔

''چل تو ساری رات کا جاگا ہوا ہے، سوجا۔ مجھے کام پر جانا ہے، واپس آکر بات کرتے ہیں۔'' مانتے نے کہا اور اٹھنے لگا۔

''پر یہ راج کا پتا تو اس نے دیا، بات ہوئی اس سے۔'' نارائن نے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو نے اسے چھوڑ دیا اچھا کیا، راج اب تیری تلاش میں نکلے گا تو پتا چل جائے گا کہ اس نے ٹھیک کہا تھا یا غلط، تیری راج ہی سے بات ہوئی تھی یا کسی اور سے، تو سوجا۔ شام کو بات کریں گے۔'' مانتے بولا اور تولیا اٹھا کر واش روم میں چلا گیا۔ اس نے بھی سوچنے کے بجائے سوجانے کو ترجیح دی۔

اس کی آنکھ دوپہر سے پہلے ہی کھل گئی۔ وہ نہا دھو کر فریش ہوا، پھر ایک کپ چائے بنا کر وہ کھڑکی میں آبیٹھا۔ سامنے لوگوں کا ہجوم آجا رہا تھا۔ یہ ہنومان مندر کے پاس والا ویرولی ہی کا ایک علاقہ تھا۔ وہ ایک بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں تھا جہاں اس کا دوست مانتے کئی برس سے رہ

رہا تھا۔ وہ بھی گنگا نگر کا تھا، اس کے بچپن کا دوست۔ ساری دنیا میں اگر اسے کسی پر یقین تھا وہ بھی ماتے ہی تھا۔ اس نے چائے کی چسکی لی اور واپس نرم گدے پر آبیٹھا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا، جب قدرت نے اسے دوبارہ نئی زندگی پانے کا موقع دیا تھا۔ وہ ماضی میں کھو گیا۔

اس دن نارائن داس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بڑے نفیس اور نرم گدے پر پایا تھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اپنی کلائی پر چٹکی بھری تو احساس ہوا کہ نہ صرف وہ جاگ رہا ہے بلکہ ہوش میں بھی ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کی حیرت اس قدر بڑھی کہ وہ بے ہوش ہونے والا ہو گیا۔ وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں تھا۔ کمرے میں اس قدر صفائی ستھرائی دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ ورنہ تو آنکھ کھلتے ہی اپنے اردگرد غلاظت، پان کی پیک بھری دیواریں، دھول مٹی یا گارے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے ناک کو سکیڑ کر سونگھا تو بدبو نہیں آرہی تھی، اس نے گھبرا کر دیکھا، اس کا اپنا لباس بھی صاف تھا۔ وہ میلے چیکٹ بدبودار کپڑے نہیں تھے۔

”کسی نے میرے کپڑے اُتارے اور.....“ وہ گھبراہٹ میں مزید نہ سوچ سکا۔ کئی خیال اس کے دماغ میں آکر رفو چکر ہو گئے۔ اس نے اپنے دماغ کو جھٹکا اور حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”ہے بھگوان میں کہاں ہوں؟“

اسے کمرے میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل رات وہ فٹ پاتھ پر تھا۔ کل شام کی ذلالت وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح کل شام بھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ نشہ پورا کرنے اور پیٹ کی آگ بجھانے نکل پڑا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے مایوسی نے آن گھیرا تھا۔ شہر کے اس علاقے میں کسی سیاسی جلسے میں افراتفری پھیل جانے کے باعث اس علاقے میں ہو کا عالم طاری تھا۔ ہوٹل تک بند ہو گئے جہاں سے وہ مانگ کر کھانا کھا سکتا تھا۔ اسے کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ دن ڈھل گیا اور وہ خالی پیٹ بلبلاتا پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گھوم پھر کر واپس اپنے ان موالیوں میں آگیا جن کے ساتھ وہ نشہ کرتا تھا۔ وہ بھی سب اسی کی طرح تھے۔ ان کی دھنسی آنکھوں سے بھوک کے ساتھ بے بسی جھلک رہی تھی۔ بھوک کے پیٹ اور نشے کی طلب نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رحم آنے لگا۔ وہ سبھی کیڑے مکوڑوں کے مانند فٹ پاتھ پر کلبلا رہے تھے۔ ممکن تھا کہ

ان میں سے کوئی مر بھی جاتا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ وہ سبھی نیم مردہ حالت میں وہاں پڑے تھے۔

بے بسی میں اُلجھی رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ ایسے ہی وقت میں ان کے پاس ایک کار آکے رُکی۔ اس میں سے دو آدمی نکل کر ان کے پاس آپہنچے۔ ان کے ہاتھ میں کافی سارے چھوٹے چھوٹے شاپر بیگ تھے۔ انہوں نے وہ شاپر بیگ ان میں بانٹ دیے۔ ان میں کھانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چرس کی تھوڑی تھوڑی ٹکڑی ان میں بانٹ دی گئی۔ تبھی فٹ پاتھ پر پڑے ان کیڑے مکوڑے نما مخلوق کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی۔ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے اور کدھر چلے گئے۔ وہ کھانے پر جھپٹ پڑے اور پھر چرس بھرا دھواں اُڑاتے۔ اُڑاتے نجانے کب وہیں فٹ پاتھ پر ہی ڈھیر ہو گئے۔ یہ انہیں بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ وہ سوئے تھے یا مدہوش ہو گئے تھے۔

نارائن داس، نرم گدے پر سے اٹھا اور کمرے کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے گھر کی چھوٹی سی دیوار سے باہر دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ ممبئی کی جھونپڑپٹی کے غلیظ علاقے میں موجود اس چھوٹے سے گھر میں ہے۔

”کیا میں اُڑ کر یہاں آگیا ہوں؟“ اس نے انتہائی احمقانہ انداز میں حیرت سے سوچا پھر اپنی اس احمقانہ سوچ پر لعنت بھیجتے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔ تبھی اس کی نگاہ کابک نما رسوئی پر پڑی جہاں سستی سی ساڑی پہنے ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی کچھ بنا رہی تھی۔ آہٹ پا کر پلٹی تو اس نے دیکھا، وہ مقامی عورت تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”اُٹھ گئے کا؟ آپ پھورن نہائی لو، میں گرم گرم پراٹھا بنائی کے لائی، چائے بھی بس بنائی سمز وو۔“

”کون ہو تم اور یہ سب کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کہا نا.....، نہائی لو، کچھ کھائی پی لو، پھر بات کرت ہوں۔“ ادھیڑ عمر عورت نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کونے میں بنے باتھ روم کی جانب چل دیا۔ تب اسے پیچھے سے آواز سنائی دی، ”اے، شیو کا سارا سامان پڑا ہے۔ بنا لینا۔“

وہ باتھ روم سے فریش ہو کر شیو بنا کے کمرے میں آگیا۔ وہ گدے پر بیٹھا تو وہ مقامی عورت ناشتا رکھ گئی۔ اس کے سامنے گھی میں تلے ہوئے پراٹھے، اچار، بھاجی، مکھن کے ساتھ چائے کا ایک بڑا سا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا، نجانے کب اور کس زمانے میں ایسا ناشتا کیا تھا۔ دکھ کی

ایک لہراس کے اندر سرایت کر گئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس کا ماضی پوری طرح بے تاب ہو کر اس سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جسے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر ان لمحوں نے سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے اپنی نم آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

وہ کھانا ختم کر چکا تو وہی مقامی عورت اندر آئی۔ وہ برتن اٹھا رہی تھی تب اس نے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ اور کون ہو تم؟''

''ابھی تم کو آرام کرنے کا، سب پتا چل جاوے گا۔ دھیرج رکھو۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا اور برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ اسے گئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ دو آدمی اندر آ گئے۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے اور اپنی وضع قطع سے پیسے والے لگ رہے تھے۔ وہ سیدھے اس کے پاس آ گئے۔ وہ کھڑے کھڑے چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہے پھر ان میں سے ایک آدمی بولا۔

''نارائن جی، ہم کون ہیں، اس بارے جاستی سوچنے کا نہیں۔ پن تمہارے واسطے ایک نئی زندگی لے کر آیا ہوں۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو نارائن نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

وہ جانتا تھا کہ ممبئی جیسے شہر میں کوئی بنا مطلب کسی کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ یہ کون ہیں جو اس کے لیے زندگی لے کر آئے تھے۔ وہ دونوں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر وہی بولا۔

''یہ ہمیں نہیں معلوم، اپن بس ڈیل کرنے آیا ہے۔''

''کیسی ڈیل؟'' اس نے اپنی آنکھوں میں اکتاہٹ سمیٹتے ہوئے پوچھا تو وہی ادھیڑ عمر جذباتی انداز میں بولا۔

''اگر تم نئی زندگی چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ چلو، پھر سے وہی اسٹرونگ مین بن جاؤ، نہیں تو اِدھر پڑا رہو، تم کو پیسہ ملتا رہے گا، کھا پیو، نشہ کرو اور اس کھولی میں مر جاؤ۔''

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟'' اس نے کافی حد تک سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اپن خود نہیں جانتا، بس تم بولو......؟'' وہ تیزی سے بولا تو اگلے ہی لمحے نارائن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''چلو۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ بات کرنے والے نے باہر چلنے کا اشارہ کیا، وہ سلیپر پہن کر چل پڑا۔ برآمدے میں وہ کالی بھجنگ عورت اس کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش کھڑی رہی۔ وہ تینوں باہر گلی میں آئے جس کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ جیسے ہی وہ جھونپڑپٹی سے نکل کر مین روڈ پر آئے، انہوں نے وہ چھوٹی گاڑی چھوڑی اور ایک بڑی فور وہیل میں بیٹھ کر آگے چل دیے۔ نارائن سمجھ گیا کہ وہ جھونپڑپٹی میں لوگوں کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کوئی دو گھنٹے بعد ان کا سفر ایک ہیلتھ کیئر سینٹر پر ختم ہوا۔ فور وہیل پورچ میں رکی۔ پہلے وہ دونوں اترے پھر نارائن اتر کر ان کے ساتھ اندر چل دیا۔ لاؤنج میں ایک بندہ کھڑا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے وہ ادھیڑ عمر شخص بولا۔

''یہ تمہارا یہاں ہر طرح سے خیال رکھے گا، اِدھر رہو، ابھی تمہیں ڈاکٹر دیکھنے آ جائے گا۔ او کے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں کوئی بات کیے بغیر واپس مڑ گئے۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

نارائن ہیلتھ کیئر سینٹر کے کمرے میں تنہا تھا۔ اسے لگا جیسے ماضی اس کے چاروں جانب اُگ آیا ہو۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگا۔

کون ہے میرا مہرباں؟ کوئی شریف آدمی تو ہو نہیں سکتا۔ وہی کر سکتا ہے جو اس کی جرم والی زندگی سے واقف ہو۔ یہ نئی زندگی وہ یونہی نہیں دینا چاہتا تھا کوئی ایسا کام تھا، جو اس کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، وہ کون تھا؟ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ اس کے سامنے آنے والا ہے اس لیے اس نے یہ سوچنے پر سر نہیں کھپایا۔ بلکہ ان دنوں کو یاد کرنے لگا، جب وہ کالج کے آخری دنوں میں تھا، اس پر پیسے بنانے کی دُھن سوار تھی۔

اس کی وجہ سمیتا دیوی تھی۔ وہ ان کے گھر سے چند گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ گنگا نگر کے علاقے میں کوارٹر نما گھروں میں رہتے تھے۔ ساتھ ہی کئی کارخانے تھے جہاں پر سمیتا دیوی کی ماں اور باپ دونوں الگ الگ شفٹ میں کام کرتے تھے۔ نجانے وہ کب اسے اچھی لگی اور اسے اپنا دل دے بیٹھا۔ محبت کی یہ آگ بھڑکی تو اس نے سمیتا دیوی کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ بات شادی کرنے تک آن پہنچی تھی۔

''دیکھ سمیتا! میں کالج میں فائنل امتحان دیتے ہی نوکری پر لگ جاؤں گا۔ باپو نے ادھر فیکٹری میں بات کر لی ہوئی ہے جس دن نوکری لگی، اسی دن تیرے گھر میں ماتا پتا

کو بھیج دوں گا۔'' نارائن داس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تب تک اگر میرے پتا نے کہیں اور بات کر دی تو مجھے الزام مت دینا۔'' سمیتا نے بڑی معصومیت میں اپنی بےقراری کا اظہار کیا۔

''ارے ایسا نہیں ہوگا پگلی، اگر ہوا بھی تو پھر تم ہی کچھ کرو گی۔'' نارائن نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں تو یہی کر سکتی ہوں نا کہ پڑھائی کے بہانے کچھ وقت لے لوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''بس تو پھر ایسے ہی کر، تو پڑھ، جب تک میری نوکری نہیں لگ جاتی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

وہ مان تو گئی لیکن وہی ہو گیا جس کا اسے ڈر تھا، ابھی نارائن کے فائنل امتحان کچھ دور تھے۔ ایک دن سمیتا دیوی نے اسے بتایا کہ آج شام ان کے گھر اس کی خالہ آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا مہیش بھی ہے۔ مہیش اِدھر ہی رہے گا، یہ کارخانے میں نوکری کرے گا۔ باپو نے ہی انہیں بلایا ہے۔ یہ پکی بات ہے کہ اس کی شادی بھی مہیش ہی سے ہو جائے گی۔

''اب کیا کروں؟'' نارائن نے تشویش سے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے، ابھی تو وہ آئے گا، نوکری کرے گا، کچھ پیسہ کمائے گا، تب بات چلے گی، تو ایسا کر تھوڑا پیسہ بنا، نوکری کر، پھر میں بھی تیری بات ہی کروں گی، ابھی کیا بات کروں؟'' سمیتا نے اسے راستہ دکھایا۔

''چل تیری بات مانی۔ دو مہینے میں پیسہ بناتا ہوں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا، اس نے عزم کر لیا کہ وہ سمیتا کو ہر قیمت پر حاصل کرے گا۔

اگلے ہی دن وہ کالج میں اپنے کلاس فیلو داوڑے کے پاس جا پہنچا، جو کالج میں ڈرگ کا دھندا کرتا تھا۔ وہ بھی گنگا نگر کا ہی تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے لیکن جب سے اس نے ڈرگ کا دھندا کیا تھا، نارائن اس سے دور رہنے لگا تھا۔

''دیکھ میں صرف اتنا ہی پیسہ بنانا چاہتا ہوں جس سے میری ضرورت پوری ہو جائے اور......'' اس نے اپنی بات پوری کرنا چاہی لیکن داوڑے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بات سن، یہاں آنے کا راستہ ہے لیکن جانے کا نہیں، تُو ایک اچھا لڑکا ہے، جانے دے، تھوڑا بہت پیسہ چاہیے تو وہ مجھ سے لے لے۔''

''مجھے نہ تو بھیک چاہیے اور نہ تھوڑا پیسہ، مجھے بس پیسہ کمانا ہے اور بہت کمانا ہے۔'' نارائن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''یار تیرا مسئلہ سمیتا دیوی ہے نا اس کے لیے بہت ہوگا۔'' داوڑے نے سمجھایا تو نارائن نے کہا۔

''ہاتھی نکل بھی گیا اور دُم پھنس گئی تو......؟ ایسا نہیں، ایسا نہیں چلے، تُو بس مجھے کام دے اور میں خوب کما لوں، پھر میں نکل بھی آؤں گا۔'' اس بار نارائن نے اُکتاتے ہوئے کہا، جس پر داوڑے کچھ دیر تک خاموش رہا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''چل آ، تجھے آج ہی کام دیتا ہوں، ایک پیکٹ پہنچا کے آ۔''

وہ پہلا پیکٹ بڑے آرام سے دے آیا تھا۔ واپسی پر جو اسے رقم ملی، اسے دیکھ کر وہ خود حیران رہ گیا۔ ایک دم اتنا پیسہ؟''

''ارے شا، ایسے کیا دیکھتا ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، دو مہینے میں تجھے نہال کر دوں گا۔ جا اب آرام کر، کل ایک پیکٹ اور دے آنا۔'' داوڑے نے کہا تو وہ خوشی خوشی چلا گیا۔

اس نے جتنی رقم سوچی ہوئی تھی، وہ اس نے ڈیڑھ ماہ ہی میں بنا لی۔ وہ زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے ایک دن حتمی بات کرنے کے لیے سمیتا کو بلا لیا۔ وہ وقت پر آ گئی تھی۔ ایک درمیانے درجے کے ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے سمیتا کو یہ خوشخبری سنا دی کہ اس کے پاس اتنی رقم ہو گئی ہے کہ چھوٹا موٹا کاروبار کر سکے۔ سمیتا بھی خوش ہو گئی۔ اس نے نارائن سے یہ پوچھنے کی کوشش تو کی کہ یہ اتنی رقم کہاں سے آئی لیکن نارائن کے ٹال جانے پر اصرار نہیں کیا۔ انہوں نے پروگرام بنا لیا کہ شادی کے لیے ان کو کیا کرنا ہے۔ وہ دونوں مل کے پلان کرنے لگے۔ کئی سنہرے خواب بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے رہے۔ بس وہ موقع دیکھ رہے تھے کہ کب سمیتا کی منگنی کے بارے میں بات ہو۔ وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا۔ اس نے اپنے پتا کو منا لیا تھا۔ یہ بات اس نے نارائن کو اس دن بتائی جب وہ دونوں سارا دن بیچ پر موج مستی کرتے رہے تھے۔

وہ دونوں خوش تھے۔ یہ سمیتا ہی کا جذباتی پن تھا کہ وہ نارائن کو جلد از جلد حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ ایک دن جب وہ فلم دیکھ کر واپس پلٹے تو ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ اس دن انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلے ہفتے میں وہ شادی کر لیں گے۔ سمیتا اپنے گھر چلی گئی اور وہ اپنے گھر۔

اگلی صبح وہ کالج کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ پولیس والوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس نے پوچھا۔

''ابے او، تیرا نام ہی نارائن عرف نٹا ہے نا؟''

''ہاں تو، پر بات کیا ہے؟'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا تو اگلے ہی لمحے اس پر تھپڑوں مکوں اور ڈنڈوں کی بارش ہو گئی۔ اسے یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ کب پولیس نے اسے گاڑی میں ڈالا اور کب پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ حوالات میں پہنچتے ہی اس کی نگاہ داوڑے کے چند لڑکوں پر پڑی۔ وہ ساری بات سمجھ گیا۔

تین برس بعد جب وہ جیل سے باہر آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ سمیتا کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ مہیش کے ساتھ نجانے کہاں تھی۔ اس کے پتا کو کسی نے اولڈ ہوم میں پہنچا دیا تھا۔ اس کے اپنے ماتا پتا بھی نہ رہے تھے۔ اس کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اس سوال کا جواب کبھی نہیں مل سکا کہ وہ کون ہے جس نے اس کے بارے میں مخبری کی تھی۔

اسی شام داوڑے اس کے پاس آ گیا۔

''داوڑے، میرا کسی کو معلوم نہیں تھا، پن مجھے پکڑا گیا۔ کس نے کیا یہ کام، کون ہے وہ جس نے میری زندگی تباہ کر دی؟'' اس کا داوڑے سے پہلا سوال یہی تھا۔

''مجھے بھی نہیں معلوم، میں نے بہت پتا کیا۔ میرا کالج میں سارا کام ٹھپ ہو گیا۔ وہ مجھے مل جائے تو ماں قسم چھلنی کر دوں۔'' داوڑے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

نارائن کا گھر رہا تھا اور نہ کوئی اپنا، وہ اسی کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا گھر دھاراوی کی جھونپڑ پٹی میں تھا۔ وہاں دو لڑکے مزید تھے۔ گھٹیا شراب کے ساتھ کھانا کھا کر داوڑے نے پلان دیا۔

''دیکھو، تم لوگوں کا کوئی نہیں رہا، بڑا ہاتھ مارتے ہیں۔ یہ چھوٹا کام اب نہیں۔''

''کیا کرنے کا؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''تم لوگوں کو کام پر لگانے کا۔ دھندا، پر بڑے لیول کا۔ ادھر جو ہو میں اپن پر ہاتھ رکھنے والا تاؤ ہے نا، فل پروٹیکشن، جو وہ بولے، مال لانا اور لے جانے کا پھر خوب عیاشی کرنے کا۔'' اس نے ہوا میں بازو گھما کر کہا۔

''کرنے کا یار۔'' نارائن نے جھومتے ہوئے کہا۔

اگلے چار برس یہی دھندا چلتا رہا۔ جرم کی دنیا میں کوئی دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی دشمن۔ صرف فائدہ ہوتا ہے۔ کون کب اور کتنا فائدہ لے جائے، یہی دیکھا جاتا ہے۔ انہیں جو ہو سے تھوڑا دور ویرولی کا علاقہ دیا گیا۔ اس علاقے کو حاصل کرنے کے لیے انہیں بڑی محنت کرنا پڑی۔ بہت لڑنا پڑا، خون بہے۔ آخر انہوں نے وہ علاقہ چھین لیا۔ نارائن بہت مال کمانے لگا تھا مگر وہ اس بندے کو کبھی نہیں بھولا تھا جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ماں باپ، سمیتا، ایک اچھی زندگی۔ وہ جتنا کماتا، سب اُڑا دیتا تھا۔ مال لانے اور لے جانے کے بعد وہ عیاشی میں دن گزارتا تھا۔ ایک سے ایک لڑکی اس کی راتوں میں آتی اور دن کے اجالے میں وہ انہیں بھول چکا ہوتا۔ ہر نیا آنے والا دن جرم کی دنیا میں نام بنا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر مشکل کام کا بڑا پیسہ مل رہا تھا۔ ویرولی میں داوڑے کا گینگ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔

یہ ممبئی میں انڈر ورلڈ کی روایت رہی ہے کہ ایک گینگ مشہور ہوتا ہے تو کچھ ہی عرصہ بعد اس کی جگہ نیا گینگ بن جاتا ہے۔ کبھی اپنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے کبھی کسی دوسرے گینگ کی جگہ چھین لینے کے باعث اور کبھی گینگ کے اہم بندوں کے مر جانے کے باعث۔ گینگ کی ایک دوسرے کے خلاف یہ چھینا جھپٹی چلتی رہتی ہے۔ اس کا فائدہ ان بڑے جرائم پیشہ لوگوں کو ہوتا ہے جو سکون سے کہیں بیٹھے، انہیں اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہوتے ہیں۔ داوڑے کے گینگ کی بھی ... کئی دشمنیاں چل رہی تھیں۔ وہ بہت محتاط ہو کر کام کرتے تھے لیکن پھر بھی بہت کی نگاہوں میں تھے۔

ایک رات ویرولی ہی کے ساحلی علاقے والے بنگلے میں نارائن ایک لڑکی کا منتظر تھا۔ شراب کا نشہ اسے ہلکا ہلکا سرور دے رہا تھا۔ وہ لڑکی جب اس کے سامنے پہنچی تو نارائن کے حواس ہی گھوم گئے۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اس نے پہلے کبھی دیکھی نہیں تھی۔

''اے چکنی، کیا نام ہے تیرا؟'' اس نے لڑکی کو صوفے پر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''بولے تو کوئی بھی رکھ لے نام، جو بولے گا وہ ہوئے گا۔'' لڑکی نے اپنے گیسو سنوارتے ہوئے قاتل ادا سے کہا۔

تب نجانے کہاں اس کے ذہن میں چھپی ہوئی سمیتا جاگ گئی۔ اس کے ہونٹ بالکل سمیتا جیسے لگ رہے تھے۔ اس نے لڑکی کے لبوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑے مسرور سے کہا۔

''چل تیرا نام، سمیتا۔ اب تو میرے پاس رہے گی، جو مانگے گی، ملے گا، پر کہیں بھی نہیں جانے کا۔''

''ڈن۔'' اس لڑکی نے کہا اور اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے۔ نارائن کسی دوسرے ہی جہان میں پہنچ گیا۔ اس رات وہ تیز نشے کے مانند خمار بن کر اس پر چھا گئی۔ نارائن کو جیسی لڑکی چاہیے تھی، وہ مل گئی تھی۔ وہ خوش

تھا۔ اس نے داوڑے سے کہا کہ چند دن ادھر ہی رہ کر عیاشی کرتے ہیں۔ وہ اس شرط پر مان گیا کہ تین دن بعد اس لڑکی کو بھگا کر کام پر جانا ہے۔

تیسری رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ نارائن قربتوں کی انتہا کو چھو کر مدہوش پڑا ہوا تھا۔ ہر جانب سناٹا تھا۔ ایسے میں بنگلے ہی کے آس پاس اُسے فائر کی آواز سنائی دی جس نے خاموشی کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ اس کے دماغ میں الارم بجتے ہی نشہ کافور ہوگیا۔ نارائن نے اپنا جائزہ لیا۔ اس نے فقط پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اسی ایک لمحے میں اس نے اپنے ساتھ پڑی اس لڑکی کے بدن میں انتہائی تیزی سے تھرتھراہٹ محسوس کی۔ وہ بے ساختہ اٹھ گئی۔ وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی کھڑکی تک گئی، پھر واپس آ کر اس نے اپنے کپڑے سنبھالے۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل بھاگتی، نارائن معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ کیونکہ باہر فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی سے اس لڑکی کو پکڑ لیا۔ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ چیخ بلند ہوئی۔

''کون ہیں باہر؟'' نارائن نے تیزی سے پوچھا۔

''م...... میں کیا جانوں؟'' لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اس نے لڑکی کو گھما کر بیڈ پر پھینکا۔ وہ اٹھنے لگی تو نارائن نے تکیے کے نیچے سے پسٹل نکال لیا۔ اسی دوران لڑکی چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھ سے نکلی اور کھڑکی کی جانب بھاگی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کھڑکی سے کودنے والی تھی۔ نارائن نے ایک ہی جست میں اسے کھڑکی کے پاس دبوچ لیا۔

''تیرے پاس صرف ایک لمحہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نارائن نے پسٹل کی نال اس کے سرخ لبوں پر رکھ دی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، ایک دم سے دروازہ کھلا، جو شخص اندر داخل ہوا اسے دیکھتے ہی سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ داوڑے کا جانی دشمن سلیم سنکا تھا۔ وہ لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر دروازے ہی میں ساکت ہوگیا تھا۔

''چھوڑ دے اِسے؟'' سلیم سنکا نے غراتے ہوئے کہا۔

''آخر تو نے اپنی اصلیت دکھا دی نا کتّے، عورت کو بیچ میں لا کر وار کرتا ہے، ہیجڑے۔'' نارائن نے انتہائی تلخی سے کہا۔

''دیکھ تیرے گینگ کے سارے لوگ مر گئے، کوئی نہیں بچا، اگر اس لڑکی کو کچھ ہوگیا تو بچے گا تو بھی نہیں، چھوڑ دے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ ڈائیلاگ بازی کسی اور سے کر کمینے، میں......''

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی اور اسی دوران میں وہ لڑکی سمیت کھڑکی سے کود گیا۔ باہر کی طرف گرتے ہی نارائن نے فائر کر دیا۔ تبھی کمرے سے بھی فائر ہوگیا۔ لاشعوری طور پر نارائن نے خود کو بچانا چاہا، کروٹ لیتے ہی وہ لڑکی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اب اس کے پاس اپنی جان بچانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ انتہائی سرعت سے اٹھا اور بھاگتا چلا گیا۔ اس کی پشت سے فائر بھی ہوئے جو اسے نہ لگے یہاں تک کہ وہ دیوار کود گیا۔

داوڑے کا گینگ ختم ہوگیا تھا۔ اب وہاں سلیم سنکا گینگ کا راج ہونے والا تھا۔ وہ صبح صبح اپنے ایک دوست مانتے کے پاس چلا گیا۔ شام تک اسے پتا چل گیا کہ وہ لوگ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس نے وہ علاقہ ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ مانتے سے اس نے تھوڑے پیسے لیے اور ویرولی کے علاقے کو چھوڑ کر دادر میں آ گیا۔ ویرولی میں رہتا تو مارا جاتا۔ دادر میں پہلے دن وہ ریلوے ٹریک کے ساتھ پڑے ایک پائپ میں سویا تھا۔ اگلی صبح بھوک اور نشے کی طلب نے اسے بے حال کر دیا۔ اس کے پاس جو پیسے تھے وہ نشے کی طلب پوری کرنے میں خرچ ہو گئے۔ وہ نشہ اسے وہیں پائپوں میں پڑے موالیوں سے مل گیا تھا۔ انہوں نے ہی نشہ ملنے والی جگہ دکھا دی۔ نارائن کا مقصد دشمنوں سے بچنا اور نشے کی عادت کو پورا کرنا تھا۔

اب اس کا مسکن کبھی کسی پل کے نیچے، کبھی ریلوے ٹریک کے ساتھ، کبھی کسی کچرے کے پاس اور پھر وہ فٹ پاتھ پر آ گیا۔ اپنی جان بچانے کے چکر میں وہ گھٹیا نشے کا عادی ہوتا چلا گیا تھا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ ذلت کی زندگی نے اس کے اندر سے موت کا خوف نکال پھینکا تھا۔ وہ بے حس ہوگیا تھا۔ اپنی اس تباہی کا ذمے دار اس کو سمجھتا تھا جس کی وجہ سے پہلی بار پولیس نے اسے پکڑا تھا۔ دوسری وہ حسین کال گرل تھی۔ اسے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کا خیال بھی آتا لیکن نشے کے چنگل میں پھنسا وہ بے بسی سے محض سوچ کر، دانت پیس کر رہ جاتا۔ پھر ایک دن اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اس ہیلتھ کیئر سینٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اب زندگی اسے کس ڈگر پر لے جانے والی تھی، اسے خود معلوم نہیں تھا۔

اس ہیلتھ کیئر سینٹر میں رہتے ہوئے اسے تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ نشے کی عادت کو بالکل ختم کر چکا تھا۔ ڈاکٹر کے علاج پر اس نے پوری توجہ دی تھی۔ اس صبح وہ

طویل جوگنگ کے بعد بھاگتا ہوا گیٹ میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ لان میں بیٹھے انہی دو ادھیڑ عمر آدمیوں پر پڑی جو اسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے بالکل ٹھیک ہونے کے بعد اب کوئی کام لینے والے ہیں۔ وہ سیدھا ان کے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''فٹ ہو گئے ہو، اچھا لگا۔'' اسی بندے نے غیر جذباتی انداز میں کہا جس نے پہلے بھی اس سے بات کی تھی۔ دوسرا خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اب بولو کام کیا ہے؟'' نارائن نے وقت ضائع کیے بغیر پوچھا تو وہ بولا۔

''کوئی کام نہیں ہے۔ تمہارے سامنے آپشن رکھنے آیا ہوں۔''

''کیسے آپشن؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک، یہاں رہنا ہے بھارت میں یا باہر جانا ہے جہاں تم اپنی زندگی گزارو...... دوسرا، یہیں کہیں جاب کرنی ہے تو بتاؤ کیا کر سکو گے؟ تیسرا اپنا کوئی بزنس کرنا چاہتے ہو تو کہو؟'' ادھیڑ عمر آدمی نے کہا تو اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''یہ آفر دینے والا کون ہے؟''

''بتایا نا مجھے خود بھی نہیں معلوم، تم بولو؟'' اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''ان میں سے کوئی بھی نہیں۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''تو......؟'' اس نے بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا تو نارائن چند لمحے خاموش رہا پھر سرد سے لہجے میں بولا۔

''اس کا شکریہ جس نے مجھے نئی زندگی دی، اس سے کہو اب کام بولو، یا مجھے جانے دو۔''

''آج شام تک بتا دیں گے۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا خاموش بندہ بھی اٹھ گیا۔ وہ انہیں پورچ تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر خود بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا، اب اسے یہاں سے جانا ہے۔ ایک نئی زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر وہ لاکھ کوشش کے بعد بھی اپنے دشمنوں کو نہیں بھلا سکا تھا۔ اسے بس انتقام لینا تھا۔ انتقام کا جذبہ اسے بے کل رکھتا تھا۔

☆☆☆

نارائن اور مانتے اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کافی دور سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ مغربی افق میں جھکا ہوا سورج شام ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ مانتے آتا ہوا کھانا لے آیا تھا۔ جب تک نارائن نے وہ کھایا، مانتے چائے بنا لایا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور خاموش تھے۔ تبھی مانتے نے دھیرے سے کہا۔

''تم کو بھارت سے نکل جانے والا آپشن مان لینا تھا۔ جو ختم ہو گیا سو ختم ہو گیا، اب جلی ہوئی راکھ سے چنگاریاں کیوں تلاش کر رہے ہو؟''

''تم کہتے تو ٹھیک ہو، پن میں باہر جا کر کروں گا کیا؟ وہی گھسٹ گھسٹ کر زندگی گزاروں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''مگر وہاں دشمنی تو نہ ہوتی۔'' مانتے نے جواب دیا۔

''تو ڈرا رہا ہے مجھے؟'' نارائن نے پوچھا۔

''نہیں، سمجھا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے چائے کی چسکی لی پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔ ''راج مٹھل تو پھر بھی سامنے آجائے گا اس نے تیری تلاش میں بندے بھی لگا دیے ہوں گے، یہ کنفرم ہے لیکن، مایا دیوی ایک ان دیکھا خوف ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی کو پیسے کے لیے نہیں مارتی۔''

''کس لیے مارتی ہے۔'' نارائن نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، پر مارتی ہے، اپنے ہونے کا ثبوت بھی دیتی ہے۔ یہ جو راج مٹھل ہے نا، اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ پر مسئلہ یہ ہے کہ تم مایا دیوی تک کیسے پہنچو گے؟ وہ کیوں مہربان ہوگی تم پر؟ اسے تم سے کیا فائدہ ہوگا؟'' مانتے نے صورتِ حال اس کے سامنے رکھی۔

''ہاں مجھے ایک سراب کے پیچھے بھاگنے کے بجائے، راج مٹھل کا بندوبست کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چائے کا مگ خالی کر دیا۔

''اس سے پہلے کہ وہ تمہارا بندوبست کرے، میرا خیال ہے، تم اس......'' یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا پھر حیرت سے بولا۔ ''پر وہ مہربان کون ہے جس نے تمہیں نئی زندگی دی اور......'' مانتے نے حیرت سے پوچھا۔

''جب اس نے نہیں بتایا تو میں کیوں پوچھوں۔ خیر، میں تمہاری زندگی عذاب نہیں کرنا چاہتا۔ تم سکون سے رہو۔ میں آج شام یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔'' نارائن نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا اور مانتے کے چہرے پر دیکھنے لگا، اس پر مانتے نے تڑپ کر کچھ کہنا چاہا تو نارائن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ نارائن سڑک کنارے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ مانتے نے چند ہزار روپے اس کی جیب میں ڈال دیے تھے۔ اس لیے وہ وقتی طور پر اس فکر سے آزاد تھا۔ اس

کا سارا دھیان راج مٹھل کی جانب تھا کہ اس تک کیسے پہنچا جائے۔ ارد گرد آتے جاتے لوگوں سے بے نیاز وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی اسے چھوٹا سا ریستوران دکھائی دیا جہاں سے کبھی اس نے داوڑے کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ وہ ریستوران میں گھس گیا۔ نچلے درجے کے غریب لوگ، کچھ سفید کالر اور طالب علم وہاں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھی ایک میز کے گرد بیٹھ گیا۔

''کیا کھائے گا سائب۔'' ایک نوجوان ویٹر نے اس کے سامنے پانی رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

داوڑے کے ساتھ اس نے جو کھایا تھا، وہی اس نے بتا دیا۔ وہ کھانا آجانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں شکل ہی سے دکھائی دینے والے چند غنڈے ریستوران میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی اس نوجوان ویٹر کو مارنا شروع کر دیا، جو کچھ دیر پہلے ہی اس سے آرڈر لے کر گیا تھا۔ چھوٹی سی جگہ تھی۔ ایک غنڈا اسے مارتا تو وہ ایک طرف گر جاتا، دوسرا مارتا تو وہ دوسری جانب گر جاتا۔ وہ سبھی اسے گالیاں بک رہے تھے۔ نارائن یہ سب دیکھ رہا تھا کہ ایک غنڈے کے مارنے پر وہ ویٹر اس پر آن گرا۔ نارائن نے اٹھ کر اسے تھام لیا۔ ایک غنڈا اسے مارنے کو بڑھا تو نارائن نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''بس اب نہیں مارنا اِسے۔''

''ابے سالے تو کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا۔'' یہ کہتے ہی اس غنڈے نے گھونسا مارنے کو ہاتھ بڑھایا تو نارائن نے پوری قوت سے اس کی ٹانگوں کے درمیان ٹھوکر ماردی۔ وہ ڈکارتا ہوا پیچھے کی جانب گر گیا۔ حملہ آور غنڈوں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر اکٹھے ہو کر حملہ آور ہوتے، نارائن نے پسٹل نکال کر زمین پر پڑے ہوئے غنڈے کی ٹانگوں میں فائر جھونک دیا۔ یہ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ سب ساکت ہو گئے۔ نارائن نے اس پر جھک کر پوچھا۔

''بتا کون سالا؟''

''مم...... مم...... میں......'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''چلو بھاگو۔'' اس نے پسٹل کی نال سے انہیں باہر کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ نکلے اس نوجوان نے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے نارائن سے کہا۔

''آپ کوئی بھی ہو، آپ نکل جاؤ یہاں سے، یہ ابھی زیادہ ہو کر واپس آئیں گے اور......''

''مت گھبراؤ، کھانا لے کر آؤ۔''

''سائب، یہ رگھو ٹانڈیا کا چھوکرا لوگ ہے، بوہت خطرناک۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تو نارائن بولا۔

''کہانا، کھانا لاؤ۔''

وہ نوجوان ویٹر تیزی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا اور اسی تیزی سے کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کھانا رکھ چکا تو نارائن نے اس نوجوان ویٹر کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔

''تیرے ساتھ کیا لفڑا ہے؟''

''یہ لوگ ہمارا کھولی مانگتا ہے، وہاں میں ہوں اور میری ماں ہے۔ اب ہم کہاں جائیں؟ انہوں نے پہلے بھی مجھے مارا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑا۔

''اچھا، باہر نظر رکھ، جب وہ آئیں تو مجھے بتانا۔'' یہ کہہ کر نارائن کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے اطمینان سے کھانا کھایا، ہاتھ دھوئے اور ریستوران کے کاؤنٹر پر پیسے دے رہا تھا کہ باہر پولیس کی گاڑی آرکی۔ دو کانسٹیبل کے ساتھ ایک حوالدار نے اندر آ کر کاؤنٹر پر بیٹھے مالک سے پوچھا۔

''کون تھا وہ غنڈا جس نے فائر کیا؟''

''میں ہوں۔'' نارائن نے کہا تو حوالدار نے چونک کر اسے دیکھا۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ اس کی ایسے بندے کے ساتھ بھی ملاقات ہو سکتی ہے جو خود کو پولیس کے حوالے کرے۔

''کون ہے بے تو؟'' اس حوالدار نے حقارت بھرے لہجے میں پوچھتے ہوئے اسے گردن سے پکڑنا چاہا۔ تبھی نارائن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سرد سے لہجے میں کہا۔

''مایا دیوی، نہیں چاہتی کہ کوئی اور اس علاقے میں ہو۔ چل پولیس اسٹیشن، لے چلے گا مجھے؟''

نارائن نے اس قدر اعتماد سے غراتے ہوئے کہا کہ وہ حوالدار ایک لمحے کو گڑبڑا گیا پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''چل، میرے ساتھ۔''

نارائن اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سب وین میں بیٹھے تو وین چل دی۔ کچھ دور جا کر اس حوالدار نے وین رکوائی اور نارائن سے کہا۔

''چل اُتر جا، تم لوگ......'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رُک گیا تو نارائن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''رگھو ٹانڈیا سے کہنا، راج مٹھل کو بتا دے، اب

میں ہوں اِدھر، اسے یہاں سے چلے جانے کا۔ ورنہ سب کھلاس۔'' یہ کہہ کر اس نے لحہ بھر حوالدار کو دیکھا اور وین سے نیچے اتر گیا۔ نارائن کو یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اسے مایا دیوی کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ ایک خوف کے مانند چھا گئی تھی۔ نارائن سڑک سے اتر کر اندھیرے کی جانب چل دیا، وہ خود سوچتا چلا جا رہا تھا کہ جس کا خوف اس قدر ہے، اس کے نام پر غنڈا گردی اسے تنکے کی طرح اُڑا دے گی۔ اس کا نام استعمال کرنا بہت بڑا رسک تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ اس وقت وہ ساحلِ سمندر کی سیمنٹ والی ریلنگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ سمندر کی لہریں سر پٹخ رہی تھیں۔ دور سامنے حاجی علی کے مزار کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک جانب دادر سے ویرولی آنے والی سمندر پر بنی سڑک تھی، جس پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس کے پیچھے ایک لمبی جھونپڑ پٹی تھی۔ وہ واپس ماتے کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے ماتے کو کوئی نقصان ہو۔ وہ ایک لگی بندھی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ اس کے پاس دولت تھی، اور نہ ہی کوئی گینگ جو اس کی قوت بن سکتا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں رہتے ہوئے اپنے دشمنوں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ جب تک وہ اتنی قوت حاصل کرے گا، تب تک وہ لوگ کس قدر طاقت ور ہو چکے ہوں گے یا ویسے ہی ان کا صفایا ہو چکا ہوگا۔ بھلے وہ خود بھی نہ رہتا۔ اس کے اور دشمنوں کے درمیان وقت حائل تھا۔

وہ تیزی سے سوچتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طرف اس کے دشمن تھے، دوسری جانب وہ لوگ جنہوں نے اسے نئی زندگی دی تھی اور تیسرا پہلو مایا دیوی تھی۔ وہ تنہا کیا کر سکتا ہے؟ وہ چند گھنٹے یا مزید ایک دن نیند کے بغیر گزار سکتا تھا۔ کوئی رہنے کا ٹھکانا تک نہیں تھا۔ اس نے جذبات میں آ کر اس شخص کی آفر ٹھکرا دی تھی، ورنہ وہ بھارت سے باہر سکون سے زندگی گزار رہا ہوتا۔

اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا جب ایک فور وہیل اس کے پہلو میں آ کر رُکی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنیاں اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی تھیں۔ اس نے ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا اور دوسرے سے پسٹل کو اپنے سامنے کر لیا۔ جس وقت اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو تین افراد کے ساتھ وہی نوجوان ویٹر بھی تھا۔ وہ لاشعوری طور پر محتاط ہو گیا۔ وہ اس کے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک لمبے قد والے نے نوجوان ویٹر سے پوچھا۔

''یہی تھا وہ؟''

''جج.... جی.... یہی تھا'' اس نے تصدیق کر دی تو دوسرے نے کہا۔

''چل، بھاگ جا۔''

اس نوجوان ویٹر نے اپنی جان بچتے ہی ایک طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ تینوں اس کے پاس آ گئے۔ تبھی لمبے قد والے نے اس کے بالکل پاس آ کر سکون سے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ آرام سے چلے گا یا زبردستی لے جانا پڑے گا۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ......'' نارائن نے کہنا چاہا تو پیچھے کھڑے آدمی نے کہا۔

''جاستی بات نہیں کرنے کا، چپ چاپ گاڑی میں بیٹھنے کا، اور ہمارے ساتھ چلنے کا۔''

''پسٹل پر اتنا اونچا بولتا ہے۔'' نارائن نے حقارت سے کہا۔

''تو بھی ہاتھ میں لیے ہوئے ہے، اب تو چلا، دیکھتے ہیں کون مرنے کا، چل چلا'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور اس نے نارائن پر پسٹل تان لیا۔ تبھی لمبے قد والے نے اپنا پسٹل پھینک کر کہا۔

''چل آ، میرے ساتھ خالی ہاتھ۔''

نارائن پاگل نہیں تھا کہ وہ پسٹل پھینک دیتا، اس نے واپس پشت پر پسٹل اُڑسا اور اس کے سامنے آ گیا۔ ان دونوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہی تھیں کہ بغل میں کھڑے تیسرے بندے نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ نارائن محتاط تھا، وہ جھکائی دے گیا۔ وہ سیمنٹ کی ریلنگ کے ساتھ جا لگا۔ پھر بھنا کر اٹھا اور اسے پکڑنے کو لپکا اسی وقت لمبے قد والا اس پر جھپٹا۔ نارائن نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے گھونسا مارا، تب تک اس کی گردن پر مکا پڑ چکا تھا، وہ چکرا گیا۔ اتنے میں تیسرا بھی اس پر پل پڑا۔ اس نے آتے ہی نارائن کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور ٹکر مارنے کو سر بڑھایا، نارائن نے سر ایک جانب جھکا لیا، وہ اپنے جھونک میں آگے ہوا تو نارائن نے اس کے ٹکر مار دی۔ وہ تینوں اس پر پل پڑے۔ نارائن جانتا تھا کہ وہ ایک وقت میں تینوں سے نہیں لڑ سکتا۔ اس نے دو کی پروا نہیں کی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس نے ایک کو پکڑا اور پوری قوت سے سیمنٹ کی ریلنگ کی

جانب لے جا کر اس کا سر زور سے مارا۔ وہ وہیں لڑھک گیا۔ اب اس کے سامنے دو تھے۔ لمبے قد والے نے ٹھوکر مارنے کے لیے ٹانگ بڑھائی تھی، اسی لمحے اس کی پسلی میں ایک ٹھوکر لگی جس کی پروا نہ کرتے ہوئے لمبے قد والی کی ٹانگ پکڑ لی، اسے اپنی جانب کھینچ کر اس نے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ تبھی اس نے پسٹل نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ تیسرا پسٹل نکال کر اس کی جانب تان کر ہی رہا تھا کہ نارائن نے فائر کر دیا۔ چند منٹوں میں وہ تینوں ڈھیر ہو چکے تھے۔ نارائن نے دیکھا دور دور کافی لوگ کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھاگ کر گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہی تھی، اس نے گیئر لگایا اور چل دیا۔

گاڑی بھگاتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لی اور ملگجی روشنی میں سمندر کی شوریدہ سر لہروں کو دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ وہ اب کہاں جائے۔ انہی لمحات میں اسے ویرولی کی اسی ساحلی پٹی پر بنے بانسوں والے اس ہوٹل کی یاد آگئی۔ جو بوڑھا ڈیلاس پتا نہیں کب سے چلا رہا تھا۔ اس نے اسی کے پاس جانے کی ٹھانی۔ وہ گاڑی بھگاتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ وہاں ہوٹل کے باہر چند موالی بیٹھے ہوئے گھٹیا شراب سے شغل کر رہے تھے۔ اس نے ہوٹل سے ذرا دور گاڑی روکی اور اُتر کے کاؤنٹر پر کھڑے ڈیلاس کے پاس چلا گیا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

''اے بچے، کدھر چلا گیا تھا تو، بہت عرصے بعد نظر آیا۔''

''ڈیلاس، مجھے گاڑی بیچنی ہے، وہ سامنے کھڑی۔''

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنا مدعا کہہ دیا، بوڑھے کے ماتھے پر بل پڑے، پھر مسکراتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔

''پریشان لگتا ہے۔ خیر۔'' یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر میں جھکا، نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا، ''چار دن بعد آنا، گاڑی کی رقم یا پھر گاڑی لے جانا۔''

نارائن نے وہ گڈی لے کے جیب میں رکھ لی۔ وہ جانتا تھا کہ ڈیلاس تھوڑی بہت جانچ کر کے ہی اس گاڑی کی رقم دے گا۔ یہ اس کا دھندا تھا، اور وہ اپنے دھندے میں بڑا محتاط تھا۔

''ایک کام اور......'' نارائن نے دھیمے سے کہا۔

''وہ کیا؟'' بوڑھے ڈیلاس نے بھویں اچکا تے ہوئے پوچھا تو نارائن نے اپنا پسٹل نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا، پھر بولا۔

''ایک بلٹ بھی نہیں بچی اس میں۔ اس کے بنا تو کچھ نہیں ہونے کا۔''

''اوہ۔'' ڈیلاس کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا، ''ابھی تھوڑی دیر رکو، میں آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چلا گیا۔ نارائن وہیں کاؤنٹر پر کھڑا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد ڈیلاس واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر بیگ تھا۔ اس نے وہ نارائن کو دیتے ہوئے کہا۔

''اپنا یہ گھوڑا اِدھر رکھو اور یہ لے جاؤ، ساتھ میں دو فالتو میگزین ہیں۔''

نارائن نے وہ شاپر کھول کر دیکھا، ڈیلاس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

رات کا دوسرا پہر بھی گزر چکا تھا۔ وہ ساحلی سڑک کے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا اور وہ سونے کے لیے کوئی جگہ کھوج رہا تھا۔ ممبئی میں ہزاروں مزدور، بے روزگار سڑکوں، پارکوں، فٹ پاتھوں اور نئی تعمیر ہونے والی بلڈنگوں میں سوتے ہیں۔ اس شہر میں یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں تھی۔ وہ چلتا چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک بلڈنگ دکھائی دی، جو ابھی تعمیر ہو رہی تھی۔ ایسی بلڈنگوں میں وہاں کام کرنے والا مزدور طبقہ اور اردگرد کے کئی موالی سو جاتے تھے۔ وہ تیزی سے ادھر بڑھ گیا۔ تعمیراتی سامان سے بچتا ہوا وہ بلڈنگ میں چلا گیا۔ نیچے کوئی نہیں تھا۔ وہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ کئی جگہوں پر اسے لوگ سوتے ہوئے ملے۔ ایک جگہ اسے سونے کے لیے مناسب لگی۔ وہ وہاں فرش پر جا کر لیٹ گیا۔ اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا اور نیند کی وادی میں کھو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اسے آنکھ کھلنے کی وجہ بھی پتا چل گئی۔ ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا، جیسے کوئی کسی کو مار رہا ہو اور کوئی آگے سے بچنے کے لیے منتیں کر رہا ہو۔ اس نے دھیان دیا تو کافی حد تک وہ بات سمجھ گیا۔ کئی غنڈے کسی کو یہاں لا کر پیٹ رہے تھے۔ کوئی بات منوانا چاہتے ہوں گے۔ وہ چند لمحے وہیں لیٹا رہا۔ اس شور کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ان کی نگاہوں میں آئے بغیر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے کان اسی شور کی جانب لگے ہوئے تھے۔ تبھی ایک نام سن کر اسے کرنٹ سا لگا، وہ تیزی سی اٹھا اور اس شور کی جانب محتاط انداز میں بڑھنے لگا۔ وہ اس شور کے قریب پہنچا تو ایک ستون کی آڑ لے کر اس نے دیکھا، چھ سات غنڈوں

کے درمیان ایک ادھیڑ عمر صحت مند شخص ہاتھ جوڑے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے جاگنگ کرتے ہوئے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ اسی حلیے میں تھا۔

''مجھے چھوڑ دو، جتنا پیٹی کہو گے، اتنا دوں گا، مجھے مار دینے سے تم کو کیا ملے گا؟'' اس نے رحم طلب انداز میں کہا۔

''نہیں گھوٹکے نہیں، بہت ہو چکا، تو نے ہماری بات نہیں مانی، بہت کہا تجھ سے، تو نے ہماری نہیں مانی، مگر ہم اپنی تو منوا سکتے ہیں نا، تجھے تیری اسی بلڈنگ میں ماریں گے، تجھے کہا تھا نا کہ ....'' ان میں سے ایک لمبے بالوں والے نے کہا، جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ پہچان گیا تھا یہی سلیم سٹکا ہے۔ وہی جس نے داوڑے گینگ پر حملہ کیا تھا۔ وہی جس سے بچ کر اس نے لڑکی سمیت کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اس اتفاق پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور فوری فیصلہ کر لیا۔

''او سلیم سٹکا، چھوڑ دے اسے۔''

آواز گونج کر رہ گئی۔ وہ سبھی ساکت ہو گئے۔ ان کے چہروں پر حیرت تھی۔ شاید ان کی سوچ میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یوں انہیں للکارے گا۔

''کون ہے بے سامنے آ۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ نارائن نے تاک کر فائر جھونک دیا۔ اس نے ایک چیخ سنتے ہی اپنی جگہ بدل لی۔ جواباً کئی فائر ہوئے۔ اس نے تاک کر دوسرا نشانہ لیا پھر یکے بعد دیگرے فائر کرتا چلا گیا۔ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ باقی شاید بھاگنے کی فکر میں تھے۔ نارائن کے پاس ساری گولیاں ختم ہو گئیں۔ اس نے پسٹل ہاتھ ہی میں رکھا۔ دوسرا میگزین چڑھا کر اس نے سامنے دیکھا۔ وہ سبھی گرے پڑے تھے۔ جسے اغوا کر کے لائے تھے وہ بھی اپنے سر پر ہاتھ رکھے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ان میں پتا نہیں کتنے زخمی تھے اور کتنے مر چکے تھے۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''چلا گولی سٹکا۔'' یہ کہتے ہی اس نے فائر کر دیا۔ دوسری جانب سے کسی نے بھی کوئی جوابی فائر نہیں کیا۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا، پھر بولا، ''گھوٹکے، اٹھ کر آ جا۔''

یہ سنتے ہی گھوٹکے کے بدن میں ارتعاش پیدا ہوا، اس نے اٹھ کر بے یقینی کے سے انداز میں ان سب کو دیکھا، پھر اٹھ گیا۔ وہ اٹھ کر چند قدم چلا ہی تھا کہ ایک غنڈا اٹھا اور اسے پکڑنا چاہا، نارائن نے بلاتردد اس پر فائر کر دیا۔ گھوٹکے تیزی سے باہر کی جانب بھاگا اور نارائن کو دیکھتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔

''اوہ......''

''پیچھے ہٹ جا، ابھی مجھے سب کو مارنا ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے ان پر فائرنگ کر دی۔ چند لمحوں بعد وہ ان کے پاس چلا گیا۔ ان میں سے دو آدمی شدید زخمی تھے، باقی سب مر چکے تھے۔ سلیم سٹکا ختم ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر نارائن کو بڑی تسکین ہوئی۔ ان میں جو ایک زندہ تھا، اسے ٹھوکر مارتے ہوئے نارائن نے کہا۔

''زندہ رہا تو راج مٹھل سے کہنا، میں آ گیا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ گھوٹکے نیچے جا چکا تھا۔ بلڈنگ کے اردگرد ہلچل مچ چکی تھی۔ نارائن بھی نیچے آیا۔ گھوٹکے نے کہا۔

''جلدی نکل چلو، ورنہ ان کے لوگ آ سکتے ہیں، یا پھر یہ پبلک نہیں جانے دے گی، چل نکل۔''

رش کی وجہ سے ٹریفک رک گئی تھی۔ نارائن کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہی لوگ اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ سامنے ایک ٹیکسی کھڑی تھی وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

وہ گھوٹکے کا شاندار گھر تھا۔ گھوٹکے اور نارائن لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نارائن فریش ہو کر نئے کپڑے پہن کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ناشتا کر چکے تھے۔ تبھی گھوٹکے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ پن میرے لیے فرشتہ کی مافق آیا تم۔ بولو کیا مانگتا۔''

''گھوٹکے، تم کیا دے سکتے ہو مجھے؟'' نارائن نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو گھوٹکے کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ پریشانی میں بولا

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، بس یہ ایک اتفاق تھا، میری وجہ سے تیری جان بچ گئی۔ اب مجھے جانا ہے۔''

''کہاں جاؤ گے تم؟''

''کہیں بھی۔'' اس نے کاندھے اچکا کر کہا۔

''نہیں تم میرے پاس رہو، اِدھر میرے گھر میں، یا تمہیں ایک فلیٹ دیتا ہوں اُدھر رہو۔ جب تک میں ہوں بس تم عیش کرو۔'' گھوٹکے اُس پر دریا دل ہو گیا۔ وہ خاموش رہا۔ اسے تو خود ایک ٹھکانا چاہیے تھا۔ تبھی گھوٹکے بولا۔ ''یہ بتاؤ تم میرے پاس رہے گا نا؟''

''شاید رہوں یا پھر نہ رہوں۔'' نارائن نے کہا ہی تھا کہ ایک ملازم آیا اور اس نے آتے ہی کہا۔

''وہ انسپکٹر اشوک آیا ہے، ملنا چاہتا ہے آپ سے۔''

تبھی گھوٹکے نے نارائن کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی رائے چاہ رہا ہو، اس پر نارائن نے کاندھے اچکا دیے۔ گھوٹکے نے اسے اندر بلانے کا اشارہ دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے ساتھ آ کر صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

''اچھا تو یہ ہے وہ جس نے آپ کی جان بچائی۔'' انسپکٹر اشوک نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد بولا، ''جان سکتا ہوں تم کون ہو اور کہاں سے ہو؟''

''یہ فالتو کا سوال ہے۔ میں ادھر سویا ہوا تھا، سلیم سنکا کو دیکھ کر اسے مارا۔'' نارائن نے جان بوجھ کر یہ بات انسپکٹر اشوک سے کہی تھی۔ وہ اس کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی سے پتا چل جاتا کہ انسپکٹر اشوک کیا چاہتا تھا۔ اس کا تیر نشانے پر لگا۔ انسپکٹر اشوک کی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ویلڈن، تم نے میرا کام آسان کیا، میں خود اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ بڑی مصیبت بن گئے ہیں یہ لوگ۔''

''تو بس اسے اپنے کھاتے میں ڈالو اور ترقی لو صاحب۔'' نارائن نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''وہ کوئی اکیلا تو ہے نہیں۔ میں اُسے اپنے کھاتے میں ڈالوں گا تو پتا نہیں کتنے دشمن بن جائیں گے۔'' انسپکٹر اشوک نے کہا۔

''ڈرتے ہو؟'' نارائن نے طنزیہ پوچھا۔

''ہاں ڈرتا ہوں مگر ان غنڈوں سے نہیں بلکہ اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی کالی بھیڑوں سے، سفید کالر جرائم پیشہ سے اور بکاؤ پریس سے۔ تم نے ٹی وی نہیں دیکھا، پولیس کی واٹ لگ رہی ہے۔'' اس نے دکھی انداز میں کہا۔

''پھر کیا چاہتے ہو آپ؟'' نارائن نے اس کی بات سے اندازہ لگاتے ہوئے فوراً پوچھا۔ وہ بھانپ گیا تھا انسپکٹر اشوک کیا چاہتا ہے۔

''میں اگر چاہوں تو ابھی تمہیں گرفتار کر کے لے جاؤں، سب کا منہ بند ہو جائے گا لیکن اس سے ہوگا کچھ نہیں۔ وہ بے غیرت غنڈے اپنا کام کرتے رہیں گے۔ گھوٹکے صاحب...... جیسے لوگوں کا دردِ سر بنے رہیں گے۔'' اشوک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''وہی تو اب آپ کیا چاہتے ہو؟'' گھوٹکے نے پوچھا تو انسپکٹر اشوک نے نارائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ پھر فیصلہ ہوگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' انسپکٹر اشوک نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''بولو، بتاتا ہوں۔'' نارائن نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہ مت بتاؤ کہ کہاں سے ہو اور کون ہو لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ یہاں پر کیوں ہو؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے راج مٹھل کو مارنا ہے۔'' نارائن نے سکون سے کہا تو انسپکٹر اشوک کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ تبھی اس نے جلدی سے پوچھا۔

''کیا تم اس کی جگہ لینا چاہتے ہو یا کوئی اور بات ہے؟''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے، مجھے بس اُسے مارنا ہے۔'' نارائن نے سکون سے کہا۔

''یہ کام تو میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ المیہ یہ ہے کہ قانون کی وردی میں کر نہیں سکتا ہوں۔ وجہ پہلے بتا دی ہے۔ اگر تم اس کی جگہ لینے کے لیے اسے مارنا چاہتے ہو تو پھر مجھے کوئی فائدہ نہیں۔ آج ان سے لڑ رہا ہوں کل تم سے لڑوں گا۔ غنڈا راج یونہی رہے گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر بولا، ''اور اگر تم اپنا کوئی بدلہ لینا چاہتے ہو تو میں تمہارا ساتھ دیتا ہوں۔ گارنٹی گھوٹکے صاحب دے دیں۔''

''ڈن ہو گیا۔'' نارائن نے سکون ہی سے کہا۔

''میں دیتا ہوں اس کی گارنٹی۔'' گھوٹکے نے دانت پیستے ہوئے کہا، اسے بھی اپنا بدلہ چاہیے تھا۔

وہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملازم نے آ کر بتایا کہ باہر پریس والے آئے ہیں۔ اس پر گھوٹکے نے انسپکٹر اشوک کی طرف دیکھا تو اس نے نارائن کی جانب دیکھ کر کہا۔

''اسے ذرا سائڈ پر کر دو، اور انہیں بلا لو۔ پریس کو یہی بتانا کہ وہ غنڈے آپس میں لڑ پڑے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر میں وہاں سے بھاگ آیا۔''

''ٹھیک ہے، بلاؤ پریس کو۔'' گھوٹکے نے کہا تو نارائن اٹھ کے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

جھونپڑ پٹی کی شمالی سڑک پار وہ کئی منزلہ عمارت تھی جس کے ایک فلیٹ میں نارائن ایک صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انسپکٹر اشوک نے اپنا ایک آدمی اس کے رابطے میں دے دیا تھا۔ جس نے پسٹل سے لے کر فالتو میگزین تک، سیل

فون سے لے کر کپڑوں تک اسے فراہم کر دیے تھے۔ اس کا سوائے سریندر کے کسی کے ساتھ رابطہ نہیں تھا۔ اب جو کچھ بھی دیکھنا تھا اسی کی آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ اسے سریندر نے کافی ساری معلومات دی تھیں۔ راج مشعل کا ابھی پتا نہیں چل رہا تھا لیکن رگھوٹانڈیا کے بارے میں ایک اطلاع آئی تھی جس کی تصدیق کرنا باقی تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ کب سریندر اسے بتاتا ہے۔

شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ ایسے میں سریندر کا میسج آ گیا۔ اس نے نیچے بلایا تھا۔ نارائن نے اپنے پسٹل سنبھالے، دروازے کو لاک کیا اور لفٹ سے نیچے چلا گیا۔ سریندر ایک سیاہ کار لیے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تو سریندر نے گیئر لگا دیا۔ سڑک پر آتے ہی وہ بولا۔

”کدھر جانا ہے؟“

”رگھوٹانڈیا اس وقت گولڈن بار میں ہے اپنی آئٹم کے ساتھ۔ اس کے ساتھ چار بندے ہیں۔ اب اگلا پلان تمہارا ہے کہ تم کو کیا کرنا ہے۔“ سریندر نے تفصیل بتائی اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

”چل وہیں چل کر دیکھتے ہیں۔“ اس نے دھیمے سے انداز میں کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔ نارائن کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے کور پر کچھ لوگ ہوں گے، جس کی اس نے تصدیق کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ اس پر نگاہ رکھنے والے تھے اور کچھ موقع ملتے ہی اس کی مدد کرنے والے۔ مگر اسے خود پر یقین تھا۔ اس نے تیزی سے یہ سوچا کہ گولڈن بار میں اسے کیا کرنا ہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ۔۔ گولڈن بار کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کے گیٹ پر بڑے بڑے رنگین سائن بورڈ لگے ہوئے تھے اور چند ہٹے کٹے قسم کے سیکیورٹی والے موجود تھے۔ سریندر نے کار اس طرح لگائی کہ ایک سیکیورٹی والا فوراً ان کی جانب بڑھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”کار اِدھر نہیں لگانا، دوسری طرف لگاؤ۔“

سریندر نے اس کی بات نہیں سنی۔ اس نے کار بند کی اور باہر نکلتے ہی اس نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس، اپنے منیجر کے پاس لے چلو۔“

اتنی دیر میں نارائن بھی باہر نکل چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان کے رکتے ہی دو کاریں اور موٹر بائیک بھی وہیں آن رکی تھیں ۔۔۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ سیکیورٹی والے نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ سیکیورٹی والوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور انہیں تلاشی لیے بغیر اندر جانے دیا گیا۔ وہ ایک راہداری سے اندر گئے تو وہاں جلتی بجھتی ہوئی رنگین روشنیوں میں کئی لوگ ناچتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ سب مستی میں تھے۔ کاؤنٹر پر شراب چل رہی تھی۔ کئی جوڑے وہاں بیٹھے شراب کے ساتھ آپس میں مست تھے۔ کئی ٹیبلو کے اردگرد بیٹھے ہوئے کھا پی رہے تھے۔ کئی کونوں میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی کو کسی کا احساس نہیں تھا۔ تیز موسیقی کے باعث کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ ہال ساؤنڈ پروف تھا، جس میں اتنا شور تھا اور اس کی آواز باہر نہیں جا رہی تھی۔ وہ دونوں ابھی جائزہ لے رہے تھے کہ ایک سوٹ پہنے ٹھگنے قد کا گنجا شخص ان کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ انہیں دیکھتا ہوا بولا۔

”جی فرمائیں، میں ہی یہاں کا منیجر ہوں۔“

”اس سے پہلے ہم تمہیں بتائیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں، تم ہمیں ایک پیک آفر نہیں کرو گے؟“ سریندر نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم نے پہلے کبھی آپ کو اِدھر نہیں دیکھا؟“ منیجر نے ان پر شک کرتے ہوئے کہا تو سریندر نے آرام سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے غرا کر کہا۔

”چل، وہاں کاؤنٹر تک چل اور وہیں سے پولیس اسٹیشن فون کر، پتا کر ہم کون ہیں؟ پھر تجھ سے بات کرتا ہوں، چل۔“

”م۔۔۔۔۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ اس نے وضاحت کرنا چاہی لیکن نارائن نے کچھ سنے بنا اس کا بازو پکڑا اور اور کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ تینوں کاؤنٹر تک جا پہنچے۔ منیجر نے بارٹینڈر کو پیگ بنانے کا اشارہ کیا۔ پھر سریندر سے پوچھا، ”جی بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”تم پہلے تصدیق کر کے آؤ، پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے حقارت سے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ رگھوٹانڈیا کو دیکھنا چاہتا تھا جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈو پیگ ان کے سامنے رکھ دیے گئے۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ غیر محسوس انداز میں کچھ لوگ ان کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھے ان کے لیے خطرناک تھے۔ نارائن نے پہلے رگھوٹانڈیا کو دیکھا ہوا نہیں تھا، اس لیے وہ سریندر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہی اسے شکل سے پہچانتا تھا۔ وہ قریب آ جانے والے لوگوں کو بھی محسوس کر چکا تھا۔ انہی

لمحات میں اس نے چند لوگوں کو تیزی سے اسی راہداری میں جاتے ہوئے دیکھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ اس نے سریندر کو اشارہ کیا تو وہ چونک گیا، پھر تیزی سے اس طرف بڑھنے لگا تو وہ چند لوگ ان کی راہ میں آ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ رگھو ٹانڈیا نکل رہا ہے۔ وہ چھ افراد تھے جو اُن کی راہ میں حائل تھے۔ نارائن نے سریندر کی طرف دیکھا، وہ ایک ساتھ ان پر پل پڑے۔ وہ انہیں وہیں پر روکنے کے موڈ میں تھے، جبکہ وہ دونوں انہیں جھکائی دے کر راہداری کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ان کے پیچھے بھاگے۔ تب تک نارائن نے پسٹل نکال کر ایک فائر کر دیا۔ وہ لمحہ بھر رکے۔ انہیں اتنا ہی وقت درکار تھا، وہ راہداری میں گئے تو وہ لوگ گیٹ پار کر رہے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے گیٹ تک پہنچے اور باہر نکل آئے۔ وہاں چار افراد تھے اور ایک کار میں بیٹھ رہے تھے۔

''وہ آگے والا رگھو ہے۔'' سریندر نے تیزی سے کہا تو نارائن نے فائر کر دیا۔ وہ کار میں بیٹھ چکے تھے اس لیے بچ گئے۔ سریندر نے عقل مندی کی کہ ٹائروں پر فائرنگ کر دی۔ ایک دھماکے سے ٹائر پھٹ گیا۔ مگر وہ اسی طرح کار بھگانے میں کامیاب ہو گئے۔ اتنی دیر میں پیچھے سے فائر ہوا۔ سریندر کار کی جانب بھاگا تو نارائن اسے کور دیتا ہوا فائر کرنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا کار تک جا پہنچا۔ سریندر نے دروازہ کھول دیا، جیسے ہی وہ بیٹھا، سریندر نے کار بھگا دی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ انہیں زیادہ دور تک نہیں جانے دیں گے۔ جیسے ہی وہ ان کے پیچھے لگے سامنے سے فائر ہونے لگے۔ ایک چھناکے سے اسکرین میں فائر ہوا۔ نارائن تاک کر نشانہ لگانے لگا۔ اسی دوران ان کے قریب سے زن سے موٹر بائیک گزریں اور وہ لمحوں میں آگے والی کار کو بھی کراس کر گئیں۔ وہ آگے والی گاڑی کے دونوں طرف ہو گئے اور پھر پسٹل نکال کر فائر کر دیا۔ سامنے والی کار لڑکھڑائی اور پھر قلابازی کھاتے ہوئے فٹ پاتھ پر آ گئی اور ایک بلڈنگ کی باہر والی باؤنڈری کے ساتھ جا لگی۔ وہ دونوں موٹر بائیک والے رکے نہیں آگے بڑھتے چلے گئے۔ سریندر نے تیزی سے بریک لگائے تو چند قدم کے فاصلے پر جا کر ہی رک سکے۔ انہوں نے کار چھوڑی اور فوراً رگھو والی کار کی جانب بڑھے۔

''یہ ہے رگھو۔'' سریندر نے اگلی سیٹ پر خون سے لت پت رگھو کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ نارائن نے اس پر فائر کر دیا۔ اس نے ہچکی لی اور وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ وہاں نہیں ٹھہرے بلکہ تیزی سے پلٹ کر اپنی کار تک پہنچے اور پھر اسے بھگا لے گئے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ گھوٹکے کے آفس میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑی پریشانی میں نارائن کو بلایا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور خاموش تھا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد گھوٹکے بولا۔

''رات مجھے راج متھل کا فون آیا تھا۔''

''اسی کو لے کر پریشان ہو، کیا کہہ رہا تھا؟'' نارائن نے پوچھا۔

''وہ تجھے مانگ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے نارائن کے چہرے پر دیکھا پھر بولا۔ ''کہہ رہا تھا کہ میں تو مر ہی جاؤں گا لیکن کیا تو زندہ رہے گا۔ آج شام تک کا وقت دیا ہے ورنہ وہ میری فیکٹری کو آگ لگا دے گا، گھر پر حملہ کر سکتا ہے اور وہ جو بلڈنگ بن رہی ہے، اُسے اُڑا دے گا۔'' گھوٹکے نے رو دینے والے انداز میں کہا تو نارائن نے پوچھا۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟''

''مجھے کیا سوچنا ہے، میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا حل تمہارے پاس ہے یا پھر انسپکٹر اشوک کے پاس۔''

''تو پھر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم دیکھ لیں گے۔'' نارائن نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا تو ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

''میں جانتا ہوں متھل کو، وہ بہت ظالم شے ہے۔ شام ہو جانے کے بعد وہ ضرور وار کرے گا۔'' گھوٹکے نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''اچھا ابھی شام تو ہونے دو، میں دیکھتا ہوں۔'' نارائن نے کہا اور اٹھنے لگا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ مایا دیوی کون ہے؟ جانتے ہو کچھ اس کے بارے میں؟''

''نہیں، میں بالکل نہیں جانتا اور نہ آج تک اس کا کوئی پتا ملا ہے، کوئی فون کال آئی، نہ ہی کبھی سنی اور نہ ہی کسی سے سنا کہ اس نے مایا دیوی سے بات کی ہو۔''

''وہ کیا اتنی ہی خفیہ ہے، کسی کو اس کے بارے میں پتا تک نہیں؟'' وہ الجھتے ہوئے بولا۔

''اور تمہیں اس کے بارے میں تجسس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' گھوٹکے نے یوں دھیمے لہجے میں کہا جیسے مایا دیوی سن نہ لے۔

''کیوں، ایسا کیوں؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''مایا دیوی کے بارے میں سنا ہے کہ جب اور جس وقت بھی اسے کسی سے کام لینا ہوتا ہے، وہ اس تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ بالکل ایسے ہے جیسے ہمارے اردگرد اَن دیکھی

ہوا۔'' وہ شاید بہت ڈرا ہوا تھا اس لیے ایسی باتیں کر رہا تھا۔
سونارائن نے مزید بات نہیں کی اور وہاں سے اٹھ گیا۔
اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ جس طرح وہ راج مٹھل کو باہر نکالنا چاہتا تھا، ٹھیک اسی طرح راج بھی اُسے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ چوہے بلی کا یہ کھیل بہت کم وقت رکھتا تھا۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ اس نے سریندر کو کال ملائی۔ وہ کہیں بازار میں تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کال کرنے کا پیغام بھیج دیا۔ جس پر نارائن نے اسے فوراً گھوٹکے کے آفس پہنچ جانے کا پیغام بھیج دیا۔ اسے سریندر کا انتظار کرنا تھا۔ وہ گھوٹکے کے آفس سے باہر نکل کر ایک ایسی کرسی پر آن بیٹھا جہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ساری توجہ باہر تھی۔ سریندر کو اس تک پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگ سکتے تھے۔ وہ باہر دیکھتے ہوئے لاشعوری طور پر سوچتا جا رہا تھا کہ راج کو کیسے باہر نکالا جائے۔ اگر اس کے ٹھکانے کا کوئی تھوڑا سا سراغ بھی مل جاتا ہے تو وہ اسے باہر نکال سکتا تھا۔

دس منٹ سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ نارائن کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اس نے اضطراب میں سریندر کو کال کرنا چاہی۔ تبھی اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے گروپ پر پڑی جو ایک وین میں سے باہر نکلا تھا۔ ان میں سے ایک سامنے دکان میں گھس گیا۔ پھر فوراً ہی باہر سامنے بلڈنگ پر ایک نگاہ ڈالی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے سب لوگوں کو بتایا، باری باری سبھی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اس نے سریندر کو کال ملا دی۔

''بس میں پہنچ رہا ہوں دو منٹ بعد۔'' سریندر نے کہا۔
''وہیں رک جاؤ۔'' نارائن نے تیزی سے کہا۔
''خیر ہے نا۔'' اس نے پوچھا تو نارائن نے اسے صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔
''مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں میرے بارے پتا چل گیا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ وہ فیلڈنگ لگا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ مزید لیں گے۔ اس کے بعد وہ یا تو مجھے باہر نکالیں گے یا میرا باہر نکل آنے کا انتظار کریں گے۔''
''یہ اچھا ہو گیا، ہم بھی فیلڈنگ لگا لیتے ہیں۔'' سریندر نے کہا۔
''اتنی جلدی ہو جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہو جائے گا، انتظار کرو۔'' سریندر نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نارائن کی بے چینی دیکھنے والی تھی۔ وہ اُن پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہیں سے انہیں شوٹ کر دے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ انہیں میرے بارے میں پتا کیسے چلا؟ ضرور ان کا مخبر یہیں کہیں آس پاس ہوگا۔ مگر یہ وقت اس مخبر کو تلاش کرنے کا نہیں تھا۔ وہ سوچتا بھی جا رہا تھا اور اس کی نگاہ اس سڑک تک تھی جتنا وہ کھڑکی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سکون سے پلٹا اور گھوٹکے کے آفس میں چلا گیا۔

نارائن نے جب ساری صورتِ حال بتائی تو وہ انتہائی پریشان ہو گیا۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔
''میں نے تمہیں بلا کر بڑا غلط کیا، وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اب کیا ہوگا؟''
''چپ چاپ اپنے آفس میں بیٹھے رہو۔'' نارائن نے کہا۔
''تم ایسا کرو، لفٹ سے نیچے چلے جاؤ، پیچھے سے ایک راستہ جاتا ہے، وہاں سے نکل جاؤ پھر دیکھتے ہیں۔'' گھوٹکے نے تیزی سے کہا۔
''تمہارا کیا مطلب ہے، وہ اُدھر نہیں ہوں گے۔ ممکن ہے ان کے بندے اندر بھی آ گئے ہوں۔ خیر، میں نے تمہیں خبردار کر دیا۔ اب میں دیکھتا ہوں انہیں۔'' نارائن نے کہا اور آفس سے باہر آ گیا۔

وہ دوبارہ اسی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا نہیں ہوا بلکہ اسی عمارت کی ایک دوسری راہداری میں چلا گیا۔ چونکہ اس عمارت میں کئی آفس تھے اس لیے لوگ آ جا رہے تھے۔ کوئی بھی کسی پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ مزید دس منٹ اسی کشمکش میں گزر گئے۔ سریندر کیا کر رہا تھا، اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ ٹہلتے ہوئے ایک کھڑکی کے پاس گیا۔ وہ لوگ ہنوز وہیں تھے۔ ان کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ دیکھنے کی بے چینی ہونے لگی کہ عمارت کی پچھلی طرف کتنے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے سریندر وہاں پھنس نہ گیا ہو۔ یہ سوچتے ہی وہ انتہائی اضطراب میں پلٹ کر دوسری جانب جانے لگا تو اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ہلکے سبز اور سفید رنگ کے سوتی لباس میں، درمیانہ سا قد، گندمی رنگ، قدرے لمبا چہرہ، تیکھے نقوش، پتلے پتلے لبوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور سیاہ کاجل بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے معصومانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیل فون کی اسکرین اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔
''نارائن داس، گنگا نگر۔''

اپنا نام اور آبائی علاقے کا نام سن کر وہ ساکت تو ہو ہی چکا تھا، سیل فون کی اسکرین پر اپنی تصویر دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے غور سے لڑکی کو دیکھا، وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' نارائن نے سرسراتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میں انجلا، میرے آفس میں آؤ، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور بڑے اعتماد سے مڑ گئی۔ نارائن نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ ایک شاندار آفس میں داخل ہو گئی۔ وہ آفس کی دائیں جانب والی کھڑکی کے پاس گئی اور اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا تو وہ بولی۔

''اس طرف بھی لوگ ہیں راج مٹھل کے، وہ دیکھو، وہ کالا سا ریڈ چیک دار شرٹ میں اور اس کے ساتھ موالی کھڑے ہیں۔''

اس پر نارائن ایک لفظ بھی نہیں بولا بلکہ انجلا کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ میز کے ایک طرف سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے نارائن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا پھر دھیمے سے انداز میں پوچھا۔

''کون ہو تم اور یہ سب......''

''بتایا نا میں انجلا، ابھی تم یہاں محفوظ ہو اور......'' اس نے کہنا چاہا تو نارائن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''باہر میرا دوست محفوظ نہیں، مجھے اس کو بچانا ہے۔''

''کیسے بچاؤ گے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں اُسے فون کرتا ہوں۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سریندر کو کال ملا دی۔ پہلی ہی بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا۔ تبھی اس نے تیزی سے کہا، ''سریندر، اِدھر مت آنا ابھی، بہت بڑی فیلڈنگ لگی ہوئی ہے۔''

''ہاں، میں نے پتا کر لیا ہے۔ میں کچھ دور ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم آگے نہیں آنا بلکہ واپس لوٹ جاؤ۔''

''مگر تم......'' اس نے پوچھا۔

''میری چھوڑو، میں نکل جاؤں گا، تم بچو۔'' اس نے صلاح دی اور فون بند کر دیا، پھر انجلا...... کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''انجلا، تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟''

''تم پر دل آ گیا ہے۔'' اس نے رومانوی انداز میں کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''ابھی میں ان پنٹر لوگوں کو دیکھ لوں، پھر بات کرتے ہیں۔''

''نہیں، یہ تمہارا مسئلہ نہیں میرا ہے، میں دیکھ لیتا ہوں انہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ انجلا بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ گئی۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھڑکی کے قریب لے گئی۔ باہر کچھ عجیب ہی سماں تھا۔ بہت سارے لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ پولیس کی گاڑیاں آ گئیں، جنہیں دیکھتے ہی وہ سب وہاں سے تتر بتر ہو گئے۔

''دوسری طرف بھی ایسا ہی ہوا ہے، دیکھنا چاہو تو دیکھ لو۔'' انجلا بولی تو نارائن اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہا۔

''تھینک یو، اگر تم اپنا سیل نمبر......''

''ارے کیا کرے گا سیل نمبر کو، میں جو تیرے پاس ہوں۔ تو کہاں جائے گا رے؟'' انجلا نے اٹھلا کر کہا۔

''مجھے جانا تو ہے، میں......''

''ارے نہیں بوا، تو کہاں جائے گا، اب میرے پاس رہے گا، میرے ساتھ، تجھے سکون سے بتاتی ہوں راج مٹھل کو کیسے پکڑنا ہے۔'' انجلا نے باقاعدہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''یہ تم کیوں......؟''

''سب بتاؤں گی نا، اب اِدھر۔ بیٹھ کھانا کھاتے ہیں۔'' اس نے نارائن کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اِدھر اُدھر فون کرتے ہوئے وہ آفس میں ٹہلتی رہی۔ جس وقت کھانا لا کر لگا دیا گیا تو وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''گھوٹکے سے کہہ دیا ہے کہ مت گھبرائے۔ سریندر بھی محفوظ ہے، اب سکون سے کھانا کھاؤ۔ پھر میرے ساتھ میرے گھر چلو۔'' یہ کہہ کر انجلا نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ نارائن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح بندہ خود کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے، اسی طرح خود کو انجلا کے سپرد کر دے گا۔

ممبئی میں لوگوں کی طرح موسم کے بدل جانے کا بھی کوئی پتا نہیں چلتا۔ وہ انجلا کے ساتھ اس کے بنگلے کے کاریڈور میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ بارش زوروں کی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ نارائن نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ انجلا سے سوال نہیں کرے گا۔ یہ کنفرم تھا کہ جب اس کو بات بتانا ہو گی وہ خود بتا دے گی۔

اگرچہ اس کے دماغ میں یہ بات پہلے ہی تھی لیکن انجلا سے ڈرامائی انداز میں ملنے کے بعد وہ شدت سے ایک ہی

بات سوچے جا رہا تھا۔ یہ سارے اتفاقات اس کے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں۔ ہر قدم پر اس کی مدد کے لیے کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے؟ کیا قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو چکی ہے یا پھر دوسری وجہ ہے؟ یہاں مرتے ہوئے بندے کے پاس سے لوگ نگاہیں چرا کر گزر جاتے ہیں، اس کے لیے اتنی مہربانی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا کوئی شخص ہے جو چھپ کر اس کے پیچھے ہے؟ وہ جرم کی اس دنیا میں رہ کر بہت کچھ سمجھ گیا تھا، عموماً ایسا ہوتا نہیں اور نہ ہی ایسے اتفاقات جنم لیتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر آنے سے پہلے اور فٹ پاتھ والی زندگی سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ فٹ پاتھ سے اٹھا لینے والی زندگی اس کی اپنی نہیں رہی، کوئی کٹھ پتلی کی طرح اسے نچا رہا ہے۔ اسے شاید یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انسان جب بھی کٹھ پتلی بن کر ناچتا ہے۔ اس کی ناآسودہ خواہشیں ہی اسے کٹھ پتلی بناتی ہیں۔ اپنی ہی ناآسودہ خواہشوں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' انجلا نے پوچھا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مگ سے لمبا سپ لیا، پھر ہنستے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔

''راج مٹھل کو پکڑنے کے بارے میں ہی سوچ سکتا ہوں، اس کے علاوہ اور کیا سوچ میرے بھیجے میں آ سکتی ہے۔'' اس نے کہا تو انجلا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اردگرد پھیل گئی۔ وہ پُرسکون انداز میں بولی۔

''اسے جب چاہو، پکڑ لو۔ فکر مت کرو، آج رات ہی اس کا کام تمام ہو جائے گا۔''

''نہیں، انجلا نہیں۔'' وہ تڑپ کر تیزی سے بولا۔ ''مجھے اُسے اپنے ہاتھوں سے مارنا ہے۔''

''چلو، ایسا کر لیتے ہیں، بس یہ سمجھ لو نارائن، وہ ہمارے سامنے ہے، جیسے ہی وہ ہاتھ کے نیچے آیا، اسی وقت......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی بات مکمل کر دی۔ ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ تبھی نارائن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''انجلا، تم اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہو مجھ پر؟ کیا پہلی نگاہ میں محبت ہو گئی ہے مجھ سے؟''

انجلا زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ چند لمحے ہنستے رہنے کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''دنیا کا سب سے بڑا فراڈ یہ محبت ہے۔ لوگ اس لفظ کی آڑ میں کس طرح ایک دوسرے کو پھنساتے ہیں اور خود پھنستے ہیں۔ زندگی کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی لفظ محبت ہے۔ کیونکہ یہ لفظ انسان کو حقیقت سے نکال کر خوابوں میں لے جاتا ہے۔''

''بڑے بھیانک خیال ہیں تمہارے۔'' نارائن نے کہا۔

''یہی حقیقت ہے پیارے۔ تمہاری بغل میں جب لڑکی ہوتی ہے، تم کتنی محبت جتاتے ہو، کام نکل گیا تو اگلے دن بھول جاتے ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' اس نے اعتراف کر لیا۔

''تم اور میں مل گئے، جتنا وقت ہمیں ملا، ہم کچھ بھی سوچے بغیر دھوم سے گزاریں، دن اور رات رنگین کر لیں پھر تم کہاں اور میں کہاں۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو نارائن سمجھ گیا، وہ کیا چاہتی ہے۔

''پر جب تک راج مٹھل ختم......'' اس نے تیزی سے کہا تو انجلا نے اس کی بات کاٹ کر مستی بھرے لہجے میں کہا۔

''ماں کی آنکھ راج مٹھل کی، چل اُسے ختم کرتے ہیں، پھر میں جو چاہوں گی، کروں گی تیرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

اس وقت شام ڈھل چکی تھی۔ نارائن ایک کمرے میں نرم گدے پر نیم خوابیدہ پڑا ہوا تھا۔ ایسے میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ انجلا کا فون تھا اور اس نے فوری اسے باہر بلایا تھا۔ وہ تیزی سے پورچ میں پہنچا تو انجلا فور وہیل میں بیٹھ چکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انجلا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو فور وہیل چل پڑی۔ وہ تیزی سے رہائشی علاقے سے نکلے اور دورویہ سڑک پر آ گئے۔ شام کے ایسے وقت میں ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ نارائن کے ساتھ بیٹھی انجلا بڑے سکون کے ساتھ اپنے سیل فون سے کھیل رہی تھی۔ نارائن نے پوچھا ہی نہیں کہ کہاں جانا ہے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور کی نگاہیں سامنے لگی ہوئی تھیں، وہ بڑی مہارت سے فور وہیل چلا رہا تھا۔ ساتھ میں بیٹھا خاموش نوجوان یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ربورٹ ہو۔ وہ بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ویرولی سے دادر جانے والی سی لنک سڑک کے قریب سے گزر گئے۔ اس کے بعد وہ نادر شہر کی طرف داخل ہوئے اور پھر جونپڑ پٹی سے ہوتے ہوئے وہ ویرولی فورٹ تک جا پہنچے۔ ڈرائیور نے فور وہیل روک دی۔ انجلا نے سیل فون سے کھیلنا بند کر دیا اور نیچے اتر آئی۔ نارائن بھی اترا تو وہ فورٹ کی جانب چل

پڑی۔ اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ کسی پکنک پر جا رہی ہو۔ وہ چاروں آگے بڑھتے گئے، پھر پتھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بالکل اوپر پہنچ گئے جہاں سے دو طرف سمندر دکھائی دے رہا تھا اور تیسری جانب وہی غربت زدہ جھونپڑ پٹی۔ وہاں اندھیرا نہیں ملگجی روشنی تھی۔ وہ چاروں بڑھتے گئے، یہاں تک کہ ایک سرے پر تین فٹ کی دیوار میں ایک دیا روشن تھا۔ وہ چرچ کی علامت تھی۔ وہیں اس کے پاس چند لوگ کھڑے تھے۔ مدھم روشنی میں احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ شکل صورت سے کیسے تھے۔ انجلا ان سے چند فٹ کے فاصلے پر جا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

''بول، کیا فیصلہ کیا ہے تو نے؟''

''اے چھمیا، تم کیوں میری دشمن ہو رہی ہے۔ میں تیرا خیال کرتا ہوں، پن تم میری بات کیوں نہیں سمجھتی ہو۔ میں......''

اس نے کہنا چاہا تھا کہ انجلا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرا بس چلے تو تو مجھے ایک سیکنڈ بھی برداشت نہ کرے۔ ادھر گولی میرے بھیجے میں مار دیوے۔ یہ عزت وزت چھوڑ، اپنا فیصلہ سنا۔'' انجلا نے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا۔

''تم ٹھیک بولی ہو چھمیا، ایک دم سولہ آنے بولی تم، پن کیا کروں ادھر میرا دھندا ہے، مجھے تو دھندا کرنے کا۔'' سامنے کھڑے ایک شخص نے کہا تو نارائن کو وہ آواز جانی پہچانی لگی۔ اس کے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔

''نہیں، اب یہاں نہیں رہنے کا، یہاں سے چلے جانے کا۔'' انجلا نے غراتے ہوئے کہا تو وہ پھر ہنس دیا۔

''اتنا محنت ایسے ہی نہیں کیا کہ تجھے سب دے کر میں دم دبا کر کتے کی ماقف یہاں سے چلا جاؤں، ہوش کر چھمیا، یہاں اس لیے آ گیا کہ تو نے ایک بار مجھ پر احسان کیا تھا۔ اگر تو یہ سوچتی ہے کہ کوئی لفڑا کرے گی، ایسا مت سوچ، ہم میں سے کوئی بھی مرا، تو دوسرا بچ کر یہاں سے نہیں جانے والا۔'' سامنے والے بندے نے کہا تو انجلا حقارت بولی۔

''میں تیرا فیصلہ سننے آئی ہوں۔ یہ کچے پکے راگ مجھے مت سنا۔''

''ابھی وقت ہے چھمیا، مجھے میرا کام کرنے دو.... تم اپنا کام کرو۔ اس نارائن کو میرے حوالے کر دو، بات ختم۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ نارائن سامنے کھڑے شخص کو پہچان گیا۔ وہ راج مٹھل تھا۔

''کیا کرے گا تو، مارے گا اس کو؟'' انجلا نے انتہائی غصے میں پوچھا۔

''مارے گا، اپنے ہاتھوں سے مارے گا۔'' اس نے بھی غصے میں کہا۔

''تو چل، اگر تجھ میں ہمت ہے تو مار، یہ کھڑا نارائن۔'' انجلا نے نارائن کی طرف اشارہ کیا تو وہ سب ایک دم الرٹ ہو گئے۔ راج مٹھل نے چشم زدن میں اپنا ہاتھ بڑھایا تو اس میں پسٹل تھا۔ انجلا کے ساتھ آئے دونوں بندوں نے بھی اس پر پسٹل تان لیے۔ صورتِ حال گمبھیر ہو گئی تھی۔

''تمہارا شکریہ چھمیا، تم نے مجھے نارائن لا دیا، جو مانگو گی ملے گا۔ پہلے مجھے اس کو مارنے دے۔'' راج مٹھل کی غراتی ہوئی آواز گونجی تو انجلا بولی۔

''فائر کر۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ راج مٹھل نے فائر کر دیا۔ کھٹاک کی آواز آئی، تب تک نارائن اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ راج مٹھل کے پسٹل میں کوئی بلٹ نہیں تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں پے در پے ٹریگر دبایا، مایوس ہو کر اس نے پسٹل پھینک دیا پھر چیختے ہوئے بولا۔

''یہ کس نے دیا مجھے؟''

''تیری قسمت نے، تیرے ساتھ کوئی نہیں ہے اس وقت، وہ جانتے ہیں کہ اب یہاں راج تیرا نہیں مایا دیوی کا ہے۔ تو بے وقوف ہے جو مایا دیوی کی طاقت نہیں سمجھا۔'' اس نے کہا اور نارائن کی طرف دیکھ کر بولی، ''مار دو اس کو۔''

''چل میں چھوڑ جاتا ہوں ویرولی۔'' راج مٹھل نے کہا۔

''نارائن مار دو اس کو۔'' انجلا نے سرد سے لہجے میں کہا تو نارائن آگے بڑھا اور راج مٹھل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔ راج مٹھل یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پرانا ریسلر ہو۔ نارائن نے اس کے ماتھے پر پسٹل رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا، اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ اس کے ساتھ انجلا کی آواز گونجی۔

''تم سب چند دن سکون کرو، جو روپیہ تم لوگوں کو ملا، اس سے عیش کرنے کا، پھر بتاتی ہوں کیا کرنا ہے، آؤ نارائن۔''

اس کے ساتھ ہی وہ پلٹی اور واپس چل دی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیے۔ وہ چاروں فوروہیل تک یوں پہنچے جیسے سیر کر کے آئے ہوں۔ وہ جس راستے سے آئے تھے، تقریباً دو گھنٹے بعد واپس انجلا کے اسی بنگلے میں پہنچ گئے۔

پورچ میں اترتے ہی ڈرائیور فوروہیل لے گیا۔ اس کے ساتھ وہ نوجوان بھی چلا گیا۔ اندر بڑھتے ہوئے انجلا نے نارائن کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے رومانوی انداز میں کہا۔

''پورے فریش ہوجاؤ، پھر ڈنر لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے بیڈروم میں لے چلوں گی۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو نارائن اس رومانوی قرب پر مست ہوجاتا لیکن اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ یہی سوچیں اسے بے سکون کردینے کے لیے کافی تھیں۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر تھا۔ نارائن نے انجلا کے بیڈروم کا دروازہ دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے جہازی سائز کے بیڈ پر سرخ رنگ کی نائٹی پہنے وہ نیم دراز تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے گلے میں تعویذ نما لاکٹ جھول رہا تھا۔ لاکٹ کی خاص بات یہ تھی کہ اس پر چاند ستارہ جھلملا رہا تھا۔ وہ خمار بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میرے بیڈروم میں خوش آمدید!''

وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے بیڈ تک پہنچا۔ انجلا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھا لیا، پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی، ''کیا تم خوش نہیں ہو یہاں میرے پاس آنے میں؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر یوں تمہارا چہرہ......؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''بس، میرے دماغ میں......'' اس نے کہنا چاہا تو انجلا نے تڑپ کر غصے میں کہا۔

''ارے تیرے دماغ کی بہن......'' یہ کہہ کر اس نے نرم لہجے میں کہا، ''میں جانتی ہوں تم بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہو، تمہارے اس دماغ میں بہت کچھ ہے۔ میں تمہیں سب بتا دوں گی، آج رات ہی بتاؤں گی، لیکن جب تک تم میرے ساتھ ہو، سب بھلا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں جب تم صبح میرے بیڈروم سے جاؤ، تمہیں سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔'' اس نے لاکٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''ڈن؟'' نارائن نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

''ڈن۔'' اس نے انگوٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نارائن نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور پھر سائڈ ٹیبل کی لائٹ آف کردی۔ بیڈروم میں ایک طوفان برپا ہوگیا تھا۔

اس وقت صبح کی نیلگوں روشنی ہر جانب پھیلی ہوئی تھی جس وقت نارائن کی آنکھ کھلی۔ وہ بیڈ پر تھا لیکن اس کے ساتھ انجلا نہیں تھی۔ وہ ایک دم سے پریشان ہوگیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور بیڈ سے اتر گیا۔ ابھی وہ قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ انجلا بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی اور اس میں دو کافی مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آؤ، اِدھر بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔''

نارائن نے ایک طویل سانس لی اور واش روم میں چلا گیا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ انجلا نے جو کہا ہے وہ ضرور کرے گی۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھپکے مارے، پھر انہیں صاف کر کے انجلا تک چلا گیا، جو بیڈروم کی انیکسی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مگ اٹھایا اور گرم گرم کافی کا سپ لے لیا۔ تبھی اس نے ماحول کو خوشگوار کرنے کی خاطر ہنستے ہوئے کہا۔

''انجلا، یہ کافی بھی تمہاری طرح بہت گرم ہے۔''

''ہاں، کوئی شے گرم نہیں ہوتی، گرم بنا دی جاتی ہے۔'' اس نے بھی عام سے لہجے میں کہا اور خاموش ہوگئی۔ چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہوگئے، پھر وہ ایک بڑا سا سپ لے کر بولی، ''نارائن، میں کچھ بھی نہیں ہوں، میرا اعتماد، میرا حوصلہ، میری طاقت، میری نہیں ہے۔ یہ سب مجھے مایا دیوی نے دیا ہے۔ ورنہ میں ایک مجبور، بے بس اور لاچار لڑکی تھی۔ جس کا...... دل چاہتا مجھ سے کھیل لیتا تھا۔ میرا جسم میرا نہیں رہا تھا۔ خیر، تمہارے ذہن میں یہی سوال ہے نا کہ یہ مایا دیوی کون ہے؟''

''ہاں، یہی سچ ہے۔'' نارائن نے اعتراف کیا۔

''وہ نہ دکھائی دینے والی ایک سوچ ہے۔ اپنوں کو، مظلوموں کو قوت دینے والی اور دشمنوں کے لیے خوف کی علامت۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کون ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ اس وقت بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔''

''مطلب...... جو یہ رات گزری۔'' نارائن نے طنزیہ پوچھا۔

''ہاں، یہ بھی اُسے معلوم ہے۔ اسی نے ہی مجھے کہا، یہ ایک رات میرا انعام تھی۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔'' انجلا نے صاف کہہ دیا۔

''پر یہ سب ہے کیا گورکھ دھندا؟'' نارائن نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی جس طرح کل دوپہر سے پہلے میں

تمہیں نہیں جانتی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی، ایک سپ لیا اور پھر کہتی چلی گئی۔ ''مجھے میرے سیل فون پر تمہاری ساری معلومات ملیں اور مجھے کہا کہ میں اسی عمارت میں گھوکھلے کے آفس میں ہوں۔ تلاش کروں اور اپنے پاس محفوظ کرلوں۔ تمہاری تصویر مجھے اچھی لگی۔ میں نے پانچ منٹ میں تمہیں تلاش کرلیا۔ باہر جو کچھ ہوا، وہ سب مایا دیوی کا اپنا کام تھا، مجھے اس کے بارے میں نہیں پتا کہ وہ کیسے ہوا، کس نے کیا۔ مجھے بس فون پر سب پتا چلتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح مجھے کہا جارہا تھا، میں ویسا ہی کررہی تھی۔''

''اور وہ راج مشعل، وہ خالی پستل؟'' نارائن نے پوچھا۔

''تم شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میں سیل فون پر کوئی گیم کھیل رہی تھی، ایسا نہیں تھا، وہ معلومات مل رہی تھیں۔ مایا دیوی کی اتنی رسائی ہے کہ اس نے راج مشعل کے اردگرد بندوں کو خرید لیا تھا، سب موالی ٹپوری پیسے کے لیے اپنی ماں بیچ دیتے ہیں سالے۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس کا لہجہ انتہائی ترش اور حقارت بھرا ہوگیا تھا۔

''سوال یہ ہے انجلا، مایا دیوی......'' اس نے کہنا چاہا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولی۔

''پوری بات سن لو، پھر کہنا۔'' اس نے کہا اور ایک بڑا سپ لے کر خالی مگ ایک جانب رکھ دیا۔

''مجھے یہ تک کہا گیا کہ بہت عرصہ ہوا تم کسی لڑکی سے نہیں ملے ہو، میں بھی پیاسی تھی۔ یہ ایک رات مجھے انعام میں ملی، یہ سب میں نے تمہیں بتادیا، اب تم جو چاہو سو پوچھ سکتے ہو۔''

''مایا دیوی کون ہے اور مجھ پر مہربان کیوں ہے؟'' نارائن نے تیزی سے سوال کیا تو انجلا مسکرادی۔ پھر سکون سے بولی۔

''اس سوال کا جواب تو مایا دیوی ہی دے سکتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو ابھی جواب بھیج دے چاہے تو نہ دے۔''

''اوکے۔'' نارائن بہت کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر انجلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تیار ہوجاؤ، ناشتا کرتے ہیں۔ تمہارا نیا لباس تمہیں مل جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈروم سے نکلتی چلی گئی۔

ناشتے کی میز پر انجلا تیار ہوکر آئی تھی۔ اس نے سیاہ بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ لبوں پر میرون رنگ کی لپ اسٹک کے ساتھ ہلکا ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون رکھا اور میز کے گرد کرسی پر آن بیٹھی۔ اس نے ستائشی نگاہوں سے نارائن کو دیکھا، وہ بھی سیاہ سوٹ کے ساتھ سفید شرٹ اور گہری نیلی ٹائی میں جچ رہا تھا۔ اس پر نارائن نے ہنستے ہوئے پوچھا

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''پتا نہیں مجھے آج رات بھی ملے گا تمہارا ساتھ یا نہیں۔''

''کیوں؟ ایسا کیا ہے؟''

''ناشتا کرو، بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ گاہے بگاہے اس کے سیل فون کی اسکرین روشن ہوتی رہی، وہ ایک نگاہ ڈالتی اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوجاتی۔ جب دونوں کے سامنے چائے کے کپ آگئے اور ملازمین نے سارے برتن اٹھالیے تب انجلا بولی۔

''وہی ہوا نا، جو میں سوچ رہی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' نارئن نے کسی نئے خدشے کا خیال کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

''سنو، تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔ نمبر ایک، یہیں ویرولی میں رہو، اور بھائی گیری کرو۔ نمبر دو، باہر جانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ نمبر تین، ممبئی میں کسی بھی جگہ کسی بھی فرم میں جاب کرلو۔''

''یہ آپشن تو پہلے بھی......'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کے ذہن میں فوری خیال آگیا کہ اسے انجلا کے سامنے اپنا ماضی بیان نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر وہ بڑے سکون سے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم یہ آپشن تمہیں پہلے ملے ہیں یا نہیں، لیکن اس وقت میرے سامنے ہیں، بولو، کیا چاہتے ہو؟''

''جس نے آپشن دیے ہیں اس کی جو مرضی۔'' نارائن نے بڑے سکون سے جواب دیا تو وہ ہنس دی۔ اسی لمحے اسکرین روشن ہوئی، انجلا نے پڑھا اور پھر بڑے ناآسودہ لہجے میں بولی۔

''نہیں آپشن تمہی سے مانگی گئی ہے۔''

''تو کہہ دو نمبر تین۔'' نارائن نے الجھتے ہوئے کہا۔ انجلا نے نمبر تین ٹائپ کردیا۔

☆☆☆

وہ جوہو کی ساحلی پٹی کے ساتھ بنے ولاز میں سے ایک ولا کے بیڈروم میں بیٹھا ہوا تھا۔ عمارت کے اندر تین خاموش قسم کے ملازمین ربوٹ کی طرح چل پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے پورا ولا دکھایا۔ دوسرے

نے اس کا بیڈ روم اور اس میں رکھی ہوئی اشیا دکھائیں اور تیسرے کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ شیف تھا۔ باقی باہر کے ملازمین کے بارے اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر پڑا سوچ رہا تھا۔ زندگی اسے کہاں سے کہاں لے آئی ہے؟ وہ اپنی پہلی زندگی کو زندگی گنتا ہی نہیں تھا۔ اس کی نئی زندگی تو فٹ پاتھ کے بعد شروع ہوئی تھی۔ اس نے تب سے اب تک غور کیا تو بہت ساری باتیں اس کی سمجھ میں آرہی تھیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اب تک اس کے ساتھ جتنے واقعات و حالات پیش آئے، وہ محض اتفاق نہیں تھے۔ اسے اگر وہ اپنی کامیابی گردانتا تو وہ بھی بالکل نہیں تھی۔ ہاں اس نے رسک لیا، اپنا اور اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہمت کی، اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ دشمنوں کا سامنا کر سکے۔ اس نے ہمت، حوصلہ اور جرأت کی، تبھی حالات بنتے چلے گئے۔ ورنہ وہ بدلہ تو کیا خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا تھا۔

دوسری بات جو اس کی سمجھ میں آرہی تھی، وہ یہ کہ فٹ پاتھ سے لے کر اب تک جو ایک ہی طرح کے آپشن دے رہا ہے، وہ کوئی ایک ہی ہے۔ اب وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے یا دشمن، کون ہے؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ صرف مایا دیوی کا نام آرہا تھا۔ ایک ایسی وجہ... جس کے بارے وہ سوچ سکتا تھا۔ اس نے مایا دیوی کی طاقت کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔ وہ صرف ایک نام ہے اور وہ نام کس کا ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر اگر سوچا جائے۔ تو یہی سمجھ میں آتا تھا کہ مایا دیوی ہی اس پر مہربان ہوئی ہے جس نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھایا اور یہاں اس ولا تک پہنچا دیا۔ وہ اب اگر اس سے بھاگ بھی جانا چاہتا ہو تو نہیں بھاگ سکتا تھا۔ وہ اس سے کیا کام لینا چاہتی تھی، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا، اس کے پاس صرف ایک ہی چوائس تھی کہ مایا دیوی جو حکم دے، وہ بلا چون و چرا قبول کر کے ایک بہترین زندگی گزارے۔

اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ کی زندگی کو دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے دشمن ختم ہو گئے تھے، جن میں مایا دیوی نے پوری طرح مدد کی تھی۔ اب اسے یہیں رہنا تھا اور جو مایا دیوی کہتی، اس کا حکم بجا لانا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ اسے سوائے کھانے پینے اور سونے کے کوئی اور کام نہیں تھا۔ شام کے وقت اس کے پاس وہی تینوں ملازم آجاتے، وہ اس کے ساتھ جم کرتے، تھوڑی دیر فائٹ کرتے اور اسے بری طرح تھکا کر اس کے ساتھ سوئمنگ کرتے۔ اس دوران میں وہ خود کو بہت فٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مایا دیوی اسے کسی خاص مقصد کے لیے تیار کر رہی ہے۔ ایسی ہی ایک شام جب وہ سب کچھ کر کے فریش ہوا اور کھانے کی میز تک آیا تو میز پر ایک قدرے فربہ مائل نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ مختصر لباس پہنا ہوا تھا، جس میں سے اس کا گورا بدن جھلک رہا تھا۔ اس کے کانوں سے ذرا اوپر بال تھے، جن میں سے وہ ترچھی نگاہ کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی نارائن کی نگاہ اس پر پڑی، اس نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ ہلایا۔ وہ قریب آیا تو اس لڑکی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں شیتل، آج رات تمہیں کمپنی دینے آئی ہوں۔''

''ویلکم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے پہل وہ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے پھر ان میں باتیں ہونے لگیں جو کچھ دیر بعد قہقہوں اور پھر بے تکلفی میں بدل گئیں۔

صبح شیتل بیڈ روم میں ہی تھی۔ اب وہ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے نارائن سے کہا۔

''او کے ڈیئر، میں اب چلتی ہوں۔''

''میں بھی تیار ہوں، ابھی نیچے جا کر ناشتا کرتے ہیں پھر......''

''نہیں ناشتا نہیں کرنا، تمہارے تکیے کے نیچے میں نے ایک سیل فون رکھا ہے۔ اس میں تمہارے لیے مایا دیوی نے بہت کچھ بھیجا ہے۔ وہ پڑھ اور دیکھ لینا۔ میں اس لیے یہاں آئی ہوں کہ جو کچھ سیل فون میں ہے، اس کا یہاں کے ملازمین کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اور ہاں اسے اِدھر نہیں کھولنا، وہ آف ہے، یہاں سے باہر کہیں دور جا کر ٹھیک دس بجے اوپن کرنا۔''

''او کے، میں سمجھ گیا۔'' نارائن نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو شیتل ہاتھ ہلاتے ہوئے بیڈ روم سے باہر چلی گئی۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھایا، واقعی وہاں ایک سیل فون پڑا تھا۔ اس نے وہ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر باہر کی جانب لپکا۔ وہ شیتل کو جاتا ہوا دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ نو بجے ایک کار لے کر نکل گیا۔ جب وہ کم از کم دس کلومیٹر سے زائد سفر کر چکا تو ایک چھوٹے سے ریستوران

میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے فریش جوس کا آرڈر دیا اور سیل فون کو کھول کر دیکھنے لگا۔ اس سیل فون میں صرف ایک نمبر محفوظ تھا اور اسی نمبر سے ایک میسج آیا ہوا تھا۔ اس میں یہ ہدایات تھیں کہ سیل فون میں کس جگہ کیا پڑا ہے۔ اس نے پہلا فولڈر کھولا، اس میں سات آٹھ چھوٹے چھوٹے ویڈیو کلپ تھے۔ وہ ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ پھر تصویروں کے فولڈر میں آ گیا، اس میں بہت ساری تصویریں پڑی ہوئی تھیں، ان میں کچھ ایسی بھی تھیں جن پر معلومات درج تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے لیے کیا حکم ہے اور اس کو کیا کرنا ہے۔ وہ پوری طرح تیار ہو گیا۔

اس ریستوران سے نکلنے کے بعد وہ ایک شاپنگ مال میں چلا گیا۔ وہاں کی پارکنگ میں اس نے اپنی کار روکی اور اندر بڑھ گیا۔ کچھ دیر تک پھرتے رہنے کے بعد وہی سیل فون بجا اور اس پر میسج آ گیا۔ ایک بیوٹی پارلر میں جانے کو کہا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں تھا۔ اس وقت وہاں کوئی خاتون گاہک نہیں تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس نے وہاں ہینگر میں پڑے کپڑے اسے تھما دیے۔

دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا۔ نارائن سیاہ رنگ کی کار کو خود ہی ڈرائیو کرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ذرا سی تبدیلی تھی۔ اس نے نقلی مونچھیں لگائی ہوئی تھیں اور بھویں کچھ زیادہ تھیں، اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی چیک دار شرٹ اور سیاہ پتلون پہنے وہ کسی آفیسر جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بڑا سکون تھا۔

اسے آزاد نگر جانے والے روڈ پر مڑنا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی، وہاں پہنچنے میں اسے زیادہ سے زیادہ تین منٹ درکار تھے۔ وہ جیسے ہی روڈ پر پہنچا، اسے سامنے وہ بلڈنگ دکھائی دی جہاں اس کو جانا تھا۔ اس نے کار پارکنگ میں لگائی اور کار لاک کیے بنا باہر نکل آیا۔ اس بلڈنگ میں کاروبار ہوتا تھا۔ اس لیے کافی لوگوں کا رش تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہاں پر سی سی ٹی وی کیمرے نہ لگے ہوتے۔ اس نے غیر محسوس انداز میں اردگرد دیکھا، اسے دو آدمی دکھائی دیے، جن کی تصویر اور کپڑے تک اس نے ویڈیو میں دیکھے ہوئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس کے کور کے لیے ہیں۔ انہیں اس وقت تک کچھ نہیں کرنا تھا، جب تک نارائن کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ وہ بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔ وہی دو آدمی اس سے پہلے ہی لفٹ کے سامنے جا پہنچے۔ انہوں نے لفٹ کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگے۔ وہ نارائن کو اس طرح کور کیے ہوئے تھے کہ اگر وہ سی سی ٹی وی کیمرے میں آ بھی رہے ہوں تو نارائن کا چہرہ دکھائی نہ دے۔

وہ لفٹ میں داخل ہو گئے۔ نارائن ان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی پشت میں لگے تین پسٹل میں سے دو انہوں نے غیر محسوس انداز میں نکال لیے۔ وہ تینوں چوتھی منزل تک جا پہنچے۔ وہ دونوں اس کے آگے آگے تھے، وہاں اس راہداری میں کوئی بندہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب چھٹی پر ہوں۔ وہاں بڑی بڑی کمپنیوں کے آفس تھے۔ جلد ہی انہیں اپنی مطلوبہ کمپنی کا آفس دکھائی دے گیا۔ وہ دونوں آفس کے اندر چلے گئے۔

ایک منٹ کے وقفے کے بعد نارائن بھی اندر چلا گیا۔ آفس کے اندر کا ماحول بڑا خاموش سا تھا۔ وہ دونوں آدمی ایک آدمی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تھے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ نارائن اس آفس کا سارا ماحول ویڈیو میں دیکھ چکا تھا۔ یہ سمجھنے میں بالکل بھی پریشانی نہیں ہوئی کہ اسے کدھر جانا ہے۔ وہ لنچ ٹائم تھا، کافی لوگ وہاں نہیں تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا اس کمپنی کے مالک کے آفس میں جا پہنچا۔ وہ موٹا مالک ایک صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ وقت چنا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہاں لوگ کم ہوتے تھے۔ کمپنی کا مالک کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے آرام کرتا تھا، سب لوگ جانتے تھے اس لیے ایسے وقت میں ملاقاتی نہیں آتے تھے۔ نیم تاریک کمرے میں وہ داخل ہوا تو ایک لمحے کے لیے اسے کچھ دکھائی نہ دیا تھا، اس نے جاتے ہی آفس کی پشت والی دیوار میں بنی کھڑکی کا پردہ سرکا دیا۔ وہ موٹا آدمی انتہائی غصے میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ نارائن اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے پوچھا۔

”ابے کون ہے تو؟“

”مایا دیوی۔“ نارائن نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا تو اس کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ یوں ہو گیا جیسے ابھی مر جانے والا ہو۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

”کک...... کک کیا بات ہے، یوں تم کیسے اندر آ گئے؟“

”تمہیں مارنے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پسٹل نکال لیا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس نے نال کمپنی کے مالک کے ماتھے پر رکھی تو وہ نیم مردہ سی آواز میں بولا۔

’’دیکھو، مایا دیوی جو کہے گی میں مان لوں گا۔ ساری پراپرٹی ان جھونپڑپٹی والوں کو واپس کردوں گا۔‘‘

’’تو لاؤ، وہ فائل کدھر ہے؟‘‘ نارائن نے کہا۔

’’ابھی دیتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اٹھا تو نارائن بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ گیا۔ وہ موٹا مالک میز کی دراز تک گیا۔ اس کی چابیاں دراز سے لیں اور ساتھ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تجوری میں تیزی سے مطلوبہ چابی لگائی اور ایک فائل نکال لی۔ نارائن نے فائل کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی تصدیق کی۔ اس نے فائل کھولی۔ اس میں دیکھا، اطمینان کرنے کے بعد پوچھا۔

’’یہی فائل ہے یا......‘‘

’’بھگوان قسم یہی فائل ہے، بس یہ......‘‘ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ نارائن فائر کرتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اپنے کپڑوں پر خون کے داغ نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ اس نے پسٹل سامنے چھپایا۔ وہ بڑے آرام سے باہر نکل آیا۔

وہ دونوں ابھی تک وہیں تھے۔ نارائن اجنبی سے انداز میں ان کے پاس سے گزرا اور پھر آفس سے باہر چلا گیا۔ ایک منٹ کے وقفے سے وہ دونوں بھی باہر آ گئے۔ وہ لفٹ تک گئے۔ یہی لمحے سب سے زیادہ رسک لینے والے تھے۔ اس دوران اگر موٹے کمپنی مالک کے قتل کا پتا چل جاتا تو وہ لفٹ ہی میں پھنس کر رہ جاتے، ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بجائے لفٹ کے سیڑھیوں کی جانب بڑھے اور پھر تیزی سے اترتے چلے گئے۔ انہیں لفٹ سے جانے کی نسبت تین منٹ زیادہ لگے۔ نارائن کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے کار میں بیٹھا اور پارکنگ سے نکل کر آزاد نگر ہی کی جانب چل پڑا۔

ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس کا سیل فون بجا پھر اس کے ساتھ ہی میسج آ گیا۔ اس نے کھول کر پڑھا تو لکھا تھا کہ جب تک خود کو محفوظ نہ سمجھو، یہ سیل فون ضائع مت کرنا اور جیسے ہی خود کو محفوظ سمجھو۔ اس میں موجود سرخ فولڈر کو کھولنا۔ نارائن نے اندازہ لگایا کہ وہ ساحلی ولا سے تقریباً دس کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اس نے خود کو محفوظ سمجھا اور سرخ فولڈر کھول لیا۔ فولڈر کھلتے ہی اسکرین تاریک ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا سیل فون کے کسی وائرس نے سارے فون کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ فون اب کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اس نے راستے میں جاتے ہوئے ایک کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔

☆☆☆

تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ نارائن کے وہی دن اور راتیں تھیں۔ اسے وہی کام تھا۔ کھانا پینا، کسرت کرنا اور سو جانا۔ کبھی کبھار وہ اپنے تینوں ملازمین کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے باہر بھی چلا جاتا۔ اسے یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ کہیں بیٹھ کر، کسی ریستوران سے کھا پی لیتا۔ وہ تینوں سائے کے مانند اس کے ساتھ رہتے تھے۔

اس شام بھی وہ ڈنر کر کے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ابھی وہ نیند میں جا ہی رہا تھا کہ اسے خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس نے ایک عورت کا ہیولا دیکھا، جو چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا تاکہ اس ہیولے کو پکڑ سکے، تب تک وہ ہیولا اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی سائیڈ ٹیبل کا لیمپ روشن ہو گیا۔ مدھم روشنی میں اس نے دیکھا، ایک عورت اس کے ساتھ بیڈ کے دوسرے کنارے پر بیٹھی ہے۔ مدھم روشنی میں وہ اس کے چہرے کو غور سے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ تبھی وہ عورت بولی۔

’’اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لیے آئی ہوں۔ سنا ہے بہت ساری لڑکیاں تمہاری زندگی میں آتی ہیں، اب ایک رات مجھے بھی آزما کر دیکھو۔‘‘

’’کون ہو تم؟‘‘ نارائن نے پوچھا۔

’’یہاں اس ولا میں، تمہارے بیڈ روم تک کس کی اجازت سے آیا جا سکتا ہے؟‘‘

’’مایا دیوی۔‘‘ نارائن نے ہلکے سے کہا تو وہ ہنس دی۔

’’تو پھر تمہیں چنتا کس بات کی ہے، سکون سے پڑے رہو۔‘‘ وہ عورت خمار بھرے لہجے میں بولی اور اگلے ہی لمحے اس سے لپٹ گئی۔ خوشبو نے جہاں نارائن کو مہکا کر رکھ دیا تھا، وہاں اس عورت کے جسم کی گرمی سے اس کے سارے بدن میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ ان کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی مگر ان کے بدن شور مچانے لگے تھے۔ نارائن کی حیرت لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کسی کا بدن اتنا پُرخلوص بھی ہو سکتا ہے، اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ تشنگی، بے تابی اور جنون کے رنگ اس کے بیڈ پر بکھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر چور ہو گیا۔ سارا شور ایک سناٹے میں بدل گیا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد نارائن نے اس سے پوچھا۔

’’کون ہو تم؟‘‘

اس پر وہ عورت بیڈ سے اٹھی۔ اس نے کپڑے پہنے

اور پھر اس نے کمرا روشن کر دیا۔ نارائن کے سامنے ایک پتلی سی عورت کھڑی تھی۔ بدن کے خدوخال بتا رہے تھے کہ جیسے انہیں تراشا گیا ہو۔ صراحی دار لمبی گردن، گول چہرہ اور لمبے بال، چہرے کے نقوش کو اس نے غور سے دیکھا تو یوں لگا جیسے یہ چہرہ اس نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہوا ہے۔ وہ عورت مسکراتے ہوئے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے تو وہ بولی۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''یہی کہ میں نے تمہیں پہلے کہاں دیکھا ہے۔'' نارائن نے اعتراف کیا۔

''کچھ بھی یاد نہیں آیا؟'' وہ منمناتے ہوئے بولی۔

''مجھے یاد نہیں آرہا۔ شاید ابھی یاد آجائے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تو وہ ہنس دی پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نارائن، میں مایا دیوی کے بہت قریب رہنے والی، ہر دم اُس کے ساتھ رہنے والی ہوں۔ اس دنیا میں اسے صرف میں نے دیکھا ہے۔'' اس کے سنسنی خیز انکشاف پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے وہ اور......'' نارائن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''یہی تو ساری دنیا جاننا چاہتی ہے اور جس دن دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے، اسی دن مایا دیوی کا وجود ختم ہو جائے گا۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟'' نارائن نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ مایا دیوی چاہتی ہے کہ تمہیں بتایا جائے۔ ایسا فیصلہ کیوں کیا گیا، ممکن ہے بعد میں پتا چل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی، ''جاننا چاہتے ہو مایا دیوی کیسے بنی؟''

''ہاں، کیسے بنی؟'' اس نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''ایک لڑکی تھی، یہی کوئی اٹھارہ سال کی تھی، ابھی کالج میں پڑھ رہی تھی۔ جہاں وہ رہتی تھی وہیں کے آس پاس رہنے والے کچھ غنڈوں نے اس کا ریپ کر لیا۔ اس نے شور نہیں مچایا، اس دکھ کو سہہ گئی۔ اس نے صرف اپنی ماں کو بتایا۔ اس کی ماں نے فوراً اس کی شادی کا بندوبست کر دینا چاہا۔ وہ لڑکی اپنے کالج فیلو کو چاہتی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کے ساتھ شادی ہو جائے مگر نہ ہو سکی۔ جہاں اس کی ماں نے کہا، اسے وہاں شادی کرنا پڑی۔ وہ سسرال چلی گئی۔''

وہ آہ بھر کے بولی۔ ''اس کا پتی بہت خبیث نکلا۔ وہ اس سے اونچے لیول کا دھندا کروانا چاہتا تھا۔ وہ چھوٹا موٹا ٹھیکیدار تھا، بڑا ٹھیکیدار بننے کے لیے اپنی پتنی کو آفیسر کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ اسے مارا پیٹا، اور اسے غنڈوں کے ریپ کی ساری کہانی سنا دی۔ وہ ریپ بھی اسی نے کروایا تھا تاکہ اس کی ماں اسے اسی کے ساتھ بیاہ دے۔ ان کے پاس دوسرا آپشن ہی نہ رہے۔ وہ لڑکی بے بس ہو گئی۔ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔'' وہ عورت یہ کہتے ہوئے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

''کیا کیا پھر اُس لڑکی نے؟'' اس نے پوچھا۔

''انہی دنوں اس کی ملاقات اپنے کالج فیلو سے ہوئی۔ اس نے اپنا سارا دکھڑا اسے سنا دیا اور مدد مانگی کہ کسی طرح اس کے پتی سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ اس کے کلاس فیلو سے اور تو کچھ بن نہ پڑا، اسے یہی کہا کہ چند دن تک تمہارے شوہر سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا، اس کا شوہر کسی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس لڑکی کو انشورنس کے علاوہ بہت پیسہ ملا۔ اس نے سب جمع کیا اور وہاں سے گھر بیچ کر کسی دوسری جگہ چلی گئی۔ یہ سب اس نے اپنے کلاس فیلو کے کہنے پر کیا۔''

''اس کلاس فیلو نے اُسے جرم کے راستے پر لگا دیا'' نارائن کو کہانی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

''نہیں اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ کمپیوٹر ہیکر تھا۔ اس کی مدد سے لوگوں کا پیسہ چراتا تھا۔ کمپنیوں کے راز فروخت کرتا تھا اور لوگوں کو بلیک میل کرتا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو کمپیوٹر پڑھنے کا کہا۔ وہ خود بھی اسے سمجھاتا اور سکھاتا۔ اس لڑکی نے تین برس دن رات ایک کر دیے۔ یہ سب لڑکے کے اپنے فائدے کے لیے تھا۔ وہ لڑکی اس کی مددگار بن گئی۔ اس لڑکی نے ڈگری لی اور ایک سوفٹ ویئر کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اسے وہاں جا کر پتا چلا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ ایک کارپوریٹ آفس میں اس کی ساری ناآسودہ خواہشیں جاگ اٹھیں۔ اس نے اپنے کلاس فیلو کے ساتھ مل کر اپنی ایک چھوٹی سی کمپنی بنائی اور پھر دن رات محنت کرتے چلے گئے۔''

''انہوں نے آپس میں شادی کر لی تھی؟'' نارائن نے پوچھا۔

''ارے کہاں، وہ ویسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ دونوں ہی غربت کی پیداوار تھے۔ انہیں بچے

نہیں چاہیے تھے۔ وہ اس جھمیلے ہی میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ گھر کی زندگی وہ چاہتے ہی نہیں تھے۔ خیر۔! ایک دن اس لڑکی کا کلاس فیلو بلیک میلنگ کے چکر ہی میں مارا گیا۔ اس دن اس لڑکی نے سوچا کہ جرم کی دنیا میں اگر رہنا ہے تو ایک طاقت بن کر، ورنہ خاموشی سے نکل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ عورت خاموش ہو گئی۔

''پھر کیا فیصلہ ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ اس دنیا سے اب نہیں نکل سکتی مگر طاقت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے پاس صرف ایک ہی راز تھا کہ جس طرح اس کی اپنی ناآسودہ خواہشیں اس کی طاقت بن گئیں، اسی طرح نجانے کتنے لوگ اپنی حسرتیں، خواہشیں اور امیدیں لیے پھرتے ہیں۔ بس انہیں استعمال کر لیا جائے۔ اس نے ابتدا اپنے ہی آفس سے کی۔ ان لوگوں کو نوازنا شروع کر دیا۔ وہ جتنی طاقتور ہوتی چلی گئی، اس نے اتنا ہی خود کو چھپا لیا۔'' یہ کہہ کر وہ عورت خاموش ہو گئی۔ اس پر نارائن نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے مایا دیوی کسی آئی ٹی کمپنی کی مالک ہے؟''

''ایک نہیں اب تو کئی ہیں۔ وہ اپنی دولت کے تین حصے کرتی ہے، ایک اپنے لیے، دوسرا اپنے لوگوں کے لیے اور تیسرا مایا دیوی کی حفاظت کے لیے۔ اس کا حکم کئی جگہوں سے ہوتا ہوا کسی تک جا پہنچتا ہے۔ وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں آئی۔'' یہ کہہ کر وہ عورت مسکرا دی۔

''میرا سوال وہیں ہے، وہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟''

''یہ تم خود سے کیوں نہیں پوچھتے؟ کوئی وجہ تو ہوگی۔'' اس عورت نے کہا اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چل دی ہو، ابھی تو رات باقی ہے۔'' اس نے عورت کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اپنا پرس اٹھایا، اس میں سے ایک سیل فون نکال کر وہیں سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''مجھے جانا ہوگا۔ یہ سیل فون رکھ دیا ہے۔ کل دس بجے، اسی طرح ولا سے دور جا کر کھولنا۔'' یہ کہہ کر اس نے حسرت سے نارائن کو دیکھا اور پھر مڑ کر بیڈ روم سے نکلتی چلی گئی۔ جب تک وہ باہر نکلا، وہ پورچ میں موجود ایک شاندار گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ نارائن واپس اپنے بیڈ پر آیا۔ اس نے سیل فون دراز میں رکھ کر وقت دیکھا، رات ختم ہونے والی تھی۔ وہ حسبِ معمول سب کچھ بھلا کر سو گیا۔

☆☆☆

نارائن ولا سے دس کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر چلا گیا۔ اس نے جوہو ساحل کی ایک پارکنگ میں کار روکی اور ٹہلتا ہوا ساحل پر چلا گیا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سیل فون نکالا اور اسے کھول لیا۔ پہلے کی طرح ایک ہی نمبر تھا اور اسی سے میسج بھی آیا ہوا تھا۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اس میں ایک ہی ویڈیو ہے اسے غور سے دیکھنا۔ اس نے ویڈیو آن کی تو اس میں وہی رات والی عورت تھی وہ کہہ رہی تھی۔

''نارائن، مجھے یہ دکھ ہمیشہ رہے گا کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ کبھی سمیتا دیوی تمہاری محبوبہ ہوا کرتی تھی، کیا تم نے مجھ میں کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ مہیش بے غیرت نکلا تھا۔ وہ ساری کہانی میری ہے جو میں نے تمہیں سنائی۔ کہیں بھی تم نے اپنا پن محسوس نہیں کیا۔ میں اتنی بدل گئی ہوں؟ میں مانتی ہوں کہ اپنی شخصیت بدلنے کے لیے میں نے اپنا چہرہ پلاسٹک سرجری سے تھوڑا سا بدل لیا مگر محبت کرنے والے تو سانسوں سے پہچان لیتے ہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میں نے تمہیں تلاش کیا جبکہ تم نشے میں گم ہو چکے تھے۔ میں نے تمہیں بڑی آسائش والی زندگی دینا چاہی مگر تم ہر بار خود ہی انکار کرتے رہے۔ میری محبت نے اس دن جوش مارا تھا جب تم نے ایک عام سی کال گرل کو میرا نام دیا تھا۔ میں نے اسے فلم اسٹار بنا دیا۔ تم نے اچھا کیا اسے قتل نہیں کیا۔ جو فائل میں نے تم سے منگوائی وہ گنگا نگر کے واسیو کی تھی۔ میں تمہارے ساتھ اس دنیا میں رہنا چاہتی تھی مگر تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ پہچان جاتے تو یہ ویڈیو نہ دیکھ رہے ہوتے۔ خیر، اس ویڈیو کے ختم ہوجاتے ہی یہ سیل فون بے کار ہو جائے گا۔ تم اب واپس ولا نہیں جا سکتے۔ تم نے میری طاقت کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن جرم کی اس دنیا میں مجھ سے بھی بڑے بڑے بلکہ بہت بڑے مجرم پڑے ہیں۔ میں بھی ایک دن راز بن جاؤں گی۔ تم پلٹ کر گنگا نگر چلے جاؤ۔ تمہارے دوست مانے کو میں نے وہ فائل دے دی ہے۔ وہ وہیں ہے گنگا نگر، تم بھی وہیں جا کر لوگوں کی خدمت کرو، یہی تم جھونپڑ پٹی والوں کی قسمت ہے۔''

ان لفظوں کے ساتھ ہی ویڈیو ختم ہو گئی۔ ایک لرزا ہوا اور اسکرین تاریک ہو گئی۔ بالکل اس کی قسمت کی طرح۔ وہ چند لمحے فون کو دیکھتا رہا اور پھر اسے زور سے سمندر میں پھینک دیا۔